سوانحی ادب کا ترجمان

جولائی، اگست، ستمبر 2023

آپ بیتی

2

کتابی سلسلہ

نئی دہلی

مدیر

شاہ عمران حسن

مدیر اعزازی

ڈاکٹر محمد سلیم

جنوری تا جون 2023ء
ششماہی ڈائجسٹ

جدید اسلامی بصیرتوں کا نقیب

■ آٹھویں دہائی سے مسلسل شاعت پذیر ماہنامہ الرسالہ دہلی ہیں
مولانا وحید الدین خاں کی منتخب فکر انگیز تحریروں کا کتابی ششماہی ڈائجسٹ

■ اسلام اور عصر حاضر کے تعلق سے معاصر علماء اور دانشوروں کی
طبع زاد اور ماخوذ' سنجیدہ اور معنی خیز تحریریں بھی شامل اشاعت رہیں گی۔

العصر

کتابی سلسلہ

ڈائجسٹ

تاریخِ عالم شاہد ہے کہ انسان اوّل و آخر ناکام و نامراد رہا
مگر وہ لوگ جنہوں نے احکامِ الٰہی کی تعمیل کی ——!

(العصر، القرآن ؛ مفہوم)

عنقریب منظر عام پر آ رہا ہے

ترتیب و تہذیب: فاروق مضطر

اہتمام
ہمالین سینٹر فار پیس اینڈ آبجیکٹیو اسٹڈیز
ہمالین کیمپس، وارڈ نمبر ۹ — راجوری (جموں)، 185131

9419170905, 9906355140, 9419184689,
9419171296, 7006452955, 7889316788

alasrhimalayan@gmail.com

سوانحی ادب کا ترجمان

کتابی سلسلہ آپ بیتی-2 نئی دہلی

جولائی، اگست، ستمبر 2023، سلسلہ نمبر:2

مدیر

شاہ عمران حسن

مدیر اعزازی

ڈاکٹر محمد سلیم

ایسوسی ایٹ پروفیسر ہائر ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ، جموں اینڈ کشمیر (راجوری)

رابطہ

مکی مسجد کالونی، مدن پور کھادر پارٹ-3، گوشالہ روڈ، سریتا وِہار، نئی دہلی-110076

Makki Masjid Colony, Madanpur Khadar Extension, Part 3,
Gaushala Road, Sarita Vihar, New Delhi-110076

Mobile:+91-9810862382,E-mail:aapbeetiquarterly@gmail.com

Kitabi Silsila Aapbeeti -2 (Book Series)

July,August,September 2023. Issue No.02. Rs.500

ISBN 978-81-936908-8-8

Editor

Shah Imran Hasan

Honorary Editor

Dr Mohd Saleem

Associate Professor English

Higher Educatoon Dept. J&K (Rajouri)

زرتعاون

- فی شمارہ:500روپے، سالانہ:دوہزارروپے،خصوصی تعاون دس ہزارروپے
- بیرون ممالک کے لیے زرتعاون سالانہ:200امریکی ڈالر
- سالانہ ممبرشپ کے لیے ہندوستان کے کسی بھی نیشنلائزڈ بینک کے کسی بھی برانچ سے درج ذیل اکاونٹ میں رقم بھیجی جاسکتی ہے، نیز فون پے اور گوگل پے سے بھی رقم بھیجی جاسکتی ہے۔

Shah Imran Hasan

A/c : **3123486501**

Central Bank of India

IFSC Code: CBIN0283835

Jasola Branch, New Delhi-110025

GooglePay, PhonePe : 9810862382

- کتابی سلسلہ میں شائع شدہ مواد سے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ کسی بھی قابلِ اعتراض مواد کی اشاعت کے لیے مضمون نگار خود ذمہ دار ہے۔
- کتابی سلسلہ 'آپ بیتی' سے متعلق تنازعات کی چارہ جوئی صرف نئی دہلی کی عدالتوں میں کی جائے گی۔

- آنر، پرنٹر، پبلشر اور مدیر شاہ عمران حسن نے مرکزی پبلیکیشنز، نئی دہلی-110025 سے چھپوا کر دفتر آپ بیتی، مکی مسجد کالونی، گوشالہ روڈ، مدن پور کھادر، سریتا وہار، نئی دہلی-110076 سے شائع کیا۔

فہرست

خودنوشت

شخصیات

انٹرویو

اسفار

تبصرے

منظوم کلام

نامے

...

مطالعۂ کتب ایک اہم ضرورت

انسان جب عہدِ طفلی سے نکل کر شباب کی پرچھائیوں پر قدم رکھتا ہے تو اسے صحیح اور غلط کی تمیز و تہذیب نظر آنے لگتی ہے۔ یہ ایک فطری بات ہے جو ہر انسان کے ساتھ لازمی طور پر پیش آتی ہے۔ اس میں امیر و غریب عالم و جاہل کا کوئی امتیاز نہیں ہے اور انسان اپنی عمر و تجربے اور عقل و شعور کی روشنی میں اپنی زندگی کا ایک نصب العین بنا کر زندگی کی گاڑی کو آگے کی طرف بڑھاتا ہے۔

تاہم کسی بھی چیز کو سہی طور پر سمجھنے کے لیے علم و معلومات کی ساتھ غور و فکر کی ضرورت بھی ہوتی ہے۔ اس کے بغیر کسی چیز کی اہمیت و افادیت کو انسان نہیں پہچان سکتا۔ بلا سوچے سمجھے انسان جو بھی اقدام کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں اسے نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور بعض اوقات ایسے نقصان ہو جاتے ہیں جس کی تلافی انسان عمر بھر نہیں کر پاتا ہے۔

مذکورہ باتوں کے پیش نظر ہمارے ذہن میں ایک سوال ابھرتا ہے کہ ان نقصانات سے بچنے کے لیے آخر انسان کیا کرے؟ اس کا جواب نہایت ہی آسان ہے کہ انسان مطالعہ و مشاہدہ کرے۔

مطالعہ کیا ہے؟ مطالعہ دراصل اپنے نہ جاننے کو جاننے کا نام ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی کے بارے میں قیاس آرائی کی بنیاد پر کچھ رائے قائم کئے ہوئے رہتا ہے جب کہ مطالعہ و مشاہدہ اس کے برعکس نتیجہ اخذ کرتا ہے۔ اس لیے ہر انسان کے لیے مطالعہ و مشاہدہ ایک ضروری ہی نہیں بلکہ لازمی شئے ہے۔

مطالعہ و مشاہدہ کے بغیر ایک انسان اپنی مقامی زندگی بھی بہتر طریقے سے نہیں گزار سکتا ہے۔ خواہ جس مقام پر بھی آپ رہ رہے ہوں اس کے بارے میں آپ کی واقفیت نہ صرف اچھی ہونی چاہیے بلکہ بہت اچھی ہونی چاہیے تا کہ آپ کو کبھی کسی مشکل کا سامنا نہ کرنا۔

اسی طرح ایک انسان کے لیے مطالعہ کی بے حد اہمیت ہے۔ اس سے انسان کی شخصیت بنتی ہے۔ وہ ایک منجمد شخصیت سے نکل کر ایک وسیع تر شخصیت والا انسان بن جاتا ہے۔ دراصل علم و مطالعہ ہی آدمی کو انسان بناتا ہے۔ اس کے بغیر انسان نہ صرف ادھورا ہے بلکہ کمتر اور نامکمل بھی۔ اسی مناسبت سے کہا جاتا ہے کہ علم طاقت ہے۔ اگر آپ کے پاس علم جیسی مقدس اور قیمتی شئے موجود ہے تو بے شک آپ ایک طاقت ور انسان

ہیں؛ اور علم ایک ایسی دولت ہے، جسے کوئی چرا نہیں سکتا، کوئی خرید نہیں سکتا؛ حتی کہ یہ ایسی منفرد اور قیمتی دولت ہے کہ خرچ کرنے سے بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ انسان حالات اور وقت کے تحت مطالعہ کرے کیوں کہ وہی نالج و جانکاری فائدہ مند ثابت ہوتی ہے جو وقت پر کام دے سکے۔ بے وقت اور حالات سے ہٹ کر مطالعہ و مشاہدہ کرنا ایسا ہی ہے جیسے کہ اندھے کوئیں میں اپنے آپ کو جان بجھ کر گرا دینا۔

یہاں مطالعہ کتب کی اہمیت وافادیت پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے سابق استاد پروفیسر ٹی ڈبلو آرنلڈ کی بات یاد آرہی ہے جو کہ ان کے رفیق سفر مولانا شبلی نعمانی نے اپنی کتاب 'سفرنامہ مصر و روم وشام' میں درج کی ہے۔

پروفیسر ٹی ڈبلو آرنلڈ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ 1892ء میں جب مولانا شبلی نعمانی نے قسطنطنیہ کا سفر کیا تو جہاز میں پورٹ سعید (مصر) تک پروفیسر ٹی ڈبلو آرنلڈ کا بھی ساتھ رہا۔ اس تعلق سے مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں: 10 مئی 1892ء کی صبح کو میں سوتے سے اٹھا تو ایک ہم سفر نے کہا کہ جہاز کا انجن ٹوٹ گیا۔ میں نے دیکھا تو واقعی کپتان اور جہاز کے ملازم گھبرائے پھرتے تھے اور اس کی درستی کی تدبیریں کر رہے تھے۔ انجن بالکل بے کار ہو گیا تھا اور جہاز نہایت آہستہ آہستہ ہوا کے سہارے چل رہا تھا۔ میں سخت گھبرایا اور نہایت ناگوار خیالات دل میں آنے لگے۔ اس اضطراب میں اور کیا کر سکتا تھا۔ دوڑا ہوا پروفیسر ٹی ڈبلو آرنلڈ کے پاس گیا۔ وہ اس وقت نہایت اطمینان کے ساتھ کتاب کا 'مطالعہ' کر رہے تھے۔

میں نے ان سے کہا کہ آپ کو خبر بھی ہے۔

بولے کہ ہاں انجن ٹوٹ گیا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ کو کچھ اضطراب نہیں۔ بھلا یہ کتاب دیکھنے کا موقع ہے۔

فرمایا کہ جہاز کو اگر برباد ہونا ہے تو یہ تھوڑا سا وقت اور بھی قدر کے قابل ہے؛ اور ایسے قابلِ قدر وقت کو رائیگاں کرنا بالکل بے عقلی ہے۔ ان کے استقلال اور جرأت سے مجھ کو بھی اطمینان ہوا، آٹھ گھنٹے کے بعد انجن درست ہوا اور بدستور چلنے لگا۔ (سفرنامہ روم و مصر وشام، مولانا شبلی نعمانی، صفحہ: 9، سنہ اشاعت 1894ء)

مولانا شبلی نعمانی کے مطابق سمندر میں پانی کا جہاز مسلسل آٹھ گھنٹوں تک خراب رہا، ان آٹھ گھنٹوں کے درمیان پروفیسر آرنلڈ مستقل یکسوئی کے ساتھ مطالعہ کرتے رہے۔ انھوں نے ان خطرناک لمحات میں بھی

مطالعہ کر کے اپنے علم میں اضافہ کرنے کو بہتر سمجھا؛ اس ایک چھوٹے سے واقعے سے مطالعہ کی اہمیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہیں یہ بھی ضروری ہے کہ انسان متنوع فکر کا مطالعہ کرے، ورنہ اس پر ذہنی جمود طاری ہو جاتی ہے اور وہ ذہنی بونا پن کا شکار ہو جاتا ہے۔ جب کہ نئے نئے افکار و نظریات کو جاننے اور سمجھنے کے بعد ہمارے خیالات میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔

غرض کہ مطالعۂ کتب سے زندگی آسان ہوتی ہے، انسانی زندگی میں جو بھی ترقیاتی سرگرمیاں ہوئی ہیں وہ مطالعہ و مشاہدہ کی مرہون منت ہیں۔ حتیٰ کہ ہم مطالعہ کے ذریعہ ہی کسی حتمی نتیجے تک پہنچ جاتے ہیں۔ مثلاً علم نفسیات کا مطالعہ انسانی رویہ کے بارے میں آپ کو آگاہی عطا کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص خرق عادت، حرکت و سکنات میں مبتلا ہے تو آپ اس کے برتاؤ اور رویہ کا مطالعہ کر کے اس کے لیے سہولت کا سامان فراہم کر سکتے ہیں۔

مطالعۂ کتب کی طرف رغبت دلانے کی ایک چھوٹی سی کاوش کتابی سلسلہ 'آپ بیتی' کی شروعات ہے، اگر اس کاوش سے لوگوں میں دوبارہ کتب کی قرأت کا رجحان پیدا ہونے لگا تو اتنی سی ہی بات اس کی کامیابی کی کافی مانی جائے گی۔

ہمارے لیے یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ کتابی سلسلہ آپ بیتی کا پہلا شمارہ (مئی جون 2023ء) شائع ہوا تو اسے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ عام طور پر قارئین کرام نے 'آپ بیتی' کے مشمولات کو پسند کیا اور خوبصورت و دعائیہ پیغامات سے نوازا گیا۔ پہلے شمارہ کی کامیابی کو دیکھتے ہوئے آپ بیتی کے اندر مزید نکھار لانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ نیز قارئین کے درمیان بہتر سے بہتر مواد پہنچانے کے لیے ادارہ آپ بیتی ہمہ وقت تیار ہے۔

پہلے شمارے کی اشاعت پر ہمیں بہت سے خطوط ملے، اب ظاہر سی بات ہے کہ طوالت کے خوف سے سارے خطوط شامل نہیں کیے جا سکتے ہیں۔ اس لیے یہاں کچھ منتخب خطوط شامل اشاعت کیے جا رہے ہیں۔ یاد رکھیے! جس طرح ہمارے لیے قارئین کرام کی دعائیں اہم ہے، اسی طرح ان کے مفید مشورے، تجاویز اور تنقیدیں ہمارے اندر کچھ بہتر کرنے کا جذبہ پیدا کرتی ہیں۔

31 جولائی 2023ء
بروز منگل

شاہ عمران حسن
نئی دہلی

...

خودنوشت

میری علمی زندگی

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

میں بجائے اس کے کہ ان کتابوں کا ذکر کروں جن سے معلومات حاصل ہوئی ہیں اور جن کا ممنونِ احسان ہوں اور جن کی وجہ سے محدود صلاحیت ہی سہی، لیکن اس درجہ کی صلاحیت پیدا ہوئی کہ لکھ پڑھ سکتا ہوں، عربی میں بھی، اُردو میں بھی، ان کے بجائے ان کتابوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے گہرا اثر ڈالا اور ایک انقلاب انگیزی کا کام کیا۔

لوگوں نے ایسی کتابیں تو لکھی ہیں جن میں کتابوں کی فہرست آ گئی ہے کہ کیا کیا پڑھا، لیکن ضرورت تھی کہ ان کتابوں کے نام لیے جاتے اور اچھے پڑھنے لکھنے والے دانشوران کتابوں کا ذکر کرتے اور ان کتابوں کا ذکر کرتے، جن کتابوں کے مطالعہ سے ان میں انقلاب پیدا ہوا۔

میرے لیے سب سے زیادہ ذوقی اور تفریحی موضوع جس میں کبھی طبیعت پر بار نہیں پڑتا اور جس سے سیری نہیں ہوتی تذکرے، تراجم اور سوانحِ حیات کا موضوع ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ دادا حکیم سید فخر الدین خیالی اور والد مولانا حکیم سید عبدالحئی حسنی بڑے مورخ اور سوانح نگار تھے، ان کی زندگی کا بڑا حصہ اس مشغلے میں صرف ہوا۔ میرا رفتارِ مطالعہ عام طور پر سست ہے، طبیعت روا داری کے ساتھ پڑھنے پر قانع نہیں ہوتی، لیکن اس کا زیادہ تر انحصار موضوع اور مضمون کی نوعیت پر ہے، ادبی اور تاریخی چیزیں تیز رفتاری سے پڑھتا ہوں اور علمی مباحث آہستہ رفتاری اور دقتِ نظر کے ساتھ۔

عام طور پر شور و شغب اور لوگوں کی موجودگی سے میرے مطالعہ میں اور بعض اوقات لکھنے میں بھی کوئی خلل نہیں پڑتا اور شاید بعض لوگوں کے لیے یہ بات موجبِ تعجب ہو کہ بعض اوقات مدد ملتی ہے۔ میں نے اپنے بعض اہم مضامین اور کتابیں تھرڈ کلاس کے مسافروں سے بھرے ہوئے ڈبے میں لکھی ہیں۔ جب طبیعت میں روانی پیدا ہو جاتی ہے اور اپنے اندر لکھنے کا تقاضا اور مضامین و خیالات کی چیونٹیاں رینگتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں تو شور و ہنگامہ اس میں مخل نہیں ہوتا، لیکن جب ایسی کیفیت نہ ہو اور طبیعت بند و کند معلوم ہوتی ہو تو تنہائی اور خاموشی کی تلاش ہوتی ہے۔

جب سے زمانہ قیام اور حضر کی مشغولیتیں اور ذمہ داریاں بڑھ گئی ہیں، کسی نئی کتاب کا مطالعہ زیادہ تر موقع سفر ہی میں ملتا ہے جو بکثرت پیش آتے ہیں۔ اِس لحاظ سے سفر بڑے مفید ثابت ہوتے ہیں۔ صدہا صفحات کی کتابیں اکثر سفر ہی میں ختم ہوتی ہیں۔ مجھے کتابوں پر نشان لگانے کی عادت بہت پُرانی ہے اور یہ میں

نے اپنے استاد مولانا سید محمد طلحہ حسنی سے سیکھی ہے، لیکن نشان بڑی احتیاط سے پنسل (Pencil) سے لگاتا ہوں۔ ان نشانوں اور حواشی سے کتاب کو دوبارہ پڑھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

وہ کتابیں جن کا پڑھنا بڑا مجاہدہ اور شدید ضرورت کے بغیر ان کے چند صفحات کا پڑھنا بھی میرے لیے دشوار ہے، وہ تین طرح کی چیزیں ہیں۔ ایک مناظرہ اور تردید کی کتابیں، دوسرے خشک فلسفیانہ مباحث یا وحدۃ الوجود وغیرہ، اور فلسفہ اخلاق کی متصوفانہ کتابیں، تیسرے قادیانی لٹریچر جو حسنِ انشاء، حلاوتِ تحریر اور عمیقِ فکر سے یکسر خالی ہے۔

مجھے مزاحیہ لکھنے والوں میں مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی سب سے زیادہ پسند ہیں۔ پطرس بخاری، رشید احمد صدیقی کے وہ مضامین جن میں زیادہ علمیت اور تفلسف نہیں ہے، پسند آتے ہیں، رشید احمد صدیقی کے مجموعوں میں سے 'گنج ہائے گرانمایہ' بہت کامیاب اور دل آویز ہے۔ طنز نگاری میں مولانا عبدالماجد دریابادی خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ خاص طور پر جہاں زیادہ تلخی اور تیزی نہیں ہوتی۔ یہ احتیاط مولانا ابوالکلام آزاد کے یہاں زیادہ ہے، اور ان کے ادب کے وہ حصے اگرچہ کم ہیں، لیکن ہیں لطیف اور سبک۔

مجھے کتابیں مستعار دینے کے سلسلے میں بڑے تلخ تجربے ہوئے۔ مستعار لینے والے اپنی ذمہ داری محسوس نہیں کرتے اور مستعار دینے والا بھول جاتا ہے کہ کتاب کس کو دی تھی۔ میرے ساتھ یہ المیہ بہت پیش آیا ہے۔ اس سے کمتر المیہ ہے کہ مستعار لینے والے کتاب بے احتیاطی کے ساتھ پڑھتے ہیں، کتاب پر دھبے اور نشانات پڑ جاتے ہیں۔ مجھے ایک کتاب سے اس لیے دست بردار ہونا پڑا کہ اس پر دھبے پڑ گئے تھے یا حواشی نے اس کی رونق و رعنائی ختم کر دی تھی۔ میں شروع سے کتاب کے بارے میں کچھ زیادہ نفاست پسند اور ذکی الحس واقع ہوا ہوں۔ کتاب پر پسینے کا ایک دھبہ یا کسی پڑھنے والے کی حاشیہ آرائی مجھے کتاب کے مطالعہ سے محروم کر دیتی ہے اور بعض اوقات مستعار لینے والے ہی کو نذر کر دیتا ہوں کہ اب میرے کام کی نہیں رہی۔

میں اُن چند کتابوں کا ذکر کرتا ہوں۔ جنھوں نے میرے محدود رقبہ علم میں، رقبہ عمل میں اور رقبہ حیات میں، میرے دائرہ فکر میں انقلاب برپا کیا، شاید بعض لوگوں کو کچھ خیال پیدا ہو، ان کے پڑھنے، ان کے دیکھنے کا، ورنہ کتابیں اپنی تعداد کے لحاظ سے، صفحات کے لحاظ سے، اپنی ضخامت کے لحاظ سے ناقابلِ شمار ہیں۔

خاکسار کا خاندان ایک خزاں رسیدہ دینی خانوادہ ہے جس کے بزرگوں نے کبھی فصل خزاں میں بھی دُنیا کو پیامِ بہار سُنایا تھا، ہندوستان میں جب دین کی بہار آخر ہوئی تو اِس خاندان پر بھی تنزل آیا، ہوش کی آنکھیں کھولیں تو دینداری جوانوں سے زیادہ بوڑھوں میں اور مردوں سے زیادہ عورتوں میں تھی۔ میرے گھر کا ماحول دادا مولوی سید فخر الدین خیالی اور والد مولانا حکیم سید عبدالحئی حسنی کی وجہ سے دینی کے ساتھ ادبی بھی رہا۔

بہت بچپن ہی سے اُردو نثر و نظم کی درسی و غیر درسی کتابیں ہم بھائی بہنوں کے مطالعہ میں رہتی تھیں۔

مولانا الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد، راشد الخیری کی بہت سی کتابیں اس زمانہ میں پڑھ لیں۔ اس زمانہ میں مولوی اسماعیل میرٹھی کا اُردو نصاب کمکِ اُردو، سوادِ اُردو اور سفینۂ اُردو رائج تھا۔ ہندوستان کا سررشتۂ تعلیم ان کتابوں سے بہتر کتابیں مرتب نہیں کرواسکا۔ ان میں 'سفینۂ اُردو' کا اثر آج تک دل ودماغ پر باقی ہے۔ نصف صدی گزر جانے کے باوجود اب بھی اگر وہ کتاب ہاتھ آجائے تو شاید سب کام چھوڑ کر اُسی کو پڑھنے لگوں اور بچپن کی یاد تازہ کروں۔

اس غیر شعوری مطالعہ کا یہ فائدہ ہوا کہ زبان کا لطف اور ذوقِ زندگی کے ہر دور میں ساتھ رہا اور تحریر و انشاء میں کبھی 'مولویانہ خشکی' پیدا نہ ہونے پائی۔ میرے خیال میں ابتدائے عمر میں سلیس وشگفتہ زبان اور اچھے مصنفین کی کتابوں کا پڑھنا جو سلیس وشریں زبان میں اپنے خیالات ادا کرنے کے عادی ہیں، بہت مفید اور ایک حد تک ضروری ہے، ورنہ نئی نسل اور نئے عہد سے رشتہ منقطع ہوجاتا ہے اور دعوت وتلقین کا پورا فائدہ نہیں اُٹھایا جاسکتا۔ میرے نزدیک ابتداً میں ادبی مطالعہ کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ادبی مطالعہ اور تحریروں کی مشق کے لیے اس وقت نوجوانوں کو مولانا شبلی نعمانی، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، ڈاکٹر سید عباد حسین، چودھری غلام رسول مہر، مولانا شاہ معین الدین ندوی، مولانا محمد حسین آزاد، ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ کی کتابوں اور تحریروں کو ضرور دیکھنا چاہیے۔

مجھے یاد ہے میری زندگی پر اثر سب سے پہلے 'مسدس حالی' کا پڑا، انھوں نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کا جہاں تذکرہ کیا ہے، پھر اسلام کی خدمت اور اس کی انقلاب انگیزی کا جہاں ذکر کیا ہے، اس کا بڑا حصہ زبانی یاد تھا، اس زمانہ میں مسلمانوں کے اکثر گھروں میں 'مسدس حالی' پڑھی جاتی تھی، اس کے بہت سے شعر خواتین بچیوں اور لڑکیوں کی زبان پر بھی تھے۔

اُردو کے ابتدائی مطالعہ اور طالبِ علمی کے اس ابتدائی دور میں جس کتاب کو اپنے شوق سے پڑھا وہ قاضی سلیمان منصور پوری کی سیرت 'رحمۃ العالمین' ہے۔ مجھے یہ کبھی نہیں بھولے گا کہ جب اس کتاب کی وی پی پی (Value Payable Post) رائے بریلی آئی اور اس کے چھڑانے کے لیے اس وقت روپیہ نہ تھا تو میں نے بے اختیار رونا شروع کیا، یہاں تک کہ کسی نہ کسی طرح اس کا انتظام کیا گیا اور کتاب میرے ہاتھ میں آئی۔ بار بار پڑھی، کئی جگہ اور کئی بار اپنے دل اور آنکھوں کو قابو میں نہ رکھ سکا۔

اُنہی دنوں مولانا شبلی نعمانی کی کتاب 'الفاروق' پڑھی، مولانا نے عراق کی جنگوں بویب، جسر اور قادسیہ وغیرہ کے میدانِ جنگ کی تصویر چھوٹے بے ساختہ و برجستہ جملوں میں کھینچی ہے، شاید اس سے زیادہ فردوسی 'شاہنامہ' میں مسلسل اشعار اور پُرشکوہ الفاظ اور مبالغہ سے پیدا نہیں کرسکا۔ مولانا شبلی نعمانی نے نظام خلافت پر جو کاوش کی ہے، اس کے سمجھنے کی اس وقت صلاحیت نہ تھی، اور اب اس سے کوئی دل چسپی اور علمی تاثر نہیں ہے،

لیکن واقعات کے حصہ کا اثر اس وقت بھی تھا اور اب بھی ہے۔

مولانا شبلی نعمانی کی دوسری کتاب جو اس دور میں پڑھی 'سفرنامہ روم ومصروشام' تھی۔ اتفاق سے یہی دو کتابیں ہمارے گاؤں کے محدود ذخیرہ کتب میں تھیں۔ آخر الذکر کتاب سے معلومات میں بڑا اضافہ ہوا، ذہن میں وسعت پیدا ہوئی، اور کیا عجب ہے کہ اوّل اوّل اِسی کتاب سے دنیائے اسلام کی سیاحت کا شوق پیدا ہوا جس کی نوبت برسوں بعد آئی۔ کچھ عرصہ بعد مولانا کی سوانحی کتب الغزالی، سوانح مولانا روم اور المامون پڑھیں۔ افسوس ہے کہ 'شعرالعجم' کے پڑھنے کی نوبت بہت بعد میں آئی جس کو میں اپنے موضوع پر منفرد اور مولانا کا شاہکار سمجھتا ہوں۔

عم محترم مولانا سید طلحہ حسنی کی صحبت میں 'آبِ حیات' سے تعارف ہوا، سنی اور بار بار پڑھی، یہاں تک کہ اس کے بہت سے مضامین مستحضر ہوگئے۔ گلِ رعنا (از مولانا حکیم سید عبدالحیٔ حسنی) گھر کی کتاب تھی، اس کو اتنی بار پڑھا کہ اُردو شاعری کی تاریخ اور شعرا سے متعلق اتنی معلومات ہوگئی کہ اس موضوع پر مجلس میں گفتگو کرنے اور گفتگو میں حصہ لینے کی استعداد پیدا ہوگئی۔ میرے ماموں زاد بھائی مولانا سید ابوالخیر برقؔ اور حافظ سید حبیب الرحمٰن وغیرہ کی صحبت میں زبان کا ذوق اور اچھے بُرے کی تمیز پیدا ہوئی۔ حافظ سید حبیب الرحمٰن کے اشعار سننے اور ان کا مطلب بیان کرنے کے سلسلہ میں دماغ پر زور ڈالنے اور مشکل اشعار کے سمجھنے کی عادت پڑی۔ میں نے بھی کچھ اشعار موزوں کرنے کی کوشش مگر بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی نے بہت سختی سے روک دیا اور یہ شغل بے حاصل جاری نہ رہ سکا۔

مولانا محمد حسین آزاد کی کتب 'نیرنگ خیال' اور 'آبِ حیات' کا بہت اثر پڑا۔ اس کی تقلید میں بہت سے صفحے سیاہ کئے، جو اپنی کم سوادی کے باوجود فائدہ سے خالی نہیں رہے۔ یہ زمانہ ہر چھپی ہوئی چیز کے پڑھنے کے مرض کا تھا، ہر قسم کی چیزیں پڑھیں، عبدالحلیم شرر اور رتن ناتھ سرشار کی بھی کتابیں پڑھیں۔ کہتے ہیں کہ کوئی پڑھی ہوئی چیز خواہ بھلا دی جائے، بے کار بے اثر نہیں رہتی، اپنا اچھا بُرا اثر ضرور کرتی ہے، اس لیے اس کا دعویٰ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ نقش آنکھوں سے آگے نہیں بڑھنے پائے۔ اُردو مضمون نویسی میں ابتدائی اثر والد صاحب کی کتاب 'یادِ ایام' کا تھا، جو سنجیدہ زبان کا ایک شگفتہ نمونہ ہے اور جس میں تاریخ کی متانت کے ساتھ، زبان کا بانکپن بھی موجود ہے۔

اکبرالہٰ آبادی مرحوم کے کلام نے بھی متاثر کیا۔ ملک میں مغربی تہذیب کا دور آیا اور میں چوں کہ لکھنؤ شہر کا رہنے والا ہوں جو تحریکِ خلافت اور تحریکِ آزادی کا بڑا مرکز رہا ہے، لیکن اس وقت انگریزی تہذیب کا اور مغربی ثقافت (culture) کا اتنا اثر تھا کہ کوئی شخص اس سے بچا نہیں تھا۔ جب کسی چیز کی بڑائی بیان کرنا چاہتے تو کہتے تھے کہ یہ ولایت سے آئی ہے، میں ولایت سے آیا ہوں۔ ان کے چند شعر پڑھتا ہوں، جن سے

آپ سمجھ جائیں گے کہ کتنی بڑی حقیقت بیان کی ہے، وہ کہتے ہیں:

لکھے گا کلکِ حسرت دُنیا کی ہسٹری میں
اندھیر ہو رہا تھا بجلی کی روشنی میں

علومِ مغربی کے بحر میں غوطہ لگانے سے
زباں گو صاف ہو جاتی ہے دل طاہر نہیں ہوتا

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بیویاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا

پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

میرے نزدیک ابتداء میں ناظرہ قرآن شریف پڑھنا بہت ضروری ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ بعض ماہرین تعلیم کی رائے کے مطابق تھوڑی سی اُردو پڑھا کر قرآن شریف کا پڑھانا زیادہ بہتر ہوگا یا عام دستور کے مطابق قرآن شریف ہی سے ابتدا کرانا زیادہ بہتر ہے۔ بہرحال مجھے اس رائے سے بالکل اتفاق نہیں ہے کہ سمجھ کر قرآن شریف پڑھنے کی استعداد پیدا ہونے کے انتظار میں ناظرہ پڑھانے کو بالکل موقوف رکھا جائے۔ ناظرہ قرآن شریف پڑھنا اور محض تلاوت خود ایک عبادت اور امر مقصود ہے، سمجھ کر پڑھنا یہ ایک الگ کام اور ضرورت ہے۔ ان میں سے کوئی ایک دوسرے سے مستغنی نہیں ہے۔

عربی تعلیم شروع ہو جانے کے بعد میرے اُستاد شیخ خلیل عرب بن محمد بن شیخ حسین یمنی نے ہمیشہ کے لیے دل پر توحید کا نقش قائم کر دینے لیے سورہ زمر بڑی توجہ اور ذوق وشوق سے پڑھائی۔ اُنھوں نے مبادی صرف اور تحریر و انشاء کی مشق کے ساتھ المطالعه العربیه، الطریقه المبتکرة، مدارج القرأة، مجموعه من النظم والنثر، نهج البلاغه، حماسه، سقط الزند، دلائل الاعجاز للبحرجانی، تاریخ الادب الغة العربیه، الضریری وغیرہ پڑھائی۔

میرے استاد شیخ خلیل عرب بن محمد کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے منتخب مصنفین ومنتخب تصنیفات کو اِس طرح طلبہ کے سامنے پیش کرتے تھے کہ گویا وہی زبان وادب اور طرزِ ادا کا واحد نمونہ اور ادب وذوق کا منتہیٰ ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ وہ مصنفین طلبہ کے دماغ اور تخیل پر حاوی ہو جاتے تھے اور طالبِ علم اُن کا رنگ

اُتارنے لگتے تھے۔ راقم الحروف نے ابن المقفع اور صاحبِ نہج البلاغہ، نیز کبھی کبھی جرجانی کی تقلید میں لکھنے کی کوشش کی اور اس کا بڑا فائدہ ہوا۔

میرے استاد شیخ خلیل عرب بن محمد نے اس تعلیم کی انتہائی مرحلہ میں سید مصطفی لطفی المنفلوطی کی کتاب 'النظرات' دیکھنے کو دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس صدی کا یہ ساحر ادیب دماغ اور تخیل پر چھا گیا اور دل میں سما گیا۔ اس کے عنوانوں پر اپنے مضامین لکھے اور تیز رفتار سوار کے پیچھے دوڑ کر دور تک خاک اُڑائی۔

میری خوش قسمتی تھی کہ حدیث میں مولانا حیدر حسن خاں جیسا متبحر استاد نصیب ہوا۔ جب حدیث کی تعلیم شروع ہوئی تو کوئی دوسرا فن اور موضوع متراجم نہ تھا، صرف حدیث کے اسباق تھے۔ درسِ حدیث میں عملی طور پر سب سے زیادہ فائدہ امام نوویؒ کی 'شرح مسلم' سے ہوا، جو ایک مبتدی طالبِ علم کے لیے بڑا اچھا اُستاد ہے۔ فتح الباری سے استفادہ کی اصل نوبت تدریس کے زمانہ میں آئی۔ قلبی طور پر سب سے زیادہ اثر ابوداوٗد کی کتاب 'کتاب الادعیہ' اور ترمذی کی 'کتاب الزھد والرقاق' نے ڈالا۔

اسی زمانہ میں 'احیاء العلوم' دیکھنے کا شوق ہوا اور اس نے دل پر بجلی کا سا اثر کیا، مگر یہ مطالعہ جاری نہیں رہ سکا۔ اس میں بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کی بصیرت کو دخل تھا جن کے نزدیک اس کے مطالعہ کے شغف سے بعض غیر معتدل رجحانات کے پیدا ہونے کا اندیشہ تھا۔

سنہ 1930ء میں علامہ شیخ تقی الدین ہلالی مراکشی کو اگر نہ دیکھا ہوتا تو عربی زبان وادب کے بہت سے مبادی وبدیہات، زبان کی تعلیم کے بہت سے حقائق واصول نظر سے ہمیشہ اوجھل رہتے اور عجمیت و ہندیت کے اثر سے کلیۃً آزادی نصیب نہ ہوتی۔ ان سے عربی ادب وشعر کی کتابیں پڑھنے کی بھی سعادت حاصل ہوئی، لیکن اس سے زیادہ مفید ان کی صحبت اور مجالس وسفر کی رفاقت تھی، ان کی صحبت وافادات سے دو حقیقتیں پہلی بار منکشف ہوئیں: ایک تو یہ کہ زبان اور ادب میں فرق ہے۔ زبان وہ ہے جو ادب کی بنیاد ہے، ادب زبان کی بنیاد کے کاخ وایوان اور زبان کی دیوار کے نقش ونگار ہیں، ادب خیالات کے اظہار کا بلند اور فنی اور ترقی یافتہ ذریعہ ہے، جو تمدن وتخیل کی ترقی کی پیدا ہوتا ہے۔ زبان کی تعلیم وتربیت ادب کی تعلیم پر مقدم ہے۔ اگر زبان نہیں آتی تو ادب نہیں آسکتا اور اس کی قبل از وقت تعلیم ضیاع وقت ہے۔ ہندوستان میں زبان کے دھوکہ میں اور عربی زبان کے نام سے اعلیٰ عربی ادب کی تعلیم دی جارہی ہے، جو اکثر اوقات بے بنیاد اور بے نتیجہ ثابت ہوتی ہے۔ دوسری حقیقت یہ منکشف ہوئی کہ صرف ونحو کے قواعد زبان کی تشکیل کے اصول ہیں، جن کا درجہ زبان کے بعد ہے۔ زبان کا ذخیرہ اگر کچھ نہ ہو تو صرف ونحو کے قواعد بے کار ہیں۔ مفردات، الفاظ و جمل مکان کی اینٹیں ہیں اور نحو کا علم اصولِ تعمیر کے قواعد اور انجینئری کا فن۔ اگر سرے سے اینٹیں نہ ہوں تو انجینئرنگ اور اصولِ تعمیر کا بڑے سے بڑا علم ناکارہ اور فضول ہے۔

یہ زمانہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں عربی کی بہار کا تھا۔ اِدھر علامہ شیخ تقی الدین ہلالی مراکشی کا فیضِ عام تھا اُدھر ہمارے دوست مولانا مسعود عالم ندوی 'الضیاء' نکال رہے تھے، عربی زبان وتحریر، نقد وتبصرہ گویا اوڑھنا بچھونا ہورہا تھا۔ عربی رسائل وجرائد پر گفتگو ہوتی رہتی تھی۔ یہ میری عربی اخبار بینی کی عمر کا بچپن تھا۔ عربی ادب کی کتابیں پڑھ لینے کے باوجود اخبارات کا بڑا حصہ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ میں نے اپنے بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کی مدد سے اخبار پڑھنا شروع کیا اور اس سے جتنا فائدہ اور تعبیر، اور اظہارِ خیال میں جتنی قدرت حاصل ہوئی، ادب وزبان کی کسی کتاب یا کتابوں سے نہیں ہوئی۔

مصری وشامی ادباء وفضلاء کے مضامین پڑھ کر ان کی فصاحت، زبان کی قدرت کا سکہ دل پر بیٹھا، اس میں کوئی شبہہ نہیں عربی زبان کے خزانہ عامرہ کے نوادر جو صدیوں سے سربمہر تھے، وہ اپنے اخبارات ورسائل کے کھلے صفحات میں روزانہ لٹاتے ہیں، اور امیر شکیب ارسلان (1946-1869)ء کے بقول عہدِ عباسی (1517-750)ء ایک ادیب برسوں میں جتنا لکھتا تھا، وہ اس عصر کا ادیب وصحافی چند دنوں میں لکھ لیتا ہے۔

سید احمد شہید کے متعلق مولانا محی الدین قصوری کا ایک مضمون بعنوان 'تیرھویں صدی کا مجدد اعظم' رسالہ توحید (امرتسر، پنجاب) شائع ہوا۔ بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کے حکم سے 1930-1929ء میں، میں نے اس کا عربی ترجمہ کیا۔ علامہ شیخ تقی الدین ہلالی مراکشی کی اصلاح کے بعد علامہ سید رشید رضا نے 'المنار' میں شائع کیا اور 'ترجمة الامام السید احمد بن عرفان الشهید' کے نام سے علاحدہ رسالہ کی شکل میں چھاپ دیا گیا۔

سنہ 1934ء میں میری مدرسی تعلیم کا اختتام ہوچکا تھا اور آزاد مطالعہ کا آغاز، حافظ ابن قیم کی 'زاد المعاد' میرا کتب خانہ، میری رفیق سفر اور میری گویا اتالیق ومعلم تھی۔ دینیات کے کتب خانہ کی اتنی بہتر نمائندگی ایک کتاب میں ملنا مشکل ہے۔ اگر مجھے کبھی پورے ذخیرۂ علمی سے محروم کردیا جائے اور صرف دو کتابوں کی اجازت دی جائے تو میں کتاب اللہ اور زاد المعاد اپنے ساتھ رکھوں گا۔ اس نے مجھے نماز سکھائی، دعائیں اور اذکار یاد کرائے، سفر کے آداب بتائے اور روزمرہ زندگی کے مسنون قواعد واحکام سکھائے اور سنت کا ضروری علم بخشا۔

ابتدائے شباب میں جو کتابیں فرشتۂ رحمت بن کر سامنے آئیں، ان میں سے زیادہ موثر اور محسن کتاب محمد بن نصر المروزی کی کتاب 'قیام اللیل' ہے۔ اس کتاب میں شب بیدار نوجوانوں کے ایسے موثر واقعات لکھے ہیں اور قرآن مجید کی بعض آیات کی اتنی پُر اثر تفسیر اور قیام لیل کے فضائل جمع کیے ہیں جو اگر کسی خوش قسمت نوجوان کو آغاز شباب میں مل جائیں، اور اپنا اثر کرجائیں تو ایک شیخ کامل کی بیعت سے کم نہیں۔

امام ابن تیمیہ کی تفسیر سورۃ النور نے بھی اس پُر آشوب زمانہ میں دستگیری کی۔ حافظ ابن قیم کی 'الجواب الکافی' نوجوانی میں بہترین محتسب وناصح ثابت ہوئیں۔ زمانہ تعلیم کے بے شعور دور میں 'تعلیم المتعلم' نے تعلیم سے اور معلمین سے نفع اُٹھانے اور ان کے احترام اور طالبِ علمی کے آداب کا لحاظ کرنے کا خیال پیدا کیا۔ اسی

طرح تحصیل علم میں ہمت ،عزیمت اور ذوقِ علم پیدا کرنے میں مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی کتاب 'علمائے سلف' نے مہمیز کا کام دیا۔

والد محترم کا ایک مسودہ 'ارمغانِ احباب' دیکھا جو بعد کو 'دہلی اور اس کے اطراف' مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے شائع ہوا۔ یہ سفرنامہ انھوں نے اپنی 26 سال کی عمر میں لکھا ہے۔ اس نے میرے دل پر بڑا اثر کیا، مردانِ خدا کی محبت اور دین کی چاشنی محسوس ہوئی، سید احمد شہید سے اصل قلبی تعلق اسی رسالہ سے پیدا ہوا۔

دوسری چیز جس نے حضرات اہلِ اللہ کی محبت وعقیدت پیدا اور دین کا ایک خاص مزہ معلوم ہوا، جس کو الفاظ میں ادا کرنا مشکل ہے، مولانا سید محمد علی مونگیری کا کتابچہ 'ارشادِ رحمانی' ہے۔ جس میں مولانا فضل رحمٰن گنج مُرادآبادی کے حالات، حکایات وملفوظات اور سلوک وطریقت کے کچھ نکات ہیں۔ مولانا فضل رحمٰن گنج مُرادآبادی میرے والد مرحوم کے شیخ تھے اور بچپن سے گھر میں ان کا ذکرِ خیر سنا تھا۔ اس سے کچھ بعد والد مرحوم کا ایک رسالہ 'استفادہ' کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے اپنے گنج مُرادآبادی کے حالات، مشاہدات ،الطاف وعنایات کے واقعات قلم بند کیے تھے۔ اس نے مولانا فضل رحمٰن گنج مُرادآبادی کی محبت وعقیدت اور اہلِ اللہ سے ملاقات اور استفادہ کے شوق میں اور اضافہ کیا۔

مشائخ وبزرگانِ دین کے ملفوظات کے مجموعے بھی نظر سے گزرے۔ ان مجموعوں میں نظام الدین اولیاء (1238-1325) ء کے ملفوظات 'فوائد الفواد'، شاہ غلام علی کے ملفوظات 'دارالمعارف' کا قلب پر اثر پڑا۔ اگرچہ ذہن نے حدیث کے اثر اور ایک خاص ذہنی تربیت ومطالعہ کی وجہ سے بعض باتوں کے قبول کرنے سے ادب کے ساتھ معافی چاہی، لیکن قلب نے واقعات اور بے ساختہ گفتگو اور خلوص کی گرمی ونرمی محسوس کی۔

فلسفۂ تصوف اور فلسفۂ اخلاق کے نکات ومباحث نے جو متاخرین صوفیہ کی کتابوں میں بکثرت ملتے ہیں، کبھی متاثر نہیں کیا۔ البتہ دردِ محبت اور سوز وگداز کی باتیں بے اثر نہیں رہتی تھیں، اور یہ تیر کم خطا جاتے تھے، دردِ محبت میں ڈوبے ہوئے اشعار اور فقرے دل پر نقش اور حافظہ میں محفوظ ہو جاتے تھے:

ہم نے اپنے آشیانہ کے لیے
جو چُبھے دل میں وہی تنکے لیے

بزرگوں کی مجالس وملفوظات کے سلسلہ میں یہ کہے بغیر آگے نہیں بڑھا جاتا کہ جب مولانا شاہ محمد یعقوب مجددی بھوپالی کی مجالس میں حاضری کا شرف حاصل ہوا اور ان کی التفات وعنایات سے سرفراز ہوا تو اُن کی زبان سے دینی حقائق ونکات اور سلوک وتصوف کی نادر تحقیقات سن کر عالمِ حیرت میں پڑ گیا، اللہ تعالیٰ نے ان کے ملفوظات ومجالس کے قلم بند کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ یہ مجالس مکتبہ الفرقان (لکھنؤ) سے 'صحبتِ با اہلِ دل' کے نام سے شائع ہوئی۔

طالبِ علمی کے باقاعدہ اختتام کے قریب قصبہ سلون (ضلع رائے بریلی) جانے کا اتفاق ہوا۔ یہاں دو کتب خانے دیکھے۔ کتب خانہ مولانا شاہ حلیم عطا کے واسطہ سے حافظ ابن جوزی، حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن قیم، حافظ ابن رجب اور ابن عبدالباری وغیرہ کی کتابیں دیکھیں۔ پھر وطن واپس آ کر احیاء العلوم مع تخریج عراقی، فضل علم السلف علی الخلف، دفائن الکنوز، تلبیس ابلیس، مختصر منہاج القاصدین وغیرہ منگوائیں۔ تلبیس ابلیس کے مطالعہ سے ناقدانہ ذہنیت پیدا ہوئی۔

اب اس سے پہلے کہ میں اپنی آخری محسن وموثر کتابوں کا ذکر کروں، تاریخی ادوار کے لحاظ کے بغیر ان کتابوں اور تحریروں کا ذکر کرتا ہوں، جنھوں نے بعض خاص حیثیتوں سے دل ودماغ پر کوئی اثر کیا اور کوئی قابلِ ذکر علمی فائدہ یا ذہنی تغیر پیدا کیا۔ نظام ونصاب تعلیم کے متعلق اصلاحی وتجدیدی خیالات کا تخم شیخ خلیل عرب بن محمد اور علامہ شیخ تقی الدین ہلالی مراکشی کی مجالس درس میں دماغ پر پڑا۔ دین ودُنیا کی باہم آمیزی اور علماء واہلِ دین کی قیادت واقتدار کی ضرورت واہمیت کا احساس مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے اس خطبہ صدارت کو پڑھنے کے بعد ہوا جو اُنھوں نے سنہ 1924ء میں پڑھا تھا۔

مغربی تہذیب ونظام سے 'نفرت' اصل میں بڑے بھائی ڈاکٹر سید عبدالعلی حسنی کی صحبتوں اور مجلسوں سے پیدا ہوئی، جو اس سے براہِ راست تعلق رکھتے تھے اور اعلیٰ مغربی تعلیم کے باوجود اس کی سخت تنقید اور مذمت کرتے تھے۔ یوں بھی ان کی زندگی اور ان کا سراپا قدیم اسلامی تہذیب وثقافت کی فتح مندی اور مغربی ماحول کے اثرات کی شکست وہزیمت کا اعلان کرتا تھا، اس نفرت کو جو زیادہ تر قلبی تھی، مولانا عبدالماجد دریا آبادی کے 'سچ' اور 'صدق' کے پرچوں نے مستحکم اور دماغی بنا دیا تھا۔

مغربی تہذیب کی تاریخ سمجھنے میں اور لادینیت ومادیت کے ارتقاء کی اس منزل کی توجیہ میں ڈریپر (John William Draper) کی مولانا ظفر علی خاں کی ترجمہ کردہ کتاب معرکہ مذہب وسائنس (Conflict Between Religion and Science) اور انگریزی زبان کے ممتاز فلسفی ولیم ایڈورڈ ہارٹ پول لیکی (William Edward Hartpole Lecky) کی مشہور تصنیف 'تاریخ اخلاق یورپ' (History of European Morals From Augustus To Charlemagne) (مترجم مولانا عبدالماجد دریا آبادی) نے بڑی مدد دی اور اس سے بڑا مواد ملا، جس سے اپنے مضامین واستدلال میں بہت کام لیا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مضامین، ترجمان القرآن اور تنقیحات نے زیادہ وضاحت و تقویت پہنچائی۔ ماہنامہ ترجمان القرآن کے مضامین نے طرزِ استدلال اور طرزِ تحریر پر بھی اثر ڈالا اور ان کی تحریروں نے ذوق وفکر کو متاثر کیا۔

مغربی تہذیب کے مزاج اور اس کے بنیادی نقائص، اسلامی تہذیب سے اس کے بنیادی واصولی تضاد

پر نو مسلم علامہ محمد اسد کی کتاب اسلام ایٹ دی کراس روڈس (Islam At The Crossroads) اور روڈ ٹو مکہ (Road To Mecca) پُر مغز چیز معلوم ہوئی جس کا لفظ لفظ دل نشیں ہوا۔ یہ کتب ہر جویائے حق اور صاحبِ ذوق کے پڑھنے کی ہے۔

جہاں تک تاریخ، اخلاقیات اور دین کا تعلق ہے، اس میں، میں نے مسلمانوں کے انحطاط، مسلمانوں کے مسندِ قیادت سے دست کش ہو جانے یا پیچھے ہو جانے سے دُنیا کو کیا نقصان پہنچا، اس کا میں نے بالکل ایک تاریخی، غیر جانبدارانہ، ایک مبصرانہ اور ناقدانہ تبصرہ کیا جو عربی زبان میں 'ماذاخسر العالم بانحطاط المسلمین ' کے نام سے چھپا جس کا اُردو ترجمہ 'انسانی دُنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر' کے نام سے شائع ہوئی۔ عالمِ عربی میں میری جو کتاب سب سے زیادہ پڑھی گئی اور مقبول ہوئی، وہ یہی کتاب تھی۔ مصر کے نامور ادیب استاد انور الجندی نے اس کا ذکر کیا کہ جب مجھے کوئی زوردار چیز لکھنی پڑتی ہے اور خیال ہوتا ہے کہ تحریر میں جوش ہو تو پہلے 'ماذاخسر العالم بانحطاط المسلمین ' کے چند صفحات پڑھ لیتا ہوں، پھر قلم اُٹھاتا ہوں۔

سنہ 1939-1938ء میں مصر کے فاضل مصنف ڈاکٹر احمد امین (1945-1886)ء کی فجر الاسلام، ضحیٰ الاسلام کے مطالعہ کا موقع ملا۔ یہ کتاب ڈاکٹر احمد امین کی قوتِ ملاحظہ اور حسن استنتاج کا اچھا نمونہ ہے، اگر چہ موجودہ عصری ومغربی تاثرات سے کلیتہً پاک نہیں اور اس کے مطالعہ سے ذخیرہ حدیث پر اعتماد کسی حد تک متزلزل ہو جاتا ہے اور اس کی بعض بنیادی شخصیتوں کے بارے میں وہ عظمت اور عقیدت قائم نہیں رہتی جو ایک مسلمان کے دل میں قائم رہنی چاہئے۔ مجھے مصنف کی اس کمزوری کا احساس اس وقت ہوا جب نے ڈاکٹر الشیخ مصطفیٰ السباعی کی کتاب 'السنة ومكانتهافي التشريع الاسلامی' پڑھی، جس کے مطالعہ کی سفارش فن حدیث کے ہر طلب علم سے ہے۔ اس کے باوجود ڈاکٹر احمد امین سے خیالات میں بڑا توارد معلوم ہوا۔ لیکن سب سے زیادہ فائدہ جوان کتابوں کے مطالعہ سے حاصل ہوا، وہ شگفتہ، شیریں اور علمی طرزِ تحریر کا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد (1958-1888)ء کے 'تذکرہ' سے امام احمد بن حنبل اور محدثین کی عمومی عظمت دل ودماغ پر قائم ہوئی۔ 'تذکرہ' اور الہلال کے ادبی سحر حلال نے مسحور کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی تفسیر 'ترجمان القرآن' سے تفسیر اور فہم قرآن کے بعض نئے گوشوں سامنے آئے اور فکر میں وسعت پیدا ہوئی۔ سورہ یوسف پر جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ نہ صرف قرآنی نکتہ شناسی کی ایک مثال، بلکہ ادبِ عالی کا ایک زندہ جاوید نمونہ ہے۔

جب ترجمہ قرآن اور تفسیر کی تدریس کی خدمت دارالعلوم ندوۃ العلماء میں سپرد ہوئی تو مولانا شبیر احمد عثمانی کے حواشی کی قدر آئی۔ انھوں نے مفسرین کے اقوال کا عطر اور ان کی تحقیق کا وہ حصہ نقل کر دیا ہے جس کو اس زمانہ کا سلیم ذہن آسانی کے ساتھ قبول کر لیا جاتا ہے۔ جدید معلومات وتحقیقات نے تفسیر کے سلسلے میں جو نئے سوالات پیدا کر دیے ہیں، ان کا حل تلاش کرنے میں 'تفسیر ماجدی' اور اس کے مصنف مولانا عبدالماجد

دریا آبادی کے تفسیری مضامین وتحقیقات سے بڑی مدد ملی اور اپنے مطالعہ ومعلومات میں تحقیقی اضافہ ہوا۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی تمام تصنیفات نقدِ کامل عیار، اور علم وانشاء کے لحاظ سے معیار ہیں؛ لیکن اس بے بضاعت کو جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ 'خطباتِ مدراس' ہے۔ اگر کسی مصنف کے حصہ میں صرف یہی تصنیف آئے تو اس کو زندہ جاوید بنادے اور اگر مقبول ہو تو مغفرت کے لیے تنہا کافی ہے۔

مولانا سید مناظر احسن گیلانی کی کتابوں میں بڑی معلومات اور مواد ہے۔ میرا ہمیشہ ان کی کتابوں میں جی لگا اور اپنے علم میں اضافہ ہوا۔ خاص طور پر ان کی کتاب 'النبی الخاتم'، ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت، تدوینِ حدیث بڑی پر از معلومات اور موثر کتاب ہے۔ ان کا مضمون 'مجدد الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ' بھی بڑی بصیرت ومعلومات کا ذریعہ بنا۔

حیاتِ جاوید، وقارِ حیات اور تہذیب الاخلاق کے پرانے فائل سے ہندوستانی مسلمانوں کے موجودہ مزاج اور ان کے موجودہ تعلیمی وسیاسی رجحانات کے سمجھنے میں بڑی مدد ملی، جس کی تکمیل 'حیاتِ شبلی' سے ہوئی۔ مولوی سید طفیل احمد کی 'حکومتِ خود اختیاری' اور 'مسلمانوں کا روشن مستقبل' سے ہندوستان کی برطانوی سیاست اور مسلمانوں کے سیاسی تنزل اور ذہنی تغیر کی توجیہ ہوئی۔

والد محترم مولانا حکیم سید عبدالحیؒ حسنی کی تصنیف اور سرمایہ حیات 'نزہۃ الخواطر' کی آٹھ جلدیں ایک سے زائد بار پڑھیں۔ ان کتابوں سے ہندوستان کی 800 برس کی جیتی جاگتی تاریخ آنکھوں کے سامنے آگئی، علماء و مشائخ، اہل درس واہلِ تصنیف، اہل ذوق واہل کمال، سلاطین و وزرا اور امراء ورؤسا کے ایسے حالات اور ہندوستان کی علمی تاریخ کے ایسے قیمتی نوادر ونکات مفت میں مل گئے، جن کے لیے سینکڑوں کتابیں اُلٹنے اور ہزاروں صفحات کھنگالنے سے بھی کام نہ چلتا۔ یہ ایک بہت بڑی ثقافت اور معلومات کا خزانہ تھا جس کو ہندوستان کا کوئی طالبِ علم جو علم سے اپنا انتساب کرتا ہو، نظر انداز نہیں کرسکتا اور جس کے بغیر آدمی اپنے ملک ہی میں اندھیرے میں رہے گا۔ علمی طور پر کسی کتاب کے مواد اور علمی ذخیرہ سے اتنا کام نہیں لیا، جتنا 'نزہۃ الخواطر' کی ان ضخیم آٹھ جلدوں کے تاریخی معلومات سے جن کی تلاش کے لیے تاریخ وتصوف کی کتابوں کے ہزاروں صفحات دیکھنے کی نہ توفیق تھی نہ فرصت، اور نہ یہ اندازہ کہ ان کو کہاں تلاش کرنا چاہئے اور کس جگہ سے وہ دستیاب ہوسکتے ہیں۔ میری محرومی کہ میں اپنی کم سنی کی وجہ سے اپنے والد سے کوئی استفادہ نہ کرسکا، لیکن وہ ایسا علمی سرمایہ چھوڑ گئے ہیں کہ ساری عمر اس سے استفادہ کا موقع ہے۔

صدرِ جمہوریہ ہند ڈاکٹر ذاکر حسین نے مجھ سے فرمایا کہ جب میں مصر کے دورہ پر گیا تو صرف آپ کے والد مولانا حکیم سید عبدالحیؒ حسنی کی کتاب 'نزہۃ الخواطر' لے گیا اور میں نے میز پر رکھ دی، جب کوئی مصری اسکالر آتا یا کوئی اخبار کا بڑا نمائندہ یا کسی جامعہ کا پروفیسر، وہ کہتا کہ کیا ہندوستان میں علم ہے؟ ہندوستان کے لوگ عربی جانتے

ہیں؟ ہندوستان میں کوئی بڑا کام ہوا، کوئی بڑی خدمت ہوئی؟ میں کہتا یہ کتاب دیکھ لیجیے۔ مصر بھی ایسی کتاب نہیں پیش کر سکتا اور میں بتاتا ہوں عالم عربی کے ایک سیاح کی حیثیت سے بھی اور وہاں کی جامعات میں جانے والے اور وہاں خطاب کرنے والے کی حیثیت سے بھی کہ ایک کتاب بھی عالمِ عربی میں ایسی نہیں ملتی جو پہلی صدی سے چودھویں صدی عیسوی پر محیط ہو، یا تو ایک صدی پر کتابیں ہیں یا پھر ایک ایک فن پر ہیں، مثلاً کوئی کتاب صرف ونحو پر ہے، کوئی شاعری پر ہے، کوئی طب پر ہے، لیکن انھوں نے ہندوستان کی تاریخ لکھی، پہلی صدی جب سے یہاں عرب آئے اور اسلام آیا، اس وقت سے لے کر اپنی وفات تک کے ناموروں کا اس میں ذکر ہے۔

والد مرحوم مولانا حکیم سید عبدالحئ حسنی نے دوسری کتاب 'مجمع اللغتہ العربیۃ' لکھی جو دمشق سے شائع ہوئی۔ ہندوستان میں اس کا ترجمہ 'اسلامی علوم وفنون: ہندوستان میں' کے نام سے دارالمصنفین کی طرف سے شائع ہوا۔ اس میں ہندوستان کے علماء کی تصنیفات کی ڈائریکٹری ہے۔ پہلی صدی سے لے کر اس وقت تک کسی فن میں بھی کسی عالم نے کوئی کتاب لکھی ہے تو اس میں اس کا ذکر ہے۔

زندگی کے طویل تر دور میں دماغ پر علامہ اقبال کا بڑا 'غلبہ' رہا اور یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی معاصر شخصیت کے افکار کا اتنا گہرا اثر دماغ پر نہیں پڑا جتنا علامہ اقبال کے کلام کا، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان خیالات اور تمناؤں کی ترجمانی کرتے ہیں جو روح وجسم میں پیوست ہو چکی ہیں۔ علامہ اقبال اور ان کے کلام پر اُردو میں سب سے زیادہ پُر مغز اور روح پرور کتاب ڈاکٹر یوسف خاں کی 'روحِ اقبال' معلوم ہوئی۔

علامہ اقبال سے پہلی ملاقات 1929ء میں ہوئی جب کہ 1937ء میں کئی گھنٹے ان کے التفات و ارشادات سے محظوظ رہا، جس کا خلاصہ 'عارفِ ہندی کی خدمت میں چند گھنٹے' کے عنوان سے شائع ہوا۔ بلادِ عربیہ کے مسلمانوں کی بے التفاتی اور ناشناسی پر دل کھول کھول کر رہتا اور رابندر ناتھ ٹیگور کی قدر افزائی پر غصہ آتا۔ مصر میں پڑھنے جانے کے لیے ایک مفصل مضمون علامہ اقبال کی زندگی وخصوصیات پر لکھا اور بعد میں عالمِ عربی میں ان کے تعارف کی سب سے زیادہ کامیاب کوشش کی توفیق 'روائع اقبال' کے ذریعہ ہوئی۔ اس کتاب کا بڑا اثر پڑا، علامہ اقبال سے لوگوں کا تعارف ہوا اور انھیں حیرت ہوئی کہ ایسے شاعر سے ہم ناواقف تھے جو اسلام کا صحیح ترجمان ہے اور اس نے طاقت کا پیغام، خود اعتمادی کا پیغام اور انقلاب انگیزی کا پیغام جو اب تک کسی شاعر نے نہیں دیا تھا، دنیائے اسلام کو دیا۔

روائع اقبال کا اُردو ترجمہ مولانا شمس تبریز خاں کے قلم سے مجلس تحقیقات ونشریات اسلام (لکھنؤ) نے 'نقوشِ اقبال' کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس کتاب نے بلادِ عربیہ کے نوجوانوں میں بڑی مقبولیت حاصل کی۔ علامہ اقبال کے اشعار خون میں تموج اور جذبات میں حرکت پیدا کر دیتے ہیں اور عالم اسلام کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے اب بھی اس کو طاقت وخود اعتمادی کا ایک بہت بڑا سرچشمہ سمجھتا ہوں۔

مولانا عبدالباری ندوی کی کتاب 'مذہب وعقلیات' سے عقل ونقل کے حدود اور تجربہ وعلم انسانی کی نارسی اور کوتاہی وناپائیداری اور انبیاء علیہم السلام کے علم کی قطعیت کا ایک ابتدائی تخیل حاصل جو مطالعہ میں بہت کام آیا۔ حافظ ابن تیمیہ کی تفسیر سورہ اخلاص اور کتاب النبوأت کے اشارات سے مزید مدد ملی، لیکن اس نقش کو پختہ شیخ احمد سرہندی المعروف مجدد الف ثانی کے مکتوبات نے کیا۔

مجدد الف ثانی اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے مکتوبات کے مطالعہ سے علم کا ایک نیا عالم آنکھوں کے سامنے آگیا۔ ان مکتوبات نے دینی حمیت وغیرت کو بیدار کیا اور افسردہ قلب وجسم میں دین کی حرارت پیدا کی۔ کم چیزوں میں ایسی زندگی اور قلب کی حرارت دیکھی جتنی ان دونوں حضرات کے مکتوبات میں پائی جن پر صدیاں گزر چکیں، مگر وہی زندگی اور تاثر موجود ہے جو عموماً لکھنے وقت ہوتی ہے۔

میرے رفیق کار مولانا محمد منظور نعمانی نے الفرقان کا شاہ ولی اللہ نمبر نکالنے کا ارادہ کیا تو مجھ سے بھی فرمائش کی کہ اس میں حصہ لوں۔ میں نے 'شاہ ولی بحیثیت مصنف' کا عنوان اپنے لیے منتخب کیا۔ اس کے لیے ضروری تھا شاہ ولی اللہ دہلوی کی تصنیفات پر ایک نظر ڈالوں۔ اس سلسلہ میں 'ازالۃ الخفاء' کے بالاستیعاب پڑھنے کی نوبت آئی۔ انسانی تصنیفات میں کم کتابوں سے اتنا متاثر ہوا ہوں گا، جتنا مکتوبات اور 'ازالۃ الخفاء' سے۔

حجۃ اللہ البالغہ میں نے مولانا احمد علی لاہوری سے پڑھی تھی۔ اس سے علمی واصولی مباحث اور متکلمانہ وفلسفہ آمیز دینی کتابوں کے سمجھنے کی استعداد پیدا ہوئی۔ ان کی مختصر تصنیف 'الفوز الکبیر فی اصول التفسیر' نے قرآن مجید کے مطالعہ وتفسیر میں بڑی رہنمائی کی۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ پچھلی صدیوں کی کسی شخصیت سے ذہن اتنا متاثر اور اس کی تحقیقات سے اتنا متفق نہیں، جتنا شاہ ولی اللہ دہلوی اور اُن کی کتابوں سے۔ اگر اپنے فکر ومسلک کے لیے کسی مکتبِ خیال کا تعین ضروری ہے تو میں انھیں کا نام لے سکتا ہوں اور درحقیقت ہمارا تعلیمی وفکری نسب و شجرہ اُنھیں پر ختم ہوتا ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کے پوتے شاہ محمد اسماعیل شہید کی عقیدت خاندانی ورثہ ہے، لیکن ان کے وفورِ علم کا اندازہ 'منصبِ امامت' سے ہوا، جو اس موضوع پر میرے محدود علم میں اپنی طرز کی منفرد تصنیف ہے۔ سید احمد شہید کے ملفوظات کے مجموعہ 'صراطِ مستقیم' تصوف کے لٹریچر میں ایک انقلابی کتاب ہے۔ طریقت وحقیقت اور سلوک وتربیت کے متعلق جو نکتے اور حقائق لکھے ہیں وہ خداداد ذکاوت، علومِ نبوت سے فطری مناسبت، اعلیٰ روحانیت اور دقتِ نظر کی دلیل ہیں، اہلِ ظاہر اور اہلِ معرفت کے مختلف فیہ مسائل میں جو محاکمہ کیا اور فیصلہ کن باتیں کہی ہیں۔

ان کتابوں کا ایک فیض یہ تھا کہ علوم نبوت سے وحشت اور اجنبیت جو وضعی اور صناعی علوم اور تصنیفات سے پیدا ہوجاتی ہے، دور ہوئی۔ اس کی بُری بھلی تمیز پیدا ہوئی کہ علمی اصطلاحات اور زمانہ کی زبان کے بغیر بھی

علوم وحقائق ادا کیے جا سکتے ہیں۔

مجھ پر سید احمد شہید بریلوی کے واقعات کا سب سے زیادہ اثر پڑا ہے۔ میں بلا کسی مبالغہ کے اور بغیر کسی خودستائی کے کہتا ہوں کہ کچھ خاندانی تعلق بھی ہے کہ میں جب ان کے حالات 'وقائع احمدی' یا 'منظورۃ السعداء' پڑھتا تو ایک دم سے مجھے معلوم ہوتا تھا کہ رحمت کی کوئی گھٹا آ گئی ہے اور دعا کرنے کا وقت ہے اور آنسو جاری ہو جاتے اور دعا کرتا، ویسا اثر میں نے سیرتِ نبوی کے بعد کسی چیز میں نہیں دیکھا، پھر اس کے بعد اس کے نتیجہ میں، میں نے 'سیرت سید احمد شہید' لکھی اس پر مولانا سید سلیمان ندوی نے مقدمہ لکھا۔ اِس کتاب نے ہزاروں انسانوں پر اثر ڈالا، ان کے عقائد میں بھی اصلاح ہوئی، ان کے جذبات میں بھی ایمانی طاقت پیدا ہوئی جو بہت کم چیزوں سے پیدا ہوتی ہے۔

مولانا محمد الیاس کاندھلوی (وفات:1944ء) سے ملا تو ان کی باتیں اور ان کے معارف سمجھنے میں نسبتاً سہولت ہوئی۔ حسن الفاظ اور حسن ادا کا خیال، زمانہ کی زبان اور علمی اصطلاحات کی تلاش مقصود کے سمجھنے میں حجاب نہ بن سکی۔ میں نے ایک موقع پر ان سے عرض کیا کہ اگر میں نے سید احمد شہید کے حالات نہ لکھے ہوتے اور مجدد الف ثانی کے مکتوبات نہ پڑھے ہوتے تو مجھے آپ کی باتوں سے بڑی وحشت ہوتی۔ مولانا محمد الیاس کاندھلوی نے اس کو پسند فرمایا اور دوسروں سے نقل کیا۔

میرے قرآن مجید کے مطالعہ میں مولانا احمد علی لاہوری کی مجلسِ درس کا فیض اور برکت شامل ہے۔ کئی الفاظ جو لسان العرب، مفردات غریب القرآن، کشاف فتوح الغیب اور تفسیر ابن کثیر سے حل نہیں ہوتیں، وہاں باتوں باتوں میں حل ہو جاتی ہیں۔ الفاظ و معانی میں نئی وسعت اور قوتِ نظر آتی ہے جو پہلے نظر سے اوجھل تھی۔ دوسری چیز یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جن راستوں پر چلے ہیں ان پر چلنے سے قرآن مجید کھلتا ہے۔

جب قرآن مجید میں آدمی کا جی لگنے لگتا ہے تو انسانی تصنیفات سے جی گھبرانے لگتا ہے۔ انسانی کتابیں، انسانی تحریریں، انسانی تقریریں پست اور بے مغز معلوم ہونے لگتی ہیں، ادبا اور حکماء اور مفکرین کی باتیں طفلانہ اور عامیانہ نظر آتی ہیں، جن میں کوئی گہرائی اور پختگی نہیں معلوم ہوتی۔ سفید کاغذ پر چھپے ہوئے سیاہ نقش ونگار کاغذی پھول معلوم ہوتے ہیں، جن کا رنگ ہے، خوشبو نہیں۔ انسان کا علم اتھلا اور خالی معلوم ہونے لگتا ہے اور اس کا دیر تک پڑھنا ذوق اور روح پر بار ہوتا ہے۔ ہر وہ چیز جو علوم نبوت کے سرچشمہ سے نہ آئی ہو مشتبہ اور الفاظ کا طلسم معلوم ہوتی ہے۔ تسکین صرف وحی و نبوت کے راستہ سے آئے ہوئے علم سے ہوتی ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُنیا تک پہنچایا اور جو وحی کی زبان میں قرآن مجید میں، اور عربی زبان میں حدیث میں محفوظ ہے۔ (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی: حیات وافکار کے چند پہلو، مرتب سفیر اختر، صفحہ:70-21)

...

میری تحریری کاوشیں

ڈاکٹر ابن فرید

ہم بچپن میں کس گرد و پیش میں رہتے ہیں؟ کس طرح سوچتے ہیں؟ کون سے تصورات اپنے اندر کشش رکھتے ہیں اور ہمارے تخیلات کی پرواز کن سمتوں کا انتخاب کرتی ہے؟ ہمارے خواب کن رنگوں سے شوخ و شنگ بن جاتے ہیں اور کون سی دنیا ان میں زندہ و شگفتہ ہو کر آباد ہو جاتی ہے؟ ان سب عوامل سے مل کر 'مستقبل' کی دنیا بنتی ہے۔

میں بہت چھوٹا تھا جب میری والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ ہم تینوں بھائیوں کو پھوپھی امی مرحومہ کے پاس بھیج دیا گیا، شاید بہت سے اندیشہ ہائے دور دراز سے محفوظ رکھنے کے لیے، شاید ماں سے محرومی کو فراموش کر دینے کے لیے۔

بچوں کے اردو رسائل دہلی، لاہور اور بجنور سے ہمارے لیے منگوائے جاتے تھے۔ میرے چھوٹے پھوپھی زاد بھائی اور مجھ سے دونوں بڑے بھائی مجھ سے پہلے یہ رسائل پڑھتے تھے: اگر کبھی میں پہلے کوئی رسالہ اُٹھا لیتا تھا تو ان میں سے کوئی نہ کوئی معصوم سی طفلانہ رقابت کے تحت مجھ سے چھین لیتا تھا۔ شاید اس رقابت نے مجھ میں رسالوں سے بہت زیادہ رغبت پیدا کر دی تھی۔ میں جب رسالہ ہاتھ میں لیتا تو اس میں اور اس کی تصویروں میں اس طرح کھو جاتا تھا کہ اس کی بے جان تصاویر تک میں مجھے حقیقت اور زندگی جھلکتی نظر آنے لگتی اور میں ان میں اس حد تک گم ہو جاتا کہ پہروں ان میں اپنی دنیا بسائے رہتا۔

والدہ کے انتقال کے بعد والد صاحب مرحوم مجھے اپنے ساتھ لیے لیے پھرتے تا کہ مجھے ان کی یاد نہ ستائے۔ جاڑوں کے موسم میں ان کے پلنگ کے قریب ہی اپنے پلنگ پر سوتا تھا۔ عموماً رات میں ان کے سرہانے کے قریب اسٹول پر لیمپ رکھا ہوتا وہ سینے تک لحاف اوڑھے ہاتھ میں کوئی کتاب لیے پڑھتے رہتے ان کا یہ پرسکون استغراق مجھے بہت ہی اچھا لگتا۔ میں جب تک جاگتا رہتا انہیں بڑے اشتیاق سے دیکھتا رہتا۔ کبھی کبھی جب انہیں علامہ اقبال، علامہ شبلی نعمانی یا کسی اور اہم شاعر کی کوئی نظم پسند آ جاتی تو وہ مجھے اپنے پاس بٹھا کر سناتے، نظم میری سمجھ میں نہ آتی لیکن ان کے پڑھنے کا انداز دل کو بھا جاتا اور میں بڑی توجہ سے سنتا رہتا۔

تھوڑا بڑا ہوا تو والد صاحب مرحوم کی الماری سے کتابیں نکال کر ورق گردانی کرنے لگا۔ تجسس یہ تھا کہ ان کتابوں میں آخر وہ کیا جادو ہے جو والد صاحب مرحوم کو مسحور کیے رہتا ہے؟ جب وہ بہت ہی فکر انگیز اور

معلومات افزا باتیں کرتے تو ان پر رشک آتا، اسی رشک کی تحریک پر میں نے ان کی الماری میں سے وہ بہت سی کتابیں نکال کر پڑھ ڈالیں جو میرے بالکل پلے نہ پڑیں۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ دوسروں پر بہت رعب پڑا کہ میں بہت پڑھا لکھا اور قابل ہوں۔ اس پس منظر میں مجھ میں بچپن سے ہی سوال پیدا ہوا کہ یہ لوگ رسالوں میں لکھتے ہیں یا کتابیں لکھتے ہیں، یہ لکھ کیسے لیتے ہیں؟ پہروں اس الجھن میں گرفتار رہتا اور خود سے الجھتا رہتا۔

اسکول کے چوتھے درجہ میں پڑھتا تھا کہ ایک دن ایک لطیفہ لکھ کر لفافے میں رکھ کر دہلی سے شائع ہونے والے ایک رسالے کو بھیج دیا۔ تیسرے مہینے وہ چھپ گیا، ستم ظریفی یہ ہوئی کہ انھوں نے میرا نام 'محمود مصطفیٰ' کے بجائے 'محمد مصطفیٰ' شائع کیا۔ میرے بھائیوں نے قطعاً یقین نہ کیا کہ وہ لطیفہ میرا بھیجا ہوا تھا۔ میں نے ان کو قائل کرنے کے لیے ایک اور لطیفہ ایک اور رسالے کو بھیجا۔ انھوں نے بھی لطیفہ کے ساتھ میرا نام محمد مصطفیٰ ہی شائع کیا، میں نے کسی سے ذکر نہ کیا کہ وہ لطیفہ میرا تھا، پھر بھی میرے بھائیوں نے مجھے بہت ستایا' کہہ دو کہ یہ بھی تمہارا لکھا ہوا ہے'۔

مجھے ان تمام رسالے والوں سے چڑھ ہوگئی۔ ایسا لگتا تھا کہ یہ سب جان بوجھ کر میرے خلاف سازش کرتے ہیں، بس پھر میں نے یہ خیال ہی دل سے نکال دیا کہ میں بھی کچھ لکھوں۔

ساتویں یا آٹھویں درجہ میں پڑھتا تھا جب میرے استاد ماسٹر احمد علی نے ایک دن انٹرول (interval) میں اسکول کے برآمدے میں مجھے اکیلے گھومتے پھرتے دیکھ لیا۔ انھوں نے بیگار کے لیے پکڑ لیا' چلو لائبریری کی الماریوں سے کتابیں نکالو، الماریاں اور کتابیں صاف کرو اور پھر سے سجا کے رکھو'۔ ان کی بڑی بڑی آنکھوں اور بغل میں دبے رول سے سب ہی ڈرتے تھے پھر میں بے چارہ کیسے سرتابی کر سکتا تھا۔ اس کام میں تین چار دن لگ گئے۔

کچھ ماسٹر صاحب کا خوف کم ہوا تو ایک دن ڈرتے ڈرتے میں نے ان سے عرض کیا کہ اگر وہ اجازت دیں تو میں ایک آدھ کتاب پڑھنے کے لیے لے جایا کروں۔ انھوں نے بلا تکلف اجازت دے دی۔ اس اجازت نے سب سے پہلے مرزا ادیب اور احمد ندیم قاسمی سے متعارف کرایا۔ یہ دونوں نام میرے لیے نامانوس نہ تھے۔ احمد ندیم قاسمی بچوں کے ایک رسالے کے مدیر تھے۔ مرزا ادیب کی کہانیاں پڑھتا رہتا تھا۔ ان کے مسلسل افسانے 'صحرانورد کے رومان' اور 'صحرانورد کے خطوط' ذہن پر چھا گئے۔ پہروں ان کی پراسرار فضا میں کھویا رہتا۔ اس مرکزی کردار کی مہم جوئی (adventure) میرے لئے مثالی بن گئی۔ دل نے سوچا لکھیں تو ایسا لکھیں لیکن دوسرے افسانہ نگاروں اور ہمایوں، ادبی دنیا، ساقی، ادب لطیف وغیرہ کے مطالعہ نے حقیقت کی دنیا میں واپس بلا لیا۔

میں اسکول کی کاپی سے ورق پھاڑ پھاڑ کر بچکانہ قسم کے افسانے لکھنے لگا اور لکھ کر چھپا کر رکھنے لگا۔ یہ سلسلہ دسویں درجہ تک چلتا رہا یہاں تک کہ دسویں درجہ میں میرے ہم جماعت پر کاش کمار کھرے نے ایک افسانے کے لیے اصرار کیا کہ میں اسے چھپوالوں۔ وہ افسانہ میں نے شمع کو بھیج دیا۔ تیسرے مہینے وہ بھی چھپ کر آ گیا۔ البتہ انھوں نے بھی یہ ستم کیا کہ نام انھوں نے بھی محمد مصطفیٰ ہی چھاپا۔ اس کا بھی سب نے بے حد مذاق اڑایا۔ میرے رشتہ کے چچا عبدالشہید قدوائی کہتے تھے کہ یہ میں نے اپنے اردو کے استاد مولوی بخش حسین سے لکھوا کر چھپوایا ہے حالاں کہ وہ بے چارے اس گوں کے نہ تھے جب میں نے عہد کرلیا کہ اب میں مسلسل لکھوں گا تا کہ یہ لوگ میرا نذاق نہ اڑا سکیں۔

پھر زندگی کی افتاد شروع ہوئی۔ تعلیم چھوڑ کر میں ملازمتوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ چند مہینوں کی ملٹری ریکارڈس آفس میں ملازمت سے اکتا کر ایئر فورس میں بھرتی ہو گیا۔ وہاں کا ستم یہ تھا کہ بیرک میں روشنی آٹھ بجے شام کو چلی جاتی تھی اور ساڑھے تین چار بجے صبح آجاتی تھی۔ اتنی سی روشنی سے بھی میں اپنا افسانہ نگاری کا شوق پورا کر لیا کرتا تھا۔ دوسرے ایئر مین (air-men) میری اس حماقت پر ناراض ہو جایا کرتے تھے پھر جب میرے دو افسانے شمع وغیرہ میں چھپ کر آئے تو انھیں مجھ پر بے حد حیرت ہوئی۔

نہیں! میں کوئی روداد نہیں تحریر کر رہا ہوں، میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ بچپن سے لڑکپن تک جو ذہنی افتاد تشکیل پاتی ہے وہی پسند یا دیوانگی بن جاتی ہے۔ مجھے کشش و امتیاز کی دنیا تحصیل و تصور کی دنیا میں نظر آئی اسی لیے میں نے باپ کی خواہش پر ہائی اسکول تو سائنس سے کرلیا لیکن کنگ جارج میڈیکل کالج لکھنؤ میں داخل نہ ہوا، اگر داخل ہوتا بھی تو شاید میں کامیاب نہ ہو سکتا۔

لوگ ادبی دنیا میں قدم رنجہ فرمائی کو بڑی بقراطیت کے ساتھ فلسفیانہ زبان میں بیان کرتے ہیں ورنہ حقیقت یہ ہے کہ 'کیوں' کی منطق بہت بعد میں وجود میں آتی ہے۔ میں نے اسی لیے اپنا مقدمہ اپنی کچی عمر کے پس منظر میں پیش کیا ہے۔ بس میں نے تو شوق میں لکھنا شروع کر دیا تھا یہاں تک کہ لوگ میری طرف متوجہ ہو گئے، انھوں نے مجھے یہ احساس دلایا کہ میری تحریریں بھی کسی لائق ہیں۔

افسانے اس وقت مقبول ہوئے جب میں بی اے کا طالب علم تھا۔ کافی عرصہ تک میں افسانے لکھتا رہا، کبھی کبھی ایک آدھ تنقیدی مضمون بھی لکھا۔ ان مضامین کے پسند کرنے والوں میں پروفیسر سید احتشام حسین جیسے اصحاب نظر تھے لیکن میں اپنے ان مضامین سے کبھی مطمئن نہیں ہوا۔ مجھے ہر وقت یہی احساس رہتا تھا کہ تنقید میرا میدان نہیں ہے۔

ستمبر 1959ء میں جب میں ماہنامہ 'ادیب'، علی گڑھ کا مدیر مقرر ہوا تو میں نے اسے خالصتاً تحقیقی و تنقیدی

جریدہ بنا دیا۔ خدا کا شکر ہے کہ اسے ہندو پاک کے ممتاز ترین اہلِ علم وادب کا قلمی تعاون نصیب رہا۔ اسے بابائے اردو مولوی عبدالحق سے لے کر مولانا عبدالماجد دریابادی، قاضی عبدالودود، سید نصیر الدین ہاشمی، پروفیسر سید احتشام حسین جیسے صفِ اوّل کے اہلِ علم تک نے اپنے رشحاتِ قلم سے نوازا۔

اس رسالہ کی ادارت سنبھالتے ہی مجھے اس خیال نے ستایا کہ لوگ کیا کہیں گے کہ خود تو ایک تحقیقی وتنقیدی جریدے کے مدیر ہیں لیکن تنقید کے نام کا ایک جملہ بھی نہیں لکھتے، چنانچہ میں نے افسانے لکھنے کم کر دیے اور تنقید کی طرف متوجہ ہو گیا۔

یہ سب لکھنا لکھانا محض تسکین ضمیر کے لیے کب تک ہوتا رہتا۔ دل اکتا جاتا ہے وہ بھی کچھ ایسے حالات میں کہ علی گڑھ کے چند بہت بڑے بڑے کوہ ہائے فلک بوس سدراہ بن گئے۔ بقول نعیم صدیقی، اٹھارہ سال یونہی حسرتوں میں بیت گئے۔ نہیں اٹھارہ نہیں، انیس سال۔ بے روزگاری آزمائش، آنکھوں کے گیارہ عدد ہیمر یج مین جائنٹس (hemorrhage meningitis) کی مریض بچی کے علاج سے معذوری، بچے کی اطمینان بخش تعلیم سے محرومی، بیوی ام صہیب کا دو مرتبہ شدید بیماری کے عالم میں موت کے منھ سے جا کر لوٹ آنا، ساڑھے تین مہینے کے معصوم بچے عبید محمود کا بغیر علاج کے دنیا سے رخصت ہو جانا۔ میں نے جب اس سانحہ کے بارے میں محمد طفیل (نقوش) کو لکھا تو انھوں نے جواب لکھا کہ میں بہانے بازی کر رہا ہوں۔

اس طویل عرصہ میں بہت کچھ ہوا لیکن مجھے نہ کسی سے شکایت ہے اور نہ کدورت جو ہونا تھا وہ سب ہو گیا۔ اب میں شکوہ کروں تو کس سے؟ اللہ سبحانہ تعالیٰ نے میرا منہ بند کر دیا ہے، اپنے دکھوں کو بھول جانے کے لیے میں نے ہمیشہ کاغذ وقلم اور کتابوں کی دنیا میں کھو جانا چاہا بڑا سکون ملتا تھا ان میں اور حوصلہ بھی! ایک دن اچانک لاہور (پاکستان) سے آئی ہوئی ایک کتاب کا پیکٹ ملا۔ بے حد تعجب ہوا کہ مجھ جیسے بے حقیقت شخص کو بھی یاد کرنے والا کوئی ہے۔ کھولا تو وہ ڈاکٹر سلیم اختر کا مجموعہ مضامین تھا۔ اس میں ان کا خط اور کتاب میں مشمولہ ڈاکٹر وحید قریشی کا مقدمہ۔ ایک بار بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی جب اس مقدمہ میں اس جملہ تک میری نظر پہنچی جس میں انھوں نے مجھے میراجی اور محمد عسکری پر برتری عطا کی تھی۔

میرا ڈاکٹر وحید قریشی سے کوئی ربط نہیں تھا نہ بالواسطہ میں نے کبھی ان کو متاثر کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ ان کا حسن نظر تھا قدر افزائی تھی کہ مجھ بے نوا کو انھوں نے خاک سے اٹھا کر آسمان پر فروکش کر دیا۔ میں تو اپنے پیش رووں کو اپنا پیش رو ہی مانتا ہوں، ان کا احترام کرتا ہوں الا یہ کہ وہ موقع پرست اور مسلم دشمن ہو۔ ایک بار پھر مجھے سوچنا پڑا کہ کیا میں واقعی کچھ مفید مطلب باتیں لکھتا ہوں؟ پھر میں نے فیصلہ کیا کہ ہر وادی میں منھ مارنے کے بجائے مجھے ادب کے کچھ گوشوں کو اپنے لیے مختص کر لینا چاہیے۔

تنقید سے گریز کر کے میں نے پہلے نفسیاتی مطالعات کی طرف رجوع کیا لیکن جلد ہی مجھے احساس ہوا کہ میں فارمولا تجزیے لکھنے لگ جاؤں گا، اس لیے میں نے ان دوسرے علوم سے بھی استفادہ کیا؛ جن کا میں نے اپنے دورابتلا میں مطالعہ کیا تھا۔ اس کا ایک بڑا محرک اس بہت وسیع لٹریچر سے تعارف بھی تھا جو دوسرے علوم میں ادب کو موضوع بنا کر لکھا گیا تھا۔ اس دنیا میں داخل ہوا تو آنکھیں چکا چوندھ ہو گئیں۔

ہم اردو میں جو تنقید کے نام سے لکھتے ہیں وہ بھی مشاعرہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ قارئین مور مور (more more) کہہ رہے ہیں یا بور بور (bore bore) کی ہوٹنگ کر رہے ہیں۔

اردو کی یہ بدنصیبی ہے کہ اس کا ایک 'کائنات' کی حیثیت سے 'مطالعہ' نہیں کیا گیا ہے۔ عصری دنیا کے علوم کا مشاہدہ کیجیے تو آپ کو ہر علم الانسانیہ (social science) میں ادب کا بے حد عمیق و بلیغ مطالعہ ملے گا۔ اردو میں کوئی ایسی کوشش کرتا ہے تو اسے بھی تنقید قرار دے کر سو درّے لگائے جاتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ نفسیات پر محمود حسن رضوی، سماجیات پر سید محمد عقیل رضوی تجزیہ (content analysis) پر گوپی چند نارنگ اور اقتصادیات و سیاسیات پر ہر'لال سلام' والا قلم اٹھا لیتا ہے ان میں شیخ محمد اکرام، باقر مہدی، وزیر آغا، ریاض احمد جیسے کم ہی لوگ ہیں جنھوں نے ادب کے علاوہ دوسرے علوم کی با قاعدہ تعلیم حاصل کی ہے۔

اپنے دور آزمائش میں، میں نے جن علوم کا بحیثیت طالب علم مطالعہ کیا تھا ان سے میں نے اردو ادب کے بین العلومی مطالعہ (interdisciplinary study) کے سلسلے میں مدد لی۔ یہ نام ان دونوں اردو میں نیا تھا۔ جلد ہی لوگوں نے اس اصطلاح کا اس طرح استقبال کیا کہ جو کچھ وہ پہلے سے لکھتے آئے تھے وہ سب بین العلومی مطالعہ تھا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے 'اولیت کا سہرا کسی کے سر بندھ جائے' بندھے۔ بس میں تو یہ چاہتا ہوں کہ کوئی ڈاکٹر حسن الدین احمد کی طرح جم کر سنجیدگی سے کام کرے۔

افسانے میں نے بہت لکھے ہیں لوگوں نے بہت پسند کیے ہیں، خطوط میں تعریفیں لکھ کر بھیجی ہیں لیکن نقاد حضرات ان کا یا میرا نام لیتے ہوئے تکلف کرتے ہیں۔ مبادا کچھ احتیاطیں مجروح ہو جائیں۔ مجھے ان کے لیے کسی طرح کی داد فریاد نہیں کرنی ہے۔ اس لیے کہ میں افسانے نام آوری کے لیے نہیں لکھتا ہوں۔ یہ کچھ فنی اور صنعتی تجربے ہیں جو پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور وہ بعض خوبیوں کی تعریف میں زیادہ اہم پہلوؤں کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔ میں نے اپنے افسانوں میں تکنیکی تجربوں کے علاوہ نثری آہنگ کا بھی اہتمام کیا ہے۔ اردو زبان شعری آہنگ کی اتنی اسیر رہی ہے کہ رجب علی بیگ سرور کے علاوہ غالب اور سرسید احمد خاں تک اس کے گرویدہ رہے ہیں۔ اب بھی جب کوئی بہت کلاسیکل قسم کی نثر لکھنا چاہتا ہے تو مقفع و مسجع نثر لکھنے کی کوشش کرتا ہے، یہ نثر کے ساتھ زیادتی ہے۔ نثر شعری آہنگ کی محتاج نہیں ہے۔ اس کا خود اپنا آہنگ

ہے جسے عام نثر نگار نظر انداز کر جاتے ہیں۔
اس کے نتیجے میں بہت کھر دری ناپختہ اور بے رس (prosaic) نثر بڑی کثرت سے لکھی جا رہی ہے اور اسے 'ڈرے ڈا'، 'ضد ڈرے ڈا' وغیرہ کا نام دیا جا رہا ہے، جو اپنے گن نہیں جانتا وہ باہر کے گن بھی در آمد نہیں کر سکتا۔ چند ایک دوستوں نے کہا کہ میری نثر میں شعریت ہے۔ میں نے تردید کرتے ہوئے انھیں بتایا کہ یہ شعریت نہیں نثری آہنگ ہے جو الفاظ کے مناسب و برمحل استعمال صوت کے نشیب و فراز موقع محل کی کیفیت (mood) کو قائم رکھنے کی کوشش اور قاری کو نثر سے باہر کھینچ لانے اور لغات میں الجھا دینے کی کوشش سے اجتناب ہے۔ یہ چند صفات ہیں جو میں نے سرسری طور پر بیان کی ہیں۔ نثری آہنگ میں اور بھی بہت کچھ ہے جو صرف تخلیقی نثر میں ہی پیش کیا جا سکتا ہے۔

تحقیق و تنقید میں استدلال و استنباط کے لیے اصطلاحات کی ضرورت ہوتی ہے جو نثر کو وہ روانی اختیار کرنے نہیں دیتی جو تخلیقی نثر کی صفت ہوتی ہے۔ اگر میں یہ کہوں کہ میں مذکورہ بالا تقاضوں کے لیے بین العلومی مطالعات پیش کرتا ہوں اور فنی و نثری تقاضوں کے لیے افسانے لکھتا ہوں تو شاید یہ میری صحیح ترجمانی ہو۔ میں نے بھی کچی عمر (adolescence) کی جذباتی کجرویوں اور منفی جرأت مندیوں کی وکالت کے لیے اپنے قلم کو آلودہ نہیں کیا ہے۔ میرا مطمحِ نظر ہمیشہ مثبت و تعمیری اقدار اور صالح و صحت مند معاشرہ کا فروغ رہا ہے۔ پرسکون و پرامن دنیا میں رہتے ہوئے جو قلبی راحت نصیب ہوتی ہے وہ تخریب کار و مفسد دنیا میں نہیں ہوتی۔

آپ میرے ساتھ دوسری جنگ عظیم میں 'برما فرنٹ' پر یا 19 سال علی گڑھ میں رہے ہوتے تو آپ کو عینی مشاہدہ کرا دیتا۔ علی گڑھ برا نہیں ہے وہ میری مادر علمی ہے میرے دکھوں کا مرہم ہے میں جب اپنے حوالے سے علی گڑھ کا نام لیتا ہوں تو ان موقع پرستوں اور مادی حریصوں کی طرف اشارہ کرتا ہوں جنھوں نے علی گڑھ کو آج اس نوبت تک پہنچا دیا ہے کہ اس کی لائق فخر اقدار اور روایات نیست و نابود ہو چکی ہیں۔ اردو سے میرے کسی طرح کے مفادات وابستہ نہیں ہیں یہ تو میرا عشق ہے بس یہی میرے لیے کافی ہے:

عافیت ابن فرید اب جا کے تم کو مل گئی
ناشناسی کے نفس میں سو رہو آرام سے

(بشکریہ ڈاکٹر ابن فرید: بے مثل انسان، بے مثل قلمکار، مرتب: انتظار نعیم، صفحہ: 20-13)

...

غلطی میری

عبدالمحیط خان
سابق پرنسپل گورنمنٹ پالی ٹیکنگ (فیض آباد)

1954ء میں جب کہ میں بنارس ہندو یونیورسٹی میں انجینئرنگ کا طالب علم تھا، ایک واقعہ پیش آیا جو کہ اب تک مجھے یاد ہے۔ میرے استاد ڈاکٹر پران ناتھ نے لاپلاس ٹرانسفارم (low plass transform) کو پڑھانا شروع کیا تو انھوں نے بتایا کہ اس سلسلے میں ایک دلچسپ کہانی ہے جو ہمارے موجودہ پرنسپل سے متعلق ہے۔

یہ پروفیسر ایم سین گپتا تھے جو اس وقت ہندو یونیورسٹی کے انجینئرنگ کالج کے پرنسپل تھے اور اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔

پروفیسر گپتا مزید تعلیم کے لیے گلاسگو یونیورسٹی (The University of Glasgow) گئے تھے اور وہاں سے انھوں نے ٹاپ کیا تھا۔ گلاسگو کا پروفیسر ایک روز بلیک بورڈ پر ایک الیکٹریکل پرابلم کو حل کر رہا تھا۔

اس درمیان میں ایکویشن (Differential Equation) کا ایک سوال آ گیا۔

گلاسگو پروفیسر نے اس کو عام طریقے سے حل کیا، جس میں کافی وقت لگا اور سارا بلیک بورڈ بھر گیا۔

پروفیسر گپتا نے اس موقع پر اپنے پروفیسر سے کہا کہ میرا خیال ہے کہ یہاں لاپلاس ٹرانسفارم کو اپلائی کیا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ سوال بہت مختصر طریقہ سے حل ہو جائے گا۔

پروفیسر نے اس تجویز پر عمل کیا تو صرف دو لائنوں میں سوال حل ہو گیا۔ اگرچہ دونوں طریقوں کا آخری جواب ایک ہی تھا۔

مگر پروفیسر نے کہا: جب مختصر طریقہ ہمارے پاس موجود ہے تو لمبے طریقے کو اختیار کرنا ہی سرے سے غلط ہے۔ اس نے بلیک بورڈ پر اپنے حل کو مٹا دیا اور پروفیسر گپتا کے طریقہ کو لکھتے ہوئے کہا کہ یہی واحد طریقہ ہے:

This is the only method.

اسی قسم کا ایک اور واقعہ 1964ء کا ہے۔ حکومت ہند کی وزارت تعلیم نے امریکی حکومت کے ایجوکیشن ڈویژن (education division) کے تعاون سے سمر اسکول فار ٹیچرس (summer school for teachers) کا ایک پروگرام شروع کیا۔

ہندوستانی شخصیتوں کے علاوہ تین امریکی پروفیسر آئے تھے، اس وقت میں چندولی پالی ٹیکنک میں سینئر لکچرار تھا اور اس حیثیت سے چنڈی گڑھ کے اسکول میں شرکت کی تھی۔ یہ پہلا کورس تھا جو 15 جون 1964ء

سے 24 جولائی 1964ء تک ہوا۔

امریکی پروفیسر میچل نے ایک روز کلاس میں سوال تخلیقی لوگ کون ہوتے ہیں؟

Who are creatives?

مختلف لوگوں نے مختلف نام لیے۔ ایک شخص نے کہا پوئیٹ (شاعر)۔

پروفیسر نے کہا کیا (what)؟

پروفیسر میچل کی سمجھ میں نہیں آیا۔ وہ بار بار 'واٹ' کہتے رہے اور ہمارے ساتھی بار بار پوئیٹ دہراتے رہے۔ بالآخر انھوں نے اس کی اسپلینگ بتائی: پی او ای ٹی (P.O.E.T)۔

اب پروفیسر میچل سمجھ گئے کہ ہمارے ساتھی کی مراد شاعر سے ہے۔ مگر ہندوستانی اور امریکی تلفظ کے فرق کی وجہ سے وہ سمجھ نہیں پاتے تھے۔ کیونکہ ہندوستانی تحفظ اس لفظ کا پوئیٹ ہے جب کہ امریکی تلفظ میں اس کو پائیٹ کہتے ہیں۔

انھوں نے آپ صحیح ہیں۔ میں ہی غلطی پر ہوں۔ کیوں کہ میں اس وقت آپ کے ملک میں ہوں۔

You are right. I am wrong because I am in your country.

(بشکریہ سبق آموز واقعات، صفحہ:16)

...

موجوں کا اضطراب-1

ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل

(ناگپور، مہاراشٹر)

عزیزہ نصرت سلطانہ (گورنمنٹ کرشنا جی راؤ پوار پی جی کالج، دیواس، مدھیہ پردیش) بہت ہی ذہین ریسرچ اسکالر ہے۔اس نے میری زندگی اور علمی وادبی کارناموں پر تحقیق کرکے جولائی 2006ء میں وکرم یونیورسٹی، اجین سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی ہے۔اس تحقیق کے درمیان میں میری تصانیف کے مطالعے کے بعد اس نے مجھ سے میری زندگی کے تفصیلی حالات اور رازہائے سربستہ معلوم کرنے کی بہت کوشش کی۔

میری ذات وصفات اور مزاج کی حقیقت کو جاننے کے لیے جہد مسلسل کی تاکہ اس کے تناظر میں میرے افکار وخیالات کا صحیح تجزیہ کرسکے۔اس نے مجھ کو خط اور ٹیلیفون کے ذریعے کریدا۔ گہرائی میں جانے کی ہمت کی لیکن میں اسے ٹالتا رہا، خاموش رہا۔

نتیجہ یہ نکلا کہ ماہنامہ قرطاس (ناگپور) کے شرف الدین ساحل نمبر (مطبوعہ از جنوری تا اپریل 2003ء) کے لیے اس نے جو مضمون لکھا اس میں یہ شکایت بھی کردی: ڈاکٹر سلیم اختر (پاکستان) کا کہنا ہے کہ انسانی شخصیت آئس برگ کی مانند ہے۔تھوڑا سا حصہ سطحِ سمندر سے باہر ہوتا ہے۔باقی آبی نقاب اوڑھے ملتا ہے۔

ہمارے اس آئس برگ (ڈاکٹر ساحل) کی ذات وشخصیت میں کیا کیا آبی نقاب اوڑھے پوشیدہ ہے؟ یا اس کے باطن میں کیا لاوا موجزن ہے؟ ایسی صورت میں ان کی شخصیت کے گمنام گوشوں کا ظاہر ہونا بہت ضروری ہے۔ان گوشوں کی نقاب کشائی آپ بیتی، ڈائری، سفرنامہ اور خطوط سے بہ آسانی ہوسکتی ہے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے ڈاکٹر ساحل نے ابھی تک کوئی آپ بیتی، ڈائری اور سفرنامہ قلمبند نہیں کیا ہے۔ اگر کیا بھی ہو تو مجھے اس کا علم نہیں ہے۔خطوط کے معاملے میں وہ اب لاپرواہی اور تساہل برتتے ہیں۔ دراصل یہ کیفیت بےزاری یا زیادہ مصروفیت کا نتیجہ ہوسکتی ہے۔(صفحہ:81)

میں اس پر بھی خاموش رہا تو اس نے 29 جولائی 2004ء کو میری ذات وصفات ومزاج کے متعلق کئی سوالات پر مشتمل ایک سوالنامہ روانہ کیا اور مجھ سے اس کے جوابات طلب کیے۔ چنانچہ میں نے ان سوالوں کے مختصر جوابات روانہ کردیے لیکن وہ اس سے مطمئن نہ ہوسکی اور خط کے ذریعہ تفصیلی حالات کا تقاضہ کرتی رہی۔

اس ضد سے مجبور ہوکر میں نے دسمبر 2004ء آپ بیتی لکھنا شروع کی اور 17 ابواب لکھ کر فروری 2005ء میں اسے روانہ کردیے۔مصروفیت اور ذہنی پریشانی کے باعث مجھ کو اس سے آگے لکھنے کا موقع نہ مل سکا۔لیکن

ان ۱۷ابواب کو پڑھ کر ہی اس نے حالات زندگی کے متعلق اطمینان کا سانس لیا۔ اپنا تحقیقی کام مکمل کیا اور پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ یہ آپ بیتی گزشتہ پندرہ سال سے فائل میں دبی پڑی تھی۔ ادھر چند سالوں سے میری بے انتہا کمزور بینائی کو محسوس کر کے نورچشم محمد رفیع الدین اور میری بہو شبانہ پروین میرے مضامین کے انتخاب وترتیب اور ان کو کتابی صورت دینے کے لیے کمپوزنگ وغیرہ کا کام بہت ہی دلچسپی سے کر رہے ہیں اور کئی کتابیں ترتیب دے کر شائع بھی کروا چکے ہیں۔ اسی درمیان میں اس نامکمل آپ بیتی کا مسودہ بھی ان کے ہاتھ آیا اور وہ اس کو مکمل کر دینے کا بار بار تقاضہ کرنے لگے۔ چنانچہ تالہ بندی کے ایام میں اس کو مکمل کر کے یہ آخری صورت دی ہے۔ یہ بہت مشکل مرحلہ تھا۔ ماضی کے واقعات کو حافظے کی مدد سے گرفت میں لے کر صفحۂ قرطاس پر منتقل کرنا تھا اس لیے بہت ہی احتیاط کے ساتھ قلم چلانا پڑا:

تالیف نسخہ ہائے وفا کر رہا تھا میں
مجموعۂ خیال ابھی فرد فرد تھا

انسان کو رزم گاہِ حیات میں مختلف مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس میں دشمن اور منافق سے بھی واسطہ پڑتا ہے۔ لباسِ تقدس میں رہزن بھی ملتے ہیں اور سندِ علمیت وفضیلت حاصل کر کے کار جہالت ومنافقت کرنے والے بھی۔ دوست بن کر ذاتی مفاد حاصل کرنے والے بھی اور تجارت میں دھوکہ دینے والے بھی۔ میں تجربے کی اسی بھٹی میں تپا ہوں۔ اس لیے اپنے صحیح حالات کو صفحۂ قرطاس پر بکھیرنے سے گریز کرتا رہا۔ اب جبکہ مجبور ہو کر آپ بیتی لکھنا پڑی تو میں نے دروغ بیانی، مبالغہ آمیزی اور الزام تراشی سے اپنا دامن بچایا ہے۔ مجھ پر جو کچھ گزری ہے اسی کو بیان کیا ہے۔ میں نے جو کچھ دیکھا ہے وہی لکھا ہے۔ تاہم میری کسی تحریر سے اگر کسی کو تکلیف پہنچ رہی ہو تو اس کے لیے دل کی گہرائی سے معافی چاہتا ہوں۔

یہ کتاب عزیزہ ڈاکٹر نصرت سلطانہ کے اصرار پیہم کا نتیجہ ہے اس لیے میں اس کتاب کو اس کے نام سے معنون کر رہا ہوں:

گر قبول افتد زہے عز و شرف

میری گزشتہ کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی نورچشم محمد رفیع الدین اور میری بہو شبانہ پروین کی دلچسپی سے منصۂ شہود پر آرہی ہے۔ اس کی ترتیب وتزئین اور کمپوزنگ وغیرہ ان دونوں نے جس احتیاط اور سلیقے سے کی ہے اس کے لیے میں ان کا دل کی گہرائی سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ (محمد شرف الدین ساحل، 20 اگست 2020ء، ناگپور):

جس کو سکوں نصیب ہو وہ دل نہیں ہوں میں
موجوں کا اضطراب ہوں ساحل نہیں ہوں میں

(محمد شرف الدین ساحل)

(1)

نقوشِ عمرِ گزشتہ سمیٹ لائے ہیں
یہ رنگ رنگ کے بادل کہاں سے آئے ہیں

(کوثر جائسی)

یہ دنیا مسرت وغم، شادمانی والم، خوش حالی وبدحالی، نیکی وبدی، حق وباطل، تعمیر وتخریب اور خیر وشر کی آماجگاہ ورزم گاہ ہے۔ یہی تضاد کشمکشِ حیات کے محرکات ہیں۔ یہی حرکت کو جمود سے اور جمود کو حرکت سے بدلتے ہیں۔ انھی کے باعث انسان بنتا بھی ہے اور بگڑتا بھی۔ اجڑتا بھی ہے اور سنورتا بھی۔ خوش حال بھی ہوتا ہے اور بدحال بھی۔ ہنستا بھی ہے اور روتا بھی۔ اس کو اچھی اور بری کیفیت کے حوالے کرنے میں جہاں اس کا ماحول بنیادی کردار ادا کرتا ہے وہیں اس میں تقدیر کا بھی عمل دخل ہوتا ہے۔ اس تقدیر کا جس کے مفہوم کو پانا آسان نہیں ہے۔ میر تقی میر نے پانے کی کوشش کی تو اس نتیجے پر پہنچے:

ناحق ہم مجبوروں پہ یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہے ہے سو آپ کرے ہے ہم کو عبث بدنام کیا

غالب نے غور وفکر کیا تو تنگ آ کر یہ کہہ دیا کہ میں نیکی کے کام کیوں کروں۔ دراصل جس قلم سے میری تقدیر لکھی گئی ہے اس کا قط ہی ٹیڑھا ہے:

ہوں منحرف نہ کیوں رہ و رسمِ ثواب سے
ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو

اور اقبال اس سلسلے میں یقین کی اس انتہا تک آئے:

کوئی اندازہ کرسکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

دراصل جب جہدِ مسلسل کے بعد بھی انسان کو اس کی خواہش کے مطابق پھل نہیں ملتا تو وہ احساسِ کمتری کا شکار ہو کر اپنی حیثیت کو کھو دیتا ہے۔ اپنی صلاحیت کو خود قتل کر دیتا ہے۔ لیکن جو بُرے حالات کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیتا ہے، وہ بے پناہ ہو جاتا ہے، زمانے پر چھا جاتا ہے۔ ہماری تاریخ میں یہ حقائق محفوظ ہیں۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ایک انسان کے حصے میں سب نعمتیں نہیں آتیں۔ اگر کوئی عالم، مفکر اور دانشور ہے تو ہوسکتا ہے کہ وہ دولتِ دنیا سے محروم ہو۔ اگر دولت مند ہے تو ہوسکتا ہے کہ وہ ناخواندہ یا جاہلِ مطلق ہو۔ عالم کا بیٹا جاہل اور جاہل کا بیٹا عالم ہوسکتا ہے۔ امیری غربت سے اور غربت امیری سے بدل سکتی ہے۔ مستقبل کا حال کون جانتا ہے۔ کسی شاعر نے صحیح کہا ہے:

میری غربت کو شرافت کا ابھی نام نہ دے
وقت بدلا تو تری رائے بدل جائے گی

اس دنیا میں وہی انسان کامیاب ہے جو اپنی تخلیق کے مقصد سے باخبر ہو۔ ہجوم غم میں بھی مسکرانے کا حوصلہ رکھتا ہو۔ صبر وشکر سے زندگی گزارتا ہو، سماج کے لیے نفع بخش ہو۔ عیش وعشرت کی فضا میں مسلسل سانس لیتے ہوئے بھی مقصدِ حیات کو نہ بھولا ہو۔

سکون وراحت کو نعمتِ خداوندی سمجھتا ہو اور کمزوروں کے آگے خود کو کمزور سمجھ کر ان کا احترام کرتا ہو۔ لیکن جو غم میں اس سچائی کو بھول جائے اور خوشی میں اس حقیقت کو فراموش کردے، وہ ناکام ہے۔ دائمی سکون سے محروم ہے۔

میں ہر حال میں اسی دائمی سکون کا متلاشی رہا ہوں۔ میں اسی کو اپنی زندگی کا مقصد تسلیم کرتا ہوں۔ میری کوششیں اور کاوشیں اسی ایک مقصد کے حصول میں صرف ہوئی ہیں۔ میری سرگرمیاں اسی کے لیے ہیں۔ اگر اس میں مجھ کو کبھی ناکامی ہاتھ آئی یا غم ملا تو مایوس نہیں ہوا۔ حرفِ شکایت زبان تک نہ لایا بلکہ عزم وہمت سے ایسے حالات کا مقابلہ کرتا رہا۔ میں نے اسی لیے کہا ہے اور سچ ہے کہا:

بیکسی میں بھی میسر ہے سکونِ زندگی
ماورائے فہم ہے حالت مری تقدیر کی

مجھ کو جن لوگوں نے تکلیف پہنچائی اور دکھ دیا، ان کو معاف کردیا۔ میں نے ان کے لیے دستِ دعا بھی اٹھایا۔ تصادم سے دور رہا:

اسی کے واسطے دستِ دعا اٹھا ساحل
جلا کے میرا نشیمن جو مہرباں گیا

اسی سوچ نے مجھ کو عزم وہمت کی وہ لازوال دولت عطا کی جو میرے غم کو خوشی سے اور یاس کو امید سے بدلتی رہی۔ اسی کے سہارے میدانِ عمل میں میرا سفر جاری رہا۔

یہاں تک کہ حوصلہ شکن حالات بھی میرے سفر میں رکاوٹ پیدا نہ کرسکے۔ اب مڑ کر دیکھتا ہوں تو مجھ کو تعلیمی، ادبی اور سماجی شعبے میں میری کوششوں کے وہ ثمرات نظر آتے ہیں جن سے روحانی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ میں اس کو کمالِ تقدیر تسلیم کرتا ہوں۔ میں اپنے عزم وہمت سے منزلِ مقصود کو پاتا ہوں۔ میں نے یہ غلط نہیں کہا ہے:

عزم و ہمت کے ستاروں کا میں خود حاکم ہوں
میری تقدیر نہیں تابعِ احکامِ نجوم

(2)

میرا شہر ناگپور ریاست مہاراشٹر کا ثانی دار الحکومت ہے۔ سنتروں کا شہر (آرینج سٹی) ہے، گرین سٹی ہے۔ اس کا پُر امن ماحول تین سو سال کی مخلصانہ سرگرمیوں کا آئینہ دار ہے۔ اس کی تشکیل میں ہندو اور مسلمان دونوں کی مشترکہ کوششیں شامل ہیں۔ یہ علاقہ سولہویں صدی میں سوائے جنگلات کے کچھ نہ تھا۔ گونڈ حکمرانوں کے زیر اقتدار تھا اور ان کی حکومت (حکومتِ دیوگڑھ) کی سرحد پر واقع تھا۔ چنانچہ حکومت کے بانی راجہ جاٹبا نے جو اکبر اعظم کا معاصر و مطیع تھا اپنی حکومت کی حفاظت کے لیے ان جنگلات میں پتھروں کا ایک عظیم الشان مضبوط قلعہ تعمیر کروایا جس میں اس کی فوج رہا کرتی تھی۔ اسی قلعہ پر جاٹبا کے بیٹے راجہ کوک شاہ کے دور میں شاہجہاں کے سپہ سالار خان دوراں نے 16 جنوری 1637ء کو زبردست حملہ کیا تھا اور سرنگ لگا کر اس کے تین برج اڑا دیے تھے۔ اس حملے کا تفصیلی ذکر عبدالحمید لاہوری نے اپنی کتاب 'بادشاہ نامہ' میں کیا ہے۔ گونڈ حکمراں مغلوں کو سالانہ خراج دیا کرتے تھے۔ یہ حملہ خراج نہ دینے کی پاداش میں تھا۔

اسی خاندان کا ایک گلِ سرسبد راجہ بخت بلند شاہ تھا جس نے اٹھارہویں صدی کے آغاز میں قلعہ کے چاروں طرف مضبوط فصیل تعمیر کروا کے ناگپور شہر کی بنیاد ڈالی اور اسے اپنی حکومت کا صدر مقام بنایا۔ راجہ بخت بلند شاہ جس کا قدیم نام مہی پت شاہ تھا، اورنگ زیب کا ہم عصر تھا۔ وہ اس کے دربار میں کئی سال مقیم رہا۔ وہیں اسلامی تعلیم و تہذیب سے متاثر ہو کر اس نے اسلام قبول کیا اور اورنگ زیب سے بخت بلند کا خطاب حاصل کیا۔ لہٰذا ناگپور شہر کی بنیاد کے ساتھ ہی یہاں خدا کی عبادت و بندگی کے لیے مسجد تعمیر ہوئی۔ گویا اس شہر کا بنیادی پتھر ہی اسلامی تہذیب و ثقافت پر رکھا گیا۔ اب راج دربار میں فارسی کے انشا پردازوں کو جگہ ملی۔ یہاں علما و صلحا کے قدم آئے۔

راجہ بخت بلند شاہ کی وفات (1709ء) کے بعد اس کے بیٹے راجہ چاند سلطان شاہ نے تقریباً چھبیس (26) سال حکومت کی۔ اس نے اس شہر کے خاکے میں کئی رنگ بھرے۔ جمعہ دروازہ، جمعہ تالاب، جمعہ مسجد، اور پتھر پھوڑ کی مسجد اسی کے دور کی تعمیرات ہیں۔ لیکن یہ اسلامی ریاست اس کی وفات (1735ء) کے بعد خانہ جنگی کا شکار ہوگئی۔ اس کا فائدہ ایک مرہٹہ سردار رگھوجی بھوسلہ کو ملا۔ اس نے اپنی زبردست حکمتِ عملی سے 1737ء سے 1748ء تک رفتہ رفتہ اس پوری حکومت کو اپنی تحویل میں لے لیا اور راجہ چاند سلطان شاہ کے بیٹے راجہ برہان شاہ کے اخراجات کے لیے تین لاکھ روپے سالانہ پنشن مقرر کی۔ اسے ناگپور کے قلعہ میں اپنی نگرانی و حفاظت میں رکھا۔ یہیں سے اس علاقے میں مرہٹوں کا دورِ حکومت شروع ہوتا ہے۔ برہان شاہ کے جانشین (راجہ بہرام شاہ، راجہ رحمٰن شاہ، راجہ سلیمان شاہ اور راجہ محمد اعظم شاہ) ہمیشہ ناگپور کے قلعہ میں ہی سکونت پذیر رہے۔ ان کو آزادی کے بعد بھی حسبِ سابق پنشن ملتی رہی۔ یوں ناگپور میں دو راج گھرانوں کی رہائش گاہیں ہیں۔

ناگپور میں بھوسلہ خاندان1853ء تک حکمراں رہا۔اس اثنا میں راجہ رگھوجی بھوسلہ کے بعد چھ راجہ یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوئے۔ یہ سب غیر متعصب، منصف مزاج اور انسانیت نواز تھے لہٰذا دکن اور شمالی ہند کے کئی مسلم خاندان ان کی پالیسی سے متاثر ہوکر ناگپور آئے اور انتظامیہ میں معزز و ممتاز عہدوں پر فائز ہوئے۔ بھوسلہ فوج میں بھی مسلم سپاہیوں کی کثیر تعداد تھی۔ان کے راج دربار میں فارسی کو زبردست اہمیت حاصل تھی۔ان حالات میں یہاں اسلامی تہذیب وثقافت اور مسلم سماج کو پروان چڑھنے کا خوب موقع ملا۔ان کے کئی محلے وجود میں آئے۔ مسجدیں، مدارس اور مکاتب تعمیر ہوئے۔فارسی اور اردو زبان وادب کو فروغ ملا اور بلند پایہ ادبا وشعرا کے علمی وادبی کارنامے سامنے آئے۔لالہ پیم چند، عاصی، محبؔ الحق محبؔ، فیض محمد فیض، مولانا غلام رسول غمگین، سید عباس علی شہرت، سید عبدالعلی عادل، غلام دستگیر شرق اور غلام عبدالقادر خان زلفی اسی عہد کے باکمال اہلِ قلم تھے جن کے روشن کارناموں سے ناگپور کی ادبی تاریخ جگمگارہی ہے۔ یہی اہلِ قلم ناگپور کے ادبی ماحول کا سنگِ بنیاد ہیں۔

اس دور میں ناگپور میں متعدد علما وصلحا بھی سکونت پذیر تھے جنھوں نے تشنگانِ علم کو دینی واخلاقی تعلیم سے آراستہ کیا اور لوگوں کے کردار کو خیر سے وابستہ کرنے کی کوشش کی۔اس اعتبار سے سجن گلزارؒ، شاہ حسنؒ، سید احمد قادریؒ، معین الدین فخریؒ، صوفی محمد ابراہیمؒ، سید محمد قادریؒ، شاہ محی الدین قادریؒ، شاہ سید محمد زکریاؒ، مفتی امان الحقؒ، مفتی ظفر علیؒ، مفتی امیر الحقؒ اور مولوی سید محمد گلؒ وغیرہ کی خدمات قابلِ احترام ہیں۔ یہ سب عربی وفارسی کے جید عالم تھے۔ان میں بعض روشن ضمیر بزرگ تھے جن کا حلقۂ ارادت وسیع تھا۔اس شہر کی خوبیوں کو میں نے اپنی نظم 'ناگپور' میں ظاہر کیا ہے۔ چند شعر دیکھیے:

مرکزِ ہندوستاں ہے ناگپور
سرزمینِ عزّ و شاں ہے ناگپور
سنتروں کا شہر، صنعت کا نگر
سانس لیتے ہیں یہاں اہلِ ہنر
محورِ عشق و محبت ہے یہ شہر
مخزنِ ایثار و برکت ہے یہ شہر
امن و راحت کا امیں یہ شہر ہے
علم و حکمت کا امیں یہ شہر ہے
روح کی تسکین ہے اس شہر میں
خوش ہر اک غمگین ہے اس شہر میں

یہ اخوت کا علمبردار ہے
یہ مثالِ نخلِ سایہ دار ہے
عہد ماضی سے ہے یہ تا عہد حال
قومی یکجہتی کی اک زندہ مثال

(3)

بھوسلہ حکومت کے زوال کے زبردست اثرات مسلم معاشرے پر ہوئے چنانچہ بیشتر خاندان فکرِ معاش میں دوسری ریاستوں کی طرف منتقل ہو گئے۔ عہدِ برطانیہ میں ان کی جگہ ان مسلم تاجروں، دست کاروں اور صنعت کاروں نے لی جو تلاشِ معاش میں یہاں مختلف شہروں سے آنا شروع ہوئے۔ یوں یکے بعد دیگرے ان کے محلے آباد ہوئے۔ ایسا ہی ایک محلّہ مومن پورہ ہے جسے اعظم گڑھ سے نقلِ مکانی کر کے آنے والے بنکروں نے بسایا۔ یہی محلّہ میری جنم بھومی بھی ہے اور کرم بھومی بھی۔

اس علاقے میں بھوسلہ راجہ کی انتظامیہ کے اعلا افسران میں سے نواب سعد الدین خان، نواب صلاح الدین خان، نواب غلام علی اور شاہی طبیب حکیم عنایت علی خان کے بڑے بڑے مکانات، باڑے، باغات اور مسجدیں تھیں۔ گھوڑے اور بگھی والوں کے رہائشی مکانات تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر غیر مسلموں کی رہائش گاہیں تھیں اور کئی بڑے بڑے تکیے (قبرستان) تھے جو تکیے دار کے نام سے مشہور تھے۔ ان تکیوں میں تکیہ دیوان شاہ، تکیہ محبوب شاہ، تکیہ معصوم شاہ اور تکیہ بفات بائی کو اہمیت حاصل تھی۔ اعظم گڑھ سے آنے والے بنکروں نے پہلے قدیم باشندوں سے ان کے مکانات خرید کر سکونت اختیار کی اور اپنی صنعت و حرفت کی بنیاد ڈالی۔ رخت سازی کا عمل شروع ہوا۔ جب آبادی بڑھی اور اعظم گڑھ کے علاوہ جونپور، فیض آباد، بنارس، سلطان پور، پرتاپ گڑھ اور مشرقی یوپی کے دیگر علاقوں سے بھی مسلم خاندان آ کر آباد ہونے لگے تو تکیہ داروں کے وارثین نے تکیے کی ان زمینوں کو فروخت کرنا شروع کر دیا جن کی حیثیت وقف الی اللہ کی تھی۔ یوں انھوں نے علامہ اقبال کے اس شعر کی اپنے عمل سے تصدیق کر دی:

یہی شیخِ حرم ہے جو کہ اکثر بیچ کھاتا ہے
گلیم بوذر و دلقِ اویس و چادرِ زہرا

آبادی کے اضافے کے ساتھ ساتھ ایک ایک کر کے سارے تکیے غائب ہو گئے۔ ان پر رہائشی مکانات تعمیر ہو گئے۔ لیکن آج بھی قدیم آثار و نشانات کو ان علاقوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ اپنے پرانے نام سے ہی جانے جاتے ہیں۔ مومن پورہ ان سب کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔

اب مومن پورہ کی آبادی اس قدر گنجان ہو چکی ہے کہ یہ طرح طرح کے مسائل پیدا کر رہی ہے۔ سانس

لینا دو بھر ہو گیا ہے۔ یہ اس قدر محفوظ، پُر امن اور سہولتوں سے بھر پور علاقہ ہے کہ باہر سے آنے والا یہاں سے جانے کو تیار نہیں ہوتا۔ اس سے متصل مغرب میں شہر کا ایک بڑا سرکاری اسپتال ہے جو میو اسپتال کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اسی میں اندرا گاندھی میڈیکل کالج ہے۔ اسپتال سے قریب ناگپور ریلوے اسٹیشن ہے۔ شمال مغرب میں بمبئی سے کلکتہ جانے والی ریلوے لائن، جنوب میں ہنسا پوری، بھنڈارہ روڈ اور سینٹرل ایوینو اور مشرق میں غیر مسلم بستی ہے۔ اس محلے میں تاریخی عید گاہ، قدیم قبرستان، عظیم الشان جامع مسجد، بے مثال محمد علی سرائے، مشہور دینی درس گاہ دارالعلوم، ینگ مسلم فٹ بال گراونڈ، ڈاکٹر ذاکر حسین ڈی ایڈ کالج، سنٹرل اسپتال، اردو کے پرائمری و ہائی اسکول اور جونیر کالج، لائبریری اور چھوٹی بڑی مسجدیں اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ گویا یہ شہر میں مسلم تہذیب و ثقافت کا سب سے نمایاں اور اعلا نمونہ ہے۔ ان مظاہر کے علاوہ یہاں پیدائش سے موت تک کام آنے والی ساری چیزوں کی دکانیں ہیں۔ ہوسٹل، ہوٹل اور پان ٹھیلوں کی کثرت ہے۔ یہ ہر اعتبار سے خود کفیل ہے۔

مومن پورہ مسلمانانِ ناگپور کی مذہبی، سیاسی، ثقافتی اور ادبی سرگرمیوں کا ہمیشہ مرکز رہا ہے۔ یہاں بڑے بڑے دینی اجلاس، کل ہند مشاعرے اور ادبی جلسے منعقد ہوئے۔ اسی سرزمین پر سیاسی جلسے، ہنگامے اور مظاہرے ہوئے۔ یہیں سے خان بہادر ایچ ملک، یوسف شریف بیرسٹر، نواب صدیق علی خان، محمد ابراہیم خاں فنا اور سمیع اللہ خان کی قیادت چمکی۔ مولانا ناطق گلاؤٹھوی، طرفہ قریشی، زرینہ ثانی اور شاہد کبیر کو ادبی دنیا میں شہرت ملی۔ منظور حسین شور، ساقی جاوید، حکیم اسرار احمد کریوی، شوکت جعفری، عزیز حامد مدنی اور نگار صہبائی کی یہیں عزت افزائی ہوئی اور انھوں نے تقسیم وطن کے بعد سرحد اُس پار نام کمایا۔ اسی نے م ناگ (ممبئی)، شفیقہ فرحت (بھوپال) اور صہبا وحید (دہلی) کو اچھالا جو ادبی حلقوں میں مقبول ہیں۔

اس سرزمین پر قدم رکھنے والے مشاہیر علما میں مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حسرت موہانی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید، مولانا محمد میاں، مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی، مولانا قاری محمد طیب، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا منت اللہ رحمانی، قاضی اطہر مبارک پوری کے نام اہم ہیں۔ سیاسی رہنماؤں میں بی اماں، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں، لیاقت علی خاں، راجہ آف محمود آباد اور محمد علی جناح نے یہاں منعقد ہونے والے اجلاس اور کانفرنس وغیرہ میں شرکت کی۔

اس علاقے کے رہنے والوں کا شعری ذوق تربیت یافتہ ہے۔ یہ کل ہند مشاعرے رات بھر سنتے ہیں۔ ٹلنے کا نام نہیں لیتے۔ مقامی مشاعروں میں بھی خاصی تعداد میں لوگ شریک ہوتے ہیں اور شعرا کی ہمت افزائی کرتے ہیں۔ اسی نے یہاں کے شاعرانہ ماحول کو جاندار اور پُر اثر بنایا ہے۔ یہاں ہر مسلک کے دینی اجلاس بھی کثرت سے منعقد ہوتے ہیں۔ اس میں بھی لوگ دیر رات تک مواعظ حسنہ سے مستفیض ہوتے ہیں۔

(4)

زمانے کی گردش امیر کو غریب سے، غریب کو امیر سے، بادشاہ کو فقیر سے، فقیر کو بادشاہ سے، طاقتور کو کمزور سے، کمزور کو طاقتور سے، عزت کو ذلت سے، ذلت کو عزت سے بدل دیتی ہے۔ یہی گردش افراد کو ایک شہر سے دوسرے شہر، ایک ریاست سے دوسری ریاست اور ایک ملک سے دوسرے ملک منتقل کرتی ہے۔ یہ دن قانونِ قدرت کے تحت باری باری بدلتے رہتے ہیں۔ یہ سب کا مقدر ہے۔ اس سے کوئی فرد یا خاندان مستثنیٰ نہیں ہے۔ اسی قانونِ قدرت کے تحت میرے جد اعلا حاجی شیخ نور محمد ابن شیخ بودھن 1857ء کے تاریخی انقلاب کے بعد تکوینی حوادث سے مجبور ہو کر تلاشِ معاش میں رسول پور (مبارکپور، اعظم گڑھ) سے ناگپور آئے اور نائیک کے تالاب کے پاس میدانی علاقے میں خیمہ زن ہوئے۔ خوش حال و فارغ البال تھے۔ پارچہ باف و تاجر تھے چنانچہ اسی کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا اور بہت جلد کافی املاک و جائیداد کے مالک ہو گئے۔ انھوں نے 11 جون 1879ء کو مومن پورہ کے علاقے میں دو ہزار اسکوائر فٹ کا ایک مکان خریدا اور اس میں سکونت اختیار کی۔ اسی علاقے میں دو سال بعد 20 فروری 1882ء کو شاہی طبیب حکیم عنایت علی خان کا عالیشان مکان، مہمان خانہ، مطب اور باغ وغیرہ بھی خرید لیا۔ یہ تقریباً تیس ہزار اسکوائر فٹ پر مشتمل تھا۔ اب انھوں نے اس کو اپنی رہائش گاہ بنالیا۔ آج بھی ہمارا خاندان اسی میں آباد ہے۔ اس کے بعد ایک مکان معہ کھلی زمین اور خریدا۔ بفضلہٖ تعالیٰ یہ سب محفوظ ہیں اور شرعی تقسیم کے مطابق وارثین کے قبضے میں ہیں۔ گویا جد اعلا کے لیے ترکِ وطن باعثِ رحمت ہوا۔ گردشِ وقت نے ان کی پریشاں خاطری کو خوش دلی سے بدل دیا۔ یہ ان کے وارثین کے لیے بھی نعمتِ الٰہی ثابت ہوا۔

ان کا شمار محلے کے رئیسوں میں تھا۔ ان کو سماج میں ممتاز مقام حاصل تھا۔ جب محلے کے لوگوں کے نزاعی معاملات کو حل کرنے کے لیے پنچایتی نظام قائم ہوا تو وہ اس کے سرپنچ بنائے گئے۔ بڑے متقی و پرہیزگار تھے۔ حج و زیارتِ بیت اللہ سے مشرف ہو چکے تھے۔ انھوں نے ایک سو سات سال کی عمر میں ۱۸۹۷ء میں رحلت فرمائی۔ ان کے تین بیٹے تھے: سلیم اللہ، حاجی درگاہی اور حاجی الٰہی بخش۔ یہ تینوں بھی سماج میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ ان میں حاجی الٰہی بخش میرے جد امجد تھے جو ایک جیّد عالم تھے۔

حاجی الٰہی بخش کو درس و تدریس، ذکر و اذکار، مطالعہ و محاسبہ اور تصنیف و تالیف کے علاوہ کسی اور شوق سے رغبت نہیں تھی۔ اپنے گھر میں ہی ایک مکتب کھول کر خدا کی رضا و خوشنودی کے لیے بلا معاوضہ بچوں اور نوجوانوں کو قرآن مجید کا ناظرہ پڑھاتے اور دینی و اخلاقی تعلیم کے علاوہ اردو و فارسی کی تعلیم بھی دیتے۔ انھوں نے جامع مسجد مومن پورہ میں پچاس سال سے زائد متولیت، خطابت اور امامت کا فریضہ انجام دیا۔ اس کا بھی کبھی کوئی معاوضہ قبول نہیں کیا۔ وہ سماج کی فلاح و بہبودی کے کاموں میں مخلصانہ حصہ لیا کرتے تھے۔

انھوں نے 1896ء میں انجمن تجہیز و تکفین بنائی اور اس کے زیرِ اہتمام لاوارث میت فنڈ قائم کیا جو پینتیس (35) سال ان کی تحویل میں رہا۔ اب یہ مسلم قبرستان مومن پورہ کی نگرانی میں کامیابی سے اپنے فرائض انجام دے رہا ہے۔ لاوارث میتوں کی تجہیز و تکفین اسی کے زیرِ اہتمام ہوتی ہے۔ اس دور میں شہر کے ضرورت مند حاجی صاحب سے فتویٰ حاصل کیا کرتے تھے۔ ان کو تصنیف و تالیف سے بھی دلچسپی تھی۔ ان کا علمی اثاثہ اور قلمی کتابیں میرے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ ان میں ان کی کتاب ضروریات مسائل کافی ضخیم ہے۔ یہ فقہ حنفیہ کے ان مسائل پر مشتمل ہے جو روزانہ زندگی میں کام آتے ہیں۔ یہ کتابیں شاہد ہیں کہ ان کو دینی علوم پر زبردست مہارت حاصل تھی۔ ان کا خط انتہائی پاکیزہ اور نفیس تھا۔ وہ خط نسخ، خط نستعلیق اور خط شکستہ لکھنے میں مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے تقریباً ایک سو تین سال کی عمر میں بروز جمعرات 24 دسمبر 1953ء کو رحلت فرمائی۔ مسلم قبرستان مومن پورہ کی مسجد کے قریب ان کا مزار مرجعِ خلائق ہے۔ صُلبی اولاد میں ایک بیٹی فاطمہ بیگم اور تین بیٹے: حاجی محمد عبدالمتین، حاجی محمد یٰسین اور حاجی محمد زین العابدین ان کی وفات کے وقت بقیدِ حیات تھے۔ ان میں اول الذکر میرے تایا، ثانی الذکر والد اور موخر الذکر چچا ہیں۔

تایا حاجی محمد عبدالمتین تعلیم یافتہ تھے۔ صوم و صلوٰۃ کے بے انتہا پابند تھے۔ انھوں نے دوبار حج کی سعادت حاصل کی۔ ان کا علمی و ادبی ذوق پختہ اور تربیت یافتہ تھا۔ مذہبی موضوع پر ان کی ایک کتاب راہِ مستقیم شائع ہوچکی ہے۔ سماجی کاموں میں ان کی دلچسپی حد سے زیادہ بڑھی ہوئی تھی۔ وہ مسلم لائبریری مومن پورہ، ایم ایل والی بال کلب مومن پورہ، مومن تعلیمی فنڈ مومن پورہ، انصار نگر ڈائنگ کوآپریٹیو سوسائٹی مومن پورہ، انصار نگر کمیٹی مومن پورہ، اسلامیہ ہائی اسکول مومن پورہ اور جامع مسجد ٹرسٹ مومن پورہ کے بانیوں میں تھے اور ان اداروں میں کلیدی و اعلا عہدوں پر فائز تھے۔ انھوں نے سماج کی تعلیمی، اقتصادی اور ثقافتی حالت کو بہتر بنانے کے لیے مخلصانہ کوششیں کیں اور اس قسم کی سرگرمیوں میں نمایاں کردار ادا کیا۔ پیرانہ سالی کے باعث نوے (90) سال کی عمر میں بروز منگل، 18 اکتوبر 1994ء کو رحلت فرمائی۔ مسلم قبرستان مومن پورہ میں اپنے والد کے مزار کے قریب سپردِ خاک کیے گئے۔ وہ لاولد تھے۔ انھوں نے اپنے حقیقی بیٹے کی طرح میری تربیت کی۔ ان کی شخصیت کا مجھ پر گہرا اثر ہے (جاری)۔

...

Dr.Mohd.Sharfuddin'Sahil'

Haidri Road,Mominpura

Dist:Nagpur-440018(Maharashtra)

Mob:9049754022

دھوپ میں جلتے پیر

منور رانا

(لکھنؤ، اتر پردیش)

زخم کیسا بھی ہو کریدیئے تو اچھا لگتا ہے۔ ماضی کیسا بھی رہا ہو سوچئے تو مزا آتا ہے۔ بچپن جیسا بھی گذرا ہو راج سنگھاسن سے اچھا ہوتا ہے۔ مجھے نہیں معلوم زمینداری کیسی ہوتی ہے کیوں کہ میں کرائے کے گھر میں پیدا ہوا۔ میں نہیں جانتا خوش حالی کیا ہوتی ہے، کیوں کہ میں نے بارہا ماں کو بھوکے پیٹ سوتے دیکھا ہے۔ مجھے کیا پتہ زمیندار کیسے ہوتے ہیں، کیوں کہ میں نے مدتوں اپنے ابو کے ہاتھوں میں ٹرک کا اسٹیرنگ دیکھا ہے۔ میں نے بہت سے خواب دیکھے ہیں۔ ممکن ہے میرے ابو نے بھی خواب دیکھے ہوں کیوں کہ ایک تھکا ماندا ٹرک ڈرائیور بہت بے خبری کی نیند سوتا ہے۔ لیکن مجھے معلوم ہے میری ماں نے کبھی خواب نہیں دیکھا تھا، کیوں کہ خواب تو وہ آنکھیں دیکھتی ہیں جو سوتی ہیں، لیکن میں نے امی کو کبھی سوتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ان کی آنکھیں ہمیشہ گھر کی دہلیز پر رکھی دیکھی ہیں، جسم جائے نماز پر رکھا دیکھا ہے اور جوانی اس ٹرک ڈرائیور کے انتظار میں قطرہ قطرہ پگھلتے دیکھی ہے جو میرے ابو بھی تھے اور امی کے سر کا آنچل بھی!

رائے بریلی سے میرا ننھیال صرف 20 میل کے فاصلے پر تھا، لیکن غربت فاصلے بڑھا دیتی ہے، لفافے اور پوسٹ کارڈ کو چھوٹا کر دیتی ہے۔ غربت میں رشتے دار بھی دور کے چراغ معلوم ہوتے ہیں۔ غربت میں وہ نشہ ہے جس میں خدا بھی رشتے دار معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے خدا آسمان پر بہت بڑے گھر میں رہتا ہو لیکن زمین پر وہ صرف غریب آدمی کے دل میں رہتا ہے۔ غربت میں کروندے اور بیر کے کانٹے انگلیوں سے خون کی بوند نکال کر اس کی جانچ کر لیتے ہیں۔ خون کی بوندوں کو جانچنے اور پرکھنے کے لیے کسی لیباریٹری (laboratory) میں بھیجنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ غربت کے وہ دن بھی کیا ہوتے ہیں جب شوکیس (showcase) میں رکھی ہوئی گڑیا کو دیکھنے کے لیے غریبی احتیاطاً ہاتھ منہ دھو لیتی ہے۔

ایک دن میرے ابو گھر آئے۔ میری امی نانی کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ میرے دو چھوٹے بھائی تھے۔ ایک چھوٹا بھائی یحییٰ رانا عین نوجوانی کے عالم میں جیپ کے حادثے میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملا۔ امی کے ساتھ چلے گئے تھے۔ میں گھر پر اپنی دادی کے پاس تھا، کیوں کہ دادی مجھے بہت چاہتی تھیں۔ پتہ نہیں لڑکوں کو دادی سے اور لڑکیوں سے نانی کو اتنی محبت کیوں ہوتی ہے۔ شاید نانی دختر زادی میں اپنی بیٹی تلاش کر لیتی ہے اور دادی

پوتے میں اپنا بیٹا تلاش کرتی ہے۔ ابو مجھے ٹرک میں اپنے ساتھ بٹھا کر ننھیال کی طرف چل دیئے۔ جہاں تک ٹرک جاسکتا تھا ابو ٹرک چلا کر لے گئے۔ پھر ایک جگہ ٹرک روک دیا اور مجھے ساتھ لے کر پیدل ہی گاؤں کی طرف چل دیے۔ غالباً دو ڈھائی میل کا فاصلہ رہا ہوگا۔ پگڈنڈیوں پر چلنے کی عادت نہ ہونے سے مجھے یوں بھی تکلیف ہورہی تھی۔ پھر سفر بھی لمبا تھا۔ چلتے چلتے میں ابو سے بہت پیچھے ہو جاتا۔ وہ مڑ کر دیکھتے تو میں پھر دوڑ کر ان کے پاس پہنچ جاتا۔ بچپن میں باپ بھی خضر علیہ السلام معلوم ہوتا ہے۔ قدرت یہ احساس صرف بچپن کو ہی عطا کرتی ہے۔

اچانک ابو ایک جگہ اکڑوں بیٹھ گئے اور بولے کہ تم میرے کندھے پر بیٹھ جاؤ!

میں نے کہا نہیں ابو جان آپ تھک جائیں گے۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گا لیکن آپ کے کندھے پر نہیں بیٹھوں گا۔

ابو نے میری طرف مسکرا کر دیکھا اور بولے تم بوجھ نہیں ہو، میرے بیٹے ہو، میں تھکوں گا نہیں۔

یہ کہہ کر انھوں نے زبردستی مجھے اپنے کندھے پر بٹھا لیا اور کہنے لگے ٹھیک ہے میں تمھیں اپنے کندھے پر بٹھا کر لے چل رہا ہوں، جب تم بڑے ہونا تو مجھے کار لا کر دینا۔ اس وقت میری عمر مشکل سے سات آٹھ برس رہی ہوگی۔

بچپن خوشبو کی طرح ہوتا ہے بہت دیر نہیں ٹھہرتا، یا بچپن کو پر لگ جاتے ہیں۔ دن مہینوں میں اور مہینے برس میں تبدیل ہوتے رہے۔ کچھ ہی برسوں بعد سارا خاندان پاکستان چلا گیا۔ جیسے طاعون میں گاؤں صاف ہو جاتے ہیں، جیسے جنگل میں آگ لگ جاتی ہے، جیسے رنگت کو دھوپ کھا جاتی ہے، جیسے کردار کو شہر کھا جاتے ہیں، جیسے ایمان کو ہوس نگل لیتی ہے، جیسے حویلیوں کو انا کھا لیتی ہے، جیسے آئینے کو ویرانی کھا لیتی ہے۔ شاید آئینہ چہرہ دیکھنے کے لیے ہوتا ہے اور ڈھال میدان میں تنہا چھوڑ کر جاتے ہوئے، لشکر کو دیکھنے کے لیے ہوتی ہے۔

سیاست کی بساط پر دنیا کی سب سے ذہین قوم مہرہ بن کر رہ گئی۔ تقسیم کے کھیل میں پاکستان جیت گیا لیکن مسلمان ہار گئے۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں یہ کیسی شکست تھی جس کا احساس 75 برس گزر جانے کے بعد بھی باقی ہے۔ یہ کیسا زخم تھا جس کی کسک ہر مرنے والے کے چہرے سے اتر کر پیدا ہونے والے کے چہرے پر چپک جاتی ہے۔ یہ کیسی ندامت تھی جسے تین نسلوں سے آنسو بھی نہیں دھو سکے۔ یہ کیسی تقسیم تھی جس کا حصہ آج تک نہیں لگ سکا۔ یہ کیسا فیصلہ تھا جس نے تاج محل کے دو ٹکڑے کر دیے، کشمیر کے دو حصے ہو گئے، جامع مسجد آدھی ہو گئی، غزل نے مرثیے کا روپ دھار لیا، اردو زبان سرحد کی سولی پر لٹکا دی گئی اور فرار کو ہجرت کا لقب دے دیا گیا۔

ایک ٹوٹے سے گھر میں بارشوں میں ٹپکتے ہوئے چھپر کے نیچے ابو نے اپنی گیلی مٹی جیسے بچوں کو اس سیدھی سادی پردے دار خاتون کے سپرد کر دیا جو میری ماں تھی اور خود اللہ کا نام لے کر اپنے بازوؤں کے بھروسے روزی کی تلاش میں شب و روز شیر شاہ سوری کی بنوائی سڑک کے پیچ و خم سے کھیلنا شروع کر دیا۔ ابو بھی

ہفتے بھر بعد آتے، کبھی دس دنوں بعد واپسی ہوتی، کبھی تھوڑے دن ٹھہرتے، کبھی تھوڑی دیر ٹھہرتے اور پھر ہم لوگوں کے روشن مستقبل کی تلاش میں ٹرک کا اسٹیرنگ تھام لیتے شاید وہ ساری زندگی ونڈ اسکرین گلاس (windscreen glass) سے سڑک کی بجائے ہمارے مستقبل کا خواب دیکھتے رہتے تھے مستقبل کا خواب بھی وہ نشہ ہوتا ہے جو ساری عمر نہیں اترتا۔ وہ الہڑ شباب ہوتا ہے جس سے بڑھاپا کترا کر گزرتا ہے۔ وہ طوفان ہوتا ہے جسے باندھا نہیں جا سکتا۔

ابو ہم لوگوں کے بارے میں سوچتے بہت تھے۔ انھیں کوئی بھی موسم ڈرا نہیں پاتا تھا۔ وہ لو دھوپ کی شدت کے زمانے میں انگوچھا بھگو کر سر پر لپیٹ لیتے تھے۔ بارہا انھوں نے رائے بریلی سے کلکتہ تک پنجاب میل کے ڈرائیور کو آگے نہیں نکلنے دیا۔ رفتہ رفتہ گاڑی چلانا ان کا پیشہ ہی نہیں شوق بن کر رہ گیا۔ وہ زیادہ سے زیادہ وقت ٹرک چلانے میں گزار دیتے تھے لیکن وہ ہم لوگوں سے غافل نہیں ہو پاتے تھے۔ وہ اس خیال سے کبھی پیٹ بھر کر کھانا بھی نہیں کھاتے تھے کہ پتہ نہیں گھر پر چولہا جلا بھی ہوگا یا نہیں اور اکثر ایسا ہوتا بھی تھا کہ میرے گھر میں چولھا نہیں جلتا تھا۔ امی ہم لوگوں کو رشتے کی ایک پھوپھی کے گھر پہ بھیج دیتی تھیں اور خود خالی پیٹ سو جاتی تھیں یا جائے نماز پر کھڑی ہو جاتی تھیں۔ ابو راستے میں اگر کہیں آگ لگی دیکھ لیتے تھے تو فوراً انھیں گھر کا ٹوٹا پھوٹا چھپر یاد آنے لگتا تھا۔ پھر انھیں یہ خیال پریشان کرنے لگتا تھا کہ میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ اگر خدانخواستہ گھر میں آگ لگ گئی تو کیا ہوگا۔ میری امی میرے گھر کی روایتی پردہ داری کی طرفدار بھی تھیں اور نگہبان بھی۔ ہم لوگوں کے کپڑے خواہ پھٹے ہوئے کیوں نہ ہوں لیکن گھر کے دروازے پر ہمیشہ ایک مضبوط پردہ جھولتا رہتا تھا۔

وقت کو دبے پاؤں چلنے کی اتنی عادت ہے کہ محسوس ہوئے بغیر گذر جاتا ہے۔ غالباً سنہ 1964ء میں ابو نے کولکاتہ میں ٹرانسپورٹ کا چھوٹا سا کام شروع کیا۔ سنہ 1967ء میں امی اور چھوٹے بھائی بہن بھی کولکاتہ چلے گئے۔ ہم تین بھائی ابو کے خالہ زاد بھائی یونس صوفی کے گھر میں رہ کر تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ 1968ء میں ابو ہم لوگوں کو بھی لے کر کولکاتہ چلے آئے۔ محمد جان ہائر سکنڈری اسکول میں میرا نام آٹھویں جماعت میں لکھا گیا۔

سنہ 1971ء میں وہاں سے ہائر سکنڈری کرنے کے بعد میرا داخلہ امیش چندر کالج میں بی کام میں ہو گیا تعلیم مکمل کرنے کی نوبت نہیں آئی کیوں کہ ایک تو مجھے شاعری، ڈرامہ نگاری اور اسٹیج پروگرام کا چسکا لگ گیا۔ دوسرے اچانک ابو بیمار ہو کر اسلامیہ ہاسپٹل میں بھرتی ہو گئے۔ تقریباً 25 دنوں تک وہ ہاسپٹل میں رہے۔

پڑھائی سے میرا جی اچاٹ ہو گیا اور میں ابو کے ساتھ ٹرانسپورٹ کے آفس میں بیٹھنے لگا۔ ابو کو شاعری بہت پسند تھی۔ سوز سکندر پوری، پروفیسر اعزاز افضل، راز الہ آبادی اور نازش پرتاپ گڑھی سے ان کے بہت گہرے مراسم تھے۔ اپنے آخری دنوں میں پروفیسر اعزاز افضل کا یہ شعر وہ مستقل پڑھتے رہتے تھے:

افضل کا مقدر ہے حق گوئی و بے باکی
حق بات کہی ہوگی جھٹلائے گئے ہوں گے

لیکن وہ اس بات پر قطعی راضی نہیں تھے کہ میں شاعر بنوں لیکن تقدیر کے لکھے کو کیسے ٹالا جا سکتا ہے۔ میں بگڑتے بگڑتے ایک دن شاعر بن ہی گیا لیکن ابو کے خون پسینے سے سینچے ہوئے کاروباری پودے پر کبھی دھوپ چھاؤں کا اثر نہیں ہونے دیا۔ کاروباری 'گدی' پر بیٹھاتے وقت ابو نے پندرہ بیس ہزار روپیوں کے ساتھ ایمانداری، بے باکی حق گوئی اور شرافت کی جو پونجی میرے حوالے کی تھی خدا کا شکر ہے کہ میں نے اس میں اضافہ ہی کیا ہے۔ سنہ 1987ء میں ابو کولکاتہ سے واپس رائے بریلی آگئے:

مہاجرو ! یہی تاریخ ہے مکانوں کی
بنانے والا ہمیشہ برآمدوں میں رہا

چھوٹے بھائی یحییٰ رانا کی موت کے بعد ابو بہت ٹوٹ پھوٹ گئے لیکن وہ بھی اس کا اظہار نہیں ہونے دیتے تھے بلکہ اندر اندر دھوپ میں رکھی برف کی طرح گھلنے لگے۔ ہم سب بھائی ان کو کسی بھی طرح خوش رکھنے کی کوشش میں لگے رہتے۔ ہر طرح ان کی دل جوئی میں مصروف رہتے لیکن اب ایک طرح سے وہ اس بچے کی طرح ہو گئے تھے جو بہت ڈرا ہوا ہوتا ہے۔ ہم لوگوں کو رات کے سفر سے منع کرتے تھے لیکن چوں کہ ٹرانسپورٹ کے کام میں کلینڈر میں لال سیاہی کا استعمال نہیں کیا جاتا ہے اور جب تک ہیڈ لائٹ ساتھ دے رات کو رات نہیں کہا جاتا ہے لہٰذا اس مجبوری کی وجہ سے ہمارا راتوں کا سفر ابو کو بھی گھر میں جگائے رکھتا تھا۔ ہفتوں گھر کا منھ نہ دیکھنے والے ابواب کہیں بھی جاتے تو کوشش یہی کرتے کہ رات ہونے سے پہلے پہلے وہ رائے بریلی واپس آجائیں۔ سمندر کی لہروں پر چلنے والا مسافر اب ندی کے کنارے بیٹھ کر وضو کرتے ہوئے بھی تھک جاتا تھا۔ ابو اپنے چہرے سے اور خاص طور سے اپنی آواز سے کبھی اپنی کمزوری کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے۔ مجھے دیر رات میں فون کرنے والے اکثر دھوکہ کھا جاتے تھے۔ وہ ٹوٹ چکے تھے لیکن ان کی آواز میں کبھی لوچ نہیں آئی تھی۔

سنہ 1999ء کے بعد ابو بالکل کمزور ہو گئے تھے۔ دونوں گردوں نے کام کرنا تقریباً بند کر دیا تھا۔ ہفتے میں دو بار رائے بریلی سے لکھنؤ ڈائلیسس (dialysis) کے لیے لے جائے جاتے۔ اس کے باوجود ان کی خود اعتمادی میں کمی نہیں آئی تھی بلکہ کبھی کبھی تو ان کے چہرے پر زندگی کی چمک دیکھ کر موت بھی لرز جاتی تھی۔

ایک دن میں نے سوچا کہ ابو کی زین (Maruti Suzuki Zen) کار پرانی ہو گئی ہے، نئی کار لائی جائے تو ممکن ہے کہ ابو کی زندہ رہنے کی امنگ بڑھ جائے۔ میں کولکاتہ گیا تو ان کے لیے ایک ٹاٹا سفاری (Tata Safari) خریدی۔

کسی نے ابو کو بتایا کہ چچا آپ کے لیے منور بھیا نے سفاری کار فریدی ہے۔

ابو بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئے اور بچوں کی طرح پوچھا 'شہر میں یہ گاڑی کسی کے پاس ہے۔'

اس آدمی نے بتایا کہ ابھی یہ گاڑی پورے ضلع میں کسی کے پاس نہیں ہے۔

یہ سن کر مسکرائے اور پھر بچوں کی طرح لیٹ کر سو گئے۔ جس دن کولکاتہ سے سفاری آئی ابو ڈائلیسس کے لیے لکھنؤ گئے ہوئے تھے۔

شام کو کچہری والوں کی طرف سے 'ہندی دیوس' کے موقع پر فیروز گاندھی ڈگری کالج کے آڈیٹوریم میں ایک کوی سمیلن تھا۔ رائے بریلی کے ضلع جج محترم پی۔ڈی کیونکہ صاحب اردو سے محبت کرتے تھے۔ اسی نسبت سے وہ میرا بھی خیال کرتے تھے انھوں نے مجھے بھی دعوت نامہ اس تاکید کے ساتھ بھجوایا کہ آپ کو شریک ہونا ہے۔ میں شام کو کوی سمیلن میں جانے کے لیے نکلا۔ کار ابو کو لے کر ابھی لوٹی نہیں تھی۔ ڈرائیور چھنّے خان جو سفاری کو لکاتہ سے چلا کر لائے تھے مجھ سے کہنے لگے چلئے میں آپ کے ساتھ کوی سملین میں چلتا ہوں۔ میں نے انکار کیا تو بولے میں آپ کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔

میں نے انھیں سمجھایا کہ میں ابھی سفاری پر نہیں بیٹھ سکتا کیوں کہ ابھی تک اس گاڑی کا اصلی مالک اس گاڑی پر نہیں بیٹھا ہے۔ یہ سن کر چھنّے خاں بھی رنجیدہ ہو گئے اور میں چپ چاپ سر جھکائے سڑک پر آ گیا اور ایک رکشے پر بیٹھ کر فیروز گاندھی ڈگری کالج کی طرف روانہ ہو گیا۔

اتفاق سے آڈیٹوریم کے صدر دروازے پر ضلع جج صاحب مل گئے۔ انھوں نے مجھے رکشے سے اترتے دیکھ لیا تھا۔ وہ میرے پاس آئے اور شکایتی لہجے میں بولے کہ آپ نے فون کر دیا ہوتا۔ کوئی بھی گاڑی چلی جاتی اور آپ کو لے آتی۔

میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کو یاد دلایا کہ آپ نے ایک بار ایک قصہ سنایا تھا کہ ایک بار کسی مندر میں ایک راجہ پہنچا اور اس نے مندر کے پجاری سے پوچھا کہ پجاری جی کیا کبھی کسی نے مندر پر چڑھاوے میں دو کلو سونا چڑھایا ہے۔ پجاری جی بولے نہیں مہاراج ابھی تک ایسا کوئی دانی ادھر سے نہیں گذرا۔

راجہ نے مسکرا کر کہا تو پنڈت جی سمجھ لیجئے کہ وہ دانی پیدا ہو گیا ہے۔ آج میں بھگوان کے چرنوں میں دو کلو سونا پڑھاؤں گا۔

پنڈت جی نے مسکراتے ہوئے ہاتھ جوڑ لیے اور بولے لیکن مہاراج میں یہ چڑھاوا لینے سے انکار کرتا ہوں۔

راجہ نے پوچھا 'پنڈت جی آپ یہ چڑھاوا لینے سے انکار کیوں کر رہے ہیں۔'

پنڈت جی نے پھر ہاتھ جوڑ لیے اور بولے کہ مہاراج دو کلو سونا چڑھانے والے تو ہر دور میں پیدا ہوتے رہیں گے لیکن ممکن ہے میرے بعد کوئی انکار کرنے والا نہ پیدا ہو۔ ضلع جج صاحب نے مجھے الجھی ہوئی سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو میں نے بھی ہاتھ جوڑ لیے اور عرض کیا کہ جناب میں اپنے دروازے پر سفاری چھوڑ کر اس

افضل کا مقدر ہے حق گوئی و بے باکی
حق بات کہی ہوگی جھٹلائے گئے ہوں گے

لیکن وہ اس بات پر قطعی راضی نہیں تھے کہ میں شاعر بنوں لیکن تقدیر کے لکھے کو کیسے ٹالا جا سکتا ہے۔ میں بگڑتے بگڑتے ایک دن شاعر بن ہی گیا لیکن ابو کے خون پسینے سے سینچے ہوئے کاروباری پودے پر کبھی دھوپ چھاؤں کا اثر نہیں ہونے دیا۔ کاروباری 'گدی' پر بیٹھاتے وقت ابو نے پندرہ بیس ہزار روپیوں کے ساتھ ایمانداری، بے باکی حق گوئی اور شرافت کی جو پونجی میرے حوالے کی تھی خدا کا شکر ہے کہ میں نے اس میں اضافہ ہی کیا ہے۔ سنہ 1987ء میں ابو کولکاتہ سے واپس رائے بریلی آ گئے:

مہاجرو ! یہی تاریخ ہے مکانوں کی
بنانے والا ہمیشہ برآمدوں میں رہا

چھوٹے بھائی یحییٰ رانا کی موت کے بعد ابو بہت ٹوٹ پھوٹ گئے لیکن وہ بھی اس کا اظہار نہیں ہونے دیتے تھے بلکہ اندر اندر دھوپ میں رکھی برف کی طرح گھلنے لگے۔ ہم سب بھائی ان کو کسی بھی طرح خوش رکھنے کی کوشش میں لگے رہتے۔ ہر طرح ان کی دل جوئی میں مصروف رہتے لیکن اب ایک طرح سے وہ اس بچے کی طرح ہو گئے تھے جو بہت ڈرا ہوا ہوتا ہے۔ ہم لوگوں کو رات کے سفر سے منع کرتے تھے لیکن چوں کہ ٹرانسپورٹ کے کام میں کلینڈر میں لال سیاہی کا استعمال نہیں کیا جاتا ہے اور جب تک ہیڈ لائٹ ساتھ دے رات کو رات نہیں کہا جاتا ہے لہٰذا اس مجبوری کی وجہ سے ہمارا راتوں کا سفر ابو کو بھی گھر میں جگائے رکھتا تھا۔ ہفتوں گھر کا منھ نہ دیکھنے والے ابو اب کہیں بھی جاتے تو کوشش یہی کرتے کہ رات ہونے سے پہلے پہلے وہ رائے بریلی واپس آ جائیں۔ سمندر کی لہروں پر چلنے والا مسافر اب ندی کے کنارے بیٹھ کر وضو کرتے ہوئے بھی تھک جاتا تھا۔ ابو اپنے چہرے سے اور خاص طور سے اپنی آواز سے کبھی اپنی کمزوری کا احساس نہیں ہونے دیتے تھے۔ مجھے دیر رات میں فون کرنے والے اکثر دھوکہ کھا جاتے تھے۔ وہ ٹوٹ چکے تھے لیکن ان کی آواز میں کبھی لوچ نہیں آئی تھی۔

سنہ 1999ء کے بعد ابو بالکل کمزور ہو گئے تھے۔ دونوں گردوں نے کام کرنا تقریباً بند کر دیا تھا۔ ہفتے میں دو بار رائے بریلی سے لکھنؤ ڈائلیسس (dialysis) کے لیے لے جائے جاتے۔ اس کے باوجود ان کی خود اعتمادی میں کمی نہیں آئی تھی بلکہ کبھی کبھی تو ان کے چہرے پر زندگی کی چمک دیکھ کر موت بھی لرز جاتی تھی۔

ایک دن میں نے سوچا کہ ابو کی زین (Maruti Suzuki Zen) کار پرانی ہو گئی ہے، نئی کار لائی جائے تو ممکن ہے کہ ابو کی زندہ رہنے کی امنگ بڑھ جائے۔ میں کولکاتہ گیا تو ان کے لیے ایک ٹاٹا سفاری (Tata Safari) خریدی۔

کسی نے ابو کو بتایا کہ چچا آپ کے لیے منور بھیا نے سفاری کار فریدی ہے۔

ابو بستر پر اٹھ کر بیٹھ گئے اور بچوں کی طرح پوچھا 'شہر میں یہ گاڑی کسی کے پاس ہے'۔
اس آدمی نے بتایا کہ ابھی یہ گاڑی پورے ضلع میں کسی کے پاس نہیں ہے۔
یہ سن کر مسکرائے اور پھر بچوں کی طرح لیٹ کر سو گئے۔ جس دن کولکاتہ سے سفاری آئی ابو ڈائلیسس کے لیے لکھنؤ گئے ہوئے تھے۔
شام کو کچہری والوں کی طرف سے 'ہندی دیوس' کے موقع پر فیروز گاندھی ڈگری کالج کے آڈیٹوریم میں ایک کوی سمیلن تھا۔ رائے بریلی کے ضلع جج محترم پی۔ڈی کیونکہ صاحب اردو سے محبت کرتے تھے۔ اسی نسبت سے وہ میرا بھی خیال کرتے تھے انھوں نے مجھے بھی دعوت نامہ اس تاکید کے ساتھ بھجوایا کہ آپ کو شریک ہونا ہے۔ میں شام کو کوی سمیلن میں جانے کے لیے نکلا۔ کار ابو کو لے کر ابھی لوٹی نہیں تھی۔ ڈرائیور چھنے خان جو سفاری کولکاتہ سے چلا کر لائے تھے مجھ سے کہنے لگے چلئے میں آپ کے ساتھ کوی سمیلن میں چلتا ہوں۔ میں نے انکار کیا تو بولے میں آپ کو چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔
میں نے انھیں سمجھایا کہ میں ابھی سفاری پر نہیں بیٹھ سکتا کیوں کہ ابھی تک اس گاڑی کا اصلی مالک اس گاڑی پر نہیں بیٹھا ہے۔ یہ سن کر چھنے خاں بھی رنجیدہ ہو گئے اور میں چپ چاپ سر جھکائے سڑک پر آ گیا اور ایک رکشے پر بیٹھ کر فیروز گاندھی ڈگری کالج کی طرف روانہ ہو گیا۔
اتفاق سے آڈیٹوریم کے صدر دروازے پر ضلع جج صاحب مل گئے۔ انھوں نے مجھے رکشے سے اترتے دیکھ لیا تھا۔ وہ میرے پاس آئے اور شکایتی لہجے میں بولے کہ آپ نے فون کر دیا ہوتا۔ کوئی بھی گاڑی چلی جاتی اور آپ کو لے آتی۔
میں نے ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کو یاد دلایا کہ آپ نے ایک بار ایک قصہ سنایا تھا کہ ایک بار کسی مندر میں ایک راجہ پہنچا اور اس نے مندر کے پجاری سے پوچھا کہ پجاری جی کیا کبھی کسی نے مندر پر چڑھاوے میں دو کلو سونا چڑھایا ہے۔ پجاری جی بولے نہیں مہاراج ابھی تک ایسا کوئی دانی ادھر سے نہیں گذرا۔
راجہ نے مسکرا کر کہا تو پنڈت جی سمجھ لیجئے کہ وہ دانی پیدا ہو گیا ہے۔ آج میں بھگوان کے چرنوں میں دو کلو سونا پڑھاؤں گا۔
پنڈت جی نے مسکراتے ہوئے ہاتھ جوڑ لیے اور بولے لیکن مہاراج میں یہ چڑھاوا لینے سے انکار کرتا ہوں۔
راجہ نے پوچھا 'پنڈت جی آپ یہ چڑھاوا لینے سے انکار کیوں کر رہے ہیں'۔
پنڈت جی نے پھر ہاتھ جوڑ لیے اور بولے کہ مہاراج دو کلو سونا چڑھانے والے تو ہر دور میں پیدا ہوتے رہیں گے لیکن ممکن ہے میرے بعد کوئی انکار کرنے والا نہ پیدا ہو۔ ضلع جج صاحب نے مجھے الجھی ہوئی سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تو میں نے بھی ہاتھ جوڑ لیے اور عرض کیا کہ جناب میں اپنے دروازے پر سفاری چھوڑ کر اس

لیے آیا ہوں کہ ہر دور میں سفاری جیسی مہنگی اور اس سے بھی مہنگی گاڑیوں پر بیٹھ کر لوگ کوی سمیلن اور مشاعروں میں آتے رہیں گے لیکن ممکن ہے میرے بعد سفاری چھوڑ کر رکشے پر بیٹھ کر آنے والا نہ پیدا ہو۔

ابو صرف ایک بار اس گاڑی پر بیٹھ سکے کیوں کہ اگلے ہفتے امی اپنی کلائی کی سب چوڑیاں توڑ چکی تھیں۔ وہ دن ہے اور آج کا دن میں نے سفاری کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا۔ تقریباً چھ مہینے تک گاڑی یوں ہی کھڑی رہی۔ میں کوشش کرتا تھا کہ اس پر نگاہ نہ پڑنے پائے۔ پھر ایک دن میرے ایک دوست اور محسن نے مجھ سے وہ گاڑی کچھ دنوں کے لیے مانگ لی۔ میں نے ڈرائیور سے گاڑی ان کے گھر یہ کھڑی کروادی اور آج تک واپس لانے کی ہمت نہیں کر سکا۔

مجھے معلوم نہیں روایتی شاعری، ترقی پسند ادب، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کسے کہتے ہیں؟ میں تو آپ بیتی کو جگ بیتی اور جگ بیتی کو آپ بیتی کے لباس سے آراستہ کر کے غزل بناتا ہوں۔ آپ کو اچھی لگے تو شکریہ، نہ اچھی لگے تو بھی شکریہ:

دکھ بزرگوں نے کافی اٹھائے مگر میرا بچپن بہت ہی سہانا رہا
عمر بھر دھوپ میں پیر جلتے رہے اپنی شاخیں ثمر دار کرتے ہوئے

(بشکریہ کہو ظلِ الٰہی سے، منور رانا، صفحہ:12-5)

...

مولانا محمد ولی رحمانی کی مفصل سوانح عمری 'حیات ولی' کے لیے رابطہ کریں: 9810862382

آمد نامہ

ڈاکٹر ظفر کمالی

(سیوان، بہار)

میرا شجرۂ نسب اس طرح ہے: ظفر اللہ (ظفر کمالی) ابن کمال الدین احمد ابن عبد الاحد ابن شیخ محمد امیر حسن ابن محمد ظہور ابن شیخ امان اللہ۔

خاندانی روایت کے مطابق میرے آبا واجداد کا تعلق مغل فوج سے تھا۔ میں نے اپنے بچپن میں اپنی دادی کے پاس زرہ بکتر، لوہے کی ٹوپی ایک خنجر اور دو تلواریں دیکھی تھیں جو بزرگوں کی نشانی کے طور پر ان کے پاس موجود تھیں۔ ایک بڑا ڈنڈا بھی تھا جس پر پیتل کا خول چڑھا ہوا تھا اور اس پر فارسی میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ یہ ساری چیزیں کسی فوجی کی ہی ہو سکتی ہیں۔ اورنگ زیب کے انتقال کے بعد جب مغلیہ سلطنت کا زوال شروع ہوا تو یہ خاندان دہلی سے ہجرت کر کے مضافاتِ عظیم آباد میں بیاپور نامی جگہ پر آباد ہوا۔ اس خاندان کی ایک شاخ نے داناپور (پٹنہ) اور دوسری نے موضع خواجہ سرائے ضلع سارن کو اپنا مستقل مستقر بنایا۔ خواجہ سرائے کے ہمارے بزرگوں میں جو پہلا نام ہمیں معلوم ہے وہ شیخ امان اللہ کا ہے۔ شیخ امان اللہ جن کی عرفیت جھانجھو تھی وہ کون تھے کیا تھے اس کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں۔ مختصر خاندانی کرسی نامہ جو خواجہ سرائے میں موجود ہے، سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ امان اللہ کو چھ بیٹے تھے: (1) شیخ محمد ظہور (2) محمد حفیظ (3) محمد عبد اللطیف (4) محمد محفوظ (5) عبد المجید اور (6) شیخ عبد الرحیم۔ شیخ امان اللہ کے بیٹوں میں محمد عبد اللطیف کی اولاد آج بھی خواجہ سرائے میں موجود ہے۔

شیخ امان اللہ کے بڑے لڑکے شیخ محمد ظہور کے متعلق بھی زیادہ تفصیلات دستیاب نہیں۔ ان کی شادی موضع منگورہاں ضلع سارن میں نورعلی نور کی صاحب زادی رسول باندی سے ہوئی تھی۔ ان کے بطن سے دو لڑکوں اور پانچ لڑکیوں کی ولادت ہوئی۔ لڑکوں کے نام تھے محمد امیر حسن اور محمد وزیر حسن۔ پانچ لڑکیوں میں دو کا انتقال بچپن میں ہی خواجہ سرائے میں ہو گیا۔ بقیہ تین لڑکیوں کے نام بی بی ظہیرن، بی بی توحیدن اور بی بی محمدن تھے۔ بی بی ظہیرن کی شادی محمد حفیظ کے لڑکے محمد جمیل سے ہوئی۔ توحیدن کی شادی خرماشاہ ساکن بیاپور نزد پٹنہ کے لڑکے جنت حسین سے ہوئی۔ محمدن 18 سال کی عمر میں غیر شادی شدہ طاعون کے مرض میں انتقال کر گئیں۔ محمد ظہور کے لڑکوں میں وزیر حسن کا انتقال بائیس برس کی عمر میں خواجہ سرائے میں ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔ بڑے لڑکے امیر حسن میرے پردادا تھے۔ یہ چھپرا کورٹ میں ریکارڈ روم انچارج تھے۔

امیر حسن کی شادی موضع رانی پور ضلع سارن حال ضلع سیوان میں محمد ابراہیم کی صاحب زادی بی بی حیثیت سے ہوئی تھی۔ انھیں ایک بیٹی اور تین بیٹے تھے۔ بیٹی کا نام فخر النسا تھا۔ بیٹے عبدالاحد، شیخ سعد اللہ اور صدرالدین تھے۔ صدرالدین کا انتقال ایک برس کی عمر میں اپنی ننھیال رانی پور میں ہوگیا۔ امیر حسن کی دس گانو کی زمیں داری تھی۔ ان میں کالو پور، خدائی باغ، بنّی، شاہ پور، جلال پور اور خواجہ سرائے شامل ہیں۔ یہ زمیں داری کالو پور سے خدائی باغ تک پھیلی ہوئی تھی۔ جب امیر حسن کا انتقال ہوا تو ان کے بڑے لڑکے عبد الاحد کی عمر صرف ۹ برس تھی۔ اس طرح کم عمری میں ہی عبدالاحد کو زمیں داری کا انتظام سنبھالنا پڑا۔ انھوں نے ایک گھوڑی خرید لی جس پر بیٹھ کر لگان وصول کرنے جاتے تھے۔ ان کے سگے ماموں خلافت حسین ان کے منشی تھے۔

میرے دادا عبدالاحد کی شادی اپنے ماموں حاجی صغیر احمد ولد محمد ابراہیم کی لڑکی عزیز النسا سے ہوئی۔ ان کے بطن سے چھے لڑکے تولّد ہوئے (1) محمد یحییٰ (2) محمد زکریا (3) کمال الدین احمد (4) جلال الدین احمد (5) بدرِ عالم اور (6) جمال اللہ۔

محمد یحییٰ اور محمد زکریا کی پیدایش خواجہ سرائے میں ہوئی اور ان دونوں کا بچپن میں وہیں انتقال ہوگیا۔ یکے بعد دیگرے دو بیٹوں کی وفات سے عزیز النسا کا دل خواجہ سرائے سے اچاٹ ہوگیا اور وہ اپنے میکے رانی پور چلی آئیں۔ دونوں میاں بیوی اور عزیز النسا کے میکے والوں کی رضامندی سے عبدالاحد نے سسرال میں ہی بسنے کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے رانی پور، بالا پور اور بنگرہ میں کچھ کاشت کی زمین خریدی اور کھیتی کرنے لگے۔ پہلے انھوں نے رانی پور سے ملحقہ بستی بالا پور میں گھر بنانا چاہا گھر کی بنیاد بھی کھودی گئی لیکن بعض وجوہات کی بنا پر انھیں یہ ارادہ ملتوی کرنا پڑا۔ ان کی سسرال کے بغل میں عبدالشکور نامی شخص کا مٹّی کا مخدوش مکان تھا۔ وہ مکان انھوں نے خرید لیا اور اس کی مرمّت کرا کر اس میں منتقل ہوگئے۔ رانی پور میں پیدا ہونے والے عبدالاحد کے لڑکوں میں بدرِ عالم کا انتقال کم عمری میں ہوگیا تھا۔

عبدالاحد اوسط قد کے گورے چٹّے شخص تھے۔ یہ میٹرک فیل تھے۔ اس زمانے میں جب ساتویں جماعت پاس کرنے کے بعد پرائمری اسکول میں معلّمی کی نوکری مل جاتی تھی میٹرک تک پہنچنا اہم بات تھی اور میٹرک فیل لوگ فخریہ اس کا اظہار کرتے تھے۔ زمیں داری کی وجہ سے مقدّمے بازی کے داﺅ پیچ سے عبدالاحد خوب واقف تھے۔ لوگ اپنے مقدمے میں ان سے مشورے بھی لیتے تھے اور کبھی کبھی سیوان کچہری میں لے جایا کرتے تھے۔ خود اپنی اولاد کو ان کا مشورہ یہ تھا کہ وہ مقدمے بازی سے دور رہے کیوں کہ عدالت میں ہر اینٹ پیسے طلب کرتی ہے۔ زمیں داری کی دیکھ بھال کے لیے کچھ دنوں تک وہ خواجہ سرائے آتے جاتے رہے لیکن آزادی کے بعد سرکار کے ذریعے جب زمیں داری کا خاتمہ ہوگیا تو ان کے ماموں خلافت حسین نے ان

کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ تم رانی پور کی جائداد دیکھو میں خواجہ سرائے کی جائداد کا خیال رکھوں گا۔

انھوں نے اس تجویز کو قبول کرلیا۔ عبدالاحد کھیتی باڑی کے کام میں بڑے ماہر تھے۔ وہ محنتی بھی بہت تھے۔ رانی پور کی وہ عورتیں جن سے ان کا مذاق کا رشتہ تھا انھیں کوڑی کہا کرتی تھیں۔ میں نے ہمیشہ انھیں دھوتی کرتے میں ملبوس دیکھا۔ روزانہ کنویں کے پانی سے غسل کیا کرتے لیکن صابن بہت کم استعمال کرتے تھے۔ چائے کے بڑے شوقین تھے۔ ہندوؤں سے برادرانہ تعلقات رکھتے تھے۔ بھوجو خلیفہ اور سہدیو چودھری سے ان کی خوب نبھتی تھی۔ سہدیو چودھری کا تو دن کا بیشتر وقت ان کے دروازے پر ہی گزرتا تھا۔ انھوں نے بالا پور کے رہنے والے چندر نام کے ایک غریب شخص کو بَیل خرید کردے دیا تھا تاکہ وہ ہل چلا کر اپنی روزی کمائے اور بدلے میں ان کا کھیت جوت دیا کرے۔ اسی طرح جمنا نام کے ایک نٹ کو بھینس خرید کردی تھی جس کے عوض وہ ہر سال خالص شہد پہنچا دیا کرتا تھا۔ بستی کے دلتوں اور مزدور پیشہ لوگوں کی وہ خوب مدد کرتے اور ان میں بہت مقبول بھی تھے۔ ان کی زندگی صاف ستھری اور صحت اچھی تھی۔ مارچ ۱۹۷۷ء میں دل کے دورے میں رانی پور میں انتقال ہوا اور وہیں سپرِدخاک کیے گئے۔

عبدالاحد کی اولاد میں کمال الدین احمد میرے والد تھے۔ یہ اچھی قد کاٹھی کے بڑے خوبصورت انسان تھے۔ مزاج میں قدرے تیزی تھی لیکن بڑے نرم دل انسان تھے۔ ہمارے کسی بھائی بہن میں ان کے سامنے گفتگو کا یارا نہیں تھا۔ سب کے دل پر ان کا رعب چھایا ہوا تھا۔ ان تک کوئی بات والدہ کی معرفت ہی پہنچائی جاتی تھی البتہ بڑھاپے میں اپنے بچوں سے وہ بے تکلّف ہوگئے تھے۔ ان کی تعلیم میٹرک تک تھی۔ خطِ تحریر بہت اچھا تھا۔ پڑھنے لکھنے میں کافی ذہین تھے اگر یہ بی۔اے کرلیتے تو یقیناً کوئی افسر ہوتے لیکن اقتصادی وجوہات کی بنا پر میٹرک سے آگے نہیں جاسکے۔ رانی پور کے ہی ان کے خالو محمد حامد ٹھیکے دار تھے۔ کچھ دنوں تک یہ ان کے ہمراہ رہے اور ٹھیکے داری میں پٹنہ اور مظفر پور میں ان کا ہاتھ بٹاتے رہے۔

ٹھیکے داری کے ضمن میں انھوں نے ایک انگریز کے بنگلے کی سفیدی کرائی۔ وہ ان کے سلیقے سے اتنا متاثر ہوا کہ انھیں گنڈک میں نوکری دلوادی لیکن کسی وجہ سے انھوں نے یہ نوکری چھوڑ دی اور بلاک میں وی ایل ڈبلو (V.L.W) کی نوکری کرلی۔ اونچی تعلیم نہیں ہونے کی وجہ سے ان کا پروموشن بھی نہیں ہوسکا۔ یہ سارن کے مختلف بلاکوں مثلاً رگھوناتھ پور بھگوان پور اور گرکھا میں رہنے کے بعد ایکما بلاک سے ریٹائر ہوئے۔ نوکری کی ابتدا سے ہی انھوں نے اپنے والد کے کہنے پر گھر کے سارے انتظامات کی ذمّے داری اپنے کاندھوں پر اٹھالی تھی اور تازندگی اسے خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ انھیں مچھلی کے شکار کا بہت شوق تھا۔ شطرنج کے ماہرین میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ جب بازی شروع ہوجاتی تو کھانا پینا بھول جاتے تھے۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انھوں نے اپنے بچوں کے لیے نیا مکان بنوایا۔

کمال الدین احمد کی شادی 18 برس کی عمر میں رانی پور کے ایک متمول گھرانے میں جناب شمس الدین ابن حافظ ابوالحسن کی صاحب زادی آسیہ خاتون سے ہوئی تھی۔ انھیں دس بچے تولد ہوئے جن کے نام یوں ہیں (1) نصیرہ بیگم عرف لاڈلی رلاڈو (2) محمد نصر اللہ صدیقی (3) ظفر اللہ (ظفر کمالی) (4) ناہید انجم (مرشدہ خاتون) (5) خورشیدہ بیگم (6) ضیاء اللہ (7) نعمت اللہ (8) نشاط افزا عرف شیریں (9) اختر جمال عرف بادل (10) جاوید اقبال عرف خسرو۔

ان میں خورشیدہ، ضیاء اللہ، نعمت اللہ اور شیریں کا انتقال لڑکپن میں ہو گیا۔ نعمت اللہ کو رات کو نمونیہ ہوا اور صبح ہوتے ہوتے روح پرواز کر گئی۔ بقیہ تین بچوں کو سوکھے کا مرض ہو گیا تھا۔ پیسے کی کمی کی وجہ سے مناسب علاج نہیں ہو سکا اور دبلے ہوتے ہوتے تینوں فوت کر گئے۔ شیریں کا جس روز انتقال ہوا اسی دن آئی۔ اے علمِ نفسیات کا میرا فائنل امتحان تھا۔ میں گھر میں میّت چھوڑ کر امتحان دینے گیا۔ ناہید انجم عرف مرشدہ جس کی شادی کالی باغ بتیا میں صدر العلیٰ سے ہوئی تھی۔ 29 اپریل 2021ء کو لاک ڈاؤن کے دوران کووڈ سے اس کی موت ہو گئی۔ بقیہ بھائی بہن بقیدِ حیات ہیں۔ کمال الدین احمد آنت کے سرطان میں مبتلا ہوئے۔ مرض کی تشخیص ہوتے ہی پٹنہ میں ان کا علاج شروع ہوا۔ آپریشن کے بعد ان کی حالت سنبھل نہیں سکی اور آخر کار 11 جولائی 2002ء کو رانی پور میں آدھی رات میں ان کا انتقال ہو گیا۔ دوسرے روز رانی پور کے قبرستان میں ہی ان کی تدفین ہوئی۔ نمازِ جنازہ راقم الحروف نے پڑھائی۔

میری والدہ آسیہ خاتون اپنے شوہر سے دو برس چھوٹی تھیں۔ شادی کے وقت ان کی عمر سولہ برس کی تھی اور میرے والد میٹرک کے طالبِ علم تھے۔ میں نے کبھی بھی انھیں اونچی آواز میں گفتگو کرتے ہوئے نہیں سنا۔ شوہر کی قلیل تنخواہ اور مٹّی کے مکان میں رہتے ہوئے انھوں نے بڑی پُر وقار زندگی گزاری۔ اپنے والدین، بھائی بہنوں، میکے اور سسرالی رشتے داروں اور اپنے پڑوسیوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں۔ اپنے شوہر سے کبھی ناراض نہیں ہوئیں۔ ابا کسی بات پر خفا ہو جاتے تو بڑے سلیقے سے انھیں منا لیتی تھیں۔ صبر و شکر کی خوگر اور روزہ نماز کی پابند تھیں۔ پوری زندگی تنگی و ترشی میں بسر ہوئی لیکن کبھی خدا کی ناشکری نہیں کی۔

چاند کے ہر مہینے کی گیارہ تاریخ کو بڑے پیر صاحب کا فاتحہ کراتی تھیں۔ کبھی قیمتی لباس نہیں پہنا۔ ہمیشہ اوسط درجے کی سوتی ساری پہنتی تھیں۔ ہر کام میں اعتدال پسندی کی راہ اپناتیں۔ رنگ برنگے پکوان بنانے میں ماہر تھیں۔ میری دادی خاصی تیز مزاج کی تھیں لیکن امّاں اپنی نرم طبیعت کی وجہ سے ہر سرد و گرم برداشت کر لیتیں۔ حسبِ مراتب کا لحاظ رکھنے اور بہت محبت کرنے والی خاتون تھیں۔ لوگوں کے جذبات کا انھیں بڑ خیال رہتا تھا۔ اپنی بساط کے مطابق بڑی خاموشی سے حاجت مندوں کی مدد کرتی تھیں۔

جس کو پیسے قرض دیتیں اس سے کبھی واپسی کا مطالبہ نہیں کرتی تھیں۔ پٹنہ کی تعلیم کے دوران کئی ایس

مواقع آئے جب مجھے اضافی پیسوں کی ضرورت پڑی۔ ان سے کچھ کہتے ہوئے مجھے بہت حیا آتی تھی لیکن دبی زبان سے جتنے پیسوں کی ضرورت بتائی انھوں نے ہمیشہ اس کی تکمیل کی۔ بچپن میں بڑے بھائی سے جب کبھی میرا جھگڑا ہوتا تو تنہائی میں دھیرے دھیرے سمجھاتیں کہ تم لوگ آپس میں لڑو گے تو لوگ بہت ہنسیں گے کہ یہ جھگڑالو ہیں۔ انھیں بہت دنوں سے گیس کا مرض تھا۔ دوائیں کھاتی رہتی تھیں۔ اس مرض کی وجہ سے بہت پریشان رہتیں۔ انھیں ہمیشہ ڈکاریں آتی رہتی تھیں۔ اسی کیفیت میں ایک دن طبیعت زیادہ خراب ہوئی۔

وہ 25 دسمبر 1996ء کی تاریخ تھی۔ تقریباً ایک بجے دن میں انھیں دل کا دورہ پڑا اور وہ درد سے نڈھال ہوگئیں۔ والد صاحب نے یہ کیفیت دیکھی تو انھیں اپنی بانہوں کا سہارا دیا۔ اس سے پہلے کہ انھیں طبّی امداد فراہم کی جاتی دیکھتے ہی دیکھتے شوہر کی بانہوں میں ہی انھوں نے دم توڑ دیا۔ دوسرے روز رانی پور کے قبرستان میں ان کی تدفین ہوئی۔ انھیں فوت ہوئے آج چھبّیس (26) برس گزر گئے لیکن ان کی موت کا غم میرے دل سے کبھی دور نہیں ہوسکا۔ سچ پوچھیے تو میری دنیا ہمیشہ کے لیے اندھیر ہوگئی۔ یہ خیال ہمیشہ میری روح کو کچوکے لگاتا رہتا ہے کہ اپنی زندگی میں ان کی کسی طرح کی کوئی خدمت نہیں کرسکا۔ ان کی نمازِ جنازہ میں نے کس دل سے اور کس حال میں پڑھائی تھی وہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔

میرا اصل نام ظفر اللہ اور قلمی نام ظفر کمالی ہے۔ سارے لوگ مجھے میرے قلمی نام سے ہی جانتے ہیں۔ میرا نام دادی نے رکھا تھا۔ 3 اگست 1959ء کو سبھی بھائی بہنوں کی طرح اپنے ددھیال میں پیدا ہوا۔ میں دو برس کا تھا کہ میری چھوٹی بہن ناہید انجم (مرشدہ) کی پیدائش ہوئی جس کی وجہ سے میں ماں کی گود سے دادی کی آغوش میں منتقل ہوگیا۔ میرے بچپن کی بیش تر یادیں اپنی دادی سے ہی منسوب ہیں۔

دادی بھی مجھے بہت چاہتی اور اپنی شفقت کا اظہار کرتی رہتی تھیں۔ انھوں نے ہی پانچ برس کی عمر میں میری بسم اللہ خوانی کرائی جس کے لیے انھوں نے اپنے ہاتھوں سے ریوڑیاں بنائی تھیں۔ قرآن پڑھنے میں میرے ہم سبق دادی کے سگے بھتیجے شہاب الدین تھے جو مجھ سے ڈھائی برس بڑے تھے۔ یہ آگے چل کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اردو کے پروفیسر بنے اور ادبی دنیا میں شہاب الدین ثاقب کے نام سے مشہور ہوئے۔ دادی نے ہی مجھے اردو کے ابتدائی اسباق پڑھائے۔ گھر کا دستور یہ تھا کہ ہم سبھی بھائی بہن مغرب کے بعد چراغ جلا کر اور ٹاٹ پر بیٹھ کر عشا کی اذان ہونے تک اپنا اپنا سبق پڑھتے۔ اس عمل میں ذرا بھی دیر ہوجاتی تو والدہ کی ڈانٹ پڑتی تھی۔ مجھے سب سے زیادہ نیند اسی وقت آتی تھی۔ میں پڑھتا کم نیند میں جھومتا زیادہ تھا۔ کبھی کبھی چپت بھی پڑجاتی تھی۔

پانچ برس کی عمر میں میرا اور دادی کے بھتیجے ناصر الدین کا داخلہ ایک ہی روز رانی پور کے پرائمری اردو مکتب میں کرایا گیا۔ یہاں داخلے سے پہلے میں اپنی بڑی بہن نصیرہ بیگم عرف لاڈلی کے ہمراہ کبھی کبھی ان کے

اسکول میں جا کر ان کے ساتھ بیٹھا کرتا تھا۔ دراصل رانی پور میں لڑکیوں کا بھی ایک پردہ نشین سرکاری اردو مکتب تھا جس میں بستی کی نہایت معزز ہستی حاجی بشیر احمد کی اہلیہ محترمہ رابعہ خاتون معلّمہ تھیں۔

یہ اسکول ان کے گھر کے ہی ایک بڑے دالان نما کمرے میں قائم تھا۔ بعد میں ان کا پورا خاندان پہلے مشرقی پاکستان اور پھر وہاں سے کراچی چلا گیا۔ رانی پور سے متصل بستی بالا پور کے رہنے والے مولوی محمد ہاشم انصاری ہمارے اسکول کے معلّم تھے۔ مولوی صاحب درس و تدریس کے تئیں بے حد سنجیدہ تھے اور بڑی محنت اور ہنر مندی کے ساتھ اکیلے ہی تین جماعت کے بچوں کو پڑھاتے تھے۔ بعد میں نورِ عین نام کے ایک دوسرے معلم آئے۔ ہاشم صاحب کی تدریسی سلیقہ مندی کا نقش آج بھی میرے دل پر قائم ہے۔

اس وقت اسکول میں وزیرِ محنت اور وزیرِ صفائی وغیرہ کے عہدے ہوا کرتے تھے جن کا انتخاب جمہوری طریقے سے کیا جاتا تھا۔ جمہوریت کا ابتدائی سبق میں نے مولوی ہاشم صاحب سے ہی سیکھا۔ اس اسکول سے تیسری جماعت کا امتحان پاس کرنے کے بعد اردو اَپر پرائمری اسکول کربلا بازار کی چوتھی جماعت میں داخلہ ہوا۔ یہاں کے اساتذہ مولوی ابوالحسن (صدر مدرس)، صغیر احمد، ریاض احمد، امیر الحق اور راجا لال جی تھے۔ سبھی اساتذہ بڑی محنت اور توجہ سے پڑھاتے۔ مولوی ابوالحسن صاحب بڑے مرکھنے تھے وہ گراں گوش بھی تھے۔ صحیح پڑھنے پر بھی غلط سن لیتے اور بے دھڑک بائیں ہاتھ سے چھڑی کا استعمال کرتے تھے۔ لڑکیوں کی شرارتوں سے بطورِ خاص چڑھتے اور چھڑی سے ان کی تواضع کرتے رہتے تھے۔

کربلا اسکول سے پانچویں جماعت تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد جی۔ ایم ہائی اسکول بڑہریا میں چھٹی جماعت میں داخلہ ہوا۔ یہ اپنے علاقے کا مشہور اسکول تھا جس کے ہیڈ ماسٹر خلیل احمد صاحب تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں خلیل صاحب جیسا رعب داب والا استاد نہیں دیکھا۔ اگر کبھی وہ اپنے چیمبر سے باہر نکل آتے تو اسکول کے احاطے میں بھگدڑ سی مچ جاتی اور منٹوں میں ہر طرف سناٹا چھا جاتا تھا۔ اسکول کے تقریباً سبھی اساتذہ اپنے مضمون میں ماہر تھے۔ عبدالستار صاحب سکنڈ ہیڈ ماسٹر تھے یہ نہایت شریف النفس انسان تھے۔

شفیع بابو تاریخ پڑھاتے تو سماں بندھ جاتا۔ ان کا معیار بہت بلند تھا۔ مغلیہ عہد کے ماہر تھے۔ یہ انگریزی بھی اچھی پڑھاتے تھے۔ انگریزی کے دوسرے استاد بھرت پورہ کے حامد بابو تھے۔ یہ طلبہ میں بہت مقبول تھے۔ نہایت مشفق بھی تھے اور انتہائی آسان زبان میں سبق پڑھاتے تھے۔ میٹرک کے زمانے میں تین مہینے تک میں نے ان سے ٹیوشن پڑھا۔ فیس بیس روپے ماہانہ تھی یہی میری زندگی کا پہلا اور آخری ٹیوشن تھا۔ اودھیش بابو، چندریکا بابو، ابراہیم صاحب، جمیل بابو، فضل الرحمان صاحب، کیلاش بابو، وشواس بابو اور اوجھا جی اپنے سبجکٹ بہت خوش اسلوبی سے پڑھاتے۔ دو تین اساتذہ فرقہ وارانہ ذہنیت کے بھی تھے لیکن خلیل صاحب کے سامنے کسی کی چلتی نہیں تھی۔ میرے پسندیدہ اساتذہ میں حامد بابو اور اردو فارسی کے استاد مولوی اسداللہ

صاحب تھے۔ اسد اللہ صاحب نہایت ذی علم انسان تھے۔ اردو قواعد اور فارسی گردان انھوں نے سب کو ازبر کرا دی تھی۔ انھوں نے کلاس میں جو فارسی پڑھائی وہ آگے چل کر میرے بہت کام آئی۔ اب اسکولوں میں ایسے استاد عنقا ہیں۔

سنہ 1977ء میں میٹرک پاس کرنے کے بعد زیڈ۔ اے۔ اسلامیہ کالج سیوان میں آئی۔ اے میں داخلہ لیا۔ انگریزی، اردو، ہندی، تاریخ اور نفسیات میرے مضامین تھے۔ اس کالج میں احمد جمال پاشا اردو کے استاد تھے۔ ان سے رابطے میں آنے کے بعد میری زندگی کا رخ ہی بدل گیا۔ انھوں نے بڑے سلیقے سے میری ادبی تربیت کی۔ اپنی دادی کے بعد میں پاشا صاحب کو ہی اپنا سب سے بڑا محسن سمجھتا ہوں۔ اسلامیہ کالج میں نشاط افزا صاحبہ بھی اردو کی اچھی معلّمہ تھیں۔ وہ طلبہ میں کافی مقبول تھیں۔ تاریخ کے استاد متین صاحب کا جواب ہی نہیں تھا۔ کالج کے پرنسپل کیپٹن بضاعت امام صاحب بڑے مخلص انسان تھے۔ ہمیشہ مسکراتے رہتے اور اساتذہ کے تئیں ہمدردی کا جذبہ رکھتے تھے۔ ہر چھوٹا بڑا دل سے ان کا احترام کرتا۔ بہار یونیورسٹی مظفر پور کا سیشن کافی لیٹ چل رہا تھا۔ آئی۔ اے جو دو سال کا کورس تھا اس کا ریزلٹ آنے میں تقریباً چار برس لگ گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ بہار یونیورسٹی سے گریجویشن کرنا مناسب نہیں اس لیے پٹنہ جانے کا خیال دل میں آیا۔ یہ بات والدہ صاحبہ کی معرفت والد صاحب تک پہنچائی تو انھوں نے صاف انکار کر دیا کہ میری اوقات ہی نہیں ہے کہ پٹنہ بھیج کر تعلیم دلوا سکوں۔ ان کا یہ کہنا بالکل حق بجانب تھا لیکن میں نے والدہ صاحبہ سے صاف کہہ دیا کہ پڑھنے کے لیے خواہ مجھے مزدوری ہی کیوں نہ کرنی پڑے لیکن پٹنہ ضرور جاؤں گا۔ میرے شوق اور ضد کو دیکھتے ہوئے والدہ نے کہا کہ تم جاؤ مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا تمھاری مدد کروں گی۔ میں چوکی مخدوم (سیوان) کے رہنے والے اپنے ہم جماعت سید خورشید انور کے ہمراہ پٹنہ چلا گیا۔

ہم دونوں کا داخلہ اورینٹل کالج پٹنہ سیٹی میں ہوا۔ اس کالج کا الحاق مگدھ یونیورسٹی بودھ گیا سے تھا۔ چند مہینے باقر گنج کی مسکن کوٹھی اور سبزی باغ میں رہنے کے بعد ہم لوگ پٹنہ سیٹی کے محلّے دولی گھاٹ چلے آئے اور قاضی اختر حسین صاحب کے بنگلے میں کرائے پر رہنے لگے۔ کچھ دنوں بعد ماہ پور سیوان کے رہنے والے انور مراد بھی ہم لوگوں کے قافلے میں شامل ہو گئے۔ قاضی اختر کا بنگلہ گنگا ندی کے کنارے تھا۔ یہ بڑی پر فضا جگہ تھی۔ وہاں جھاڑ جھنکاڑ بہت تھا۔ میں نے بڑی محنت سے اسے صاف کیا اور مختلف طرح کے پھول لگائے۔ جب گیندے کے سینکڑوں پودوں میں ایک ساتھ پھول آتے تو وہ سماں قابلِ دید ہوتا تھا۔ کمرے کے سامنے دیوالی نام کا ایک کاشت کار مولی، پھول گوبھی اور بیگن کی کھیتی کرتا اور بنگلے کے لڑکوں کو عموماً مفت میں سبزیاں دے دیا کرتا تھا۔ اورینٹل کالج میں اس وقت کے پرنسپل فیاض حیدر صاحب تھے۔

اردو کے اساتذہ میں احسان اللہ صاحب، ڈاکٹر شکیب ایاز اور ڈاکٹر مشتاق تھے۔ ہم لوگ شکیب ایاز

صاحب سے زیادہ قریب تھے۔ وہ اچھا پڑھاتے بھی تھے۔ ان کے رہن سہن اور گفتگو میں بڑا وقار تھا۔ کبھی کبھی اپنے گھر بھی بلا لیتے تھے۔ چائے ناشتے کے بغیر کبھی نہیں آنے دیا۔ میں نثر میں کچھ لکھتا تو بہت حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ بی۔ اے میں داخلہ لینے کے بعد ایک سال کے اندر ہی فائنل امتحان ہو گیا۔ سنٹر گیا شہر میں تھا۔ دورانِ امتحان تقریباً ایک مہینے تک میں اپنے چچازاد ماموں رحیم الدین صدیقی کے گھر رہا جو کریم گنج میں ایک کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ امتحان میں اتنی سختی میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

چوری تو دور رہی کوئی بھولے سے بھی پیچھے مڑ کر دیکھ لیتا تو اسے باہر کا راستہ دکھا دیا جاتا تھا۔ جب ریزلٹ آیا تو دو نمبر سے میرا فرسٹ ڈویژن چھوٹ گیا جس کا مجھے بڑا صدمہ ہوا۔ تاریخِ اسلام کا پرچہ وہاب اشرفی صاحب کے پاس گیا تھا انھوں نے مجھے چھپن نمبر دیے تھے۔ میرا خیال ہے کہ کاپیاں انھوں نے خود نہیں دیکھی تھیں بلکہ کسی اور کے حوالے کر دی تھیں۔ مجھے معلوم ہے وہ اکثر ایسا کرتے تھے۔ میرا وہ پرچہ تمام پرچوں میں اچھا ہوا تھا۔ پاشا صاحب بھی میرے ریزلٹ سے مایوس ہوئے۔

ایم۔ اے میں داخلہ ذرا مشکل تھا لیکن پاشا صاحب کے کہنے پر پروفیسر محمد علی صاحب نے پٹنہ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو پروفیسر ممتاز صاحب سے میری پیروی کی اور آخر کار داخلہ ہو گیا۔ اس وقت صدرِ شعبہ کے علاوہ پروفیسر کلیم عاجز، پروفیسر اسلم آزاد اور ڈاکٹر حمیرہ خاتون شعبے کے مستقل استاد تھے۔

جناب اسرائیل رضا جو اس وقت ریسرچ اسکالر تھے کبھی کبھی عروض کا کلاس لیا کرتے تھے۔ ان اساتذہ کے علاوہ بی۔ این کالج سے ڈاکٹر اعجاز علی ارشد آتے۔ وہ ہمیں 'سب رس' پڑھایا کرتے تھے۔ اقبالیات کا پرچہ پڑھنے کے لیے ہم لوگ پروفیسر یوسف خورشیدی صاحب کے پاس پٹنہ کالج جاتے۔ فارسی کا پرچہ شعبۂ فارسی کے استاد پروفیسر حبیب المرسلین شیدا پڑھایا کرتے تھے۔ ایم۔ اے میں ڈیزرٹیشن کا مقالہ میں نے کلیم عاجز صاحب کی نگرانی میں لکھا۔ مقالہ جمع کرنے کا آخری وقت آیا تو کلیم عاجز کو دل کا دورہ پڑ گیا اور وہ اسپتال میں بھرتی ہو گئے۔ اسی حالت میں بڑی مشکل سے انھوں نے دستخط کیے۔ 1984ء میں ایم۔ اے کرنے کے دوسرے سال میں نے پٹنہ یونیورسٹی سے پرائیوٹ امیدوار کے طور پر فارسی میں ایم۔ اے کیا اور اردو فارسی دونوں میں اول درجے میں کامیاب ہوا۔ اس کے بعد اسی یونیورسٹی سے بی۔ ایڈ کیا۔

پی ایچ ڈی میں داخلہ بڑی ٹیڑھی کھیر ثابت ہوا۔ میرا موضوع تھا ''احمد جمال پاشا، عہد اور فن'' اور نگراں تھے ڈاکٹر اعجاز علی ارشد۔ اتفاق سے اس وقت ممتاز صاحب نہ پاشا صاحب سے خوش تھے اور نہ اعجاز صاحب سے۔ مجھ پر دباو ڈالا گیا کہ میں نگراں اور موضوع بدل دوں۔ میرے انکار پر یہ پیش کش ہوئی کہ دونوں میں سے کوئی ایک ہی تبدیل کر دوں۔ میں نے پھر انکار کر دیا۔ اس کی وجہ سے تقریباً دو برسوں تک میرا رجسٹریشن نہیں ہونے دیا گیا۔ اس تاخیر کا اپنی ملازمت میں مجھے بہت نقصان اٹھانا پڑا۔

بڑی مشکلوں سے اپریل 1990ء میں مجھے ڈاکٹریٹ کی ڈگری ملی۔ میرے تحقیقی مقالے کے ممتحنین پروفیسر عبدالرب عرفان (ناگپور) اور پروفیسر قمر رئیس تھے۔ جب میں ریسرچ کررہا تھا اسی دوران بی۔این کالج پٹنہ میں اردو ایم۔اے کی پڑھائی شروع ہوئی۔ اس کالج میں ایم اے کا پہلا بیچ تھا۔ اپنے استاد اور نگراں ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کے حکم پر میں نے ایم اے کے ساتھ ساتھ بی۔اے آنرز کی جماعت کو بھی پڑھایا۔ طلبہ اچھے تھے۔ ایم۔اے کے طلبہ میں خالد سیف اللہ بھی تھے جو ان دنوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں استاد ہیں۔

22 اپریل 1990ء کو میرا تقرر زیڈ۔اے اسلامیہ کالج سیوان کے شعبۂ فارسی میں ہوگیا۔ صدر شعبۂ فارسی جناب محمود الحسن انصاری تھے۔ نوکری سے قبل 15 مئی 1989ء کو میری شادی اسلامیہ محلّہ گوپال گنج کے رہنے والے جناب منظور علی ابن اسماعیل علی کی بیٹی رضیہ سلطانہ سے ہوئی۔ خوشدامن کا نام نور صبا عرف منّی ہے جو میری سگی خالہ ہیں۔ قدرت نے مجھے تین بیٹوں سے نوازا جن کے نام احمد نوید، احمد نفیس اور احمد علی عرف نقیب ہیں۔ تینوں اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ بڑے بیٹے کی شادی ہوچکی ہے۔ بہو کا نام صائمہ جبیں ہے جو رانی پور کے ہی رہنے والے میرے پڑوسی جناب عبدالباری ابن جمیل احمد مرحوم کی دختر ہیں۔ فضلِ خدا سے اب میں دادا بھی بن چکا ہوں۔ دسمبر 1996ء سے تنخواہ ملنی شروع ہوئی۔ اس درمیان چند برسوں تک محلّہ نوپلور (سیوان) کے 'پیسیفک پبلک اسکول' میں پڑھایا۔ یہ پرائیوٹ اسکول میری بستی رانی پور کے جناب طارق حسنین نے قائم کیا تھا۔

اپنے گاؤں میں بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھاتا رہا۔ 1990ء سے 1996ء تک کا زمانہ میری زندگی کا سخت آزمائشی دور تھا۔ 1990ء میں میری شادی ہوئی اور میرا بڑا بیٹا احمد نوید تولّد ہوچکا تھا۔ شادی کے بعد آمدنی کا مستقل اور معقول ذریعہ نہیں ہونے کی وجہ سے بہت پریشانیوں کا سامنا کیا اور ذہنی اذیتوں کے دور سے گزرا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اہلیہ صبر و شکر کی خوگر تھیں لہٰذا ان کی جانب سے مجھے ہمیشہ اطمینان رہا۔ اسلامیہ کالج جوائن کرتے وقت میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ یہ اپنے شہر کا کالج ہے اور گھر سے قریب بھی ہے لہٰذا سکون سے بسر ہوجائے گی اس لیے سرکاری کالج میں بحالی کی کبھی کوشش نہیں کی۔

اسلامیہ کالج میں نوکری کرنے کا فیصلہ میری زندگی کا سب سے غلط فیصلہ ثابت ہوا۔ تقریباً پوری ملازمت میں مجھے ذہنی سکون نصیب نہیں ہوسکا۔ اس اجمال کی تفصیل کسی اور موقعے پر بیان کی جائے گی۔ فضلِ خدا سے ڈیڑھ برسوں بعد 31 اگست 2024ء کو ریٹائر ہوجاؤں گا اور قیدِ غلامی سے نجات ملے گی۔

جب میں آٹھویں جماعت کا طالبِ علم تھا تو بستی کے بچے رمضان کے مہینے میں قافلہ نکالا کرتے تھے۔ ان میں اور لوگوں کے علاوہ میرے بڑے بھائی محمد نصر اللہ صدیقی، شہاب چچا، اسد اللہ، عظیم الحق، صفدر رضا

وغیرہ شامل تھے۔ لوگوں کو اکٹھا کرنے کی ذمّے داری میری تھی۔ عموماً ڈھائی بجے رات میں قافلہ نکلتا تھا۔ قافلے میں کسی باہری شاعر کا کلام نہیں پڑھا جاتا تھا۔ بیش تر نغمے میرے بڑے بھائی ہی لکھا کرتے جن کا تخلص 'امید' تھا۔ سرخیلِ قافلہ وہی تھے۔ ہم لوگوں کی حیثیت ہمنوا کی تھی۔ کبھی کبھی شہاب چچا بھی کسی فلمی گانے کی تضمین لکھ دیا کرتے تھے۔ ان کی تضمینیں بہت اچھی ہوتی تھیں۔ بعد میں چند ترانے میں نے بھی لکھے۔ دراصل اسی سے میری شاعری کی بھی ابتدا ہوتی ہے۔

میرے علاقے میں اعلیٰ تعلیم کا رواج چند گھرانوں تک محدود تھا۔ عموماً لوگ میٹرک تک تعلیم حاصل کرتے تھے۔ کچھ لوگ گریجویشن بھی کر لیتے تھے۔ مسلمانوں میں کالج کا منہ بہت کم لوگ ہی دیکھ پاتے تھے۔ اردو کا چلن عام تھا۔ تاریخ، جغرافیہ، سائنس اور علم الحساب کی کتابیں بھی اردو میں ملتی تھیں۔ میں نے بھی میٹرک تک کی تعلیم اردو میں ہی حاصل کی اور میٹرک کے امتحان میں ہندی اور انگریزی کو چھوڑ کر سبھی پرچوں کے امتحان کی کاپیاں اردو میں ہی لکھیں۔ متوسط مسلم گھرانوں میں قصّے کہانیوں اور دینی مسائل کی کتابیں ذوق وشوق سے پڑھی جاتی تھیں۔ میرے گھر میں منجھلی چچی کو چھوڑ کر سب کو مطالعے کا شوق تھا۔ دادا، دادی، والد، والدہ، چچا، بڑے بھائی سبھی مطالعے کے شوقین تھے۔ الف لیلیٰ، باغ و بہار، فسانۂ عجائب، طلسمِ ہوش ربا، معجزۂ آلِ نبی، قصہ جمجمہ بادشاہ، آرایشِ محفل، میلادنامے، کیمیاے سعادت اور سیرت پر مختلف کتابیں گھر میں موجود تھیں۔ دادی 'دیوانِ ذوقؔ' کی عاشق تھیں۔

مطبع نول کشور لکھنؤ سے 1923ء میں چھپا ہوا نسخہ ان کے سرہانے رکھا رہتا تھا جس کی غزلیں وہ پڑھتی رہتی تھیں۔ 'چمن بے نظیر' نام کی کتاب بھی ان کے مطالعے میں رہتی تھی جو کلاسیکی اردو شاعری کا انتخاب تھی۔ والد صاحب کے مطالعے میں جو ادبی کتابیں میں نے دیکھیں ان میں سجاد ظہیر کی 'لندن کی ایک رات'، فراقؔ کی 'روپ' اور خلیل جبران کی تصنیفات شامل تھیں۔ وہ زیادہ تر 'ہند پاکٹ بکس' سے چھپی کتابیں ہی خریدتے تھے جن کی قیمت ایک روپے ہوتی تھی۔ مختلف ڈائجسٹ اور ابن صفی کے ناول بھی ہر مہینے پابندی سے آتے تھے۔ 'مسدس حالی' سب کی پسندیدہ کتاب تھی۔ 'اندر سبھا امانت'، 'حق السماع'، 'فنِ تجوید' اور نصیر حسین خیال کی کتابیں بھی مجھے یاد ہیں۔ دادی کے بھائی ڈاکٹر محمد ہاشم کی انگریزی بہت اچھی تھی۔ وہ انگریزی میں ہی روسی کلاسیکی ناول پڑھا کرتے تھے۔ میں دادی کے پاس ہی سوتا تھا۔ وہ پابندی سے تہجّد پڑھا کرتی تھیں۔ وردو وظائف سے فارغ ہونے کے بعد متصوفانہ ٹھمریاں اور ذوقؔ کی غزلیں گنگناتیں۔ 'کسی بیکس کو اے بیداد گر مارا تو کیا مارا' ان کی پسندیدہ غزل تھی۔

بستی کے دیگر باذوق حضرات میرے گھر سے کتابیں مانگ کر لے جاتے تھے۔ اگر کسی کتاب کا کوئی ورق پھٹ جاتا تو دادی بہت ناراض ہوتی تھیں۔ 'الف لیلیٰ' اور 'طلسم ہوش ربا' کی ڈیمانڈ سب سے زیادہ

تھی۔ دادا کو فارسی کے بہت اشعار یاد تھے لیکن اس کا اظہار بہت کم ہوتا تھا۔ دادی کے چچا محمد فاروق اور دادا جب کبھی جاڑے کی دھوپ میں ساتھ بیٹھتے تو ان کی زبان سے فارسی کے اشعار سننے میں آتے تھے۔ ان میں سعدی، حافظ، فیضی، عرفی اور صائب تبریزی کے نام میرے ذہن میں محفوظ ہیں۔ میٹرک کے امتحان سے کچھ پہلے ایک رات دادا نے مجھ سے کہا کہ کوئی فارسی رباعی سناؤ۔ میں نے یہ رباعی پڑھ دی:

کم گو و بجز مصلحتے خویش مگو
چیزے کہ نہ پرسند تو خود پیش مگو
گوشِ ترا دو دادند و زبانِ تو یکی
یعنی کہ دو بشنو و یکی از بیش مگو

انھوں نے ترجمہ پوچھا۔ میں نے ترجمہ بتایا تو ان کے چہرے پر خوشی کے آثار نظر آئے پھر وہ خاموش ہوگئے۔ دوبارہ انھوں نے اس طرح کا سوال کبھی نہیں کیا۔ امتحان کے زمانے میں صبح کی اذان سے قبل جب کبھی میں فارسی نظموں کے خلاصے چلا چلا کر رٹتا تو دادی بغور سنتیں۔ درمیان میں کبھی مطالب پر تبصرہ بھی کرتیں اور خوش ہوتیں۔ نومبر دسمبر کے زمانے میں سالانہ امتحان کے وقت بستی کے سبھی طالبِ علم علی الصباح سبق رٹا کرتے تھے۔ ہم لوگ چھپ چھپ کر ایک دوسرے کا سبق سنتے کہ کون کیا یاد کر رہا ہے۔ سب ایک دوسرے سے اپنے یاد کیے ہوئے اسباق چھپاتے تھے۔

میرے گھر میں دادی کے کمرے کے ایک بکس میں ابنِ صفی کے سیکڑوں ناول رکھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے چھپا کر کچھ ہی دنوں میں سارے ناول پڑھ ڈالے۔ اس سے میری اردو کو کافی فائدہ پہنچا۔ صادق سردھنوی اور عبدالحلیم شرر کے تاریخی ناولوں نے بھی مجھے بہت متاثر کیا۔ عورتیں اے۔ آر خاتون، فیاض علی اور راشدالخیری کے ناول دل چسپی سے پڑھا کرتی تھیں۔ راشدالخیری کے ناول صبحِ زندگی، شامِ زندگی اور شبِ زندگی پڑھ کر بہت رونا آتا تھا۔ مجھے عبدالحلیم شرر کا ناول 'فردوسِ بریں' بہت پسند آیا۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں میں 'توبۃ النصوح' نے کافی متاثر کیا۔

مڈل اسکول کے زمانے میں میرے نانا جن کا نام شمس الدین تھا، پرولیا (مغربی بنگال) سے رانی پور آتے تو بچوں کے ڈھیر سارے رسائل لاتے۔ ان میں ٹافی، غنچہ، کلیاں اور 'نور' کے پرچے شامل ہوتے۔ 'نور' کا کالم 'ریڈیو نورستان' پڑھ کر ہم لوگ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوجاتے۔ میں نویں جماعت میں آج کل، کتاب نما، کھلونا اور خاتونِ مشرق کا سالانہ خریدار بن چکا تھا۔ ہائی اسکول کے زمانے میں ہی میں نے پہلی مرتبہ ادبی تنقید کا نام سنا۔ 'کتاب نما' میں آلِ احمد سرور کی کتاب 'تنقید کیا ہے' کا اشتہار نظر سے گزرا تو جھٹ ایک پوسٹ کارڈ مکتبہ جامعہ کو لکھ بھیجا کہ یہ کتاب مجھے بھیج دیں۔ کتاب آ گئی تو خوشی کا ٹھکانا نہیں رہا۔ وہ کتاب آج بھی

میری لائبریری میں موجود ہے جس پر شہاب چچا نے میری جانب سے یہ یادداشت لکھی ہے: 'ایں کتاب را بتاریخ 6 دسمبر 1975ء بمطابق 2 ذی الحجہ 1395ھ از مکتبہ جامعہ دہلی بذریعہ ڈاک دستیاب کردم'۔

سنہ 1975ء میں میں دسویں جماعت کا طالبِ علم تھا۔ اسی وقت میں نے پریم چند کا افسانوی مجموعہ 'آخری تحفہ' بھی منگوایا تھا۔ کتابیں خریدنے کے لیے پیسوں کا انتظام بڑی مشکل سے ہوتا تھا۔ دسویں جماعت سے ہی میں نے اپنی بستی کے کچھ بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ ابتدا میں دس روپے فی طالبِ علم ٹیوشن فیس ملا کرتی تھی جو میرے لیے نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں تھی۔ انھی پیسوں کی مدد سے میں نے بیسیوں کتابیں خریدیں اور اپنے ذوق کی تکمیل کا سامان فراہم کیا۔ نویں جماعت میں ہی میں نے انجم مانپوری اور ان کے مضمون 'میر کلّو کی گواہی' کا نام سنا۔ شہاب چچا کے گھر 'ندیم' کے کچھ شمارے تھے ان میں ہم لوگوں نے انجم مانپوری کی تخلیقات پڑھیں اور ان کا خوب لطف اٹھایا۔ میری دادی کی چھوٹی بہن اکبری بیگم عرف گل رو کے شوہر محمد حامد انجم مانپوری کی تجارت میں کچھ دنوں تک ساجھے دار رہ چکے تھے۔ وہ مانپوری کے دل چسپ قصّے سناتے رہتے تھے۔

میٹرک کا امتحان دینے کے بعد میں نے دادی سے مانگ کر 'چمن بے نظیر' کا بغور مطالعہ کیا اور اس کی غزلوں سے متاثر ہو کر غزلیں کہنے کی مشق کرنے لگا۔ دادی کے سب سے چھوٹے بھتیجے صباح الدین ہاشمی کو جو مجھ سے عمر میں کئی برس چھوٹے تھے، اپنی غزلیں سناتا۔ وہ اِن دنوں شعبۂ لسانیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ وہ میرے ہر کچے پکّے شعر پر واہ واہ کرتے تو میری خوشی کا ٹھکانا نہیں رہتا تھا۔ میں تقریباً روزانہ ہی ایک غزل کہتا اور اپنے کو بڑا شاعر سمجھنے لگا تھا۔ قافیہ، ردیف اور حرفِ روی کا نام تو سنا تھا اور کسی حد تک سمجھتا بھی تھا لیکن وزن و بحر کی کوئی خاص تمیز نہیں تھی۔ ذہن چونکہ موزوں تھا لہٰذا میں نے کبھی ناموزوں اشعار نہیں کہے۔

انٹرمیڈیٹ میں پہنچا تو شہاب چچا علی گڑھ جا چکے تھے جہاں ان کا داخلہ بی۔ اے میں ہو گیا تھا۔ میں نے ایک غزل بیکس سیوانی کو دیکھنے کے لیے دی تو انھوں نے اسے مجنوں قطبی کے حوالے کر دیا۔ مجنوں قطبی نے میری دو غزلوں پر اصلاح دی۔ اس کے بعد میں نے اپنی چیزیں بذریعۂ ڈاک شہاب چچا کو علی گڑھ بھیجنا شروع کیں۔ انھوں نے میری بیسیوں غزلوں کی اصلاح کی۔

ان میں خاص طور پر وہ غزلیں تھیں جو سیوان کی ادبی بزم 'بزمِ انور' کے مصرعۂ طرح پر لکھی گئی تھیں۔ یہ محفل مہینے میں ایک مرتبہ عموماً جوہر سیوانی کے دولت کدے پر بڑے اہتمام سے ہوتی تھی۔ مجھے بڑی بے صبری سے اس کا انتظار رہتا اور بڑے چاؤ سے وہاں غزلیں سناتا تھا۔ صدارت جناب حمید تمنائی کی ہوا کرتی تھی۔ 'بزمِ انور' میں پابندی سے شرکت اور بزرگ شعرا کی حوصلہ افزائی نے مجھ میں شعر کہنے کی لگن پیدا کر دی۔

زیڈاے اسلامیہ کالج سیوان میں داخلے کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے جناب احمد جمال پاشا جیسے استاد کی شاگردی نصیب ہوئی جسے میں اپنا سرمایۂ افتخار سمجھتا ہوں۔ یہ شاگردی میرے لیے بڑی بابرکت ثابت ہوئی۔ پاشا صاحب کی بدولت ہی مجھ میں ادب کا اعلا ذوق پیدا ہوا اور انھیں کے کہنے سے میں نے ظرافت کے میدان میں قدم رکھا۔ یہاں ذرا ٹھہر کر میں اپنی ظرافت نگاری کی ابتدا کی داستان بھی سنا دینا چاہتا ہوں جو کم دل چسپ نہیں ہے۔ انٹرمیڈیٹ میں لازمی اردو کا پرچہ جناب احمد جمال پاشا پڑھاتے تھے۔

نصابی کتاب میں جس کا نام 'ادبستان' تھا، انجم مانپوری کا مضمون 'کرائے کی ٹم ٹم' بھی تھا۔ ایک روز پاشا صاحب سبھی طلبہ سے یکے بعد دیگرے اس کے اقتباسات پڑھوا رہے تھے۔ جب میرا نمبر آیا تو سبق وہاں پہنچ چکا تھا جہاں یکّے کا مریل گھوڑا قمچیاں کھانے کے بعد بجائے آگے بڑھنے کے پیچھے ہٹنے لگا۔ یہ منظر دیکھ کر ایک مسافر نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر گھوڑا الٹا چلنے کا عادی ہے تو اس کا رخ اسٹیشن کی جانب سے پھیر کر پورب کی طرف کر دیا جائے تاکہ یہ پیچھے کی طرف ہٹتے ہٹتے اسٹیشن پہنچ جائے۔ اسے پڑھتے وقت مجھے ایسی زبردست ہنسی آئی کہ آگے پڑھنا مشکل ہو گیا۔ ایک جملہ پڑھتا اور ہنسنا شروع کر دیتا۔ مضمون ہی اتنا دل چسپ تھا کہ ہنستے ہنستے میں بے حال ہو گیا۔

پاشا صاحب مستقل مسکرانے کے ساتھ ساتھ مجھے غور سے دیکھ بھی رہے تھے۔ کلاس کا وقفہ ختم ہونے پر انھوں نے مجھ سے کہا کہ آج آپ میرے ساتھ میرے گھر چلیے گا۔ دو بجے دن میں ان کے ساتھ رکشے سے پہلی مرتبہ ان کے دولت کدے پر پہنچا۔ پہلے تو انھوں نے میرا پورا جغرافیہ کھنگال ڈالا اور چائے ناشتے کے بعد کنھیا لال کپور کی کتاب 'بال و پر' اور اپنی تصنیف 'اندیشۂ شہر' دی اور فرمائش کی انھیں غور سے پڑھ کر اسی طرح کا کوئی مضمون لکھ کر لائیے گا۔ 'بال و پر' میں ایک مضمون 'کاٹھ کا الّو' تھا۔ وہ مجھے پسند آیا اور اسی طرز پر میں نے اپنا پہلا مزاحیہ مضمون 'اور میں وزیر اعلیٰ بن گیا' کے عنوان سے لکھا۔

پاشا صاحب نے اپنے گھر پر اسے پڑھا تو بے حد خوش ہوئے اور اپنی اہلیہ سرور جمال کو زور سے پکارا اور کہنے لگے کہ میں نہیں کہتا تھا کہ یہ لڑکا لکھ سکتا ہے۔ اسے انھوں نے 'مگدھ پنچ' پٹنہ میں بھیج کر چھپوا بھی دیا۔ 12 اپریل 1980ء کا یہ شمارہ جب مجھے اعجاز علی ارشد صاحب کے اس نوٹ کے ساتھ موصول ہوا کہ 'مزید قلمی تعاون کی درخواست کے ساتھ پرچہ ارسالِ خدمت ہے' تو مجھ پر شادیِ مرگ جیسی کیفیت طاری ہو گئی۔ اس داستان کی مزید تفصیلات سے احتراز کرتے ہوئے صرف یہ عرض کرنا ہے کہ پاشا صاحب نے ہی مجھ میں چھپے ظرافت نگار کو پہچانا۔ اسی وقت میں نے کچھ اور مضامین لکھے اور مزاحیہ شاعری بھی کی۔

اس طرح رفتہ رفتہ میری ظرافت ایسی پھلی پھولی کہ اب تک میرے چار ظریفانہ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کے نام ہیں: ظرافت نامہ، ڈنک، نمک دان اور ضربِ سخن۔ اللہ کی مہربانی ہے کہ ابھی تخلیقی

سوتے خشک نہیں ہوئے ہیں۔

پاشا صاحب نے اپنے یہاں 'حلقۂ اربابِ ادب' کے نام سے طلبہ کی ایک تنظیم قائم کی تھی جس کا مجھے جنرل سکریٹری بنایا گیا تھا۔ صدر وہ خود تھے۔ اس کا ماہانہ جلسہ پاشا صاحب کی قیام گاہ 'کوٹھی نشاط افزا' پر ہوا کرتا۔ اس میں شرکت کے لیے طالب علموں کے ذریعے دعوت نامے بھیجے جاتے تھے۔ جلسے میں سب سے پہلے طلبہ اپنی تخلیقات پیش کرتے۔ ان میں سید خورشید انور، انور مراد، شفیع التنویر حیدر عرف جاوید، معیز بہمن بروی اور نور سلطانی وغیرہ پیش پیش رہتے تھے۔ اس بزم میں شاعری کے ساتھ افسانے بھی سنائے جاتے جن پر باقاعدہ بحث ہوتی تھی اور تخلیقات کی خوبیوں خامیوں کو آشکار کیا جاتا تھا۔

آخر میں پاشا صاحب اپنی رائے پیش کیا کرتے تھے۔ اس وقت کے ڈی۔ او کمال صبا صاحب، پربھو نارائن ودیارتھی اور سرور جمال کے علاوہ شہر کے شعرا کی شرکت ہوتی اور شاعری کا دور بھی چلتا تھا۔ ہر جلسے میں بزم کے سکریٹری کو گذشتہ جلسے کی کارروائی تحریری صورت میں پیش کرنی ہوتی تھی جو ظاہر ہے میری ذمّے داری تھی۔ 'حلقۂ اربابِ ادب' کے جلسوں کی بدولت بھی ہم سب کی ذہنی آبیاری ہوئی اور شعر و ادب سے رابطہ مستحکم ہوا۔ اسی زمانے میں میری تخلیقات گاہے بگاہے مختلف اخبارات و رسائل میں چھپنا شروع ہوئیں۔

میری دادی محترمہ عزیز النسا مرحومہ نے مجھ میں اردو زبان اور ادب کی محبت پیدا کی۔ اپنے گھر اور پاس پڑوس میں لوگوں کی کتابوں سے رغبت نے اس ذوق کو جلا بخشی۔ جناب شہاب الدین ثاقب نے مجھے شاعری کے ابتدائی اسباق پڑھائے اور کلام کی اصلاح کی۔ بول چال میں میری غلطیوں پر وہ ہمیشہ مجھے ٹوکتے رہے۔ اس کا مجھے بہت فائدہ پہنچا۔ ان سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ علی گڑھ خط آنے جانے میں وقت بہت لگتا تھا اور کبھی کبھی مصرعۂ طرح کی غزلوں کی بروقت اصلاح نہیں ہو پاتی تھی جس سے مجھے پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

اس دِقت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے میں نے جناب کوثر سیوانی کی شاگردی اختیار کی۔ انھوں نے 1994-1995ء میں میری تخلیق 'مرثیۂ احمد جمال پاشا' کو پہلی مرتبہ بہ نظرِ اصلاح دیکھا۔ ان کی حوصلہ افزائی کی وجہ سے میں نے تیزی سے ظریفانہ نظمیں لکھیں۔ میری کتاب 'ظرافت نامہ' کا تمام کلام ان کا دیکھا ہوا ہے۔ ان کی زندگی میں مَیں نے پہلی رباعی کہی اور انھیں دکھایا۔ انھوں نے اس کی اصلاح کر دی۔

جب دوسری رباعی دکھائی تو انھوں نے اسے کاٹ دیا اور مجھے رباعی کہنے سے منع کر دیا۔ ان کے حکم کی تعمیل میں ان کی زندگی میں پھر کوئی رباعی نہیں کہی۔ ان کے انتقال کے بعد میں نے رباعی کے فن اور اوزان کو سمجھا اور اس کی خصوصیات پر غور کیا۔ پھر رباعی گوئی کا سلسلہ شروع ہوا تو اس کے پانچ مجموعے 'رباعیاں'، 'رباعیاتِ ظفر'، 'خاکِ جستجو'، 'جھکاریں' اور 'سوغات' کے نام سے طبع ہوئے۔

سنہ 1982ء سے بچوں کی نظمیں لکھنی شروع کیں۔ اس زمانے کی کئی نظمیں ماہنامہ 'نور' رام پور میں شائع ہوئیں۔ 'چہکاریں' بچوں کی رباعیوں پر مشتمل تھی۔ 'بچوں کا باغ' اور 'حوصلوں کی اڑان' میں بچوں کی نظمیں ہیں۔ 'بچوں کا باغ' کا دوسرا ایڈیشن قومی کونسل دہلی نے شائع کیا۔ 'حوصلوں کی اڑان' پر 2022ء میں مجھے ساہتیہ اکادمی انعام برائے ادبِ اطفال عطا کیا گیا جو میری زندگی کا نہایت اہم واقعہ ہے۔ جناب کوثرؔ سیوانی کے وصال کے بعد کچھ دنوں تک اپنی تخلیقات جناب قمرؔ سیوانی کو دکھائیں لیکن ادبی معاملات میں ذہنی ہم آہنگی نہیں ہونے اور بعض دیگر وجوہات کی بنا پر یہ سلسلہ قائم نہیں رہ سکا اور میں نے ان کی شاگردی ترک کردی۔

میری نثر نگاری کی ابتدا آئی۔ اے میں پڑھنے کے دوران ہو چکی تھی۔ چند مختصر مضامین اور 'شعلۂ افکار' کے اداریوں کے علاوہ پاشا صاحب کے ایما پر ظریفانہ مضامین لکھنے لگا تھا جن میں تین مضامین 'مگدھ پنچ' پٹنہ اور 'شگوفہ' حیدرآباد میں چھپے بھی لیکن ایم اے میں جب ڈیزرٹیشن کا مقالہ لکھنا ہوا تو میرے ہاتھ پانو پھولنے لگے۔ میں نے استاذی جناب احمد جمال پاشا سے اپنی پریشانی کا تذکرہ کیا کہ مجھے تنقیدی اور تحقیقی مضمون لکھنا نہیں آتا۔ میں کیا کروں؟ انھوں نے میری پریشانی سنی اور کہا کہ اس کے لیے تمھیں چالیس روز تک میرے ساتھ سیوان رہنا پڑے گا۔ میں نے فوراً ہامی بھرلی اور پہلی فرصت میں سیوان حاضر ہو گیا اور پورے چالیس روز ان کے ساتھ رہا۔

اس دوران انھوں نے جس انداز سے میری تربیت کی اور تقریباً ہاتھ پکڑ کر لکھنا سکھایا اس سے میری خود اعتمادی میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ ابتدا میں دو دنوں تک اپنی بے بسی پر رویا لیکن چالیس روز پورا ہوتے ہوتے میری ساری جھجک دور ہو گئی۔ پاشا صاحب کا یہ احسان تازیست میں نہیں بھلا سکتا۔ تبلیغی جماعت کے لوگ تو چالیس روز کے چلّے میں نکلتے رہتے ہیں لیکن میرے علاوہ کسی اور نے ادب کا چلّہ لگایا ہے یا نہیں یہ مجھے معلوم نہیں۔ ایم۔ اے کرنے کے دوران اور پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھنے میں میرے استاد ڈاکٹر اعجاز علی ارشد صاحب نے بھی بڑی شفقت فرمائی اور ایک سچے سرپرست کا حق ادا کیا۔

ادب کے میدان میں شاعری میرا پہلا شوق کبھی نہیں رہی۔ یہ اور بات ہے کہ اب تک میرے چھوٹے بڑے گیارہ شعری مجموعے چھپ چکے ہیں اور جو غیر مطبوعہ کلام میرے پاس ہے اس سے رباعیوں کے دو اور مجموعے ترتیب دیے جا سکتے ہیں۔ ادبی شعور کی بالیدگی کے ساتھ میرا فطری رجحان ہمیشہ سے تحقیق کی جانب رہا۔ آج بھی تحقیقی مضامین لکھ کر جو ذہنی آسودگی نصیب ہوتی ہے وہ کسی اور صنف سے نہیں ہو سکتی۔

جناب عابد رضا بیدار کے زمانے میں خدا بخش لائبریری میں منعقد ہونے والی مسلسل ادبی محفلوں اور قاضی عبدالودود سے متعدد ملاقاتوں نے اس ذوق کو پروان چڑھایا۔ جناب مختارالدین احمد آرزو، رشید حسن خاں، قاضی عبدالستار، حنیف نقوی اور ظفر احمد صدیقی کی حوصلہ افزائیوں نے میرے حوصلوں کو اعتبار بخشا۔

میں جب تک پٹنہ میں رہا خدا بخش لائبریری کی مدد سے تحقیقی مضامین لکھتا رہا لیکن 1990ء میں جب پٹنہ کی سکونت ترک کر کے سیوان آ گیا تو میرے تحقیقی کام کو جیسے گہن لگ گیا۔ ہر چند کہ میں نے تقریباً چھے لاکھ روپے سے زیادہ کی کتابیں اور رسائل و جرائد خریدے لیکن تحقیقی اعتبار سے یہ ساری چیزیں اونٹ کے منہہ میں زیرہ ثابت ہوئیں۔

چوں کہ لکھے بغیر رہ نہیں سکتا تھا اس لیے مجبوراً شاعری کی دنیا میں پناہ لینی پڑی لیکن کوئی بھی تخلیقی کام یکسوئی اور سنجیدگی سے کرنے کی عادت رہی ہے اس لیے شاعری بھی کی تو دل لگا کر۔ میں نے پوری ادبی زندگی میں کبھی بھی تساہل پسندی سے کام نہیں لیا اور ہوس پرستی کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیا۔ مجھ میں جتنی صلاحیت تھی اس کے استعمال میں ہمیشہ ایمانداری برتی۔

مطالعے کی عادت بچپن سے رہی۔ داستانیں اور قصّے کہانیاں خوب پڑھیں۔ خاکے اور خودنوشتیں آج بھی بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ بزرگوں کے ملفوظات اور تصوف کی کتابوں کا مطالعہ میرے معمول میں داخل ہے۔ قرآن کی تلاوت کے ساتھ ترجمے اور تفسیر پڑھنے کا بھی بہت شوق ہے۔ اچھے اشعار پڑھ کر مجھ پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ خواجہ میر درد، غالب، اقبال، میر حسن، میر انیس، اسماعیل میرٹھی، شاد عظیم آبادی، حالی، اصغر گونڈوی اور جمیل مظہری میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ عصرِ حاضر کے شاعروں میں عرفان صدیقی، زیب غوری، حسن نعیم، کلیم عاجز، جون ایلیا، اسعد بدایونی، سلطان اختر، شجاع خاور، فرحت احساس اور خورشید طلب کو بہ طورِ خاص پسند کرتا ہوں۔

مشائخِ چشت، فضلِ رحماں گنج مراد آبادی اور شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کے ملفوظات مجھے بہت پسند ہیں۔ نثر نگاروں میں پریم چند، مرزا ہادی رسوا، شاہد احمد دہلوی، اشرف صبوحی، مولانا عبد الماجد دریابادی، شوکت تھانوی، خواجہ حسن نظامی، رشید احمد صدیقی، قاری طیب، قاضی عبدالستار، مشتاق احمد یوسفی، عصمت چغتائی، مختار مسعود، مشفق خواجہ اور سید محمد اشرف کی نثر مجھے زیادہ پسند ہے اور ان کے مطالعے سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ محققین میں حافظ محمود شیرانی، انصار اللہ نظر، رشید حسن خاں، حنیف نقوی، ظفر احمد صدیقی اور شمس بدایونی نے بہت متاثر کیا۔ فارسی میں شیخ سعدی میرے سب سے پسندیدہ ادیب ہیں۔

میں جب گلستاں پڑھتا ہوں تو اس کے ادبی حسن سے مسحور ہو جاتا ہوں اور دکھ درد کا احساس جاتا رہتا ہے۔ مولانا عبدالرحمان جامی کے کلام خصوصاً نعتوں کا تو گویا عاشق ہوں۔ ان کے علاوہ خواجہ فرید الدین عطّار، مولانا روم، حافظ شیرازی، امیر خسرو اور ابنِ یمین کا بے حد قائل ہوں۔

1980ء سے اپریل 1990ء تک پٹنہ میں میرا قیام رہا۔ تقریباً سوا برس تک اقتصادی پریشانیوں سے نبرد آزما رہنا پڑا۔ ابتدا میں مجھے گھر سے صرف سو روپے ماہانہ ملتے تھے۔ اسی میں ہر طرح کا خرچ شامل تھا۔ کچا چنا

اور گڑ صبح کا ناشتہ ہوتا تھا۔ دوپہر کے کھانے میں ہم لوگ چاول میں نمک ڈال کر کھچڑی کی طرح پکا لیتے تھے۔ رات میں سبزی روٹی بنتی تھی۔ انڈے اور گوشت کا نمبر گاہے بگاہے ہی آتا تھا۔ اسی میں ایک مرتبہ ذاتی طور پر مجھے 48 گھنٹے کا فاقہ بھی کرنا پڑا۔ میں نے صرف پانی کے سہارے یہ وقت گزارا اور لاج کے کسی فرد پر یہ بات ظاہر نہیں ہونے دی۔ میرے ساتھ رہنے والے بھی اسے محسوس نہیں کر سکے۔

دوسرے روز شام میں ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے بھوک کی شدّت سے دم نکل جائے گا۔ اسی وقت ڈاکیہ آیا اور منی آرڈر موصول ہوا تو جان میں جان آئی۔ میں نے کوشش کر کے کئی گھروں میں ٹیوشن پڑھانا اور بہار پبلی کیشن کے یہاں مختلف یونیورسیٹوں کے اردو پاسپورٹ اور گیس پیپر لکھنے کا کام شروع کیا تو اقتصادی تنگی دور ہوئی اور فراغت کا دن دیکھنا نصیب ہوا۔ اسی زمانے میں میرے بڑے بھائی کی شادی کے موقع پر میری والدہ نے مجھے تین پینٹ کے کپڑے دیے کہ انھیں سلوا لوں۔ ان میں سے دو کپڑے بیچ کر میں نے کتابیں خرید لیں اور صرف ایک کپڑا سلوایا۔ یہ سب دیکھ کر لاج کے لڑکوں نے میرا بڑا مذاق اڑایا تھا۔ اس وقت تک ایم اے میں داخلہ لیے ہوئے مجھے چھ مہینے گزر چکے تھے۔

ایم۔ اے میں داخلہ لینے کے بعد میں چھ سات مہینے تک دولی گھاٹ سے پٹنہ یونیورسٹی (دربھنگہ ہاؤس) تک پیدل آتا جاتا رہا۔ کرائے کے پیسے ہی میسّر نہیں تھے۔ طبیعت تھک جاتی تھی۔ ایک روز میں نے اپنے قدم گنے تھے جو چھہتّر ہزار ہوئے تھے۔ کلاس ختم ہوتے ہی خدا بخش لائبریری چلا جاتا تھا اور لائبریری بند ہونے پر دولی گھاٹ آتا پھر جلدی جلدی ہاتھ منہہ دھو کر ٹیوشن پڑھانے نکل جاتا۔ نو ساڑھے نو بجے واپس آکر کھانا پکاتا۔ نماز پڑھنے کے بعد بارہ بجے رات تک مطالعہ کرتا رہتا تھا۔ یہی روزانہ کی روٹین تھی۔

1984ء تک پٹنے کا ادبی ماحول شاندار تھا۔ اسے ہم عظیم آباد کی آخری بہار بھی کہہ سکتے ہیں۔ قاضی عبدالودود، کلیم الدین احمد، سید حسن عسکری، عطا کاکوی، سید حسن، سید محمد محسن، رضا نقوی واہی، واقف عظیم آبادی، کلیم عاجز، تقی رحیم، احمد یوسف، سید محمد حسنین وغیرہ جیسی عظیم ہستیوں کی وجہ سے عظیم آباد کی فضا منور تھی۔ آئے دن ادبی محفلیں ہوتی رہتی تھیں جن کا ایک خاص معیار ہوتا تھا۔ خدا بخش لائبریری کے فعال ڈائرکٹر عابد رضا بیدار بڑے بڑے سمینار کراتے جس میں پوری دنیا سے اکابرینِ ادب شرکت کرتے۔

پٹنہ میں ہی میں نے پہلی مرتبہ عصمت چغتائی، مسعود حسین خاں، مختار الدین احمد آرزو، ڈاکٹر انصار اللہ نظر، رشید حسن خاں، پروفیسر محمد حسن، قمر رئیس، صالحہ عابد حسین، قاضی عبدالستار، تنویر احمد علوی، مجروح سلطان پوری، کیفی اعظمی، سید حامد، سید صباح الدین عبدالرحمان، عبداللطیف اعظمی، سردار جعفری جیسے اکابرینِ ادب کو دیکھا اور انھیں سنا۔ اس وقت بہار اردو اکادمی بھی بے حد فعال تھی۔ اے۔ جی آفس کے مشاعروں کی بھی دھوم تھی۔ خدا بخش لائبریری کے سمیناروں اور وہاں کے ادبی مباحث نے میری سوچ میں ایک انقلاب برپا

کر دیا۔ استاذی احمد جمال پاشا کی وجہ سے قاضی صاحب کے یہاں رسائی ہوئی۔

ان کے گھر بیسیوں مرتبہ حاضری کا شرف حاصل ہوا اور بہت قریب سے قاضی صاحب کو دیکھنے اور انھیں سمجھنے کا موقع ملا۔ قاضی صاحب کی باتیں سن سن کر یہ بات سمجھ میں آئی کہ علم کا سمندر کسے کہتے ہیں۔ 1984ء میں کلیم الدین احمد اور قاضی عبدالودود کے انتقال کے بعد پٹنہ کے ادبی ماحول کا زوال شروع ہوا اور آج یہ صورتِ حال ہے کہ وہاں جایئے تو سارا شہر بھائیں بھائیں کرتا نظر آتا ہے۔ دل گھبراتا اور ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کسی اجڑے دیار میں آ گیا ہوں۔

قاضی صاحب اور کلیم صاحب اپنے گھروں میں رہتے تھے لیکن پورے شہر پر ان کا رعب چھایا ہوا تھا۔ کسی شاعر اور ادیب کی مجال نہیں تھی کہ اپنی خفیف الحرکاتی دکھائے۔ پٹنہ میں جس شخصیت نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ سید حسن عسکری کی ذات تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں جن دو بڑے عالموں کو دیکھا ان میں سید حسن عسکری اور پروفیسر نذیر احمد تھے۔ عسکری صاحب بڑھاپے میں، جب ان کی بینائی بے حد کمزور ہو چکی تھی اپنی آنکھوں سے مخطوطہ لگائے گھنٹوں پڑھتے اور نوٹس بناتے رہتے تھے۔

میں نے خدا بخش لائبریری میں پاکستان کے مشہور قوال مقبول صابری برادران کے سامنے انھیں کھڑے کھڑے تان سین کے بارے میں معلومات کا دریا بہاتے ہوئے دیکھا ہے۔ صابری برادران کی آنکھیں پھٹی ہوئی اور ان کے منھ حیرت کے مارے کھلے ہوئے تھے۔ عسکری صاحب دنیا کی مختلف لائبریریوں میں تاریخ کے قلمی نسخوں کا جس طرح حوالہ دیتے تھے اسے سن کر ان کی وسعتِ مطالعہ اور ضعیفی میں بھی بیدار مغزی پر حیرت ہوتی تھی۔ اب وہ باتیں یاد آتی ہیں تو دل میں ہوک سی اُٹھتی ہے۔

قیامِ پٹنہ کے دوران دو فرقہ وارانہ فسادات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ پہلا فساد اندرا گاندھی کے قتل کی وجہ سے ہوا۔ پٹنہ میں دن کے اجالے میں سکھوں کی دکانوں اور ان کے کاروبار کو جس طرح لوٹا اور نذرِ آتش کیا گیا وہ بے حد شرمناک تھا۔ میرے محلے میں ایک سکھ کا چھوٹا سا کارخانہ تھا جس میں ربر کی گیندیں تیار ہوتی تھیں۔ ظالموں نے اسے بھی نہیں چھوڑا۔ حد تو یہ ہے کہ اس میں کام کرنے والے مزدور، المونیم کے جن برتنوں میں کھانا پکاتے تھے وہ بھی لوگ اٹھا لے گئے۔ میں جن گھروں میں ٹیوشن پڑھاتا تھا ان میں ایک خوبصورت مکان والے انجینیر صاحب بھی تھے۔ مصدقہ ذرائع سے مجھے معلوم ہوا کہ رات میں وہ بھی ایک دکان سے ٹی۔ وی اور فریز لوٹ کر لائے ہیں۔ اس خبر سے مجھے اتنا ملال ہوا کہ میں نے ان کے یہاں پڑھانے سے انکار کر دیا۔

دوسرا فساد زیادہ بھیانک تھا جو لال کرشن اڈوانی کی رتھ یاترا کے موقع پر ہوا۔ جس روز اڈوانی جی کا رتھ پٹنہ سیٹی سے گزرا میں بھی اسے دیکھنے گیا تھا۔ جلوس میں شامل لوگ جیسے پاگل ہوئے جا رہے تھے۔ اڈوانی جی رتھ پر کھڑے ہوئے وقفے وقفے سے دھیمی آواز میں 'جے شری رام' کہتے جو لب میں مجمع آسمان سر پر اٹھا لیتا

تھا۔ جس روز فساد ہوا اس دن شام کے وقت میں اپنے ایک ساتھی کے ہمراہ خانہ داری کا سامان خرید نے پچھم دروازے کے پاس مینا بازار گیا ہوا تھا۔ ہم لوگوں نے فضا میں ایک خاص طرح کا تناؤ اور خوف محسوس کیا۔ میری چھٹی حس نے خبردار کرنا شروع کیا کہ یہاں سے جلدی نکلو۔ ہم لوگوں نے جلدی جلدی احتیاطاً ضرورت سے زیادہ خریداری کرلی اور مغرب کی اذان کے وقت تک دولی گھاٹ واپس آ گئے۔

رات میں تقریباً ساڑھے نو بجے ایک زوردار دھماکہ ہوا اور یکا یک اتنے بم پھٹنے کی آوازیں آنے لگیں جیسے ایک ساتھ کئی دیوالیاں منائی جارہی ہوں۔ پھر چاروں طرف سے جے شری رام اور نعرۂ تکبیر اللہ اکبر کی آوازیں بلند ہونا شروع ہوئیں۔ دولی گھاٹ مسلمانوں کا چھوٹا سا محلّہ تھا جو فسادیوں کے لیے لقمۂ تر کی حیثیت رکھتا تھا۔ محلے والوں نے اپنی بساط کے مطابق اپنی حفاظت کا سامان کیا۔ رات بھر لوگ پہرہ دیتے رہے۔ طرح طرح کی افواہیں اڑ رہی تھیں۔ فساد کی تیسری رات سب سے زیادہ خوفناک تھی۔ ایسا محسوس ہورہا تھا کہ آج ہم لوگوں کے محلے پر حملہ ہوجائے گا۔ ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔ لوگ گھبرائے ہوئے تھے۔

ذاتی طور پر میں بھی اندر سے کافی سراسیمہ تھا۔ دس بجے رات سے نعرے گونجنے لگے۔ ہم لوگوں نے منصور صاحب کے دومنزلہ مکان کی چھت پر چڑھ کر دیکھا کہ پڑوس کے محلے حمام میں بلوائیوں کا ہجوم اکٹھا ہے اور نعرے لگا رہا ہے۔ ان میں سب سے آگے ہاتھوں میں ننگی تلوار لیے جولڑکا سب سے زیادہ اچھل رہا تھا وہ ہم لوگوں کے لاج پر روزانہ آتا تھا اور چائے ناشتہ کر کے جاتا تھا۔ وہ سڑک جو دولی گھاٹ سے میتن گھاٹ کو جاتی ہے اس کے نالے میں دو نامعلوم لوگوں کی لاشیں بھی نظر آئیں۔ رات دو بجے لالو پرشاد یادو نے اطراف کا دورہ کیا۔

اس فساد میں یادو برادری نے مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا۔ میں پٹنہ سیٹی میں گرجا اسپتال کے نزدیک مانس پتھ میں ایک برہمن فیملی کے بچوں کو پڑھاتا تھا۔ یہ اوستھی جی کا گھر تھا اور وہ لوگ میرا بڑا احترام کرتے تھے۔ جب فسادات نے زور پکڑا تو ان بچوں کے والد کچھ لوگوں کے ہمراہ ہمارے لاج میں آئے۔ رائفل ان کے ساتھ تھی۔ ان لوگوں نے بہت ضد کی کہ میں حفاظت کی غرض سے ان کے گھر منتقل ہوجاؤں۔ دوستوں کو چھوڑ کر مجھے تنہا جانا گوارا نہیں ہوا۔ وہ لوگ بھاجپا کے زبردست حمایتی تھے۔ میرے انکار کرنے پر وہ لوگ مجھے اپنی رائفل سونپنے لگے لیکن میں نے اسے لینے سے انکار کردیا۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اوستھی جی کے خاندان نے بھاجپا کی حمایت کے باوجود اپنے محلّے کے دو مسلم خاندانوں کو اپنے یہاں اس وقت تک پناہ دی جب تک شہر کے حالات معمول پر نہیں آ گئے۔ اس فساد نے میرے دل و دماغ پر بہت منفی اثر ڈالا جس کا اثر برسوں زائل نہ ہوسکا۔ جس ملک کے عوام ملکی بنیاد پر اجتماعی سوچ نہیں رکھتے ہوں اور فرقہ وارانہ بنیاد پر تقسیم ہونے کو ہمہ دم تیار ہوں اس ملک کی حقیقی ترقی کبھی ممکن نہیں۔

میرا ماننا ہے کہ عوام بنیادی طور پر امن وسکون کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں لیکن ہمارے لیڈران اپنے حقیر سیاسی فائدے کی خاطر انتشار کا ماحول بنائے رکھنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتے ہیں لہٰذا مختلف بہانوں سے وہ دل ودماغ کی کھائیاں پاٹتے نہیں بلکہ اسے مزید وسیع کرتے ہیں۔

میرا بچپن غربت میں بسر ہوا۔ میرے دادا عبدالاحد کے پاس کاشت کاری کی کچھ زمین تھی جس میں سے رانی پور کی زمین میں وہ خود کھیتی کیا کرتے تھے۔ بالا پور اور بنگرا کی زمینیں بٹائی پر دے دی جاتی تھیں۔ ہم لوگوں کا مکان مٹّی کا تھا۔ دیواروں کی بوسیدگی کی وجہ سے اس کی مٹّی جھڑتی رہتی تھی۔ جب پُروا ہوا چلتی تو مٹّی جھڑنے کی رفتار تیز ہو جاتی۔ سال میں کئی مرتبہ خصوصاً مختلف تہواروں کے مواقع پر دیواروں کی مرمّت ہوتی تھی۔ گھر کے اندر اور برآمدے کی دیواروں کی لپائی پتائی کا زیادہ تر کام میری دادی کیا کرتی تھیں۔

اس کام میں میں بھی ان کا ہاتھ بٹایا کرتا تھا۔ میں ربیع کی فصل کٹنے کے بعد کھیتوں سے چن چن کر مٹّی کے ڈھیلے لاتا۔ انھیں توڑ کر رات میں بھگوتا اور دن میں گیہوں کا بھوسا ڈال کر اسے تیار کرتا جس سے دیواروں کی مرمت ہوتی تھی۔ پیلی مٹّی سے دیواریں لیپی جاتی تھیں۔ باہر کی دیواروں کی مرمت مزدور کرتے تھے۔ برسات کے موسم میں جب کھپریل کی چھت ٹپکتی تو بہت حسرت ہوتی تھی کہ کاش ہم لوگوں کا بھی مکان پختہ ہوتا۔

گھر میں اتنا اناج ہو جاتا تھا کہ تقریباً سال بھر غلّہ نہیں خریدنا پڑتا تھا۔ اگر کبھی بارش کم ہوتی یا قحط پڑ جاتا یا سیلاب میں فصل برباد ہو جاتی تو گیہوں چاول کی بھی خرید ہوتی تھی۔ بستی میں چند لوگوں کو چھوڑ کر سب کے گھر مٹّی کے تھے۔ کچھ لوگ پھوس کے مکانوں میں بھی رہتے تھے۔ غربت عروج پر تھی۔ گانو کے کچھ ہی گھرانے خوش حال تھے جن میں میری ننھیال شامل تھی۔ ددھیال میں بھی کھانے پینے کی کمی نہیں تھی۔ میرے والد گوشت مچھلی کے بڑے شوقین تھے۔ وہ قصائی محلّے سے ایک ہی مرتبہ کئی کئی کیلو گوشت لاتے۔ گوشت کھاتے کھاتے ہم لوگوں کا جی اوب جاتا تھا۔ وہ مچھلی خریدتے بھی تھے اور اس کا شکار بھی کرتے تھے۔ میرے چھوٹے چچا مچھلی کے شکار کے بڑے ماہر تھے اور اس میں نت نئے تجربات کرتے رہتے تھے۔

میرے بچپن میں رانی پور کا جو ماحول تھا آج کی نسل اس کا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ بستی کے گوالوں کے بچوں کو پہننے کے کپڑے تک میسّر نہیں تھے۔ وہ ہمیشہ نیم برہنہ رہتے تھے۔ غربت کے سبب اکثر لوگوں کے گھروں میں فاقے ہوتے۔ آلو کے موسم میں کچھ لوگ آلو ابال کر نمک کے ساتھ کھا لیتے۔ کچھ لوگ صبح کے ناشتے میں مکئی کا بھونا کھا کر رہ جاتے۔ عموماً لوگ صرف جمعہ کو نہاتے تھے کہ اس سے صابن کی بچت ہو جاتی تھی۔ لڑکے بالے دن بھر ننگے پانو رہتے۔ مغرب کی اذان کے وقت ہاتھ پانو دھو کر لکڑی کی کھڑانو پہن لیتے جسے مقامی زبان میں کھٹ پٹّی کہتے تھے۔ جن گھروں کے لوگ ہوائی چپل پہنتے دوسرے لوگ انھیں رشک بھری

نگاہوں سے دیکھتے تھے۔

بجلی تو تھی نہیں۔ گھر گھر میں مٹی اور شیشی کے چراغ جلتے جنھیں ڈِھبری کہا جاتا تھا۔ لالٹین کا رواج بہت کم تھا۔ قدرے خوش حال گھروں میں ایک لالٹین ہوتی تھی جو دروازے پر جلتی تھی۔ میرے والد جب ٹین کا چراغ خرید کر لائے تو ہم بھائی بہنوں کی خوشی قابلِ دید تھی۔ قدرے بعد میں لیمپ آنے پر بھی خوشی کا وہی حال تھا۔ چولھا جلانے کے لیے شام کے وقت لوگ پڑوس کے گھر سے آگ مانگتے تھے۔

جاڑے کے زمانے میں بچے گانتی باندھتے۔ پیسے والوں کے یہاں فلالین کے شرٹ اور کرتے سلوائے جاتے۔ رضائی کا رواج بھی کم ہی تھا۔ شادی بیاہ کے موقعے پر تیسی کے تیل میں گل گلے پکتے۔ ہر گھر میں اوکھلی، موسل اور چکّی کا ہونا لازمی تھا۔ عورتیں دھان کوٹتیں اور چکّی میں گیہوں پیستی تھیں۔ وہ تقریباً دن بھر اپنے کام میں لگی رہتی تھیں۔ میرے گھر میں میری دادی سب سے زیادہ محنتی تھیں۔ وہ گھر کا سارا نظام سنبھالے رہتیں۔ میری بڑی آپا بھی بڑی ہنر منداور جفاکش تھیں۔ دھان کوٹنے میں ان کے ہاتھوں میں آبلے پڑ جاتے تو وہ سوئی چبھو کر اسے پھوڑتی تھیں۔

ایک دن میں نے دیکھا کہ ان کے دونوں ہاتھوں میں دس بڑے بڑے آبلے پڑے ہوئے ہیں اور حسبِ معمول وہ سوئی کی مدد سے انھیں خشک کر رہی ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر میرا دل بھر آیا اور گھر کے ایک گوشے میں جا کر بہت رویا۔ اسی دن پہلی مرتبہ مجھے اپنی غربت کا احساس ہوا اور میں نے فیصلہ کیا کہ دادی اور آپا کی مدد کے لیے دھان کوٹنا سیکھوں گا اور میں نے ایسا ہی کیا۔ کئی برسوں تک اس کام میں ان کا ہاتھ بٹاتا رہا۔ ہمارے گھر میں باسی کھانا پھینکنے کا رواج نہیں تھا۔ دانے کا بہت احترام کیا جاتا تھا اور فضلِ خدا سے آج بھی یہ احترام باقی ہے۔

باسی کھانا زیادہ تر دادی اور ہم کھاتے تھے۔ گیہوں کی روٹی بچ جاتی تو اسے دھوپ میں سکھا کر گڑ اور دودھ ڈال کر دادی پکا دیتیں جسے میں بہت شوق سے کھایا کرتا۔ جب ابا نوکری سے گھر آتے تو تقریباً روزانہ ہی گوشت پکتا تھا۔ اس وقت پیسے کی کمی تھی لیکن چیزیں سستی تھیں۔ ایک روپے میں دس انڈے مل جاتے تھے۔ اس وقت آم تول کر نہیں گن کر بکتے تھے۔ ایک روپے کے سو بیجو آم ملتے تھے۔ قحط کے زمانے میں جب چاول کے دام دو سو بیس روپے کوئنٹل تک جا پہنچے تو عام خیال یہ تھا کہ اب جینا محال ہے۔ بستی میں عام طور پر کنویں کا پانی استعمال ہوتا تھا۔ عورتیں صبح کی اذان سے پہلے کنویں سے پانی بھر لیتی تھیں۔ چند گھروں میں چانپا کل بھی موجود تھا۔

سائیکل بھی چند گھروں میں ہی تھی۔ سواری کے لیے بیل گاڑی اور ٹم ٹم کا رواج تھا۔ لوگ دور دراز کا سفر پیدل ہی طے کرلیا کرتے تھے۔ میں ساتویں جماعت میں تھا تو میرے دل میں ریل دیکھنے کا شوق پیدا ہوا۔

اس شوق کی تکمیل کے لیے اپنی بستی کے ہی ایک صاحب عبدالباری کے ہمراہ رانی پور سے تیرہ کیلومیٹر کا سفر پیدل طے کر کے سیوان ریلوے جنکشن پہنچا اور ریل دیکھنے کا ارمان پورا ہوا۔

محرّم کا چاند ہوتے ہی گاؤں میں چہل پہل سی پیدا ہو جاتی۔ رانی پور میں دو تعزیے بنتے۔ ایک سرکاری تعزیہ کہلاتا اور دوسرا زیبا نام کی خاتون اپنے نواسے محمد قاسم کے نام کی منّت کا بنواتی تھیں۔ مغرب کی نماز کے بعد ڈھول بجنا شروع ہو جاتا اور لوگ لاٹھیاں وغیرہ کھیلتے۔ مجھے اور میرے بڑے بھائی کو یہ منظر دیکھنے کا بڑا شوق تھا لیکن دادا کی ممانعت تھی کہ وہاں نہیں جانا ہے۔ کبھی کبھی ہم دونوں بھائی انجان بن کر دبے پانو گھر سے نکلنے کی کوشش کرتے تو دادا فوراً ٹوکتے۔ 'کہاں جا رہے ہو گھر پر رہو' لیکن کبھی کبھی موقع مل ہی جاتا تھا۔

محرم کی نویں تاریخ کو آدھی رات کے بعد تعزیے کا جلوس پورے گانو میں دروازے گھومتا جسے گنوارا کہا جاتا تھا۔ تعزیہ گوالوں کے محلے میں بھی جاتا۔ وہ لوگ بھی تعزیے کا بہت احترام کرتے تھے۔ ان کی عورتیں ملیدہ اور لوٹے میں پانی لے کر چوک پر آتیں۔ کوئی پانی کے بدلے دودھ لے کر آتی تھی۔ محرم کے دن ظہر کی نماز کے بعد جب تعزیے کا جلوس نکلتا تو اس میں ہر مذہب و ملّت کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ تعزیے پر عورتیں گڑ دھانی پھینکتیں جسے لڑکے لوٹ کر کھاتے تھے۔ کبھی میں بھی اس جماعت میں شامل ہو جاتا تھا۔

میرے بچپن میں بستی کے باغیچے میں اکھاڑا تھا جس میں نوجوان کسرت کرتے اور کشتی لڑتے تھے۔ کبھی کبھی کشتی کا مقابلہ بھی ہوتا تھا۔ مجھے کشتی لڑنے اور کسرت کرنے سے کوئی دل چسپی نہیں تھی لیکن کشتی کا مقابلہ دیکھنے میں بڑا مزا آتا تھا۔ اب یہ ساری چیزیں خواب و خیال ہو گئیں۔ فٹ بال اور کرکٹ کا کھیل میں نے کبھی نہیں کھیلا۔ کبڈی البتہ کھیلی ہے۔ جب میں تیسری جماعت میں تھا تو ہندستان میں سخت قحط پڑا۔ قحط کا یہ سلسلہ کئی برسوں تک جاری رہا۔ بارش نہیں کے برابر ہوئی۔ لوگ دانے دانے کو محتاج ہو گئے۔ سرکاری راشن میں امریکی باجرا ملتا تھا اسے ہی کھا کر لوگ گزارا کر رہے تھے۔ سرکاری اسکولوں میں مکئی کا دلیا اور ولایتی دودھ، کبھی آٹے کی ابالی ہوئی لٹی اور دودھ دوپہر میں بچوں کو کھانے کے لیے ملتا تھا۔ لڑکے اپنے گھر سے رکابی لے کر آتے تھے۔

میرے دادا نے سختی سے منع کر رکھا تھا کہ کبھی برتن لے کر اسکول نہ جاؤں اور نہ وہاں کی کوئی چیز کھاؤں۔ اسکول میں دلیا اور دودھ تیار ہوتے دیکھ کر میرا دل بہت للچاتا۔ ایک دن دادی اور اماں کی خوشامد کر کے میں بھی اپنے بستے میں تام چینی کی پلیٹ لے کر آیا اور دوپہر میں جب بچے کھانے کے لیے قطار میں بیٹھے تو میں بھی خوشی خوشی ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ مکئی کا دلیا کھانے کے بعد ابھی پلیٹ میں دودھ لے ہی رہا تھا کہ دادا آتے ہوئے نظر آئے۔ میری تو جیسے جان ہی نکل گئی۔ انھوں نے بھی یہ منظر دیکھا لیکن خموشی سے آگے بڑھ گئے۔ گھر جا کر انھوں نے دادی سے کچھ کہا یا نہیں یہ تو مجھے نہیں معلوم لیکن چھٹّی ہونے پر جب گھر پہنچا تو

دادا نے بغیر کچھ پوچھے میرے گالوں پر چار زناٹے دار طمانچے رسید کیے۔ میں تو بالکل بلبلا اٹھا۔ یہ منظر دیکھ کر دادی آگ بگولہ ہوگئیں اور دادا سے ان کی تیکھی جھڑپ ہوئی لیکن اس دن کے بعد میں نے پھر کبھی اسکول میں سرکاری کھانا نہیں کھایا۔

سنجیدگی بچپن سے ہی میرے مزاج کا حصہ رہی۔ کھیل کود سے میری دل چسپی برائے نام تھی۔ کھیلنے کے لیے میں نے کنچے بھی کھیلے، رسّی پھلانگی، لٹو نچایا، دوڑ میں حصہ لیا، غلیل چلائی، صابن کے پانی سے بلبلے اڑائے لیکن دیگر بچوں کی طرح کھیل کا دیوانہ کبھی نہیں ہوا۔ البتہ لوڈو بہت دنوں تک کھیلتا رہا۔ مداری کا کھیل، بھالو بندر کے تماشے اور بائسکوپ میں نے خوب دیکھا۔ آٹھویں جماعت میں تھا تو پہلی فلم دیکھی لیکن ایم۔اے کے بعد فلم دیکھنے سے توبہ کرلی۔ اس وقت اسکولوں میں ششماہی اور سالانہ امتحان کے وقت گانے کا بھی امتحان ہوتا تھا۔

گانا گانے کے نام سے ہی میری جان نکلتی تھی۔ تیسری جماعت میں مولوی ہاشم صاحب نے گانے پر اصرار کیا تو میں نے صاف کہہ دیا کہ مجھے گانا نہیں آتا اور نہ کوئی نغمہ یاد ہے۔ انھوں نے حکم دیا کہ باہر جا کر ٹہلو اور دس منٹ میں دو نغمے سوچ کر آؤ۔ جب فرار کی کوئی گنجایش نہیں رہی تو میں نے بڑے سپاٹ انداز میں پہلا نغمہ سنایا 'بول رادھا بول سنگم ہوگا کہ نہیں'۔ دوسرے گانے کی فرمایش پر نثری انداز میں پڑھ دیا 'میں کیا کروں رام مجھے بڈھا مل گیا'۔

پورے کلاس میں خوب ہنسی مچی۔ مولوی صاحب بھی زیرِ لب مسکراتے رہے۔ اس کے بعد ایسے امتحان سے مجھے پھر کبھی نہیں گزرنا پڑا۔

میں نے اپنی زندگی بڑی خموشی سے گزاری ہے اور تماشائی بن کر دنیا کا خوب خوب تماشا دیکھا ہے۔ اپنے عزیزوں کی بے اعتنائیاں بھی دیکھی ہیں اور قریبی دوستوں کی فریب کاریاں بھی۔ شرافت کے پردے میں عیاریوں کا کھیل بھی دیکھا اور روباہ صفت لوگوں کی 'خوش اخلاقیاں' بھی۔ نااہلوں اور اجہلوں کا اکرام بھی دیکھا ہے اور اہل لوگوں کی ناقدری بھی۔

بے عمل مولوی بھی دیکھے اور ایسے خودساختہ پیروں کو بھی دیکھا جو روزہ نماز سے دور ہوتے ہوئے بھی مریدوں میں خلافتیں تقسیم کرتے ہیں۔ اپنے سوتیلے شاگردوں کی استادیوں سے آج بھی محظوظ ہوتا رہتا ہوں۔ ہمارا معاشرہ بھی عجیب معاشرہ ہے۔ یہاں کئی چہرے والے لوگ ہی سرخ رو ہوتے ہیں۔ سیدھی اور سچی بات لوگوں کی سمجھ میں کم ہی آتی ہے۔ ظاہرداری عام ہے اور خلوص کے قدردان ڈھونڈے نہیں ملتے۔ اہلِ دنیا کی فریب کاریاں اور ان کے منافقانہ رویّے کو دیکھتے ہوئے میں دل سے محسوس کرتا ہوں کہ ایسے معاشرے میں مجھ جیسے لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ میں جس راہ کا مسافر ہوں اس میں کوئی ہم سفر نظر نہیں آتا۔ مجھے

باطنی طور پر ایسی تنہائی کا احساس ہوتا ہے جس کی سرحدیں بے بسی سے جا ملتی ہیں۔

غالبؔ کی طرح میں نے بھی دنیا کو ہمیشہ بازیچۂ اطفال ہی سمجھا ہے اور اس کی طرف کبھی محبت کی نظر سے نہیں دیکھا۔ پیسے کو زندگی کی بڑی ضرورت سمجھتا ہوں لیکن دولت کا کبھی خواہاں نہیں رہا۔ میری نظر میں انسان کے پاس اتنا ہی پیسہ ہونا چاہیے کہ اس کی جائز ضرورتیں آسانی سے پوری ہو جائیں اور اسے کسی کا دست نگر نہ بننا پڑے۔ ایسی دولت کس کام کی جو غریبوں کو انسان ہی نہ سمجھے۔ بچوں کی مہنگی پڑھائی اور مہنگے علاج کو دیکھتے ہوئے بطورِ حفظِ ماتقدّم کچھ پیسوں کا بھی ہونا ضروری ہے تا کہ ہنگامی حالات میں پریشان نہ ہونا پڑے۔

اونچی عمارتوں کو دیکھتا ہوں تو بادشاہوں کے محلوں کے کھنڈرات نظروں کے سامنے آ جاتے ہیں۔ اس بات پر یقین رکھتا ہوں کہ انسان کے حق میں اللہ کا ہر فیصلہ بہتر ہوتا ہے بھلے ہی وہ چیز انسان کی سمجھ میں نہ آئے۔ لہٰذا اپنا کوئی بھی کام پوری محنت اور ایمانداری سے کرنے کے بعد نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیتا ہوں۔

مجھے کسی کی ترقی دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے اس کے لیے میں نے خود پر کافی ریاضت کی ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ زندگی کی کسی منزل میں بھی میرے دل میں حسد، جلن، بغض اور کینے کا کبھی گزر نہیں ہوا۔ کسی کے رویے سے تکلیف پہنچے تو صبر کرتا ہوں اور کوئی میرے خلاف بالکل کمر بستہ ہی ہو جائے تو اس سے علاحدگی اختیار کر لیتا ہوں۔ نخوت اور غرور والوں سے خواہ وہ کتنے ہی ثروت مند اور ذی مرتبہ ہوں، خاکساری کا برتاو کبھی نہیں کرتا اور نہ انھیں ذرّہ برابر اہمیت دیتا ہوں۔ ایسے لوگوں سے بڑی الجھن ہوتی ہے جن کی خاکساری رعونت کے خمیر سے اٹھی ہے۔ دراصل ایسے لوگ ظاہر میں بھیڑ اور باطن میں بھیڑیے ہوتے ہیں۔

میں بنیادی طور پر تنہائی پسند ہوں۔ میلوں ٹھیلوں، سمینار اور سمپوزیم سے حتی المقدور دور رہتا ہوں۔ مارے باندھے کہیں جاتا بھی ہوں تو اگلی صف میں نہیں بیٹھتا۔ اسٹیج پر بیٹھنا میرے لیے قیامت سے کم نہیں۔ فنائیت اور گم شدگی مجھے دل سے عزیز ہے۔ دنیاداری کے تقاضوں سے واقف تو ہوں لیکن ان پر عمل نہیں کرتا۔ اس کا نقصان بھی اٹھاتا رہتا ہوں۔ اللہ کے سوا کسی کی خوشامد نہیں کرتا۔ چاپلوسی اور درباداری سے سخت نفرت ہے۔

لوگوں کی مصلحت آمیز گفتگو اور منافقانہ رویّے سے بیزار رہتا ہوں۔ ایسے لوگ جو اپنے حقیر فائدے کے لیے دوسروں کا نقصان کرنے پر آمادہ ہوں ان سے دور رہنے میں ہی عافیت محسوس ہوتی ہے۔ ادبی گروہ بندی بھی میرے مزاج کو راس نہیں آتی۔ شہرت پسندی اور انعام و اکرام کے پیچھے بھاگنے سے متنفر رہتا ہوں۔ میرے استاد احمد جمال پاشا صاحب نے مجھے سمجھایا تھا کہ 'اچھا لکھنے سے بہتر کوئی تعارف نہیں ہوتا۔ بقیہ ساری چیزیں ڈھل ڈھلا کر ختم ہو جاتی ہیں۔ آخر میں اپنا لکھا پڑھا ہی کام آتا ہے'۔ استاد کی اس بات پر پختہ یقین رکھتا ہوں۔ گوشے میں بیٹھ کر ایمانداری سے لکھتے پڑھتے رہنے سے دل کو بہت سکون ملتا ہے۔ وقت سے بڑا

منصف کوئی نہیں ہوتا۔ یہ دیر سویر سب کے ساتھ انصاف کرتا ہے۔ ادبی کاموں میں عجلت گوارا نہیں۔ اپنی تخلیقات سے متعلق کسی خوش فہمی کا شکار نہیں رہتا۔ اپنی تحریروں میں تراش خراش کرتے رہنا ضروری سمجھتا ہوں اس لیے شاعری ہو یا نثر تحریر کی نوک پلک درست کرنے پر خاص توجہ دیتا ہوں۔ شاید اسی بنا پر عرفان صدیقی کا یہ شعر مجھے پسند ہے:

غزل تو خیر ہر اہلِ سخن کا جادو ہے
مگر یہ نوک پلک میرے فن کا جادو ہے

اگر کوئی میری خامیوں کی جانب اشارہ کرے تو اس کا دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

اچھی کتابیں میری جان ہیں۔ ان کے حصول کی ہر ممکن کوشش کرتا رہتا ہوں۔ ان کی خریداری میں کبھی پیچھے نہیں رہتا۔ کتابوں کا یہ ذوق گرچہ بچپن سے تھا لیکن پاشا صاحب نے میرے حوصلوں اور ذوق کو مہمیز لگائی۔ کتابوں کے درمیان خاموش بیٹھے رہنا بھی اچھا لگتا ہے۔ اچھی خوشبو اور اچھی کتابوں سے بڑھ کر میرے لیے کوئی اور تحفہ نہیں۔ اللہ کا شکر ہے کہ میری اپنی خاصی لائبریری ہے جن میں اردو ظرافت سے متعلق ہند و پاک کی قابلِ قدر تصانیف موجود ہیں۔ اپنے بچوں کو میں نے خود اردو پڑھائی ہے۔ سب کو مطالعے کا ذوق اور اپنی زبان سے محبت ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ میرے بعد بھی وہ میری کتابوں اور اپنی مادری زبان کی حفاظت کریں گے۔

شعر گوئی کا شوق تو مجھے بہت ہے لیکن محفلوں میں شعر سنانا اچھا نہیں لگتا۔ مشاعروں میں تو شعر سنانے کے نام سے وحشت سی ہوتی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ آج کے مشاعروں نے اپنی تہذیبی اہمیت بالکل کھو دی ہے۔ مشاعروں کا انتظام و انصرام غیر ادبی لوگوں کے ہاتھوں میں آچکا ہے۔ اکثر مشاعرے تجارتی اور سیاسی مقاصد کے تحت ہونے لگے ہیں۔ اچھے شاعروں کے مقابلے گلے باز اور بازاری شاعروں کا بول بالا ہے جس میں تقریباً نصف تعداد متشاعروں کی ہوتی ہے۔ واہ واہ، سبحان اللہ، مکرر ارشاد کی جگہ تالیوں نے لے لی ہے۔ ایسی بدمذاقی ہر کوئی گوارا نہیں کرسکتا۔ میں دس برس پٹنے میں رہا لیکن اس مدت میں اپنے ساتھیوں کو اپنا ایک شعر بھی نہیں سنایا۔ ڈاکٹر عبدالمغنی صاحب کے زمانے میں انجمن ترقیِ اردو بہار کے ایک مشاعرے میں اپنے دو اساتذۂ کرام جناب احمد جمال پاشا اور جناب شکیب ایاز کے حکم پر ایک مزاحیہ غزل پڑھی تھی اور بس۔

میں تنہا سفر کرنے سے گھبراتا ہوں۔ طویل سفر پسند نہیں۔ بڑے شہروں کی سیر کا بھی کوئی شوق نہیں۔ نئے نئے دیہاتوں کو دیکھنا اور ہرے بھرے کھیتوں میں پگڈنڈیوں پر گھومنا اچھا لگتا ہے۔ تاریخی عمارتوں، ان کے کھنڈرات، پہاڑوں اور جھیلوں کے کنارے گھومنے کی خواہش رہتی ہے لیکن ایسا موقع بہت کم دستیاب ہوتا ہے۔ بڑے عہدیداروں اور امیروں کی صحبت سے خائف رہتا ہوں۔ سیاست دانوں سے ملاقات کرنا قطعی

پسند نہیں۔ ایسا غریب جو شریف النفس ہو اس سے ملنا پسند ہے۔ معصوم بچوں سے گفتگو کرنا اور ان کی طفلانہ حرکات وسکنات کا مشاہدہ دل کو بہت بھاتا ہے۔

مذہبی شدّت پسندی سے کوسوں دور رہتا ہوں۔ دیوبندی بریلوی اختلاف نے ہمیشہ میرے دل کو تکلیف پہنچائی ہے۔ جو لوگ مسلکی شدّت کے قائل ہیں انھیں برا ہی نہیں بلکہ قوم وملت اور مذہبِ اسلام کے لیے مہلک تصور کرتا ہوں۔ لوگ عام طور پر اختلاف اور مخالفت کا فرق نہیں سمجھتے اور اختلاف کی اخلاقیات سے بھی واقف نہیں۔ میرا ایمان ہے کہ بقاے باہم کے اصول کو اپنائے بغیر ایماندارانہ اور سکون کی زندگی ممکن نہیں۔

دیوبندی بریلوی، مقلّد غیر مقلّد اور شیعہ سنّی جب تک آپس میں لڑتے رہیں گے تب تک ان میں سے کسی کا بھلا نہیں ہونے والا۔ ہمارے یہاں بیش تر علما کا المیہ یہ ہے کہ ایک طرف وہ اتحادِ بین المسلمین کا نعرہ لگاتے ہیں دوسری جانب مسلکی اختلاف کو ہوا بھی دیتے ہیں اور وہ مسائل جو خواص کے درمیان رہنے چاہئیں انھیں عوام کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ میرے خیال میں علماے کرام کو اپنے اپنے مسلک پر عمل پیرا ہوتے ہوئے دوسرے فرقوں کے ساتھ ایک نقطۂ اتصال تلاش کرنا ہی ہوگا۔ میں خود کو نہ دیوبندی سمجھتا ہوں اور نہ بریلوی بلکہ اپنے کو صرف حنفی کہتا ہوں اور اختلافی اور فروعی موضوعات پر خموشی کو ترجیح دیتا ہوں۔ مذہبی مباحثے کے معاملے میں اکبرالہ آبادی کے اس شعر پر عمل کرتا ہوں:

مذہبی بحث میں نے کی ہی نہیں
فالتو عقل مجھ میں تھی ہی نہیں

الحمدللہ! میری بستی رانی پور کی غالب اکثریت مسلکی شدّت پسندی سے دور رہتی ہے۔ بستی میں محفلِ میلاد کے موقعے پر دیوبندی اور بریلوی دونوں علما آتے ہیں۔ اگر بریلوی عالم آئیں تو سبھی خوش دلی کے ساتھ قیام کرتے ہیں اور دیوبندی عالم کے قیام نہیں کرنے پر کسی کو اصرار نہیں ہوتا۔ یہاں کسی عالم کو اجازت نہیں کہ وہ دوسرے مسلک کے خلاف باتیں کرے۔ ایک مرتبہ میرے پڑوس میں میلاد ہوا۔ اس وقت میں آئی۔ اے کا طالبِ علم تھا۔

میلاد میں جو عالم آئے خلافِ توقع انھوں نے بڑے جوش وخروش اور بپھرے ہوئے انداز میں دیوبندیوں کی برائیاں بیان کرنا شروع کیں۔ انھیں جی بھر کر کوسا اور ان کے حق میں سخت الفاظ کا استعمال کیا۔ لوگ خموشی سے ان کی باتوں کو سنتے رہے۔ جب انھوں نے اپنی بات تمام کر لی تو اچانک میرے بڑے نانا حاجی قمرالدین صاحب نے مجھے حکم دیا کہ تم ان کی باتوں کا جواب دو۔ ظاہر ہے کہ میں کوئی عالم نہیں تھا اور نہ کبھی اس طرح کی بحثوں سے سابقہ پڑا تھا مگر ان کے حکم کی تعمیل بھی ضروری تھی۔ میں نے اپنی سمجھ کے مطابق

مسلکی تشدّد کے نقصانات کی تفصیلات بیان کیں اور ہندستان کے مخصوص ماحول کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے آپسی اتحاد و اتفاق کی اہمیت پر زور دیا اور اپنی بات اقبالؔ کے اس شعر پر ختم کی:

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمھاری داستاں تک بھی نہ ہو گی داستانوں میں

حاضرینِ مجلس نے میری تقریر کو بہت سراہا اور مسرور ہوئے لیکن حضرتِ واعظ نے جواب الجواب کے طور پر میرے ہاتھ سے مائک لینا نہیں بلکہ چھیننا چاہا تو انھیں سب نے سختی سے منع کیا کہ اب آپ ایک لفظ بھی نہیں بول سکتے ہیں۔ صاحبِ خانہ کو بھی تنبیہ کی گئی کہ آیندہ آپسی اختلاف کو ہوا دینے والے واعظ کو آپ کبھی نہیں بلائیں گے اور لوگ بغیر شیرینی لیے اپنے اپنے گھر کو رخصت ہو گئے۔

یہاں میں واضح کرتا چلوں کہ میری دادی حضرت مولانا ریاض احمد سنت پوری چمپارنی سے مرید تھیں جو دیوبندی خیال کے عالم اور حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کے زمانے میں کچھ دنوں تک دیوبند کے شیخ التفسیر رہ چکے تھے اس کے باوجود دادی جان شبِ برات کے حلوے بھی بناتی تھیں اور بارہ وفات، گیارھویں شریف، رجب کی ستائیس تاریخ اور محرم کی ایک سے دس تاریخ تک روزانہ خود فاتحہ کرتی تھیں۔ نیاز کی شیرینی ہم لوگ بڑے شوق اور عقیدت سے کھایا کرتے تھے۔ اونچ نیچ اور ذات برادری کا میں ہمیشہ مخالف رہا لہٰذا اس کی سیاست کو بھی پسند نہیں کرتا۔ فضیلت اور بزرگی کا معیار صرف تقوے کو سمجھتا ہوں۔ اپنے کو دنیا کا حقیر ترین اور سب سے گنہ گار انسان تصور کرتا ہوں لیکن اللہ کی رحمت پر میرا کامل بھروسا ہے۔ کسی شخص کو بھی بحیثیتِ انسان حقیر نہیں سمجھتا لیکن اس کے برے عمل سے ضرور نفرت کرتا ہوں۔

میں اپنے بچوں کو روزہ نماز اور تلاوتِ قرآن کی برابر تاکید کرتا ہوں اور اللہ کا شکر ہے کہ اس معاملے میں انھوں نے مجھے شکایت کا موقع نہیں دیا۔ فضول خرچی سے بچنا میرے معمول میں داخل ہے۔ اوسط درجے کا کپڑا پہننا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ قیمتی چیزوں کے استعمال سے پرہیز ہے۔ متشاعروں اور نالائقوں کی صحبت سے گریزاں رہتا ہوں۔ پہلے گوشت مچھلی سے بہت رغبت تھی لیکن ذیابیطس اور بلند فشارِ خون کی وجہ سے ممکنہ حد تک احتیاط برتتا ہوں۔ سادہ غذا اب زیادہ پسند ہے اس لیے شادی بیاہ کی تقریبوں میں بہت کم شریک ہوتا ہوں۔

اپنی پوری زندگی غفلت اور اللہ کی نافرمانی میں گزر گئی اسے یاد رکھتے ہوئے اللہ رب العزت کے سامنے توبہ و استغفار کرتا رہتا ہوں۔ مجھے زندگی سے بہت پیار ہے لیکن موت سے کبھی نہیں گھبراتا۔ بس اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ایمان پر خاتمہ کردے۔ قبر اور آخرت کا خیال بہت ستاتا ہے۔ خدا کے سامنے حاضری کے خیال سے دل کانپ اٹھتا ہے۔ یہ دنیا بڑی پُر فریب جگہ ہے لیکن یہی آخرت کی کھیتی بھی ہے لہٰذا اس کی اہمیت سے انکار نہیں بشرطیکہ یہ انسان کے دل میں نہیں اترے۔ اگر یہ دل میں اتر گئی تو آدمی کو آدمی نہیں رہنے دیتی۔

مجھے اپنی زندگی سے کوئی شکوا نہیں۔ اللہ نے میرے استحقاق سے زیادہ مجھے اپنی نعمتوں سے نوازا۔ ان میں ایک بڑی نعمت طمانیت قلب ہے۔ میرا دل ہمیشہ پرسکون رہتا ہے۔ اگر کوئی میری تعریف کرے تو اتراتا نہیں اور مذمّت کرے تو دل برداشتہ نہیں ہوتا۔ یہ دونوں چیزیں اب میرے لیے بے معنیٰ ہو چکی ہیں۔ ہر وقت اپنی اصلاح کی کوشش میں لگا رہتا ہوں۔ میرے خیال میں دنیا کا مشکل ترین کام خود اپنی اصلاح ہے لیکن عام طور پر لوگ اسے نہیں سمجھتے اور سمجھتے بھی ہیں تو اہمیت نہیں دیتے۔

بچپن سے ہی اپنے سے بڑوں اور بزرگوں کی صحبت میں بیٹھنا اور ان کی باتیں سننا مجھے اچھا لگتا ہے۔ عورتوں کو میں نے ہمیشہ احترام کی نظر سے دیکھا۔ وہ مرد جو عورتوں پر ہاتھ اٹھائے اسے نالائق تصور کرتا ہوں۔ کسانوں، مزدوروں، اہلِ حرفہ اور چھوٹے چھوٹے کام کرنے والوں کی دل سے عزّت کرتا ہوں۔ عصری تہذیب کی بے راہ روی سے پریشان رہتا ہوں۔ شرم و حیا اور عفت و پاکدامنی کی اہمیت روز بروز کم ہوتی جارہی ہے۔ مغربی تہذیب کا جادو لوگوں کے سروں پر چڑھ کر ناچ رہا ہے۔ اچھے خاصے مذہبی گھرانوں میں بھی مشرقی تہذیب کا چلن نہیں۔ بے پردگی عام ہوگئی ہے۔ بے باکیاں بڑھتی جارہی ہیں۔ یہ چیزیں میرے لیے کافی اضطراب کا باعث ہیں۔

اردو زبان میری روح میں بستی ہے بلکہ سچ کہوں تو یہ میرے لیے محبوبہ کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے بغیر مجھے چین نہیں۔ میری فرصت کے تمام اوقات اسی کے لیے وقف ہیں۔ اسے پڑھنا اور اس میں لکھنا میرے لیے ذہنی سکون کا باعث ہے۔ میں نے جو کچھ بھی لکھا اسی کی محبت میں لکھا ہے اور یہ محبت میری آخری سانس تک باقی رہے گی۔ میرے تخلیقی جوش و جذبے میں کوئی کمی نہیں آئی ہے بلکہ ڈھلتی عمر کے ساتھ اس میں بتدریج اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ مجھے ظریفانہ ادب میں کچھ بنیادی نوعیت کے کام کرنے کی آرزو ہے۔ خاکے، شخصی مضامین اور خود نوشت بھی لکھنے کا ارادہ ہے۔ ظرافت نگاروں سے متعلق دو تذکروں کی تدوین بھی پیشِ نظر ہے۔ بچوں کے لیے مزید نظمیں لکھنے اور اچھی نظموں کا ایک جامع انتخاب بھی میری ترجیحات میں شامل ہے۔ کچھ مقامی بزرگ شعرا کے کلام کو بھی شائع کرانا ہے۔ اللہ سے یہی دعا ہے کہ وہ مجھے صحت و عافیت کے ساتھ اتنی مہلت عطا فرمادے کہ یہ سارے کام پایۂ تکمیل کو پہنچ جائیں۔ پھر وہ ایمان کی سلامتی کے ساتھ اپنے حضور میں بلالے۔

...

Dr. Zafar Kamali

Ismail Shaheed, M.M.Colony,

Mill Road, Siwan-841226(Bihar

Mob.9431056963,E-mail:kamalizafar@gmail.com

گردشِ ایام-1

معین الدین عثمانی
(جلگاؤں، مہاراشٹر)

(1)

ویسے تو ابھی 70 کے پیٹے میں ہوں۔ آخری پڑاؤ ہے۔ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ زندگی کی گاڑی دھیمی رفتار سے اٹھلاتی بل کھاتی آگے کی جانب رواں ہے۔ میں نہیں جانتا کہاں تک جائے گی۔ اور کوئی دوسرا بھی نہیں جانتا، کیونکہ یہ ایک راز کی بات ہے۔ خالق کائنات نے گاڑی کے آنے اور جانے کے بارے میں کسی کو بھی نہیں بتایا۔ یہ علم تو بس اسی کا خاصہ ہے۔ یہ مناسب بھی ہے، ورنہ کوئی مسافر کرائے کے مکان سے سوار ہی نہ ہو اور خلد آشیانی دائمی مکان خالی ہی رہ جائے۔

میری سمجھ میں آج تک یہ بات نہیں آسکی کہ ہمارا پشتینی مکان کس شہر میں تھا۔ میں نے دادا ابا اور تاؤ جی کو بچپن میں جب بھی دیکھا 'بھوساول' شہر کے کرائے کے مکان میں ہی دیکھا۔ بلکہ دونوں کا انتقال بھی کرائے والے مکان ہی میں ہوا تھا۔ آج تک کسی نے مجھے یہ بھی نہیں بتایا کہ وہ کہاں سے آکر یہاں بس گے تھے۔ اور اب تو یہ معلوم کرنا بھی مشکل ہے کہ بتانے والا کوئی نہیں ہے۔

ویسے دیکھا جائے تو اب اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ پہلے کبھی تھی ایسا بھی نہیں ہے۔ خدا کا تخلیق کردہ یہ کرۂ ارض یہاں سے وہاں تک ایک ہی تو ہے۔ وہ بس ایک فطری لگاؤ ہے جو کسی زمین کے ٹکڑے سے ہو جاتا ہے۔ ورنہ فی الوقت جس زمین پر ہماری پرورش و پرداخت ہوئی وہی ہمارا ماضی و حال کا مستقر۔

اسی طرح ہم نے کبھی اپنا شجرہ بھی نہیں بنایا۔ ہمیں یقین ہے کہ صرف تین نسلوں کے نام ہی ہماری یاداشت کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ اگر کسی نے تحریر کر کے رکھا بھی ہے تو اس سے کیا حاصل۔ اگر پچھلی نسل میں کوئی بادشاہ بھی گزرا ہوگا تو وہ کیا فیض دے سکتا ہے؟

البتہ والد صاحب نے ایک دن دوران گفتگو بتایا تھا کہ ریلوے کی عارضی ملازمت کے دوران آفیسر سے کسی بنا پر حجت ہو جانے کے سبب انھیں ملازمت سے برخاست کر دیا گیا تھا اور پھر وہ روزگار کی تلاش میں قریبی شہر 'جلگاؤں' آکر مزدوری کرتے ہوئے کرائے کے مکان میں رہنے لگے تھے۔ امی بتلاتی تھی کہ میری پیدائش بھی کرائے کے مکان میں ہوئی۔ مجھے اس مکان کے بارے میں کچھ ہوش نہیں کہ کیسا رہا ہوگا۔ البتہ سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ مکان جیسا تو ہرگز نہ ہوگا، مگر جھونپڑے جیسا ضرور رہا ہوگا۔ بہر حال بچپن کی دہلیز

پر جب قدم رکھا تو اپنے آپ کو کرائے کے مکان میں پایا۔ امی نے یہ بھی بتایا تھا کہ یہاں آنے کے بعد یہ ہمارا دوسرا امکان ہے۔ اب ہم جس بستی میں رہ رہے تھے وہ مل مزدوروں کی بستی تھی۔ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ مل مالک نے مزدوروں کے لیے ایک کالونی قائم کر دی تھی۔ سات سوا سکوائر فٹ میں ڈیڑھ کمروں پر مشتمل یہ گھر اس زمانے میں بے گھر خاندانوں کے لیے کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ ماہانہ کرایہ بھی معمولی سا تھا۔ گھر کے دونوں جانب تھوڑی سی جگہ چھوڑ دی گئی تھی جسے صحن کے طور پر استعمال کیا جاتا۔ اوپر چھت کی جگہ گول قسم کے کویلو بچھا دیے گئے تھے جس سے سردی اور گرمی کا احساس نہیں ہوتا اور بارش کی بھی کوئی فکر نہ تھی۔

چونکہ یہ کالونی شہر سے کچھ فاصلے پر تھی اس لے شہر کے مزدوروں کو یہاں رہنا پسند نہ تھا۔ اسی بنا پر بہت سارے مکانات خالی تھے۔ اتفاق سے اسی کالونی میں ایک مکان کا آدھا اگلا حصہ والد صاحب نے کرائے پر لے لیا جس میں ہم رہنے لگے تھے۔ ہم خوش تھے کہ ہم پکے مکان میں رہ رہے ہیں۔ اب تو وہی ہمارے لیے گھر بن گیا تھا۔ عام طور پر گھر میں افراد خانہ کی تعداد وقفہ وقفہ سے بدلتی ہے۔ اسی کلیے کی ضمن میں میرے بعد دو بہنوں اور دو بھائیوں کی آمد نے تعداد میں اضافہ کر دیا۔ چھوٹا سا کمرہ تھا جو ہمارے لے ڈرائنگ روم اور کچن کا کردار ادا کر رہا تھا۔ اسی کمرے میں امی جب جب بھی لکڑیاں جلا کر چولہے پر کھانا بناتی تو کمرے میں چاروں طرف دھوئیں کا بسیرا ہو جاتا۔ باتھ روم کے نام پر سامنے کے اوٹے پر کپاس کی پلکھاٹیوں کو جوڑ کر تین آدھی دیواریں کھڑی کر کے درمیان میں بڑا سا سل نما پتھر رکھ کر پردہ لٹکا دیا گیا تھا۔ یہی ہماری موری کے ساتھ حمام خانہ تھا۔ جس کے تھوڑے ہی فاصلے پر پینے کے پانی کے لیے مٹی سے بنا مٹکا رکھ دیا گیا تھا۔

محلے میں حاجت کے لے سبھی لوگ عمومی بیت الخلا کا رخ کرتے تھے۔ جن لوگوں کو کھلے کی عادت تھی وہ صبح تڑکے یا سورج غروب ہونے پر قریب کے میدان کا رخ کرتے۔ کمال تو یہ ہے کہ عمومی بیت الخلا کی طرح میدانی علاقے کو بھی خواتین و مرد کے لیے تقسیم کر کے حد فاصل کھینچ دی گی تھی۔ جس پر سب سختی سے عمل پیرا تھے۔ اگر کوئی لڑکا بالا غلطی سے ادھر ادھر قدم ڈال دیتا تو اس کے ساتھ اس کے گھر والوں کی بھی شامت آجاتی۔ کئی کئی دنوں تک بحث و تکرار جاری رہتی۔

اسے محض اتفاق ہی جانئے کہ ہمارے نانا، نانی بھی جلگاؤں میں آکر کچھ عرصے کے لیے بس گے تھے۔ ویسے تو وہ 'کاٹیا فایل' میں رہتے تھے مگر نانی اماں ہر ہفتے دوپہر میں ہم سے ملنے بلا ناغہ آجایا کرتی تھیں۔ ہمیشہ کچھ نہ کچھ کھانے کے لے لاتیں اور جاتے ہوئے سب بھائی بہنوں کو آنا دو آنا دے کر جاتیں۔ ہمارے یہاں ان کے آنے جانے سے آس پاس کے مکینوں سے بھی ان کے تعلقات ہو گئے تھے۔ مزاج ہی ایسا تھا کہ سب کی خیریت چاہنا اور مزاج پرسی کرنا۔ نانی نے اپنے گھر میں کچھ بکریاں اور مرغیاں پال رکھی تھیں۔ جب جب بھی کپاس کا سیزن آتا، نانا کو کارخانے سے بلاوا آتا۔ وہ اپنے زمانے کے ماہر فٹر تھے۔ اس لے دو تین ماہ کے

لیے اطراف کے کارخانوں میں جانا پڑتا۔ مشکل یہ تھی کہ وہ اکیلے نہیں جاتے تھے بلکہ پورے خاندان کو ساتھ لے کر جاتے تھے۔ اس دوران ان کی بکریوں اور مرغیوں کی دیکھ بھال کے لئے ہمیں وہاں رہنا پڑتا۔ دونوں محلوں کے درمیان بمشکل فاصلہ میل بھر کا بھی نہ تھا، شارٹ کٹ نے اسے مزید آسان بنا دیا تھا۔ ہم اچھلتے کودتے کبھی ادھر تو کبھی ادھر دندناتے پھرتے۔ اس طرح تین مہینے کیسے گزر جاتے احساس ہی نہ ہوتا۔

ابتدائی تعلیم کا زمانہ تھا۔ والدہ ان پڑھ تھی تو والد صاحب کی تعلیم بھی بس 'دستخط' تک ہی محدود تھی۔ مگر ایک بات یقین سے کہی جا سکتی ہے کہ دونوں کو ہی ہماری تعلیم کی فکر تھی۔ محلے میں چار ذاتی کمروں پر مشتمل شہر میونسپلٹی کا ایک اسکول نمبر 12 تھا۔ جہاں ہم لڑکے لڑکیوں کے ہمراہ مشترکہ طور پر پڑھنے لگے تھے۔ ہفتہ کے چھ دن اسکول چلتا اور جمعہ کے روز تعطیل کر دی جاتی۔ اسکول کی حالت ایسی تھی کہ وہاں بھی پیشاب کے لے پڑوس کی بند پڑی ہوی آئیل مل کا رخ کرنا پڑتا۔

لڑکیاں قریب کے شناسوں کے گھروں میں چلی جاتیں۔ اسکول میں ایک معلّمہ کے علاوہ تین مدرسین اور ایک خادم تھا۔ جس کی مدرسین کے ساتھ ساتھ تمام بچے بھی کسی بزرگ رشتے دار کی طرح عزت کرتے تھے۔ سب انھیں 'رزاق دادا' کہہ کر بلاتے۔ اس زمانے میں ایک رواج تھا بلکہ سرکاری فرمان تھا کہ داخلے کے وقت تاریخ پیدائش سے نابلد طلبہ کی تاریخ بائیں ہاتھ سے کان پکڑ کر 'یکم جون' طے کر لی جائے۔ اسی روایت کے طفیل مجھے بھی پانچ ماہ بڑھا کر اول جماعت میں داخل کرا دیا گیا۔ والد دن بھر مزدوری کے لیے باہر رہتے، والدہ گھر میں مصروف تو ایڈمیشن کا یہ فریضہ بھی پڑوسی کے توسط سے انجام پایا۔ اسکول بیگ کی بجائے کپڑے کی تھیلی میں مٹی سے بنی تختی اور مٹی ہی کی پینڈ کے ہمراہ درسی کتاب کے علاوہ پہاڑوں کی کتاب ہمارا تعلیمی سرمایہ تھا۔ یونیفارم طے تھا مگر میسر نہ ہونے سبب موجودہ کپڑے ہی ہمارا یونیفارم تھا جس کو گوارہ کر لیا جاتا تھا۔ اسکول میں تعلیمی لوازمات برائے نام تھے بیٹھنے کے لیے دری نما پٹیاں تھیں جنھیں لڑکے لڑکیوں کے درمیان فاصلہ رکھ کر بچھایا جاتا۔ حیرت ہے کہ اس پر بیٹھ کر ہمیں تخت طاؤس کا مزہ آتا تھا۔ آج کی طرح ڈیجیٹل کلاس روم تو نہ تھے مگر اس کے باوجود بھی تعلیم کی حصول یابی تھی۔

اساتذہ اور طلباء کیسے یہ سب کر لیتے تھے اب تو یہ تصور سے بھی پرے ہے۔ اس زمانے میں یاد کرائی گئی نظموں میں اسماعیل میرٹھی کی 'گائے' والی نظم آج بھی کانوں میں صدا دیتی ہے:

رب کا شکر ادا کر بھائی
جس نے ہماری گائے بنائی
کھا لیتی ہے سب خوش ہو کر
دانہ دنکا بھوسی چن کر

مجھے اچھی طرح یاد جب ہم تیسری جماعت میں گئے تو مکتوب نگاری کرنے لگے تھے۔ ہمارے ہاتھ کا لکھا خط والد کے نام پوسٹ کیا گیا تو وصول ہونے پر ہم نے ہی گھر پر پڑھ کر سنایا تھا۔ اس وقت والدین کے چہرے دیدنی تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس پر بزبان مراٹھی پتہ جناب نے ہی درج کیا تھا۔

والد صاحب نے جب دیکھا کہ مجھے پڑھنا آ گیا ہے تو وہ باقاعدگی سے ہفتہ واری اخبار 'نشیمن' ہر ہفتے خرید کر لانے لگے۔ جس دن اخبار آتا اسی دن شام میں مجھے اس کی بلند خوانی کرنی ہوتی۔ میں بخوشی وہ آٹھ صفحاتی جہازی سائز کا اخبار آدھے گھنٹے میں سنا کر فارغ ہو جاتا۔ اسی طرح جب کبھی میں ان کے ہمراہ بازار جاتا تو مراٹھی میں لکھے دکانوں کے سائن بورڈ پڑھ کر سنانا میری ذمہ داری تھی جس کے عوض مجھے بطور انعام ایک آنہ ملتا تھا۔

چار درجے آسانی سے پاس کر لینے کے بعد معاملہ اپر پرائمری تعلیم کا آیا تو ہماری مرضی جانے بغیر دوسرے محلے پونا فایل کی اسکول نمبر 13 میں، میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ محلّہ بھی گیندامل کے مزدوروں کے لے بسایا گیا تھا۔ اس علاقے کی خوبی یہ تھی کہ یہاں کے مکیں اپنے آپ کو زیادہ تعلیم یافتہ اور ترقی پسند سمجھتے تھے۔ مزدوروں کی فلاح بہبود کے لیے بہت سی اسکیموں کو یہاں نافذ کرنے کی کوشش کی گئی تھی جن میں تفریح کے لیے ساج کلیان کیندر کا قیام تھا۔ جہاں اخبارات رسائل پڑھنے کو مل جاتے تھے۔ ایک طرف کیرم کلب بھی تھا۔ لڑکے لڑکیوں کا اختلاط یہاں بے معنی تھا۔ اس لیے ہم لڑکے لڑکیوں کے گھر آنے جانے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے تھے۔ ہفتہ واری تعطیل یہاں آنے پر جمعہ کی بجائے اتوار کو کر دی گئی تھی۔

ہمیں یہاں سے اس محلے میں جانے کے لیے ایک پل سے گزرنا پڑتا تھا۔ مگر قریب ہی ریلوے برج بھی تھا جو ٹرین سے آنے والے مسافروں کے لیے مخصوص تھا۔ جتنے بچوں نے چوتھا درجہ پاس کیا اس کے نصف بچے وہاں جانے لگے اور بقیہ زمانے کی گردش میں کہاں گم ہوے اس کا ابھی تک کسی کو پتہ نہ چل سکا۔ اب یہاں دو محلے کے طلباء تھے۔ بیرون محلہ ہجرت کر کے آنے والے کم تھے۔ ظاہر سی بات ہے کہ ان کے ساتھ طلباء اور اساتذہ کا نظریہ بھی روایت کے مطابق عجیب سا ہونا چاہئے جو کچھ حد تک تھا بھی۔

گیارہ بجے اسکول کا وقت شروع ہوتا تھا، مگر ہم صبح دس بجے سے نکل کر 'غلام غوث' کے گھر جمع ہوتے ہاتھوں میں تھیلی نما دفتر اور کپڑے کی پوٹلی میں دوپہر کا کھانا۔ مزدوری والے گھروں میں کھانے کے اوقات متعین نہیں ہوتے لہٰذا زیادہ تر بچوں کی پوٹلی میں رات کی بچی ہوی جوار کی باسی روٹی اور اچار کی قاشیں ہوا کرتیں۔ مجھے حیرت ہے کہ کبھی اسکول کے کسی خالی کمرے یا پھر پلیٹ فارم کے کنارے بیٹھ کر ہم بڑے مزے سے مل جل کر کھایا کرتے تھے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی دعوت ہو رہی ہے۔ پلیٹ فارم پر لگے نل پر ہی سیر ہو کر پانی پیتے ہوے اچھل کود کرتے ہوے دوبارہ کلاس میں جاتے۔ یہاں احاطے میں پیشاب خانہ تھا جو بعض

مرتبہ مسیں بھیگنے والے بچوں کی کھسر پھسر کا اڈہ بن جاتا تھا۔ پیاس بجھانے اکثر بچے ملحقہ مسجد جاتے اور بانگی صاحب کی ڈانٹ سن کر دوڑے دوڑے واپس آتے۔ اسکول میں دن کیسے گزر جاتا احساس ہی نہ ہوتا۔ اسکول کو جاتے تو لگتا کسی جنگی محاذ کے لے روانگی ہورہی ہے اور واپسی پر اگر چہ کہ پیٹ خالی ہوتا تھا مگر مٹر گشتی میں ایک دوسرے کو پیچھے چھوڑنے میں کوئی کسر نہیں رکھی جاتی تھی۔ راستے میں کوئی شناسا مل جاتا تو شرافت دوڑ کر آجاتی اور نظریں نیچے ہو جاتی۔ جانے والا حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر آگے بڑھ جاتا تو کچھ لمحے بعد ہی ہنسی کے پھوارے پھوٹنے لگتے۔

مجھے اچھی طرح یاد جب ہم لوگوں کو سیر کے لیے گرنا ندی پر لے جایا گیا تھا۔ نیم کھڑی گاؤں کے قریب لب سڑک بنے سرائے میں بیٹھ کر فلمی گانے گا کر سب نے آسمان سر پر اُٹھالیا تھا۔ صفیہ کی آواز میں وہ گیت:

او میرے پیار آجا، بن کے بہار آجا

آج بھی یادوں کے گوش میں رس گھولتا ہے۔ گرنا ندی کے ٹھنڈے پانی میں نہاتے ہوئے لڑکوں نے پل سے گزرتی ریل کے مسافروں کو ہاتھ ہلا ہلا کر متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر کسی نے بھی ہماری طرف نہیں دیکھا تھا۔ اندر ہو یا باہر گھر جیسی تربیت تھی۔ دباؤ نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ البتہ ایک قسم کا اخلاقی نظام تھا کہ پڑھائی کی طرف خود بخود رغبت بڑھنے لگی تھی۔ کچھ اساتذہ تو باپ کا نعم البدل تھے۔ محمود شاہ نے اس وقت حساب کی مد میں اوسط نکالنے کا طریقہ، شرح سود اصل زر اور کل زر کے ساتھ ترسیم کی جو لکیر اس وقت کھینچی تھی اس کے نشانات ذہن کے پردے پر اب بھی صاف دکھائی دیتے ہیں۔ پی ایس سی امتحان کی تیاری میں ان کا جواب نہ تھا۔ جو بچہ بھی یہ امتحان پاس کر لیتا ذہانت کی طوق گلے میں ڈال کر دندناتا پھرتا۔ اگر عمر کی اٹھارویں منزل پر آجاتا تو معلّمی کے درجہ پر فائز ہو جاتا۔ میری یادوں کے ذخیرے میں وہ واقعہ آج بھی روشن ہے۔ جب غلام محمد ناظر انصاری اچانک ہماری کلاس میں آگئے تھے۔ ناظر انصاری کا جوابی پرچہ لیکر کلاس میں آنا اور نام کی درستی کروانا اسی وقت کا کارنامہ ہے، ورنہ برسوں تک جو نام ہی غلط لکھتا رہا اس کی تصحیح کیوں کر ہو پاتی۔ بہت دیر بعد معلوم ہوا کہ بچوں کو الف ب کی گردان پڑھانے والا یہ شخص برصغیر کا نامور شاعر اور نقاد تھا۔ ایسے گھنے درخت کے زیر سایہ جو بھی پودا پروان چڑھے گا اس میں ادب کی کچھ تو بوآئے گی۔

اسی کے ساتھ ساتھ ہماری عربی تعلیم کا بھی نظم تھا۔ حیرت کرنے والی بات یہ ہے کہ شہر میں ہمارا ہی ایک محلّہ ایسا تھا جہاں مسلم آبادی خاصی ہونے کے باوجود کوئی مسجد نہ تھی۔ خیر سے کچھ فاصلے پر مسلمانوں کا ایک بورڈنگ اسکول تھا جس سے ملحق ایک مسجد تھی جسے دن کے اوقات میں اسکول کے اساتذہ وطلباء آباد کرتے تھے؛ محلے والے بھی نماز کے لیے یہیں آیا کرتے تھے۔ اسکول والوں نے مسجد کی امامت کے ساتھ صاف صفائی کے علاوہ دیکھ بھال کی ذمہ داری بھی محلے کے ذمے داروں کے سپرد کر دی تھی۔

امامت کے لیے بھی کوئی مقرر نہ تھا۔ کبھی نثار سیٹھ تو کبھی بقائی حضرت یہ فریضہ انجام دے دیا کرتے تھے۔ میں نے شروع شروع میں ان ہی دو بزرگ حضرات کی قیادت میں نماز ادا کی پھر جب حافظ محمد یوسف کا باقاعدہ تقرر عمل میں آیا تو میری نمازوں میں بھی باقاعدگی کے ساتھ ترتیب آ گئی۔ وہ ہمیں نماز پڑھانے کے ساتھ عربی قاعدہ بھی پڑھایا کرتے تھے۔ پہلے پہل مسجد میں، پھر محلے ہی میں عربی کی تعلیم کا نظم کر دیا گیا۔ مل کالونی کے قائم کردہ گھروں میں سے ایک گھر ہندوؤں کو جہاں انھوں نے 'اکھاڑہ' مطلب ورزش گاہ بنا دی تو مسلمانوں کے تصرف میں آنے والے گھر کو 'انجمن' کا نام دے کر مدرسہ شروع کر دیا گیا۔

حافظ محمد یوسف کی سختی اور تعلیم نے رنگ دکھایا۔ بچے مہذب اور نماز میں رغبت لینے لگے۔ مدرسہ کا وقت مغرب بعد کا تھا اس لے صبح کی فرصت کو والد صاحب نے منشی جی کے حوالے کر دیا۔ اس طرح روز آنہ صبح منشی جی کی گھڑی کی دکان پر تو شام کو انجمن میں عربی تعلیم کا سلسلہ چل پڑا۔ صبح شام عربی اور دوپہر کو اسکول نے دن بھر کے لے مصروف کر دیا۔

اس وقت شروع میں یہ گراں گزرتا تھا مگر کچھ عرصے بعد عادت سی ہوگی۔ آج خیال آتا کہ زندگی میں جو تھوڑا بہت دینی و دنیوی شعور ہے شاید انہیں دنوں کی محنت کا ثمرہ ہے۔ اتوار کی تعطیل اکثر سیر سپاٹے میں گزرتی۔ ایک دفعہ یوں ہوا کہ ہمارے ٹولے نے سامنے کے کھیتوں سے گزرتے ہوئے آم کے باغوں کا رخ کر لیا۔ کچے آموں کا موسم تھا درختوں پر آم کے پھولوں کی بہار تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے درختوں پر پتھر برسنے لگے۔ سالدار جو سویا ہوا تھا بیدار ہو کر دوڑا چلا آیا اور ڈانٹنے لگا۔ مگر کسی کی کون سنتا۔ پریشان ہو کر مارے خوف کے وہ شنکر بھیا کو آواز دینے لگا۔ اوہ شنکر بھیا، جلدی آؤ۔ تبھی کسی نے کہا کہ یہ شنکر بھیا کون ہے؟ دوسرے ہی لمحے سالدار نے خوف زدہ آواز میں کہا کہ وہ ہمارا مددگار ہے اور ہم اس کے مددگار ہیں۔

(2)

ابتدائی تعلیم کا مرحلہ طے ہوا تو ہائی اسکول میں جانے کی تیاری کرنے لگے۔ بزرگوں سے معلوم ہوا کہ آزادی سے قبل یہاں ایک ہی سرکاری اسکول تھا جہاں ہندو مسلم بچے اکھٹے پڑھا کرتے تھے۔ پرائمری اردو مدارس کے پرانے رجسٹروں میں پسماندہ غیر مسلم بچوں کے نام آج بھی درج ہیں۔ کیونکہ اس وقت اردو ذریعہ تعلیم کا رواج زیادہ تھا۔ بیرون شہر سے آنے والے بچوں کے قیام کا مسئلہ تھا۔

اسی لے غالباً 1942ء میں حاجی حسین آئیل مل والوں نے طلبہ کے لیے بورڈنگ کا قیام عمل میں لایا۔ دو قطاروں والی اس عمارت میں ایک طرف چند پکے کمروں کی قطار تو سامنے انگریزی کویلوں سے بنے کچھ زائد کمروں کی قطار تھی۔ پڑوس میں مسجد تھی۔

آزادی کے بعد اسے ہائی اسکول میں تبدیل کر دیا گیا۔ جس نے کلکٹر، کیپٹن اور میجر جیسے افراد پیدا

کر کے فارغ کیے۔ حسن اتفاق سے یہی ہائی اسکول ہماری ثانوی تعلیم کی آماجگاہ بن گئی۔ اسکول جانا پہچانا تھا کیونکہ نماز کے لیے وہیں سے ہو کر اکثر گزرتے تھے۔ صدر مقام ہونے سے ہمارے وقت بھی یہی ضلع کا واحد اسکول رہا جہاں شہر اور اطراف کے بچے اکٹھے تعلیم حاصل کرتے۔ تعداد کے لحاظ سے عمارت طلبہ کے لیے کافی تو نہ تھی مگر پھر بھی غنیمت تھی۔ اس وقت اسکول کے اطراف میں آبادی نہیں تھی۔

اسکول کو لگ کر کھیت تھے۔ بڑے سے میدان میں پولیس والوں کے لیے بنائی ہوئی چھوٹی سی پہاڑ نما ٹیکڑی تھی جسے 'چاند ماری' کہا جاتا۔ یہ نام کیسے پڑا کس نے دیا آج تک معلوم نہ ہو سکا۔ چاند کو مارنے کا جواز کیا ہے۔؟ ابتک سمجھ میں نہیں آیا۔ ہفتے میں ایک دن غیر تربیت یافتہ پولیس سپاہی وہاں بندوق چلانے کی مشق کرتے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ان کی رہائش کے لیے انگریزوں کے زمانے کی قائم کردہ کالونی تھی۔ جسے 'پولیس لائن' کہتے تھے جو آج بھی موجود ہے۔ مگر اس کی ہیت بدل چکی ہے۔ جہاں جہاں جگہ خالی تھی حکومت نے کثیر منزلہ عمارتیں تعمیر کر کے بھر دی۔ اس کے باوجود کوارٹر کی کمی کی شکایات آئے دن سننے کو ملتی رہتی ہیں۔

لب سڑک اسٹنٹ ڈی ایس پی آفس کی عمارت نے شہر کی خوبصورتی میں اضافہ کر دیا ہے۔ اسکول سے ملحق مسجد کی اس زمانے میں بناوٹ بھی پرانے طرز کی تھی۔ بیت الصلوٰۃ میں بمشکل تین صفوں کی گنجائش ہوا کرتی تھیں۔ مگر احاطہ اس قدر وسیع تھا کہ اس میں آم کے دو درخت لہلہایا کرتے۔ سامنے مہندی کی کیاریاں لگا نے سے منظر شاداب ہو گیا تھا۔ احاطے میں لمبی سی پانی کی ٹنکی بنا کر آٹھ دس نلکے جوڑ دیے گئے تھے۔ جس کے سامنے بیٹھ کر لوگ وضوء کیا کرتے۔ نلکے نیچے کی جانب زیادہ جھکے ہونے سے نمازیوں کو بیٹھنے میں دقت ہوتی اس لے لکڑی کے کچھ تختے رکھ دیے گئے تھے۔ جن کو اکڑو بیٹھ کر وضو کرنے میں دقت تھی تختوں کے سبب آسانی ہو گئی تھی۔ ٹنکی کو ہی لگ کر چھوٹا سا حمام خانہ بنانے سے امام صاحب اور مسافروں کے نہانے کا نظم ہو گیا تھا۔ وضو کی ٹنکی کا ایک نل حمام خانے میں لگا دینے سے پانی باہر سے لانے لے جانے کی جھنجھٹ نہ تھی۔ گرمیوں کی دوپہر میں جب بھی مسجد خالی ہوتی اور نہانے کا جی ہوتا تو ہم بلا دریغ بہت سارے پانی کو استعمال میں لا کر گرمی سے نجات پاتے۔ غسل خانے کو لگ کر ہی ایک کمرہ تھا۔ جو امام صاحب کا 'حجرہ' کہلاتا تھا۔ ویسے امام صاحب مقامی تھے اس لیے بہت کم اس کا استعمال کرتے نماز عشاء پڑھانے کے بعد سائیکل سے گھر چلے جاتے۔ مگر حیرت ہوتی کہ فجر میں بروقت آجاتے۔

کمرے میں اکثر بیرونِ شہر سے ملازمت یا کسی اور غرض سے آنے والوں کا ڈیرہ رہتا۔ مگر میں نے ایک یا دو سے زیادہ لوگوں کو وہاں کبھی نہیں دیکھا۔ اکثر ان مسافروں سے ہماری دوستی ہو جاتی۔ اور وہ ہمیں عشاء کے بعد چائے پلانے اسٹیشن کی طرف لے جاتے تو خوشی سے ہم پھولے نہ سماتے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر چار عدد پرانے طرز کے ڈبے والے بیت الخلا تھا؛ جو اسکول کے طلباء اور اساتذہ کے استعمال میں آیا کرتا۔ سچی بات

تو یہ ہے کہ اساتذہ سے زیادہ مسجد میں آنے جانے والوں کا ہی اس پر تصرف زیادہ تھا۔ہم لوگ بھی کبھی کبھار وہاں بڑے حق سے فارغ ہوجایا کرتے۔ان دنوں میلا ڈھونے کے لیے ہاتھ گاڑی لے کر 'مہترانی' آیا کرتی تھی۔کبھی کبھی اس کے آنے میں دیر ہوجاتی تو فضلہ نالی کے باہر نکل کر بہنے لگتا۔بفاتی حضرت دیر تک اسے دیکھتے رہتے، تو لڑکے کہتے ابھی معائنہ ہو رہا ہے جلد ہی سائنس کا نیا تجربہ ہوگا۔اور پھر سب ایک ساتھ ہنسنے لگتے۔حافظ محمد یوسف سے قبل نثار سیٹھ نماز پڑھایا کرتے تھے۔وہ زیادہ پڑھے لکھے تو نہ تھے مگر جمعہ کے خطبے کے لیے غنیمت تھے۔تقریر کے فن سے واقف نہ تھے۔بات کرنے میں بھی احتیاط کرتے۔سر پر پرانے طرز کا صافہ اور سفید قمیض پاجامے میں ملبوس وہ شخص جب خطبے کے لیے عصاء سنبھالے ممبر پر کھڑا ہوتا تو سادگی کے ہمراہ تقدس بھی ظاہر ہوتا۔اکثر وہ کسی پرانی کتاب سے اردو کا منظوم خطبہ پڑھ کر سناتے۔جس کے اشعار آج بھی کانوں میں محفوظ ہیں:

اے خدا ہم تجھے بھولے ہیں تو نہ ہم کو بھول جا

سن کر بعض مصلیان کی آنکھیں نم ہوجاتیں۔کبھی کبھار اچانک طور پر قاری مقیم الدین کہیں سے وارد ہوجاتے تو مسجد کا سماں ہی بدل جاتا۔ان کے ساتھ پریشانی یہ تھی کہ نہ ان کے آنے وقت طے تھا نہ ہی جانے کا۔جمعہ کے دن اگر ان کی آمد ہوجائے تو خطبہ وہی دیتے۔وہ اپنے دور کے جید دینی عالم، قاری کے ساتھ عصری علوم میں عثمانیہ یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے۔بعض لوگوں کا تو یہ بھی کہنا تھا کہ وہ عامل بھی تھے۔مگر سقوط حیدرآباد کے سبب دماغ انتشار کا شکار ہوگیا۔اس حادثے میں وہ اپنے کی عزیز واقارب کے ساتھ بے شمار مال ومتاع کھو چکے تھے۔اسی لے طبیعت میں آگ بھرگئی تھی، غصہ بس گیا تھا۔جس کا اظہار وقتاً فوقتاً لاشعوری طور پر وہ کیا کرتے تھے۔لوگوں کو ان کے مزاج کا علم تھا اس لیے کوئی بھی ان کی باتوں اور حرکتوں کا برا نہیں مانتا تھا۔

مجھے یاد ہے جب ایک مرتبہ وہ جمعہ کا عربی خطبہ دے رہے تھے۔پتہ نہیں کسی آیت پر اچانک رک گئے اور ممبر سے اتر کر نیچے کھڑے ہو کر تقریر کرنے لگ گئے۔حالات حاضرہ پر بولے جارہے تھے یوں لگ رہا تھا گویا معلومات کا سمندر پھوٹ پڑا ہے۔لوگ ہمہ تن گوش تھے۔تھوڑی دیر بعد جب حواس یکجا ہوے تو دوبارہ خطبہ دینے ممبر کی طرف مڑ گے۔ہم بچے ان کی تقریر سے محظوظ ہوتے اور زبان و بیان کا انداز سیکھنے کی کوشش کرتے۔ان کی آواز میں غضب کی جاذبیت تھی ہمیں زیادہ کچھ سمجھ میں تو نہیں آتا تھا مگر جی چاہتا تھا کہ سنتے چلے جائیں۔وہ اکثر بچوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔ایک دفعہ یوں ہوا کہ بعد نماز عشاء، ہم ان کے ہمراہ چائے پینے اسٹیشن کی طرف چلے گئے۔ایک کپ چائے پینے کے بعد طبعیت سیر نہ ہوئی تو بلا تکلف کہنے لگے ایک پیالی اور منگوا لیجیے۔چائے سے فراغت کے بعد پاس میں بیٹھے ایک غیر مسلم قلی کا نام دریافت کرنے کے بعد راست انداز میں اسے کہنے لگے کہ 'بھائی صاحب آپ اسلام قبول کرلیجیے نہ'۔اچانک اس طرح کے سوال

کے لیے وہ ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔ چند لمحوں بعد غصے سے کہنے لگا 'جاؤ جاؤ! اب ہم تمہاری باتوں میں نہیں آنے والے۔ مغلوں نے کافی لوگوں کو پھنسایا ہے۔

ایسے میں وہاں سے روانگی ہی میں ہم نے عافیت جانی اور نکل پڑے۔ بعد نماز عصر مسجد میں اکثر سید عمر علی پوسٹ مین تلاوت میں مصروف رہتے۔ ان کی آواز بڑی باریک تھی۔ قاری مقیم الدین مسجد میں ہوتے تو ان سے مخاطب ہوکر کہنے لگتے 'خطوط رسان صاحب' آپ کی آواز بڑی 'زنانہ' ہے۔ اس آیت کو اس طرح نہیں اس طرح پڑھیے اور پھر وہ تلاوت میں یوں کھو جاتے جیسے اس دنیا کے نہیں بلکہ کسی اور جہاں کے باسی ہیں۔ محلے میں کسی کے بھی گھر بلا تکلف چلے جاتے مگر پردے کا پورا خیال رکھتے۔ حق سے کھانے کے لیے مانگتے اور بنا بتائے چلے جاتے۔

ایک بار یوں ہوا کہ شبیر سر عصر کی جماعت ہو جانے کے بعد مسجد آئے تو انھیں دیکھ کر کہنے لگے کہ 'جماعت کے اوقات کی پابندی کیا کیجیے۔'

شبیر سر تھکے ہارے اور بھرے ہوئے تھے الٹ کر کہنے لگے: 'میں آپ کی طرح بے کار نہیں ہوں۔'

قاری مقیم الدین آپے سے باہر ہو کر کہنے لگے کہ 'گھنٹی کے غلام جماعت کی اہمیت کو سمجھ۔ جماعت کا ثواب زیادہ ہے۔'

مسجد میں آنے والوں کی اکثریت سیدھے سادے لوگوں کی تھی۔ زیادہ تر لوگ 'تبلیغی جماعت' سے متاثر تھے۔ ہم میں سے اگر کسی کو پتلون میں دیکھ لیتے تو کہتے یہ دیکھو آگئی پتلون والوں کی جماعت۔ کسی کے ہاتھ میں اگر غلطی سے بھی نصابی کتاب نظر آجائے تو کہنے لگتے ایسی کتابیں مت پڑھا کرو ذہن خراب ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ان کے اندر کا مبلغ اچانک جاگ جاتا اور وہ ہمیں روک کر عملی طور پر نماز کی مشق کرانے لگتے۔ اگر کوئی غلطی کرتا تو مارتے۔ ایک کوئی مار کھاتا تو دوسرا ہنسنے لگتا۔ اس طرح باری باری سبھی کو مار پڑتی۔ یوسف بھائی کو تقریر کا بڑا شوق تھا۔ حدیث کے حوالے دیتے اور بولتے بولتے بھول جاتے تو خفت مٹانے اور تقریر جاری رکھنے کی خاطر 'محترم بزرگوں اور دوستو' بار بار دوہراتے۔ ادھر ہم لوگ منہ پر ہاتھ رکھے ہنسی کے غبارے پھوڑنے لگتے۔

محلے کے لوگوں کی سادگی بھی عجیب تھی۔ میونسپلٹی میں برسوں سے ایک ہی غیر مسلم آدمی کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے کثیر ووٹوں سے چن کر آرہا تھا۔ پورے 25 برسوں میں کبھی کسی کو خیال نہیں آیا کہ ایک آدھ بار اپنی مرضی کے آدمی کو بھی نمائندگی ملنی چاہیے۔ عیسیٰ مکرم نامی شخص باقاعدگی سے ہر بار فارم بھرتا ضرور مگر الیکشن سے ہفتہ بھر پہلے ہی پیچھے ہٹ جاتا۔ حالانکہ وہ ممبر بھی بے ضرر تھا۔ کیونکہ کمیونزم کا فلسفہ تو دور میونسپل قاعدے قانون سے بھی وہ نابلد تھا۔ پٹوں کے کپڑے کی چڈی اور بنیان پہنے کندھے پر طولیہ اوڑھے گھر کے باہر کرسی لگائے بیٹھا رہتا۔ سیدھے ہاتھ کی کر انگلی سے پیلا ہاتھی سیگریٹ کے کش ہوا میں چھوڑتے ہوئے اکثر قہقہے لگایا کرتا۔

تو یہ ہے کہ اساتذہ سے زیادہ مسجد میں آنے جانے والوں کا ہی اس پر تصرف زیادہ تھا۔ ہم لوگ بھی کبھی کبھار وہاں بڑے حق سے فارغ ہوجایا کرتے۔ ان دنوں میلا ڈھونے کے لیے ہاتھ گاڑی لے کر 'مہترانی' آیا کرتی تھی۔ کبھی کبھی اس کے آنے میں دیر ہوجاتی تو فضلہ نالی کے باہر نکل کر بہنے لگتا۔ بفاتی حضرت دیر تک اسے دیکھتے رہتے، تو لڑکے کہتے ابھی معائنہ ہورہا ہے جلد ہی سائنس کا نیا تجربہ ہوگا۔ اور پھر سب ایک ساتھ ہنسنے لگتے۔ حافظ محمد یوسف سے قبل نثار سیٹھ نماز پڑھایا کرتے تھے۔ وہ زیادہ پڑھے لکھے تو نہ تھے مگر جمعہ کے خطبے کے لیے غنیمت تھے۔ تقریر کے فن سے واقف نہ تھے۔ بات کرنے میں بھی احتیاط کرتے۔ سر پر پرانے طرز کا صافہ اور سفید قمیض پاجامے میں ملبوس وہ شخص جب خطبے کے لیے عصاء سنبھالے ممبر پر کھڑا ہوتا تو سادگی کے ہمراہ تقدس بھی ظاہر ہوتا۔ اکثر وہ کسی پرانی کتاب سے اردو کا منظوم خطبہ پڑھ کر سناتے۔ جس کے اشعار آج بھی کانوں میں محفوظ ہیں:

اے خدا ہم تجھے بھولے ہیں تو نہ ہم کو بھول جا

سن کر بعض مصلیان کی آنکھیں نم ہوجاتیں۔ کبھی کبھار اچانک طور پر قاری مقیم الدین کہیں سے وارد ہوجاتے تو مسجد کا سماں ہی بدل جاتا۔ ان کے ساتھ پریشانی یہ تھی کہ نہ ان کے آنے وقت طے تھا نہ ہی جانے کا۔ جمعہ کے دن اگر ان کی آمد ہوجائے تو خطبہ وہی دیتے۔ وہ اپنے دور کے جید دینی عالم، قاری کے ساتھ عصری علوم میں عثمانیہ یونیورسٹی کے گریجویٹ تھے۔ بعض لوگوں کا تو یہ بھی کہنا تھا کہ وہ عامل بھی تھے۔ مگر سقوط حیدرآباد کے سبب دماغ انتشار کا شکار ہوگیا۔ اس حادثے میں وہ اپنے کی عزیز واقارب کے ساتھ بے شمار مال ومتاع کھو چکے تھے۔ اسی لے طبیعت میں آگ بھر گئی تھی، غصہ بس گیا تھا۔ جس کا اظہار وقتاً فوقتاً لاشعوری طور پر وہ کیا کرتے تھے۔ لوگوں کو ان کے مزاج کا علم تھا اس لیے کوئی بھی ان کی باتوں اور حرکتوں کا برا نہیں مانتا تھا۔

مجھے یاد ہے جب ایک مرتبہ وہ جمعہ کا عربی خطبہ دے رہے تھے۔ پتہ نہیں کسی آیت پر اچانک رک گئے اور ممبر سے اتر کر نیچے کھڑے ہوکر تقریر کرنے لگ گئے۔ حالات حاضرہ پر بولے جارہے تھے یوں لگ رہا تھا گویا معلومات کا سمندر پھوٹ پڑا ہے۔ لوگ ہمہ تن گوش تھے۔ تھوڑی دیر بعد جب حواس یکجا ہوے تو دوبارہ خطبہ دینے ممبر کی طرف مڑ گے۔ ہم بچے ان کی تقریر سے محظوظ ہوتے اور زبان وبیان کا انداز سیکھنے کی کوشش کرتے۔ ان کی آواز میں غضب کی جاذبیت تھی ہمیں زیادہ کچھ سمجھ میں تو نہیں آتا تھا مگر جی چاہتا تھا کہ سنتے چلے جائیں۔ وہ اکثر بچوں کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔ ایک دفعہ یوں ہوا کہ بعد نماز عشاء ہم ان کے ہمراہ چائے پینے اسٹیشن کی طرف چلے گئے۔ ایک کپ چائے پینے کے بعد طبیعت سیر نہ ہوئی تو بلا تکلف کہنے لگے ایک پیالی اور منگوا لیجیے۔ چائے سے فراغت کے بعد پاس میں بیٹھے ایک غیر مسلم قلی کا نام دریافت کرنے کے بعد راست انداز میں اسے کہنے لگے کہ 'بھائی صاحب آپ اسلام قبول کر لیجیے نہ'۔ اچانک اس طرح کے سوال

کے لیے وہ ذہنی طور پر تیار نہ تھا۔ چند لمحوں بعد غصے سے کہنے لگا' جاؤ جاؤ! اب ہم تمہاری باتوں میں نہیں آنے والے۔ مغلوں نے کافی لوگوں کو پھنسایا ہے۔

ایسے میں وہاں سے روانگی ہی میں ہم نے عافیت جانی اور نکل پڑے۔ بعد نماز عصر مسجد میں اکثر سید عمر علی پوسٹ مین تلاوت میں مصروف رہتے۔ ان کی آواز بڑی باریک تھی۔ قاری مقیم الدین مسجد میں ہوتے تو ان سے مخاطب ہو کر کہنے لگتے 'خطوط رسان صاحب' آپ کی آواز بڑی 'زنانہ' ہے۔ اس آیت کو اس طرح نہیں اس طرح پڑھیے اور پھر وہ تلاوت میں یوں کھو جاتے جیسے اس دنیا کے نہیں بلکہ کسی اور جہاں کے باسی ہیں۔ محلے میں کسی کے بھی گھر بلا تکلف چلے جاتے مگر پردے کا پورا خیال رکھتے۔ حق سے کھانے کے لیے مانگتے اور بنا بتائے چلے جاتے۔

ایک بار یوں ہوا کہ شبیر سر عصر کی جماعت ہو جانے کے بعد مسجد آئے تو انھیں دیکھ کر کہنے لگے کہ 'جماعت کے اوقات کی پابندی کیا کیجیے'

شبیر سر تھکے ہارے اور بھرے ہوئے تھے الٹ کر کہنے لگے: 'میں آپ کی طرح بے کار نہیں ہوں'

قاری مقیم الدین آپے سے باہر ہو کر کہنے لگے کہ 'گھنٹی کے غلام جماعت کی اہمیت کو سمجھ۔ جماعت کا ثواب زیادہ ہے'

مسجد میں آنے والوں کی اکثریت سیدھے سادے لوگوں کی تھی۔ زیادہ تر لوگ 'تبلیغی جماعت' سے متاثر تھے۔ ہم میں سے اگر کسی کو پتلون میں دیکھ لیتے تو کہتے یہ دیکھو آ گئی پتلون والوں کی جماعت۔ کسی کے ہاتھ میں اگر غلطی سے بھی نصابی کتاب نظر آ جائے تو کہنے لگتے ایسی کتابیں مت پڑھا کرو ذہن خراب ہوتا ہے۔ کبھی کبھی ان کے اندر کا مبلغ اچانک جاگ جاتا اور وہ ہمیں روک کر عملی طور پر نماز کی مشق کرانے لگتے۔ اگر کوئی غلطی کرتا تو مارتے۔ ایک کوئی مار کھاتا تو دوسرا ہنسنے لگتا۔ اس طرح باری باری سبھی کو مار پڑتی۔ یوسف بھائی کو تقریر کا بڑا شوق تھا۔ حدیث کے حوالے دیتے اور بولتے بولتے بھول جاتے تو خفت مٹانے اور تقریر جاری رکھنے کی خاطر 'محترم بزرگوں اور دوستو' بار بار دوہراتے۔ ادھر ہم لوگ منہ پر ہاتھ رکھے ہنسی کے غبارے پھوڑنے لگتے۔

محلے کے لوگوں کی سادگی بھی عجیب تھی۔ میونسپلٹی میں برسوں سے ایک ہی غیر مسلم آدمی کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے کثیر ووٹوں سے چن کر آ رہا تھا۔ پورے 25 برسوں میں کبھی کسی کو خیال نہیں آیا کہ ایک آدھ بار اپنی مرضی کے آدمی کو بھی نمائندگی ملنی چاہیے۔ عیسیٰ مکردم نامی شخص باقاعدگی سے ہر بار فارم بھرتا ضرور مگر الیکشن سے ہفتہ بھر پہلے ہی پیچھے ہٹ جاتا۔ حالانکہ وہ ممبر بھی بے ضرر تھا۔ کیونکہ کمیونزم کا فلسفہ تو دور میونسپل قاعدے قانون سے بھی وہ نابلد تھا۔ پٹوں کے کپڑے کی چڈی اور بنیان پہنے کندھے پر طولیہ اوڑھے گھر کے باہر کرسی لگائے بیٹھا رہتا۔ سیدھے ہاتھ کی کرانگلی سے پیلا ہاتھی سیگریٹ کے کش ہوا میں چھوڑتے ہوئے اکثر قہقہے لگایا کرتا۔

اس زمانے میں کسی کا کوئی دفتری کام بھی نہیں ہوا کرتا تھا کیونکہ کھانے کمانے میں سب مشغول رہتے۔
ایک سال جب الیکشن قریب آئے تو امیر بڑھلیا نامی شخص کو کچھ لوگوں نے گھیر لیا اور کھڑے ہونے کے لیے اصرار کرنے لگے۔ امیر دادا مل پر ڈیوٹی سے نپٹے تھے، تھکے ہارے تھے الیکشن کا سنا تو خوش ہوئے۔ رات میں میٹنگ ہوئی تو نہا دھو کر کپڑے تبدیل کر کے شریک ہوئے۔ لوگوں نے مدعا بیان کر کے اظہارِ خیال کی دعوت دی۔ کھڑے ہو کر کہنے لگے کہ میں ساڑھے چار بجے ڈیوٹی سے کر کے آیا تو یہ سب معلوم ہوا۔ گھر میں تمہاری بھابھی نے چائے چڑھائی، پی کر ابھی ادھر آیا، اب کل صبح پھر سات بجے ڈیوٹی پر جانا ہے۔ تو یہ تھا ان کا مخاطبہ جسے سن کر نوجوان لڑکے چہ میگوئیاں کرنے لگے۔

آٹھویں جماعت میں داخلے کے لیے تیاری ہونے لگی۔ آٹھ آنے دے کر جب فارم لیا تو سمجھ میں آیا کہ یہ تو ایک سایکلو اسٹال کاغذ ہے جس پر نام پتہ درج کرنا ہے۔ والد کی سالانہ آمدنی کو بطور خاص درج کرنا ہے۔ جس سے فیس کا معاملہ طے ہونا ہے۔ ہم نے دیکھا ایک بوہری لڑکے نے آمدنی کے کالم میں جھیرو لکھ کر لایا تھا۔ ہم ہنسنے لگے تو اس کے والد نے کہا کام ہی نہیں تو آمدنی کہاں سے ہوگی؟ ہم نے دوستوں سے مشورہ کر کے کم سے کم آمدنی دکھلائی۔ ویسے اس کی ضرورت بھی نہ تھی۔ کیونکہ وہ تو تھی ہی کم۔ فارم لے کر ہم آفس پہنچے۔ آفس کیا تھا درمیان کا ایک کلاس روم تھا جس کے دروازے کی اوپری سطح پر جلی حرفوں میں آفس لکھ دیا گیا تھا۔ درمیان میں لکڑی کے پارٹیشن سے کمرے کو دو حصوں میں منقسم کر دیا گیا تھا۔ پہلے حصے میں ہیڈ ماسٹر صاحب کے لیے ایک کرسی اور سامنے میز رکھ کر دو کرسیاں مزید رکھ دی گی تھیں۔

پارٹیشن کے پرے دادا کی نشست تھی۔ اساتذہ انھیں 'شیخ صاحب' تو بچے 'دادا' کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ ان کی شخصیت بھی عجیب تھی۔ زیادہ تر وہ خاموش ہی رہتے۔ بچے کسی کام سے جاتے تو اکثر غصہ کرتے۔ ان کے بدن پر ہمیشہ سفید پاجامے پر کالا کوٹ ہوتا جس کی ایک جیب میں چھوٹی سی شیشی ہوا کرتی تھی۔ ہم بچوں کو وہ دوائی جیسا محلول نظر آتا، سامنے بڑی سی میز تھی۔ جس پر وہ لکھنے میں مصروف رہتے۔ میز اکثر رجسٹر وں اور فائلوں سے بھری ہوتی۔ پڑوس میں لکڑی سے بنی الماری بھی تھی۔ ہمیں نہیں معلوم کہ اس میں کیا رکھا ہوا تھا۔ دادا نے ادھر داخلہ فارم لیا اور ای بی سی کا چھپا ہوا فارم دے کر بھر کر لانے کو کہا۔ پرائمری والوں نے ٹی سی براہِ راست اسکول والوں کے حوالے کر دینے سے ہم اسے دیکھ بھی نہ سکے تھے۔ اس عرصے میں جس کو جہاں جگہ ملی بیٹھ رہا تھا۔ تین دنوں کے گزرتے ہی سارے نو آمد طلباء کو قطار میں کھڑا کر کے اونچائی کے مطابق آگے پیچھے کر دیا گیا۔ چھوٹے قد والوں کو چھوٹا سمجھ کر لڑکیوں کی جماعت میں بیٹھنے کا حکم صادر ہوا۔ چونکہ ہمارا قد درمیانہ تھا اس لے بی ڈیویزن میں روانہ کیا گیا۔ باقی لمبے قد اور زیادہ عمر والے سی ڈیویزن کے جانب چل پڑے۔ اس طرح ہماری تقسیم ہو جانے پر اگلے روز سے پڑھائی کا آغاز کر دیا گیا۔

ہمارے داخلے کے ساتھ ہی اسی سال زیب النساء میڈم، زہرا بائی اور سلیم سر کا بھی تقرر عمل میں آیا تھا۔ زیب النساء میڈم اردو تو زہرہ بائی جنرل سائنس اور سلیم سر علم الحساب پڑھانے لگے۔ سلیم سر سائنس میں اے گروپ کے گریجویٹ تھے۔ مگر ان ٹرینڈ تھے۔ ایک بات اب تک سمجھ میں نہیں آسکی کہ وہ پڑھاتے اور کلاس میں شور ہونے لگتا تو ہمیں مخاطب کر کے یوں کہتے کہ مجھے نوکری کی ضرورت نہیں ہے۔ اے گروپ کا گریجویٹ ہوں کہیں بھی جا سکتا ہوں۔ ان کے علاوہ کچھ بزرگ اساتذہ ایسے بھی تھے جن کے پاس کوئی ڈگری نہ تھی مگر حیرت ہے کہ پڑھائی میں کوئی ان کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا تھا۔ ان میں ایک شیخ احمد سر تھے جنھوں نے انگریزی اور فارسی پڑھائی تھی۔ فارسی میں پڑھائے ان کے ضمائر آج بھی ازبر ہیں۔ کوئی پرانا ساتھی مل جائے تو ہم آج بھی من، ما، تو، شما، اوں ایشیاں کی گردان الاپنے لگ جاتے۔ نویں جماعت میں جاتے ہی اسکول والوں کو کیا سوجھی کی فارسی کی جگہ عربی پڑھانے کے لیے مولوی صاحب کو مدعو کر دیا۔ ہم بھی کہاں پیچھے ہٹنے والے تھے۔ 'کیف حالکم؟ انت اسم؟' کا، یا شیخ کہہ کر عربی جملہ بندی کرنے لگے۔ مولانا بڑے جید عالم تھے جامع مسجد میں خطیب و امامت کی ذمہ داری کے ساتھ سنیچر کی صبح طلباء کو بنیادی دینی تعلیم پر بیان بھی دیا کرتے تھے۔

دسویں میں آتے ہی پھر پرشین (فارسی) شروع کروادی گئی۔ مگر اس دفعہ پرشین اور انگریزی پڑھانے کی ذمہ داری جن کے طرف دی گئی وہ ٹیوشن کروانے کے حامی تھے۔ جن بچوں نے تعمیل کی، انھیں ششماہی میں زیادہ نمبرات سے نوازا۔ حکم عدولی کے شکار بچوں کے گلے میں ناکامی کا طوق ڈال دیا۔ مگر سالانہ امتحان میں حق باحقدار رسید کی ترجمانی کی گئی۔

آج جب سوچتا ہوں تو ان کے وہ جملے 'اسٹاپ اسٹاپ رائٹنگ' اور 'ڈونٹ ٹاک، ڈونٹ ٹاک' ذہن میں کھلبلی مچا جاتے۔ نویں کلاس سے اکبر رحمانی سر بھی ہماری کلاس لینے لگے تھے۔ ان کے ذمہ اردو زبان دانی اور سوشل اسٹیڈیز جیسے مضامین تھے۔ رحمانی سر کی مشکل یہ تھی کہ انھیں بار بار پونہ جانا پڑتا وہ بال بھارتی کے ساتھ سیکنڈری ایجوکیشن بورڈ کے ممبر تھے دونوں سطح پر نصابی کتب کے تیاری میں ان کا اہم رول ہوا کرتا تھا۔ اس لیے وہ اکثر کلاس نہیں لے پاتے۔ مگر جب جب بھی ان کی کلاس ہوتی وہ جی جان توڑ کر پڑھایا کرتے تھے۔ غیر حاضری کے دنوں کی تلافی زائد کلاس لیکر کر دیا کرتے تھے۔ جب بھی موڈ میں ہوتے ٹھیٹ 'خاندیسی' لہجہ پر اتر جاتے۔ ان کا کہنا تھا کہ تلاش کرنے میں وہ مزہ نہیں جو جھا ملنے میں ہے۔ دسویں میں آنے کے بعد عربی فارسی کی جھنجھٹ میں نہ پڑتے ہوئے ہم نے مراٹھی کو ترجیح دی۔ زیادہ تر بچوں نے بھی ہماری تقلید میں یہ قدم اٹھایا۔ اتفاق سے مراٹھی پڑھانے کی ذمہ داری اسماعیل سر کو سونپی گئی جو انتظامیہ کمیٹی سے اکثر پنگا لیتے رہتے۔ مراٹھی کی جانکاری اور ریاستی اہمیت سے آگاہ تھے۔

یہ تعلیمی سال بھی 1971-1970ء کا زمانہ تھا۔ جو جلگاؤں کی تاریخ میں سیاہ حروف میں درج کیا جائے

گا۔ یہی وہ زمانہ ہے جب بھیونڈی کے ساتھ جلگاؤں کو بھی فساد کی آگ میں لپیٹ دیا گیا تھا۔ ساری کارروائی بے ہوشی کے عالم میں یک طرفہ ہوگی تھی۔ جبار جو نویں کلاس سے ساتھ میں تھا عین شادی کے دن زندہ جلا دیا گیا۔ اس کے گھر کے تو 27 افراد شہید کر دیے گئے تھے۔ کئی محلوں کے مکانات نذر آتش ہو گے تھے۔ بے گھر لوگ جب کیمپوں میں آگئے تو وزیر اعظم اندرا گاندھی کی آمد پر اکبر رحمانی سر نے نم دیدہ ہو کر روداد پیش کی تھی جسے یاد کر کے آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

یہی گیارہویں کا سال تھا جسے میٹرک کہا جاتا تھا۔ یہاں کچھ مضامین لازمی تو کچھ اختیاری ہوا کرتے تھے۔ ہائیر میتھ لینے والے دو لڑکے اور ایک لڑکی کو علاحدہ بٹھا کر جب پڑھایا جاتا تو باقی طلبا رشک بھری نگاہوں سے دیکھتے۔ ادھر گھر میں مطالعہ کی گنجائش نہیں تھی تو رات میں دوستوں نے لیمپ پوسٹ کے نیچے پڑھتے پڑھتے سو جانے کی ترکیب نکالی۔ مگر اس پر زیادہ دنوں تک عمل پیرا نہ رہ سکے۔ اس لیے قریب کی پولیس لائن میں شکیل کے گھر کی چھت پر سونے اور پڑھنے کے لیے جانے کا پروگرام بنا۔ مگر یہاں مشکل یہ تھی کہ روزآنہ چھت پر پچھواڑے سے چڑھ کر رات کو اوپر جانا دوسرے دن صبح سویرے سامنے سے چھلانگ لگا کر نیچے اترنا پڑتا تھا۔ جو بڑا جوکھم بھرا اور صبر آزماء کام تھا۔ اس لیے دھیرے دھیرے یہ تجربہ بھی ادھورا ہی رہا۔ اب لے دے کر ہم نے گھر کے آنگن میں چار بامبوں لاکر ٹاٹ پتری کا منڈپ ڈالا اور بان کی رسی والی چارپائی بچھا کر چمنی کی روشنی میں پڑھنا شروع کر دیا۔ یہاں ایک طرح سے تنہائی کے ساتھ راحت محسوس سی ہونے لگی۔ مگر کبھی کبھار آوارہ گردی کرنے والے کتے ایک ساتھ آ کر ادھم مچاتے تو ڈر کے ساتھ دم بھی گھٹنے لگتا۔ محلے کی چوتھی گلی میں سبحان بھائی نامی شخص اپنے چھوٹے بھائی شجاعت خان کی فیملی کے ہمراہ رہا کرتے تھے لکڑی کام میں ماہر تھے۔ مگر ایدھی پن کے سبب اکثر بے کار رہتے۔

وہ شام کی چائے کے وقت بلا ناغہ آتے۔ اکثر گڑ سے بنی امی کے ہاتھ کی چائے وہ امرت سمجھ کر نوش کرتے۔ چائے کے عوض امی نے ان سے چھوٹی سی تین خانوں والی الماری بنوالی تو ہماری بکھری کتابوں اور بیاضوں کو مستقل مسکن مل گیا۔ خاکی ورق میں ملبوس بیاضیں یوں رہنے لگیں جیسے ابھی ابھی دکان سے خریدی گئی ہو۔ اللہ اللہ کر کے گیارہویں کا مطلب میٹرک کا سال آ گیا۔ آٹھویں کے وقت بنے تین ڈویزن میں سے اب صرف دو ہی رہ گے تھے۔ البتہ گزشتہ میٹرک میں ناکام طلبہ میں سے کچھ اعادے کی خاطر کلاس میں آنے لگے تھے مگر ان کی موجودگی اکتوبر میں ہونے والے سپلی مینٹری امتحان تک ہی تھی۔ ان بچوں میں عبدالکریم سالار کا بھی شمار تھا۔ مضامین کے انتخاب کا معاملہ تھا۔ سر سے بار بار پوچھنے کی سکت نہ تھی۔ یہ بھی معلوم نہ تھا کہ آٹھ مضامین لے لینے سے اوسط مارکس کم ہو جاتے ہیں۔ سات لازمی تھے جس سے اوسط بڑھ جاتا مگر ناکامی کا خطرہ بھی تھا۔ ہم نے آٹھ مضامین لیے اور فرسٹ ڈویزن لیکر اسکول میں تیسری پوزیشن حاصل کی۔

ہر سال کی طرح امید تھی کہ تنظیم والے تیسرا انعام لیکر آئیں گے۔ مگر اس مرتبہ انھیں نہیں آنا تھا تو وہ نہیں آئے اور اس طرح ہمارا انعام اب تک باقی ہی رہ گیا۔ عام طور میٹرک کے امتحانات مارچ کے مہینے میں منعقد کئے جاتے تھے۔ اس مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ ہم لوگ امتحان سے فارغ ہوئے تو والد صاحب نے مالیگاؤں کے 'عالمی تبلیغی اجتماع' میں روانہ کردیا۔ اجتماع میں لاکھوں افراد کی بھیڑ تھی۔ ہم تو وہاں شہر میں ادھر سے ادھر گھومتے رہے، وہاں لگی دکانوں کی سیر کرتے رہے یا پھر چٹ پٹے کھانوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ اجتماع ختم ہوا تو وہیں سے طلباء کی دس روزہ جماعت میں زبردستی نکال دیا گیا۔

ہم قریہ قریہ گاؤں گاؤں اپنا بستر لے گھوم رہے تھے۔ اسی دوران جب مالیگاؤں کے قریب ہی کے کسی دیہات میں ہماری جماعت کا قیام تھا۔ مسجد میں اتفاق سے 'جماعت اسلامی' کے ذمہ دار 'رشید عثمانی' آگئے۔ مجھے نہیں معلوم یہ ان کا مجوزہ پروگرام تھا یا پھر اتفاق سے آگئے تھے۔ بعد نماز مغرب ان کا درس قرآن ہوا۔ کھانے سے فراغت کے بعد انھوں نے ایک ایک سے نام پوچھا، پڑھائی کا حال جانا اور پھر بڑے پیار سے کہنے لگے کہ بیٹا جماعت میں جانا اچھا ہے مگر ابھی تم زیر تعلیم ہو، اس لے پہلے دلجمعی سے پڑھائی کرلو، بعد میں یہ سب کرنے کو زندگی پڑی ہے۔'

میں نے ان کی بات گرہ میں باندھ لی اور اپنا وقت پورا کرکے گھر لوٹ آیا۔ گھر آیا تو یہاں ایک نیا بکھیڑا منہ کھولے کھڑا تھا۔ جس مکان میں ہم رہتے تھے اسے خالی کرنے کا تقاضا ہونے لگا۔ دراصل میر صادق اور میر جعفر صرف بادشاہوں کے ہمراہ نہیں ہوتے تھے۔ وہ تو جگہ جگہ معاشرے میں ککرمتے کی طرح تھوڑے سے وقتی فائدے کے لیے کہیں سے بھی نکل آتے ہیں۔ یہاں بھی ایسا ہی کچھ ہوگیا تھا۔

ہم جس مکان میں رہتے تھے اس کی مالکہ بیوہ ہونے کے ساتھ پیر سے معذور تھی۔ اسے مکان بیچنے کے لے مجبور کردیا گیا۔ والد صاحب نے اسے خریدنے کا من بنالیا تھا مگر قیمت طے نہیں ہورہی تھی۔ ایک غیر مسلم نے زیادہ کی بولی لگائی تو مکان اس کے حوالے کردیا گیا۔ درمیانی افراد کو کمیشن بڑھ کر مل رہا تھا۔ حالانکہ اس زمانے کا کمیشن پانچ دس روپیوں سے زیادہ نہ رہا ہوگا۔ ایک جواری شخص کو مکان کا آدھا حصہ 25 روپے ماہوار سے دینے کو تیار کیا گیا۔ اور اس طرح ہم پڑوس کی گلی میں منتقل کردیے گئے۔ یہ تین ماہ کا عرصہ بھی بڑا ہنگامہ خیز رہا۔

یہاں آتے ہی چھوٹی دو بہنوں کے لیے شادی کے پیغامات آگئے۔ والد صاحب نے جو رقم اس مکان کو خریدنے کے لیے پس انداز کی تھی شادی میں صرف کردی۔ لڑکے والوں کو بھی عجلت تھی لہٰذا بہت ہی سادگی سے سارے امور اپنے انجام کو پہنچے۔ محض 75 کلو اناج پسوا کر مانڈے بنائے گئے جس کو ڈیڑھ سو باراتیوں کے ہمراہ محلے والوں نے بھی اطمینان سے تناول کیا۔

جون میں میٹرک کا رزلٹ آجانے کے بعد ہم کالج جانے کی تیاری میں مصروف ہوگئے۔

(3)

کالج میں داخلہ ہونا تھا جو اس وقت کے حالات کے پیش نظر مشکل تو نہ تھا مگر ہم جیسے حالات کے ماروں کے لیے آسان بھی نہ تھا۔ چند مسائل تھے جو سر اُبھارے کھڑے تھے۔ پہلا مسئلہ ماحول کا تھا۔ شہر فساد گزیدہ ہونے سے لوگ سہمے ہوئے تھے، حالاں کہ معاملے کو گزرے عرصہ ہوگیا تھا لیکن وہ کہتے ہیں نہ کہ سانپ کے گزر نے کے بعد بھی نشان باقی رہ جاتا اور لوگ ہیں کہ نشان سے بھی گھبرا جاتے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ یہ انسانی نفسیات کی کارفرمائی ہو۔ اس پر طرفہ تماشا کہ ادارہ غیر مسلم انتظامیہ کا اور 99 فیصد طلبہ غیر مسلم۔ اساتذہ میں اردو کا صرف ایک پروفیسر، دفتر میں واحد کلرک کے علاوہ لیب اسٹنٹ بھی تنہا ہی تھے جو اپنے سے لگتے تھے۔

ہم نے آرٹ لائن میں ایڈمیشن کی ٹھانی اور معلوم کیا تو پتہ چلا کہ داخلہ فیس 135 روپے ہیں۔ آج کے زمانے کی یہ معمولی سی رقم ہمارے لے اس وقت کسی خزانے کے لٹانے کے مترادف تھی۔ سو روپے داخلہ فیس تو 35 روپے لائبریری ڈپازٹ کے طور پر جو پڑھائی کے اختتام پر لوٹا دیے جاتے تھے، مگر اس کے لیے چار سال تک رسید کو سنبھال کر رکھنا ضروری تھا۔ ادھر دونوں رقوم کا بیک وقت بھرنا بھی لازمی تھا۔ والد صاحب کے لیے یک مشت اتنی بڑی رقم بروقت مہیا کرنا ممکن ہی نہ تھا۔ کیوں کہ اتنی کمائی تو ہفتے بھر کی کل مزدوری سے بھی نہیں ہوتی تھی اور پس انداز کی گی کوئی رقم بھی نہ تھی۔

یہاں تو بس اتنا ہی میسر تھا جتنی کہ ضرورت تھی، بعض مرتبہ تو ضرورت بھی بمشکل پوری ہوتی تھی، زندگی کی گاڑی چل تو رہی تھی، چل کیا رہی تھی بلکہ گھسیٹی جا رہی تھی یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس میں نہ رفتار تھی نہ ہی کسی طرح کی کوئی رمق۔ داخلے کی تاریخ جوں جوں قریب آ رہی تھی بے چینی میں اضافے کا باعث ہو رہی تھی۔ اتفاقات بھی عجیب ہوتے ہیں۔ انسانی گمان سے پرے کام کر جاتے۔ اس دوران امی نے بڑے ماموں جان کا وعدہ یاد دلایا تو امید کی کرن جاگ اُٹھی۔ بڑے ماموں جان جو اپنے زمانے کے ذہین طالب علم تھے، معاشی بحران کے سبب تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ بعد ازاں بھساول میونسپل میں ڈرائیور ہو گئے تھے۔ مجھے پڑھتا دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ ایک دن یوں ہی ترنگ میں کہہ دیا کہ پہلی کوشش میں اگر میٹرک پاس کر لیتے ہو تو کالج کے داخلے کی فیس مجھ سے لے لینا۔ اندھا کیا چاہے صرف دو آنکھیں۔ (اس زمانے میں میٹرک پاس کر لینا واقعی جوئے شیر لانے کے مترادف تھا)۔

مجھے پسنجر ٹرین سے بھساول روانہ کیا گیا مگر وہاں جاتے ہی پتہ چلا کہ تنخواہ کے ہونے میں ابھی دو روز باقی ہیں۔ تب آ کر لے جانے کی ہدایت کی گئی۔ ادھر ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر کو دشواری کا علم ہوا تو دوسرے روز مجھے بلا کر انتظامیہ کے چیرمین کے نام بزبان انگریزی ایک رقعہ لکھ کر دیا۔ 'لڑکے نے نمایاں مارکس سے میٹرک پاس کر لیا ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے ایڈمیشن کے لیے تعاون کی درخواست ہے۔ میں رقعہ لے کر گھر آیا تو پتہ

چلا کہ ماموں جان نے رقم بھجوادی ہے۔اس طرح اگلے روز ہمارے داخلے کا مرحلہ 'خان دیس' کے معروف تعلیمی ادارے ملجی جیٹھا کالج میں طے ہوااور ہم نے یک گناہ اطمینان کی سانس لی۔

واضح رہے کہ مذکورہ ادارے کے پرنسپل شری وائی ایس مہاجن اس وقت رکن پارلیمنٹ تھے جو بعد میں بھی مسلسل تین مرتبہ علاقے کی نمائندگی کرتے رہے۔اس زمانے میں ڈگری کورس سے پہلے یک سالہ پری ڈگری کا امتحان دینا ہوتا تھا۔اس میں کچھ لازمی تو کچھ اختیاری مضامین ہوا کرتے۔انگریزی زبان کا شمار لازمی مضمون میں تھا۔حیرت ہے کہ اس وقت دیہات سے آئے اکثر بچے اسی لازمی مضمون میں ناکام ہوتے تھے،جس کے سبب ان کی ڈگری کورس کی تعلیم ادھوری رہ جاتی۔عام طور پر پری ڈگری میں سائنس اور کامرس کی بہ نسبت آرٹس کے بچوں کی تعداد نسبتاً زیادہ ہوا کرتی تھیں۔اس وقت بھی کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔

خدا خدا کرکے ایک مرحلہ طے ہوا۔اگلے روز سے ہم نے جانا شروع کیا۔سردست تمام ہی مضامین کے بچے اکٹھا ایک بڑے سے ہال میں بیٹھ رہے تھے۔جس نے کویلو اور ٹین کے شیڈ والے کمروں میں اب تک کا اپنا تعلیمی سفر طے کیا ہو اس کے لیے دوسری منزل پر بنا وسیع وعریض ہال کسی نعمت سے کم نہ تھا۔ایک قسم کا سرور تھا جسکے نشے میں بیٹھ کر عجیب طرح کا نامعلوم جذبہ مسرت میں دل ڈوب کرا بھر رہا تھا اورا بھر کر ڈوب رہا تھا۔

چوں کہ یہاں یونیفارم کا رواج نہ تھا اس لیے لڑکے لڑکیاں رنگ برنگی لباس میں ملبوس ایک دوسرے سے باتوں میں محو تھے۔شور تھا کہ کسی پل تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا کہ اچانک نائب پرنسپل شری سی آر پوتنیس سر کا ورود ہوا،شور تھم سا گیا۔چھوٹے قد کا وہ شخص گوری رنگت اور برہمنی صاف صفائی کے سبب سب کی توجہ کا مرکز بن گیا۔آتے ہی اپنا تعارف پیش کرتے ہوئے بزبان مراٹھی کہنے لگے میں آپ لوگوں کو پولیٹیکل سائنس پڑھاؤں گا۔یہ مضمون بڑا ہی دلچسپ ہے۔پھر انہوں نے کہا کہ جن طلبہ کو میٹریک میں ساٹھ فیصد یا اس سے زائد مارکس ملے ہیں وہ کھڑے ہو جائیں اور اپنے ساتھ اپنی اسکول کا نام بھی بتلاءیں۔

جب ہماری باری آئی تو انہوں نے اردو ہائی اسکول کا نام سن کر مسرت کا اظہار کیا۔ادھر ہماری خوشی کا بھی ٹھکانہ نہ تھا۔اور اس طرح دوپہر ڈھلی کلاس کا اختتام ہوا۔اور گھر کا رخ کرنے کی بجائے ہم نے کالج لائبریری جو دوسری منزل پر تھی وہاں پہنچ کر اس کا جائزہ لیا۔پرانی طرز پر بنی یہ عمارت کالج کی مین بلڈنگ کے پیچھے تھی۔جس میں لڑکے لڑکیاں خموشی کی چادر تانے مطالعہ میں غرق تھے۔کچھ بچے کتابوں کی مدد سے نوٹس تیار کر رہے تھے۔لائبریری انچارج سامنے بیٹھا گاہے گاہے سب پر نظریں گھما رہا تھا۔جو بچے کتابیں اشو کر رہے تھے ان کی جانب سے ہو رہی آوازوں پر ڈانٹ بھی رہا تھا۔یہاں کسی نے مجھے بتلایا کہ کالج کے لائبریرین کا درجہ بھی پروفیسر کے ہم پلہ ہوتا ہے۔اسے بھی ان کے برابر ہی تنخواہ ملتی ہے۔میں حیرت سے سوچ رہا تھا کہ محض کتابیں تقسیم کرنے والے کو اس قدر تنخواہ کی ضرورت کیا ہے۔مگر معلوم ہوا کہ ان کی ڈگری بھی پروفیسر کے ہم

پلہ ہوتی ہے۔ مزید حیرت یہ بھی تھی کہ اسے لائبریری سائنس کہا جاتا ہے۔ بہر کیف واپسی پر ہم جمخانہ گئے جہاں لڑکے انڈور گیم میں مصروف تھے۔ بڑا سا ہال تھا جس میں کیرم بورڈ، بیڈمنٹن کے علاوہ مختلف کھیلوں کی بساط لگی تھی۔ کچھ تو ایسے بھی تھے جنہیں ہم پہلی بار دیکھ اور سن رہے تھے۔

جس نے اب تک کی زندگی کا بیشتر حصہ گلی چوراہوں میں گلی ڈنڈا یا پھر کبڈی جیسے بنا خرچ کے کھیلوں میں گزارا ہو اس کے لیے تو ان نئے کھیلوں کا تصور بھی مسرت آمیز تھا۔ جیسے ہی عملی طور پر کھیلنے کی امنگ نے ذہن میں انگڑائی لی تو سامنے لگی نوٹس بورڈ پر نظر ٹھہر گئی۔ جم خانہ کے اصول وضوابط کے ہمراہ ماہانہ فیس دیکھ کر کھیل کے جذبات رفتہ رفتہ دم توڑنے لگے۔ یہ ضلع کا سب سے پرانا اور بڑا تعلیمی مرکز تھا جہاں شہر اور ضلع بھر سے ہزاروں بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ دو منزلہ مین عمارت کے سامنے بڑا سا رستہ، جسے عبور کرلو تو پڑوس میں تین منزلہ کامرس بلڈنگ، عقب میں ہوسٹل کے کمرے مع بہت سارے بیت الخلا اور حمام خانے، سائیکل اسٹینڈ کے علاوہ کینٹین کے ساتھ لمبا چوڑا خالی میدان، سردیوں میں جس پر اُگی ہری ہری گھاس پر بیٹھ کر صبح کی دھوپ کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا تھا۔

روزانہ صبح شام گلی محلے کے ٹیڑھے میڑھے کھردرے رستے، کچے پکے مکانات کے درمیان گزری حیات میں اگر اچانک سلیقے سے بنی پکی عمارتوں کے درمیان وقتی طور پر ہی سہی گزر ہو جائے تو شادمانی کی چادر کا خود بخود پھیل جانا فطری ہے۔ یہاں بھی ایسا ہی کچھ نامعلوم جذبہ کے تحت ہونے لگا تھا۔ دو روز بعد پتہ چلا کہ پڑھائی کے علاوہ کچھ دوسرے عملی کام بھی ہیں جن کو انجام دینے کے عوض بیس مارکس بونس کے طور پر دیے جاتے ہیں۔ ایک کا نام این ایس ایس تو دوسرا این سی سی کے طور پر بتایا گیا تھا۔

ہم نے این سی سی جوائن کرلی۔ اس کے لیے ہمیں ایک مخصوص ڈریس مع ٹوپی دی گئی، ساتھ ہی بڑے سے مضبوط کالے جوتے بھی تھے۔ جسے اچھی طرح پالش کر کے پہننے کی ہدایت کی گئی۔ ہر ہفتے اتوار کی صبح سات بجے پریڈ میں حاضر ہونا لازمی قرار دیا گیا۔ ہمارے پاس اس وقت تک سائیکل بھی نہ تھی۔ پہلے ہی ہفتے جب وہ ڈریس پہن کر باہر نکلے تو محلے والوں کی عجیب وغریب نظریں ہمارے تعاقب میں دوڑنے لگیں۔ ہمیں بھی کچھ عجیب سا محسوس ہونے لگا تو ہم نے ایک ترکیب نکالی، جوتا اور خاکی پتلون پر روزآنہ کی شرٹ، ہاتھ میں ٹوپی اور این سی سی کا شرٹ لے روانہ ہوئے تو کسی کی کچھ بھی سمجھ میں نہ آسکا۔ مسجد پہنچ کر شرٹ پر شرٹ پہن کر ٹوپی لگائی اور میدان میں پہنچ گئے۔

قریب دو گھنٹے لیفٹ رائٹ کرتے ہوئے پریڈ کی تو پیٹ میں چوہے کلبلانے لگے۔ اس دوران ایک ہم جماعت نے بتلایا کہ سال کے اواخر میں ڈریس کی دھلائی کے لے پورے بیس روپے بطور واشنگ الاؤنس دیے جاتے ہیں تو یہ سن کر معلوم نہیں کیوں بھوک کی شدت میں کمی احساس ہوا۔ اب باقاعدگی سے کلاس کا آغاز

ہوگیا تھا۔انگریزی کے لیے ایک کرسچن غیر شادی شدہ میڈم آنے لگی تو لڑکے پڑھائی سے زیادہ ان کی حرکات وسکنات پر توجہ دینے لگے۔شروع شروع میں محترمہ اسکرٹ زیب تن کر آنے لگی تھی تو پرنسپل نے ساڑی سے متعلق ہدایت دے دی، مگر ساڑی کے پلو کو سنبھالنا ان کے لے مشکل ہوتا گیا۔البتہ کچھ ہی دنوں میں فراٹے دار انگریزی سے مرعوب طلبہ رفتہ رفتہ پڑھائی کی جانب متوجہ ہونے لگے۔اردو کی کلاس میں پندرہ نئے اور دو سابق طلباء اکٹھا ہوئے تو سر ندارد۔دوسرے دن بھی یہی عالم رہا تو ایک سابق طالب علم نے بیاض کے صفحے پر نا معلوم کیا لکھا اور ہمارے دستخط لیکر پرنسپل کے حوالے کر دیا۔تیسرے دن سے کلاس وقت پر شروع ہوگئی۔پروفیسر نے پڑھائی سے قبل کہا کہ آپ لوگوں کو تحریری شکایت سے قبل مجھ سے بات کر لینا چاہئے تھا۔تب جا کر ہمیں اندازہ ہوا کہ وہ بیاض کا صفحہ نہیں بلکہ ان کے تعلق سے شکایت نامہ تھا۔بہر کیف موصوف کا دوران کلاس پان چبانا اور چار مینار کے کش لیکر بار بار پچکاری مارنے کے لیے کرسی سے اٹھنا بڑا عجیب سا لگا۔

اس طرح وقت گزرتا گیا اور ششماہی امتحان کب آ گیا پتہ بھی نہ چل سکا۔چوں کہ ہمارا تعلق اردو میڈیم سے تھا اس لیے مراٹھی میں گھلنے کے لیے وقت درکار تھا۔مگر جب ششماہی امتحان کے پرچے پروفیسر حضرات لوٹانے آئے تو ایک قسم کی شرمندگی اور خوف کے احساس نے آ گھیرا۔ہمیں لگا ہماری جوابی کاپی پڑھ کر سنائی جائے گی اور زبان و بیان کا کلاس میں مذاق اڑایا جائے گا۔مگر اس دوران جب ہم نے دیکھا کہ ایک لڑکا کسی سوال کے جواب کے جانچ سے چھوٹنے پر پروفیسر کی میز کے قریب گیا تو موصوف نے اسکیل سے جواب کی لمبائی ناپ کر دیکھی اور مارکس لکھ کر اسے روانہ کر دیا۔یہ منظر دیکھ کر ہماری جان میں جان آئی۔بالآخر جب رول نمبر پکارا گیا اور پرچے ہاتھ میں آئے تو دیکھا سبھی میں فرسٹ کلاس کے مارکس تھے۔اور پھر یوں گزرتے دنوں کے ساتھ ہمارا پری ڈگری کا سال بھی گزر گیا۔اب ہم بی اے فرسٹ ایر کے طالب علم کہلانے لگے تھے۔یہاں پھر مضامین کے انتخاب کا سوال تھا۔ڈگری جنرل یا پھر اسپیشل مضامین میں کی جاتی تھی۔

ہم نے انگریزی اسپیشل کے طور پر کرنے کا ارادہ کرلیا تو ذہین بچوں میں شمار ہونے لگے۔اس وقت انگریزی، نفسیات، اور جغرافیہ وغیرہ مضامین کی اہمیت تھی۔ان مضامین کے گریجویٹ مشکل سے ملتے تھے۔اوسط مارکس بڑھانے کی خاطر سائنس اور کامرس کے طلباء زبان کے طور پر اردو کا انتخاب کرتے تھے اس طرح اردو پڑھنے والوں کی تعداد اتفاقی طور پر بڑھ گئی تھی۔

عید آئی تو زندگی میں پہلی بار ٹیریلین کا شرٹ اور ٹیری کاٹ کی پتلون کا جوڑا ہمارے حصے میں آیا۔ساتھ ہی ہرکولیس کمپنی کی سائیکل بھی نصیب ہوگئی۔اس وقت 65 روپے میں خریدی گئی وہ سواری بھی مہنگی لگی تھی۔سائیکل مقفل کر کے اسٹینڈ پر کھڑی کرتے ضرور مگر دل میں اکثر دھچکا رہتا کہ محفوظ بھی ہے کہ نہیں۔اس لیے خالی پیریڈ میں خواہ مخواہ ادھر سے گزر کر ایک نظر دور ہی سے ڈال کر مطمئن ہو جاتے۔ہماری کلاس کا آغاز

بارہ بج کر چالیس منٹ پر ہوتا تھا مگر ہم وہاں روزآنہ دس بجے کے قریب پہنچ جایا کرتے تھے۔سب سے پہلے ہوسٹل کے بیت الخلاء میں فراغت پاتے اور پھر لائبریری میں گھنٹہ بھر گزارنے کے بعد کلاس کا رخ کرتے۔

انگریزی میں اس وقت آر کے لکشمن کا ناول دی گائیڈ (The Guide) پڑھنے کے لیے تجویز کیا گیا تھا۔فہمائش کی خاطر سر نے اس ناول پر مبنی فیچر فلم لانے کا وعدہ بھی کیا تھا مگر تعلیمی سال ختم ہو گیا فلم کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ ہندوستانی رائٹر کا انگریزی میں تحریر کردہ ناول پڑھنے میں آسان اور اچھا بھی لگا۔نتیجتاً انگریزی میں دلچسپی بڑھنے لگی اور ہم نے انگریزی ادب میں بی اے کرنے کی ٹھان لی۔ایس وائے بی اے میں آنے کے بعد سنجیدگی میں اضافہ ہو گیا۔حالاں کہ اس سال کو ریسٹ ایر کے طور پر گردانا جاتا تھا۔

اتفاق سے انگریزی ڈپارٹمنٹ کے پروفیسر حضرات بھی غیر معمولی صلاحیتوں والے تھے۔ایچ او ڈی کی سنجیدگی اور لیکچر کی گونج تو اب بھی کانوں میں سنائی دیتی ہے۔اس دوران ہمیں شیکسپیر کے کئی ڈرامے پڑھنے کا شرف حاصل ہوا۔تنقید کیا ہوتی ہے یہ معلوم ہوا۔کالج جانے کے لیے عام طور پر گھر سے قریب کا راستہ ہم اپناتے تھے مگر واپسی میں جب سب دوست احباب ساتھ ہوتے تو مٹر گشتی کرتے ہوئے شہر سے ہوتے ہوئے گھر آتے تھے، درمیان میں تھوڑے ہی فاصلے پر کلکٹر آفس تھا۔ایک دن واپسی پر رمضان خان نے بتلایا کہ ٹیچرز بھرتی کا اشتہار آیا ہے۔ مجھے وہاں سے فارم لینا ہے جس کی قیمت پانچ پیسے ہے۔تو ہم سب اس پر ہنسنے لگے۔ارے ارے گریجویٹ بننے کی بجائے ماسٹر بن رہا۔

تبھی مخدوم علی بولا انٹرویو کے لیے تجربہ حاصل کرنے میں کیا ہرج ہے اور پھر تین فارم منگوا کر بھر دیے گئے اور جمع بھی کر دیے گئے۔انٹرویو ہوا تو ہمارے میٹریک کے مارکس اور ایف وائے بی اے کی مارکشیٹ دیکھ کر کمیٹی کے ممبران مسکرا دیے۔علاقے کے اسمبلی ممبر اور رکن پارلیمنٹ کے نام پوچھنے پر ہم نے صحیح صحیح بتا دیا اور گھر آ کر بھول گئے کہ کبھی کوئی انٹرویو بھی دیا تھا۔دن مہینوں میں بدلتے رہے اور وقت گزرتا رہا، امتحانات کی آمد آمد تھی۔مارچ کے مہینے میں جس کے ہونے کے امکانات تھے۔ادھر پڑھائی بھی اپنی رفتار سے جاری تھی کہ ایک دن اچانک ڈاکیے نے تقرری کا آرڈر لا کر دے دیا۔دوسرے دن خبر ملی کہ مخدوم علی کو بھی حکمنامہ ملا ہے۔رمضان خان جو بے تابی سے منتظر تھا محروم رہا۔

(4)

اب تک کی زندگانی کا یہ سفر حقیقت کے دوش پر سوار ہو کر گزرا تھا جس میں تصور کی کارگزاری بالکل نہیں تھی۔یقین جانیے اس حقیقت پسندی نے پیٹ کے لیے روٹی اور رہائش کی اہمیت کو کچھ حد تک سمجھا دیا تھا۔ جہاں انسان سوچتا نہیں، لیکن سوچ کی گھڑی جب اس کے ذہن میں گھر بنا لیتی تو وہ کچھ ایسے فیصلے بھی کر جاتا جو غیر متوقع ہوتے ہیں۔یہاں بھی شاید ایسا ہی کچھ ہونے والا تھا۔کہیں پر ہم نے یہ پڑھ لیا تھا جو پتہ نہیں کیسے

ذہن کے کسی خانے میں گھر کر گیا تھا کہ انسانی خواہشات کی پری جب دور جانے لگتی تو وہ مشاہدہ سے بھی بہت کچھ حاصل کر لیتا؛ عقل مند کبھی خود پر تجربہ نہیں کرتا بلکہ اوروں کے تجربات سے سیکھتا۔

ہماری کلاس کا وہ لڑکا شام راؤ باری جو پڑھائی کے ساتھ نوکری بھی کر رہا تھا۔ کچھ نہ کہتے ہوئے بھی بہت کچھ کہہ گیا تھا بلکہ غیر محسوس طریقے سے سمجھا گیا تھا۔ وہ ہم سے ایک سال آگے تھا اور مراٹھی زبان وادب سے گریجویشن کر رہا تھا ساتھ ہی معلّمی کی نوکری بھی۔ آخری سال کے لیے اس نے نوکری والے شہر پاچورہ کالج میں داخلہ بھی لے لیا تھا۔ صبح کی گاڑی سے جانا، کالج اٹینڈ کرنا اور دوپہر میں اسکول میں نوکری کر کے شام ڈھلے گھر آجانا۔ اتوار کو جب بھی ملاقات ہوتی وہ اپنی روداد مزے لے لے کر سناتا۔ کچھ ہی عرصے میں وہ ترقی کر گیا مگر کیسے، یہ اب تک سمجھ میں نہ آسکا۔ ناظر تعلیمات بننے کے بعد جب بھی ملتا تو اس کا طنز بھرا جملہ کہ میں ماں باپ پر بوجھ نہیں ہوں۔ اکثر دل میں گھر کر جاتا اور ہم ہے کہ سوچتے ہی رہ جاتے۔ وقت کا پنچھی پر لگا کر اڑتا رہا اور ادھر ہمارا تعلیمی سفر جاری رہا۔

مارچ کا مہینہ تھا اور سالانہ امتحان کی آمد تھی، بلکہ ٹائم ٹیبل بھی آگیا تھا۔ غالباً سنیچر کا دن رہا ہوگا ہم کالج سے گھر آچکے تھے کہ دوپہر میں ڈاکیے کی آمد ہوئی۔ بلند آواز میں نام پکار کر ایک لمبا سا لفافہ تھما گیا۔ کھولنے سے قبل ہم نے آفس کی مہر دیکھ کر اندازہ لگا لیا تھا کہ ہو نہ ہو یہ تقرری کا حکمنامہ ہی ہے۔ خوف اور خوشی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ چاک کیا تو وہی نکلا۔ اتفاق دیکھیے کہ تعیناتی کی جگہ بھی اتفاقی طور پر پاچورہ ہی تھی۔

سینٹرل ریلوے لائن پر صرف چالیس کلومیٹر کی دوری اور چالیس منٹ کے وقفے پر ہمارے شہر سے یہ پہلا اسٹاپ تھا۔ جہاں آنے جانے کے لے دن بھر میں کئی گاڑیاں تھیں۔ پسنجر کے علاوہ ایکسپریس ٹرینیں بھی یہاں ٹھہرتی تھیں۔

سنیچر کا آدھا دن تو یوں ہی گزر گیا۔ دوسرے روز اتوار تھا۔ ہمیں فیصلہ کرنے میں دقت ہو رہی تھی۔ کیوں کہ اگر نوکری پر رجوع ہوتے ہیں تو تعلیم کے متاثر ہونے کا خدشہ تھا۔ اس وقت پڑھائی کی رغبت نوکری سے زیادہ تھی۔ مگر گھر کے معاشی حالات بھی ایسے تھے کہ جو موقع کو گنوانے کی اجازت بھی نہیں دے رہے تھے۔ والدین نے سارا معاملہ ہماری صواب دید پر چھوڑ دیا تھا۔ لہٰذا ہم نے پھر اپنے ایک کم عمر دوست میاں افسر سے کہا کہ چلو کل صبح پاچورہ جا کر اسکول دیکھ آتے ہیں۔ حتمی فیصلہ وہاں سے آنے کے بعد کر لیں گے۔ گھومنے کی خاطر وہ تیار ہو گیا۔ ہم پیر کی صبح ٹھیک سات بج کر پانچ منٹ والی ایکسپریس ٹرین سے جونا گپور سے بمبئی کے درمیان چلتی تھی پاچورہ کے لے روانہ ہو گے۔ پونے آٹھ بجے اس نے ہمیں اسٹیشن پر چھوڑ کر آگے کوچ کر لیا۔ اجنبی شہر جو تحصیل کا مقام تھا مگر اب بھی دیہات جیسا لگ رہا تھا۔ شہری چمک دمک کے آثار بھی تھے جو کہیں کہیں دکھائی دے رہے تھے۔ سیمنٹ سے بنی سڑک پر ہم راستہ ناپتے ہوئے اسکول تک پہنچ گئے۔

اسکول آنے کے بعد سے ہی وہ دن بھراسے دھوپ دکھاتے رہے کچھ حد تک سوکھ جانے پر بوقت واپسی ریلوے کلرک سے اس پر دوبارہ ٹھپہ لگوالیا تو ان کی جان میں جان آئی۔ تیسرے دن اسکول آتے ہی یہ عقدہ کھلا کہ اب اسکول شفٹ سسٹم سے چلے گا۔ ہم لوگوں کو دوپہر کی کلاسوں پر تعیناتی کرنے سے دیری سے آنے کا مسئلہ خود بخود حل ہوگیا۔ ہم نے اطمینان کی سانس لی اور پڑھانا شروع کردیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے مہینہ گزر گیا تو انچارج ہیڈ نے بینک سے تنخواہ نکال کر ہمارے سپرد کی۔ چونکہ ہم مہینے کی چوتھی تاریخ سے حاضر ہوے تھے اس لے 27 دنوں کا معاوضہ کل ایک 197 روپے لے کر جب گھر پہنچے اور پہلی تنخواہ والدہ کے حوالے کی تو وہ کہنے لگیں کہ 'یہ ایسی کیسی پگار ہے۔'

انھوں نے پورے دوسوروپے بھی نہیں دیے۔ اپریل شروع ہوا تو اسکول میں امتحانات آ گے۔ ہم نے پڑھایا تھا تو مہینہ بھر مگر امتحان سال بھر کا لینا تھا۔ اسی مہینے کے اواخر میں ہمارے بھی ایس وائے بی اے کے دو پرچے تھے جس کے لیے ہمیں چھٹی درکار تھی۔ ہم نے اسکول میں جب رخصت کی بات کی تو ٹکا سا جواب ملا کہ نئے لوگوں کو رخصت نہیں ملتی۔ ہم نے بھی کہ دیا چاہے جو بھی ہو جائے ہم تو پیپر دینے ضرور جائیں گے۔ آخرش ان کے دل میں کوئی بات آئی تو پھر خصوصی رخصت کا فارم نمبر 12 دے کر کہا۔

یہ بات یاد رکھو کہ رخصت کے دنوں کی تنخواہ کٹ جائے گی۔ اس طرح بچوں کے ہمراہ ہمارا بھی آدھا امتحان ہوا۔ اسٹاف میں مرد اساتذہ کے ہمراہ دو خواتین بھی تھیں جن میں ایک مطلقہ تو دوسری اپنے شوہر کے ہمراہ اسی مدرسے میں تھیں، حالاں کہ تقرری کے وقت انہوں نے تحریر دی تھی کہ دوران ملازمت پردہ نہیں کریں گی مگر یہاں پردے کا معقول انتظام تھا۔ وہ تو بس پرچے جانچتے وقت سب گھول بنا کر بیٹھتے تھے۔ اس وقت اندازہ ہوا تھا کہ یہاں خواتین بھی کارفرما ہیں۔ ہمارے بقیہ پرچے مئی کی تعطیلات میں آرہے تھے۔ اس لیے رخصت کی ضرورت نہ تھی۔ تعلیمی سال کا یہ امتحانی مرحلہ گرتے پڑتے گزرا پھر گرمیوں کی تعطیلات شروع ہوگئی اور ہم مہینہ بھر کے لیے آزاد ہوگے۔ (جاری)

...

Moinuddin Usmani
264, Shahu Nagar,
District:Jalgaon-425001(Maharashtra)
Mob:99212 99749, E-mail:moinusmani123@gmail.com

سنئے تو سہی

ڈاکٹر صادقہ نواب سحرؔ

(کھوپولی، رائے گڑھ، مہاراشٹر)

دہ سردیوں کا ایک سنہری دن تھا میں پچھلے چار دنوں کی طرح آج بھی اپنی پیاری سہیلی مہ جبین کی ناراضگی پر تڑپ رہی تھی کُٹّی برداشت سے باہر ہو رہی تھی۔ آخر میں نے نوٹ بک سے ایک صفحہ پھاڑا اور اس کے نام ایک خط لکھ دیا۔ خط اس تک پہنچا تو وہ بہت ناراض ہوئی۔ منہ پھلائے بیٹھی رہی۔ نجمہ ٹیچر کے کرسی سنبھالتے ہی اس نے جھٹ سے وہ پرچی آگے کر دی۔ ٹیچر نے مجھے سامنے بلایا۔ میں اپنی تھیلیوں میں فٹ پٹی کی گرمی محسوس کرنے لگی۔ ٹیچر ڈائس سے اتر کر میرے قریب آئیں۔ ہاتھ میں فٹ بھی تھی۔ میں اپنی ہتھیلیوں کو مسلنے لگی۔ انہوں نے قریب آ کر مجھے وہ پرچی زور سے پڑھنے کو دی۔ میں نے پڑھ دی۔ انہوں نے کہا، 'اس لڑکی میں تو شاعری کے جراثیم موجود ہیں۔'

اسکول کے بعد صوفیہ کالج سے اردو ادب میں فرسٹ کلاس آنرس لیا۔ ممبئی یونیورسٹی سے یکے بعد دیگرے تین زبانوں میں ایم اے کیا۔ پی ایچ ڈی بھی کر لی مگر اپنے بچپن کی ساتویں کلاس کی وہ ٹیچر مجھے کبھی نہیں بھولیں جنہوں نے اپنی سہیلی کے نام منظوم چھٹی لکھنے پر مجھ میں شاعری کے جراثیم ہونے کی نشاندہی کی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں گھر میں آنے والے اخباروں اور رسالوں میں سب سے پہلے شعری حصہ پڑھتے ہوئے نظر آتی تھی۔ ممی کبھی کھلکھلا کر ہنس دیتی تھیں۔ ان کے دانتوں کی قطاریں چمک اٹھتیں۔ وہ جب بھی بازار جاتیں، کئی رسالے بھی خرید لاتیں۔ بیسویں صدی، شمع، روبی، انقلاب، ٹائمس آف انڈیا، اکنامک ٹائمس گھر آتے۔

ناشتے کے بعد والدہ پورا انقلاب پڑھتیں۔ پھر وہ ہمارے حصے میں آتا۔ زبانیں مجھے بچپن سے بہت پسند ہیں۔ اسکول میں اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی، مراٹھی فارسی ہمارے مضامین تھے۔ سبھی مجھے پسند تھیں۔ قواعد سیکھنے میں مجھے بہت لطف آتا۔ فارسی میں لکھی ہوئی اپنی کہانی میرے پاس اب تک محفوظ ہے۔ ادب کیا ہے اور کیا چیز ادب نہیں ہے اس کا اندازہ کرتی رہتی تھی۔ انھیں دنوں ایک بار انقلاب میں مزاحیہ نظم پڑھی۔ عنوان تھا 'رشتہ مطلوب ہے'۔ جواب میں کئی مزاحیہ نظمیں انقلاب میں ہفتوں شائع ہوتی رہیں۔ میری حسِ مزاح جاگی اور میری نظم بھی ان میں شامل ہوئی۔ ان دنوں سردار عرفان ایڈیٹر تھے۔ مجھے بلایا۔ ممی کے ساتھ

میں تار دیو آفس میں ان سے ملاقات ہوئی۔ ٹی وی پروڈیوسر سدھا اروڑا کے مشہور پروگرام 'یو درشن' کے دو مشاعروں میں شامل کی گئی۔ بس یہیں سے شاعرہ کی حیثیت سے بلائی جانے لگی۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں اسکول کی لائبریری کی چھوٹی چھوٹی رنگین کرسیوں پر بیٹھ کر بچوں کی کہانیوں، ڈراموں اور نظموں کی کتابیں لائبریری پیریڈ میں پڑھا کرتی تھی۔ نئی کتابیں ہاتھ لگتیں تو کھِل اٹھتی... اردو، ہندی اور انگریزی کی کتابوں کو اسکول کھلنے سے پہلے ہی چاٹ جاتی۔ کتنی کہانیوں میں ڈوبی رہتی تھی میں! شاعری کی دنیا میں غرق رہتی! بعد میں کتابوں میں چھپا کر کہانیاں اور ناول پڑھنے کے شوق نے جکڑے رکھا۔

گھر میں نیم ادبی اخبار و رسائل آتے تھے۔ تب بڑے شوق سے اس کی کہانیاں، فلمی ستاروں کی زندگی اور سوال جواب کے کالم گھر میں پڑھے جاتے تھے۔ سب کو دلچسپی تھی۔ والدہ بہت ہنستی اور خوش ہوتی تھیں کہ میں شاعری بڑی دلچسپی سے پڑھتی تھی۔ والد نے میرے شوق اور ذوق کو تحریک دینے کے لیے کبھی کوئی کہانی سنائی اور اس کو اپنے طریقے سے لکھنے کو کہا اور کبھی موضوع دیے۔

'ایک لہسن کی کہانی لکھو...'

'آج ایک پیاز کی کہانی لکھو...'

'ایک کرسی کی...'

اب سوچتی ہوں تو تعجب ہوتا ہے کہ شاید وہ ایسا کروا کر مجھے ہر موضوع پر لکھنے کے لیے تیار کر رہے تھے۔ کیسے شکریہ ادا کروں ان کا کہ اب دنیا میں نہیں... ممی اور نانی کی شاعری، ان کی زبانی کہی ہوئی کہانیاں جو کبھی شاعری کی کتاب، کبھی ڈائری بن جاتی تھی۔ والدہ نے کئی ڈائریاں لکھی تھیں لیکن پھر پھاڑ دیں۔ ہم نے وہ ڈائریاں نہیں پڑھیں۔ وہ اپنی سوچ کو اپنی حد تک محدود رکھنا چاہتی تھیں۔ بس یہی وجہ تھی کہ سب پُرزے خاک میں ملا دیے گئے... بی اے کے پہلے سال میں داخلے کے وقت صوفیہ کالج کی پرنسپل اور بابا کی رائے ایک ہی تھی کہ زبانوں میں اس کی دلچسپی لکھنے کے فن میں مدد کرے گی۔

مجھے بچپن سے ہی بڑے بوڑھے بہت اچھے لگتے ہیں کہ ان کے پاس تجربات کا خزانہ ہوتا ہے۔ ہمارے پڑوس کے دو بزرگ کتابیں لے کر ہمارے گھر آتے تھے۔ وہ پڑھ نہیں پاتے تھے لیکن نسیم حجازی کے ناول بڑے شوق سے سنتے تھے۔ کسی کو تمیم انصاری مل گئی تھی۔ وہ کچھ اور بھی کتابیں خرید کر لاتے اور مجھ سے پڑھوا کر سنتے۔ یاد آتا ہے اپنی آپا سے بھی بچپن میں کہانیاں سننے کا لاڈ کروالیا تھا۔ بابا کو کتابیں پڑھنے کا بڑا شوق تھا۔ ان کے پاس ہر موضوع پر کتابوں کا انبار ہوا کرتا تھا۔ ان کو یاد کرتی ہوں تو ایزی چیئر پر لنگی اور بنیان پہنے ہوئے،

چشمہ لگائے ہوئے ڈیل کارنے جی کی یا کسی نفسیات کی کتاب پڑھتے ہوئے...دکھائی دیتے۔ یاد ہے چوتھی کلاس میں، میں نے ان کا اس طرح کا اسکیچ بنایا تھا جس میں ان کی ذہین آنکھیں عینک میں سے کتاب میں غرق دکھائی دے رہی تھیں۔ کم عمر میں ہی انھوں نے زندگی جینے کے سارے گُر ہمیں سکھا دیے۔ ان کو عملی جامہ پہنایا ممی نے۔ خیال آتا ہے کیسی زندگی جی لی انھوں نے! بچوں کے سوا انھیں کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ ان کی پرورش، ان کا آج، ان کا مستقبل...کم عمر میں ان کی شادی ہوئی تھی۔ ساری زندگی ماں باپ نے ہم پر لٹا دی۔

گھر میں ایک کتاب 'قصص الانبیاء' تھی۔ ہر رات کھانے کے بعد ہم سب ہال میں اکٹھا ہوتے تھے۔ میں اسے پڑھتی اور نانی اس کا خلاصہ کرتی جاتیں۔ کبھی کبھی وہ خود بھی پڑھ کر سناتیں۔ آہ نانی! انھوں نے ہی تو ماں کو روایت دی تھی بچوں کے لیے مرمٹ جانے کی۔ اٹھارہ سال کی عمر میں بیوہ ہو گئیں اور ساری زندگی شوہر کی ذمہ داریوں اور شوہر کے دیے ہوئے بچوں کا خیال رکھنے کا وعدہ نبھاتی رہیں۔

پیغمبروں کے قصے میرے اندر اترتے گئے۔ ممبئی میں ڈگری کالج میں اردو کی لیکچررشپ ایم اے کرتے ہی حاصل ہو گئی تھی لیکن اس وقت تک میں ایک ننھی منی سی بچی کی ماں بن چکی تھی۔ کھوپولی لوٹ کر ہندی پڑھاتے ہوئے مہابھارت اور رامائن کو جاننے کا موقعہ ملا۔ پہلے مجھے شکایت رہتی تھی، ایک چھوٹی سی جگہ پہنچا دیے جانے کی...لیکن بعد میں احساس ہوا۔ اب خدا کا شکر بجا لاتی ہوں کہ اس نے مجھے یہاں بھیجا۔ شاید میں بڑے شہروں کی زندگی میں محدود ہو کر رہ جاتی۔ یہاں کا ماحول، یہاں کے طالب علم، ملک کے الگ الگ حصوں اور خاص طور پر مہاراشٹر کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے اساتذہ اور کرم چاری۔

میں نے طلبا سے بھی بہت کچھ سیکھا۔ یقیناً آدیواسی تو مجھے کہاں ملتے۔ ان کا رہن سہن، ان کے گھر اور گاؤں، ان کے ریت رواج اور شادیاں، ان کے مسائل، ان کی، دلتوں کی، غریب مسلمانوں کی جھگّی جھونپڑیوں تک بھی میں پہنچ پائی...یہ علاقہ صنعتی علاقہ ہے۔ چھوٹے بڑے کارخانوں میں کام کرنے والی آبادی سے بنا ہوا۔ اچھے گھر کے پڑھے لکھے یا چھوٹے بڑے کاموں کے ہنر مند لوگ یہاں بستے ہیں۔ میں اکثر ہنستی ہوئی کہتی ہوں، 'جو یہاں آیا، یہیں کھپ گیا، یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ اچھا ہے کہ میں یہاں ہوں۔ یہاں ان سب نے میری سوچ کو اُجالا دیا ہے۔ صادقہ آراء سحؔر نے مضامین بھی لکھے، شاعری بھی کی اور افسانے بھی لکھے۔ رسالوں میں افسانے آئے، شاعری مسکرائی اور مبارک باد کے ڈھیر سارے خطوط آنے لگے لیکن صادقہ نواب سحر کے پاس وقت کی تنگی ہو گئی۔

بچے بڑے کرتے ہوئے چھپنے کا سلسلہ تقریباً نا کے برابر ہو گیا۔ جب جب وقت ملا، ٹی وی سیریلوں اور سہیلیوں سے گپ بازی میں نہیں گزارا بلکہ کبھی لکھا کبھی پڑھا۔ جو جی میں آیا، کیا۔ بچے بڑے کرنے کے علاوہ

جاب کی مصروفیات بھی ہوئی۔ان دنوں شاعری میرے اظہار کا ذریعہ زیادہ تھی کہ وہ تو ذہن میں تیار ہونے کے بعد کچھ ہی منٹوں میں کاغذ پر اتر جاتی تھی لیکن شاعری کو چھپنے کے لیے کم بھیجا۔اب بھی کم ہی بھجواتی ہوں۔کئی اہم مشاعروں میں بھی شریک ہوئی۔خوش قسمتی سے ایک شعری مجموعہ'انگاروں کے پھول' بھی آ گیا۔ یہ میری پہلی کتاب تھی۔اس کتاب کو میں کہیں پہنچا نہیں پائی۔کیا پتہ تھا کہ پہنچانا بھی ہوتا ہے!ناشر قتیل راجستھانی نے مجھ سے کہا بھی کہ میں اسے غزل گائیکوں تک پہنچاؤں۔پانچ سو کتابیں گھر میں پڑی رہ گئیں یا تحفوں میں چلی گئیں۔

شاعری کی طرف رخ ہوا،غزل سے زیادہ زندگی کی تلخ اور شیریں سچائیوں کو آزاد اور نثری نظموں میں اتارنے لگی۔خلوصِ دل سے دنیا کو شاعری میں سمیٹا۔'تکمیل' نے ممبئی کے شعرا پر نمبر نکالا، مجھے شامل کیا۔جینوئن شاعر مانی جانے لگی۔مجروح سلطانپوری صاحب نے شعبہء اردو کی سربراہ پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی کی موجودگی میں مہاراشٹر کالج کے ایک مشاعرے میں کہا تھا،'اس لڑکی میں بہت جَس ہے۔'

جرمنی سے شائع ہونے والے رسالے'جدید ادب' نے'صادقہ نواب سحر کی دس دلت نظمیں' کے عنوان سے میری نظموں کو مان دیا۔میں نے مان لیا کہ یہی میرا میدان ہے بس!لیجیے ایک عمر گزر گئی یہ سوچنے میں کہ میں کیا لکھنے کے لیے بنی ہوں۔شاعری کی طرف رجحان ہوا تو نثر نے پسندیدگی پائی اور جب نثر کی طرف جھکی تو شاعری نے قارئین کو متاثر کیا۔کچھ ایسا ہی ڈراموں کے ساتھ بھی ہوا۔

ہندی ادب میں فن کار کے خصوصاً دو طرح کے احساسات مانے جاتے ہیں۔سوانو بھوتی (ذاتی تجربہ)، سہانو بھوتی (دوسروں کا تجربہ) مثال کے طور پر بھکتی کال کی مشہور شاعرہ اور بھکت میرا بائی جو بچپن سے کرشن کی دیوانی ہیں، جب کہتی ہیں ہیں:

ہے ری میں تو پریم دیوانی ،میرا درد نہ جانے کوئی
گھایل کی گتی گھایل جانے اور نہ جانے کوئی

تو یہ ان کا اپنا تجربہ اپنی قلبی وارداتیں ہیں جو شعر کی شکل میں پھوٹی ہیں:

کون سی پاٹھی پڑھے ہو لل
من لیہو پر دیہو چھٹانک نہیں

تو یہ'سُجان' نامی بیوفا رقاصہ کے لئے ان کے اپنے جذبات واحساسات کا لیکھا جوکھا ہیں۔یہی سوانو بھوتی ہے۔اب آیئے'سور داس' کی طرف۔بھکتی کال کے اندھے کوی نے'بھرمر گیت' میں ان گوپیوں کے احساسات کو اپنے دل پر جھیل کر گوپی بن کر کرشن کے دوار یکا جانے پر جدائی کے درد کو دل پر جھیل کر گیتوں میں

سمویا۔ سورداس کے درد کو آپ کسی طرح بھی میرا کے درد سے کمتر نہیں مان سکتے۔ انہوں نے سہانو بھوتی یعنی ہمدردی کو سوانو بھوتی یا اپنے دل کا درد بنالیا تھا۔ کوئی بھی پڑھنے والا یہ نہیں کہہ سکتا کہ اگر گوپیوں کے پاس ذریعہ اظہار ہوتا تو وہ یوں ہی کہتیں:

نِس دن برست نین ہمارے

جب میرے طلباء مجھ سے میری تحریک کے بارے میں پوچھتے ہیں تو ان سے ہیں۔ یہی کہتی ہوں کہ تمہیں لوگوں سے میں نے احساسات وخیالات پائے ہیں۔ میری شاعری میرا کی کم اور سورداس کی شاعری زیادہ ہے اور یہ مان لینے میں مجھے کوئی جھجک نہیں۔ میں ممنون ہوں اپنے شوہر اسلم نواب صاحب کی جنہوں نے کبھی نہ مجھے ہی غلط کیا اور نہ میری شاعری کو بلکہ اس کتاب کی اشاعت میں بھی ان کی حوصلہ افزائی کارفرما رہی۔ شکرگزار ہوں والد مرحوم خواجہ میاں صاحب اور والدہ شرف انساء بیگم کی جن کی محبت اور حوصلہ افزائی مجھے بچپن سے ہی دستیاب ہے۔

احسان مند ہوں اپنے تمام اساتذہ کی جنہوں نے مجھے اردو ادب سے روشناس کرایا۔ خاص طور پر پروفیسر فصیح احمد صدیقی، جو اردو کے ایک جید عالم ہیں۔ شکریہ افتخار امام صاحب کا جنھوں نے میری چند غزلوں کی اصلاح کی اور اپنی قیمتی آرا سے بھی نوازا لبشکریہ پروفیسر نندلال پاٹھک کا جنھوں نے میری تحریروں میں انفرادیت کا احساس دلایا۔ اور میرے قلم کو عورت ذات کا قلم ہونے کے باوجود نڈر بنانے کا حوصلہ یہ کہہ کر دیا کہ شاعر اور ادیب ایک اداکار یا کلاکار ہی ہوتا ہے۔ اداکار کو بھی رام اور کبھی راون بنا پڑتا ہے۔ اسی طرح شاعر کو ہر طرح کے جذبات کی ترجمانی کرنی پڑتی ہے۔

پھر پتہ نہیں کیا ہوا! ایک دن اچانک ایک خیال نے مجھ سے ایک ناول لکھالیا۔ 2008ء میں پہلے ناول 'کہانی کوئی سناؤ متاشا' کی آمد نے احساس دلایا کہ میں فکشن کے لیے بنی ہوں... اور پھر کچھ پرانی کچھ نئی کہانیاں جمع کر کے ایک مجموعہ 'خلش بے نام سی' تیار ہوا۔ دوسرا ناول 'جس دن سے...!' نے بھی پذیرائی حاصل کی۔ دو ناولوں کے، ایک افسانوں کے اور ایک ڈراموں کے مجموعے 'مکھوٹوں کے درمیان' فکشن کے نام پر میری جھولی میں آگئے۔ ان پر لکھی گئی تنقیدی تحریریں 'صادقہ نواب سحر: شخصیت اور فن (فکشن کے تناظر میں)' میں آٹھ سو صفحات میں اور 'روبرو' میں آٹھ سو صفحات میں سمٹ گئیں۔ میرے شوہر اسلم نواب صاحب نے ہر قدم پر نہ صرف میرا ساتھ دیا بلکہ رہنمائی بھی کی۔ ملک بھر کی سیر کروائی۔ ہم نے بیرونِ ممالک کے تجربے بھی حاصل کئے۔ میری تحریروں کے لیے یہ تجربات بھی اساس بن گئے۔ 'پیچ ندی کا مچھیرا' میرا دوسرا افسانوں کا مجموعہ ہے۔ اب سوچتی ہوں... اچھا ہے کہ فکشن کی طرف دیر سے آئی۔ اب رومانی، نیم رومانی زندگی میں

اکیسویں صدی کی نئی دنیا گھل مل جوگئی ہے۔ دیر آید درست آید۔

میں اپنے موضوعات زندگی سے اخذ کرتی ہوں۔اسی دنیا سے اپنے آپ آس پاس سے میرے یہاں کردار وہی ہوتے ہیں۔ جو حقیقت میں کہیں نہ کہیں موجود ہیں۔آج کل اتنے کردار موضوعات بکھرے پڑے ہیں کہ خیالی کردار کی تخلیق کی ضرورت ہی نہیں، زندگی کتنی رنگ برنگی، کتنے عجیب وغریب، کتنی خوبصورت، کتنی بد صورت مشاہدے سے پتا چلتا ہے۔اور خالص ایسی ہے بھی نہیں۔ یہاں کوئی سپاٹ کردار نہیں ہے۔اور نہ کوئی گول کردار ہے۔سب گڈ مڈ ہے۔

میرا پسندیدہ موضوع خالص رومانس ہرگز نہیں ہے۔ زندگی کی خوشیوں اور دکھوں میں سمائے ہوئے عصری معاشی مسائل مجھے متاثر کرتے ہیں۔ میرے کوشش یہی رہتی ہے کہ میں نئے نئے موضوعات اور مسائل پر لکھوں۔مختلف قسم کے کرداروں کے زندگی کے پہلوؤں کو آشکار کروں۔ان چھوٹی باتوں پر لکھوں۔ اُسلوب افسانہ لکھنے سے پہلے ذہن میں ابھرتا تو ہے۔لیکن افسانہ مکمل ہوتے ہوتے کبھی کبھی اس کا ڈھب بدل جاتا ہے۔میں موضوعات اور کردار زندگی سے لیتی ہوں۔تصور سے رنگ بھرتی ہوں۔

مجھے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہر انسان جو اظہار خیال کرنا چاہتا ہے اور لکھنا چاہتا ہے اسے لکھنا ہی چاہئے۔ اچھا لکھنے کے لئے اچھا پڑھنا بھی چاہئے۔تحریر میں دیانت داری ہو سچائی ہو اور سادگی ہو۔

آج کل انٹرنیٹ نے پوری دنیا کو عالمی گاؤں میں تبدیل کر دیا ہے۔اور ہم کسی ایک شہر یا ملک میں پیدا نہ ہو کر اس دنیا میں پیدا ہوئے ہیں۔دنیا میں جو کچھ ہے اس پر لکھا جا سکتا ہے جو اپیل کرے، جو متاثر کرے۔آج کا دور ایسی تخلیقات ہی ادب سے چاہتا ہے۔اور اس کی ضرورت بھی ہے۔

...

Dr. Sadiqua Nawab Saher
Flat No.301, 3rd Floor,
Sadiqua Mansion, Shastri Nagar, Above Axis Bank,
Khopoli, Dist: Raigad-410203(Maharashtra)
Mob:-09370821955, E-mail :sadiquanawabsaher@hotmail.com

بال برادری: بچوں کی خلد بریں

غیاث الرحمٰن

(نوئیڈا، یوپی)

وہ بھی کیا دن تھے، جب ہم خود بچے تھے اور بہت سے ننھے منے بچوں کے بیچ گھرے رہتے تھے۔ وہ خوشی کے لمحات، وہ کھیل کود کی ساعتیں، وہ بے فکری کا عالم پھر اس کے بعد زندگی میں کبھی بھی میسر نہ ہوا۔ 'بال برادری' کی وہ چہل پہل وہ رونقیں ایک حسین اور ناقابلِ فراموش خواب کی طرح اب بھی ہمارے ذہن و دل کے نہاں خانوں میں محفوظ ہیں۔ موجودہ زندگی کی ہماہمی اور مشینی دور کی اس دوڑ دھوپ میں جب بھی تنہائی کے کچھ لمحات ملتے ہیں تو میں بال برادری میں گزارا ہوا بچپن یاد کر کے اپنے سارے دکھ درد، رنج والم اور تلخ حالات کو بھول کر بال برادری کے گلستاں میں لڑکھڑاتے ہوئے بچپن کی یادوں میں کھو جاتا ہوں۔ جنھیں یاد کر کے ایک گونا راحت وانبساط کا احساس ہونے لگتا ہے۔

بال برادری جو قیصر نقوی صاحب کے خوابوں کی تعبیر تھی، بچوں سے ان کی والہانہ محبت اور سماج کی فلاح و بہبودی کے لیے کچھ اچھا کر جانے کی کوششوں کا نتیجہ بال برادری کا قیام تھا۔ جہاں روزانہ شام میں ننھے منے بچوں کی شکل میں رنگ برنگے پھول کھلتے تھے۔ بچوں کے لیے ہر طرح کے کھیلوں اور مختلف قسم کی اکٹیویٹز (activities) کا بھر پور انتظام تھا۔ 4 سے 14 سال کی عمر کے بچے ہی اس کے ممبر ہوا کرتے تھے ان کی دلچسپی کی تمام تر چیزیں وہاں موجود تھیں۔ ان بچوں کے لیے تو بال برادری گوشہ جنت سے کم نہ تھی۔

عبداللہ گرلز کالج کے گیٹ کے سامنے کافی وسیع وعریض ہرے بھرے لان کے بیچوں بیچ کشادہ سفید عمارت، عمارت میں کئی کمرے اور ایک بڑا سا ہال، ہال کے ایک حصہ میں ٹیبل ٹینس، دوسرے حصوں میں آرٹ اینڈ کرافٹ کا سامان موجود تھا۔ موسیقی کے آلات ڈرائنگ اور پینٹنگ کی سہولتیں، ایک کمرے میں بہت سی چھوٹی چھوٹی سائیکلیں جن کے سب بچے دیوانے ہوا کرتے تھے۔ لان کے ایک حصے میں بڑا سا دائرہ نما سیمنٹ سے بنا ہوا چکنا پلیٹ فارم جہاں بچے چھوٹی چھوٹی سائیکلیں چلا کر خوشی سے جھومتے ہوئے نظر آتے تھے، وہیں پلیٹ فارم کے باہر بہت سے بچے قطار میں کھڑے ہوئے، اپنی باری کا انتظار کرتے ہوئے دکھائی

دیتے تھے۔ انڈور گیمز میں کیرم بورڈ، لوڈو، بلاک فٹنگ اور تعلیمی تاش جیسے کھیل، تو میدانی کھیلوں میں فٹ بال کرکٹ وغیرہ موجود تھے۔

کلچرل ایکٹیوٹی (cultural activity) میں میوزک اور ڈرامے کی پریکٹس، بچوں کی شخصیت کو نکھارنے اور ان میں خود اعتمادی بڑھانے کے لیے کہانی سننا سنانا، لطیفے پیش کرنا، کسی موضوع پر تقریر یا ڈبیٹ کرنا شامل تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ یہ سارا نظام بچے ہی چلاتے تھے۔ قیصر صاحب ایک نگراں کی حیثیت سے ان پر نظر رکھتے تھے۔ ہر ایکٹیویٹی (activity) کا ایک بچہ ذمہ دار یا انچارج ہوتا تھا۔ میری دلچسپی اور احساس ذمہ داری کو دیکھ کر مجھے بہت جلد جنرل سیکریٹری بنا دیا گیا تھا۔ میں ان تمام انچارج بچوں کا انچارج ہو گیا تھا اور ان کی کارگزاریوں کا نگراں بھی تھا۔ میں اجازت لے کر ہر اتوار کو ایک چھوٹا سا کلچرل پروگرام کرنے لگا تھا۔ جس میں بچے اپنی استعداد کے مطابق کوئی گیت، نظم، لطیفہ، کہانی، یا ڈرامہ وغیرہ پیش کرتے تھے۔

یہ پروگرام بہت زیادہ مقبول ہونے لگا۔ بچوں کے والدین بھی آجاتے تھے اور بہت لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔ پھر تین چار مہینوں میں ایک بڑا کلچرل پروگرام کیا جانے لگا۔ اس کے ساتھ سال میں ایک یا دو بار کوئی پکنک یا تعلیمی ٹوور کا بھی اہتمام ہوتا تھا۔ شام کے وقت سارے کھیل بند کر دیے جاتے تھے۔ سائیکلیں اور کھیل کود کے دوسرے سامان کمروں میں سلیقہ سے رکھ دیے جاتے تھے تب بھی بہت سے بچوں کا گھر جانے کا دل نہیں ہوتا تھا۔

ان کی اس تشنگی کو دیکھتے ہوئے میں نے بچوں کو کہانیاں سنانے کا سلسلہ شروع کیا بچے بہت دلچسپی لینے لگے۔ کہانی وہی پریوں، چاند تاروں، پھولوں، پیڑ پودوں، جانوروں اور پرندوں کی سبق آموز اور بچوں میں اعتماد بڑھانے والی کہانیاں جو مسلسل کڑی سے کڑی جڑتی چلی جاتی اور ایسے موڑ پر چھوڑتا کہ بچوں میں تجسس قائم رہے۔ بچوں کی دلچسپی بڑھتی گئی میں نے یہ شرط لگا دی کہ میں انہیں بچوں کو کہانیاں سناؤں گا جو اپنا ہوم ورک پورا کریں گے اور اپنے والدین کی نافرمانی نہیں کریں گے۔ میرا یہ فارمولا بہت کامیاب ہوا بچوں کے والدین بھی بہت خوش اور مطمئن تھے۔

قیصر صاحب نے بال برادری میں شام کے بعد ایک اور عمل شروع کیا تھا وہ تھا آس پاس کے رکشہ چلانے والے اور مزدوری کرنے والے لوگوں کو ایک ساتھ جمع کر کے ان کے ساتھ تاش اور کیرم بورڈ کھیلنا،

مقصد یہ تھا کہ اس طبقے کے لوگوں کا تھوڑا سا انٹرٹینمنٹ ہو جائے اور وہ دن بھر کے تھکے ہارے کچھ دیر آرام اور آسائش میں گزاریں۔ کوئی نشہ کرنے کی بجائے یہاں آ کر کچھ دیر خوش ہو جائیں اور پھر گھر جا کر بیوی بچوں پر زیادتی کرنے کے بجائے اچھے انداز سے پیش آئیں۔ میں بھی ان لوگوں کے ساتھ کھیلتا بھی تھا اور کھیل کھیل کے دوران انہیں تھوڑا بہت پڑھا بھی دیا کرتا تھا اردو ہندی اور انگریزی کے حروف کے ساتھ ساتھ ان کو اپنا نام لکھنے کی مشق کرانا، جس میں کافی کامیابی ہوئی تھی۔

ایک روز ایک نیا شخص آیا اس کا نام تھا 'کالو'۔ اس کو دیکھ کر کچھ لوگوں نے ناک بھوئیں چڑھائیں۔ ایک نے آ کر میرے کان میں کہا۔

'میاں اس آدمی کو یہاں سے نکال دیجئے یہ بہت بدتمیز اور لڑاکو آدمی ہے۔ روز دارو پی کر اپنی بیوی کو مارتا ہے۔' (وہاں سب رکشہ والے مجھے میاں کہتے تھے)

قیصر صاحب دوسرے لوگوں کے ساتھ تاش کھیل رہے تھے اور میں دو تین لوگوں کو ان کا نام لکھنا سکھا رہا تھا۔ اگرچہ میں خود ابھی دسوئیں کلاس ہی میں تھا لیکن لوگوں سے ٹھیک سے ڈیل کرنا آتا تھا۔ کالو ادھر ادھر گھوم رہا تھا کوئی اس کو لفٹ نہیں دے رہا تھا۔ میں نے اس کو اشارے سے اپنے پاس بلایا وہ آیا تو اس کے لیے میں نے ایک کرسی کھینچتے ہوئے اس سے کہا۔

'آیئے اس پر بیٹھ جائیں'۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے بھی اس سے ڈر لگ رہا تھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا 'بھائی آپ کا نام کیا ہے؟' اس نے بڑی کرخت آواز میں کہا۔

'کالو...کالو ہے میرا نام'۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

'واہ۔ بڑا اچھا نام ہے اور لکھنے میں بھی بہت آسان ہے۔'

وہ میری طرف ایسے دیکھنے لگا، گویا میں اس کی ہنسی تو نہیں اڑا رہا ہوں۔

پھر میں نے کہا۔ 'کالو بھائی...آپ کو اپنا نام تو لکھنا آتا ہی ہوگا؟'

'نہیں آتا۔ مجھے لکھنا پڑھنا نہیں آتا'۔ اس نے کہا۔

میں نے کہا کہ 'کوئی بات نہیں۔ آپ کا نام تو بہت آسان ہے۔ لکھنے میں ذرا بھی پریشانی نہیں ہوگی... ان کا نام تو بہت مشکل ہے۔ محی الدین'، میرے پاس بیٹھے ہوئے ایک آدمی کی طرف میں نے اشارہ

کرتے ہوئے کہا۔

آٹھ دن سے میں انھیں محی الدین لکھنا سکھا رہا ہوں، لیکن ابھی تک بھی انھیں اپنا نام لکھنا نہیں آیا۔

'آپ کا نام تو اتنا آسان ہے کہ ایک بار میں ہی سیکھ جائیں گے۔'

میں نے کاپی پنسل ان کی طرف بڑھائی اور اس پر انگریزی میں کالو (KALU) لکھ دیا۔ انہیں تھوڑی سی دلچسپی پیدا ہوئی۔ میرے لکھے پر پنسل پھیرنے لگے پھر اس کی نقل کرتے ہوئے نیچے لکھنے لگے۔ آدمی ذہین لگ رہے تھے ایک دن میں اپنا نام انگریزی میں لکھنے لگے۔ دوسرے دن پھر آئے اس طرح روز آنے لگے۔ رویہ بتدریج نرم ہوتا ہوا محسوس ہوا۔ پہلے اپنا نام انگریزی میں لکھنا سیکھا، پھر ہندی میں اور بعد میں اردو میں بھی 'کالو' لکھنا آ گیا۔ انہیں پڑھائی میں اس قدر دلچسپی بڑھی کہ نشے کی یاد ہی نہیں آئی۔

لڑائی جھگڑے بھی بند ہو گئے ایک روز وہ کاغذ کے تھیلے میں بہت سی گرما گرم جلیبیاں لے کر آئے۔ وہاں بیٹھے ہوئے سبھی ممبران کو اپنے ہاتھ سے ایک ایک جلیبی کھلائی۔ وہ بہت خوش دکھائی دے رہے تھے۔ ان کا یہ رویہ دیکھ کر سب لوگوں کو تعجب ہو رہا تھا۔

پھر انہوں نے کہا کہ 'آج تک کسی نے مجھے عزت نہیں دی تھی۔ میرا نام لیکر، کالو... کالو، کہہ کر مجھے چڑھاتے تھے۔ (میری طرف اشارہ کر کے کہا) میاں نے مجھے عزت دی، اپنے پاس کرسی پر بٹھایا۔ میرے نام کی تعریف کی، مجھے میرا نام لکھنا سکھایا، میں تو میاں کا غلام ہو گیا۔'

قیصر صاحب نے اٹھ کر اسے گلے لگا لیا۔ کالو بھائی نے جوش میں مجھے اٹھا کر اپنے کندھے پر بٹھا لیا۔ وہ بڑا عجیب و غریب منظر تھا یہ واقعہ میں آج تک نہیں بھولا۔ ہائی اسکول پاس کرنے کے بعد میں ہاسٹل میں شفٹ ہو گیا تھا۔ اس کے بعد پھر کبھی کالو بھائی سے ملاقات نہیں ہوئی لیکن یہ احساس ہے کہ بال برادری کے ماحول میں آ کر نہ جانے کتنے کالو بھائی راہِ راست پر آ گئے ہوں گے اور نہ جانے کتنے بچوں کو ان کی زندگی میں آگے بڑھنے اور پروان چڑھنے میں مدد ملی ہو گی...

بال برادری میری زندگی کا پہلا ٹریننگ اسکول کا درجہ رکھتی ہے۔ میری عملی زندگی میں اس کا اثر جاری و ساری رہا وہاں بچوں کو کہانیاں سناتے سناتے کہانیاں لکھنے کا شوق ہوا اور کہانی لکھنے کا ہنر اور سلیقہ آ گیا۔ مجھے اب بھی لگتا ہے کہ اگر میں بال برادری سے منسلک نہ ہوا ہوتا تو شاید کبھی افسانہ نگار نہ بن پاتا۔ میرے افسانوں

اور ناولوں میں ہمیشہ ایک بچہ کردار ضرور ہوتا ہے، یہ لاشعوری طور پر بال برادری کا ہی اثر ہے کیوں کہ اتنے دنوں بچوں کے بیچ کام کرنے سے مجھے بچوں کی نفسیات کا عملی مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ میں بچوں کے کردار کو زیادہ خوبی سے نکھارنے میں لذت محسوس کرتا ہوں۔

وہیں سے مجھے کھیلوں سے بھی دلچسپی ہوئی جس سے مجھے پہلے یونیورسٹی اور بعد میں آل انڈیا ریڈیو میں مختلف کھیلوں میں نمائندگی کا موقع ملا۔ بال برادری سے ہی میں نے کھیلوں کی کمینٹری کرنا سیکھا، جس کا فائدہ یہ ہوا کہ مجھے آل انڈیا ریڈیو میں انٹرنیشنل میچوں کی کمنٹری کرنے کے مواقع ملے اور میں مستقل اسپورٹس پروگرام کا انچارج بنا رہا۔ بال برادری میں عملی تجربے اور مشاہدوں سے مجھ میں خود اعتمادی اتنی بڑھی کہ یو پی ایس سی (PUSC) کے فرسٹ اٹیمپٹ (first attempt) میں ہی گزٹیڈ آفیسر کی پوسٹ کے لیے منتخب ہو گیا۔

یوں تو بچوں کے بے شمار واقعات ہیں جو مجھے کبھی بھی یاد آ جاتے ہیں تو لبوں پر مسکراہٹ بکھر جاتی ہے۔ ایک بچی جو مجھے اب بھی بہت یاد آتی ہے اس کا وہ معصوم چہرہ اب بھی میری آنکھوں میں سما جاتا ہے۔ ہوا یوں کہ ایک مرتبہ میں سوشل ایجوکیشن آفس گیا، جو بال برادری سے میریس روڈ کی طرف جاتے ہوئے نزدیک ہی تھا۔ اس آفس میں رادھارمن ایک سینئر افسر تھے۔ میں ہمیشہ انہیں آداب کرتا تھا اور وہ بڑے ہی شفقت کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اس روز ایک صاحب ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ مجھے دیکھ کر رادھارمن ان صاحب سے بولے۔ (ان صاحب کا نام تو یاد نہیں رہا۔)

'تم اپنے بچوئیں کو بال برادری کیوں نہیں بھیجتے؟ یہاں بھیجا کرو، بچوں کے مانسِک وشاریرِک وِکاس کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔'

پھر مجھ سے مخاطب ہو کر بولے 'سنو بابو، ان کے بچوں کا اچھی طرح دھیان رکھنا۔'

میں نے بڑے احترام سے قبول کر لیا۔

اسی روز شام کے وقت میں نے دیکھا کہ وہی صاحب اپنے اسکوٹر پر اپنی تین لڑکیوں کو لے کر بال بھون پہنچ گئے اور میرے حوالے کر کے چلے گئے۔ میں نے تینوں بچیوں کو اندر لے جا کر ممبر شپ والے رجسٹر میں ان کے نام نوٹ کیے۔ بڑی لڑکی سات سال کی تھی، دوسری پانچ سال کی اور تیسری صرف تین سال کی تھی، جو ممبر نہیں بن سکتی تھی۔ میں نے اس کا نام پوچھا اس نے بڑی میٹھی سریلی آواز میں کہا، 'پلیا'۔ مجھے اس کا نام اتنا پیارا

لگا کہ میں بار بار اس سے اس کا نام پوچھتا رہا اور وہ اپنی تتلی زبان میں، 'پلیا، پلیا' کہتی رہی۔ اس کی بڑی بہن نے بتایا کہ اس کا نام 'پریہ' ہے۔ لیکن مجھے اس کا 'پلیا' کہنا ہی بہت اچھا لگ رہا تھا۔

میں نے دونوں بڑی بہنوں کو سائیکلیں دے دیں۔ وہ دونوں سائیکل چلانے میں مصروف ہو گئیں اور میں اس نازک سی چمیلی کی نوخیز کلی، 'پلیا' کو گود میں لیے لیے پھرتا رہا۔ دو ڈھائی گھنٹے کے بعد وہ صاحب اپنی بیٹیوں کو لینے آ گئے، لیکن 'پلیا' مجھ سے اتنی مانوس ہو گئی تھی کہ وہ اپنے والد کے ساتھ جانے کو تیار نہیں ہو رہی تھی۔ اور مجھ سے چپٹی جا رہی تھی۔ بمشکل وہ جانے کو تیار ہوئی۔ کچھ دن بعد اتوار میں کلچرل پروگرام ہونا تھا میں نے بڑی بہن سے کہا کہ تم تینوں کوئی 'گیت' یا 'کویتا' تیار کر کے سنانا۔ اگلے اتوار کو صبح دس بجے سے پروگرام ہونا تھا۔ وہ تینوں بہنیں وقت پر پہنچ گئیں۔ وہ لوگ میرس روڈ کی طرف کہیں رہتے تھے۔ پروگرام سے پہلے ایک مرتبہ میں سب بچوں کی ریہرسل دیکھتا تھا۔ دونوں بڑی بہنوں نے تو اچھی سی دیش پریم کی کویتا سنائی۔ جب میں نے 'پلیا' سے پوچھا کہ تم کیا سناؤں گی تو اس نے اپنی وہی مترنم توتلی زبان میں کہا۔

'چھالے جہاں چھے اچھا ہندوچھتاں ہمالا ہم اُچ چھے بُلبے بُلبے۔' (سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا، ہم اس کے بلبلے... یہ سن کر سب لوگ ہنس پڑے۔

وقت بیت تا گیا۔ کئی برسوں بعد ایک مرتبہ علیگڑھ کے ریلوے اسٹیشن پر میں گورکھپور جانے والی ٹرین کے انتظار میں تھا تو ایک لڑکی میرے پاس آئی نمستے کہتے ہوئے پوچھا، 'سر آپ وہی ہیں نا، جو بال برادری میں ہوا کرتے تھے؟'

میں نے اس کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا، 'ہاں، لیکن تم کون ہو؟

اس نے کہا، 'میں ثریا ہوں، سر، ہم تین بہنیں بال بھون میں آتی تھیں، آپ ہمیں سائیکل دلوایا کرتے تھے۔'

مجھے ایک دم یاد آ گیا میں نے کہا، 'ہاں... اوہو، تم شاید 'پلیا' کی بہن ہو'؟

'ہاں سر میں پریہ کی بڑی بہن ہوں۔'

میں نے اس سے پوچھا، 'لیکن اتنے برسوں بعد تم نے مجھے کیسے پہچان لیا؟'

'سر آپ میں تو کوئی چینج نہیں آیا۔ آپ بالکل ویسے ہی ہیں، ہاں میں بڑی ہو گئی ہوں۔'

میں نے پوچھا، 'تم کیا کر رہی ہو؟ اور میری 'پلیا' کیسی ہے؟'

اس نے کہا، 'سر میں لکھنؤ میں بینک منیجر ہوں، مجھ سے چھوٹی، مونیکا، سی بی آئی انسپکٹر ہے، آجکل مدراس میں پوسٹیڈ ہے اور پریہ، یعنی آپ کی 'پلیا' ائیر انڈیا میں، ائیر ہاسٹیس ہے۔'

'واہ۔ بڑی خوشی کی بات ہے کہ تم سب نے بہت پروگریس کی اور تمھارے پتا جی کیسے ھیں؟'

'سر پتا جی کا تو دس سال پہلے دیہانت ہو گیا۔'

'اوہ، بہت دکھ ہوا سن کے...'

کچھ اور باتیں ہوتیں، اس سے پہلے ہی ٹرین آ گئی۔ اس کو بھی غالباً اسی ٹرین سے جانا تھا، لیکن ہم دونوں کا ریزرویشن الگ الگ ڈبوں میں تھا۔ بات پوری بھی نہ ہوئی تھی کہ ہمارا سفر شروع ہو گیا...

...

Prof. Ghayasur Rahman Syed,
B-706, Prasarkunj Govt Colony,
Sector Pi-1, Greater Noida,
Gautam Buddha Nagar-201315(Up)
Mob:9911982682

مولانا محمد فاروق خان کی یاد میں

شاہ عمران حسن
(ایڈیٹر کتابی سلسلہ آپ بیتی، نئی دہلی)

جون 2023ء کی 28 تاریخ تھی اور شام چھ بجے کا وقت۔ میں کچھ ضروری کام میں مشغول تھا کہ اچانک رابطہ عامہ کی سائٹ فیس بک کے ایک خبر پر نظر پڑی، غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ ابھی چند گھنٹے قبل معروف عالم دین اور جماعت اسلامی ہند کے معمر رہنما مولانا محمد فاروق خان انتقال کر گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون!

میں خبر کی تحقیق کے لیے فیس بک پر اسکرول کرنے لگا اور مزید لوگوں کے ٹائم لائن دیکھنے لگا اور پھر اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ جماعت اسلامی کے صوفی بزرگ مولانا محمد فاروق خان اب اس دنیا میں نہیں رہے ہیں۔ ایک طرف میں مولانا محمد فاروق خان کے انتقال کی تصدیق کر رہا تھا اور دوسری طرف ان کے تعلق سے میرے ذہن میں یادوں کی ریل چل رہی تھی کہ آج ہم سے وہ شخصیت جدا ہوگئی جو مترجم قرآن (ہندی) کے طور پر مشہور تھی۔

29 جون 2023ء کو عید الاضحیٰ تھی۔ لکھنؤ میں عید کی نماز کے بعد مولانا محمد فاروق خان کی نمازِ جنازہ پڑھائی گئی۔ پھر جنازہ کو ان کے آبائی وطن سلطان پور لے جایا گیا، جہاں دوبارہ نمازِ جنازہ ہوئی اور تدفین عمل میں آئی۔

مولانا محمد فاروق خان کے قلندرانہ مزاج کو دیکھ کر قدیم زمانہ کے صوفیا کرام کی یاد تازہ ہو جاتی تھی، ایسا لگتا تھا کہ وہ دنیا جہاں سے بے خبر ہیں مگر ایسا نہیں تھا بلکہ وہ اسی دنیا میں رہتے ہوئے آخرت میں جیتے تھے، وہ انتہائی سنجیدہ فکر کے حامل انسان تھے، جن کی دلچسپی کا سب سے بڑا مقصد دین کی خدمت تھا، شاید یہی سبب ہے کہ انھوں نے اپنی پوری زندگی قرآن وحدیث کی تشریح وتوضیح اور افکارِ اسلامی کی تنقیح وتحقیق کرتے رہے۔ اور ہمیشہ نام ونمود سے دور رہے، حتیٰ کہ ان کی درویشانہ اور قلندرانہ صفت کو دیکھ کر انسان حیرت واستعجاب میں پڑ جاتا تھا۔

سکریٹری شریعہ کونسل، جماعت اسلامی ہند مولانا محمد رضی الاسلام ندوی کے مطابق عید الاضحیٰ کا تہوار منانے کی غرض سے مولانا محمد فاروق خان 28 جون 2023ء کو قومی دار الحکومت نئی دہلی سے بذریعہ کار ریاست اتر پردیش کے دار الحکومت لکھنؤ کے لیے صبح کے چھ بجے روانہ ہوئے۔ دن کے گیارہ بجے وہ اپنے صاحبزادے طارق انور خان کی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ وہاں انھوں نے دن کا کھانا کھایا۔ ظہر کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد انھوں نے اپنے صاحبزادے سے سینے میں درد کی شکایت کی۔ انھیں دوا دی گئی، دوا لینے کے بعد وہ بستر پر لیٹ گئے

مگر افاقہ نہ ہوسکا اور عصر سے قبل ابدی نیند سو گئے۔ بقول حیرت الہ آبادی:

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا پل کی خبر نہیں

انتقال کے وقت مولانا محمد فاروق خان کی عمر 91 سال تھی۔ وہ ریاست اتر پردیش کے ضلع سلطان پور کے گاؤں مسورن میں سنہ 1932ء، میں پیدا ہوئے۔ مسورن گاؤں کادی پور تحصیل میں واقع ہے۔

ابتدائی تعلیم انھوں نے مقامی سطح پر حاصل کی، اس کے بعد انھوں نے ہندی زبان وادب میں ایم ایم ایچ کالج غازی آباد، یوپی (M M H College,Ghaziabad) سے ایم اے کیا۔ انھوں نے ہندی زبان وادب میں تعلیم حاصل کی تھی اگرچہ وہ ہندی اور اردو میں یکساں طور پر لکھتے تھے، جب کہ عربی، فارسی اور انگریزی زبانوں پر بھی انھیں قدرت تھی۔

سنہ 1952ء میں انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز اعظم گڑھ میں درس وتدریس کے ساتھ کیا۔ اگرچہ وہ جلد ہی اس پیشے کو ترک کر کے تصنیف وتالیف سے وابستہ ہوگئے۔ وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریروں سے متاثر ہوئے اور آزادی ہند کے بعد سنہ 1956ء میں جماعت اسلامی ہند میں شمولیت اختیار کی، وہ تاعمر جماعت اسلامی ہند سے نہ صرف وابستہ رہے بلکہ اس کی آبیاری کے لیے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ صرف کر دیا۔ جماعت اسلامی ہند سے وابستگی کے دوران انھیں متعدد ذمہ داریاں دی گئیں جسے انھوں نے بحسن وخوبی انجام دی۔

ادارہ الحسنات (رام پور، یوپی) کے بانی مولانا ابوسلیم عبدالحی (1910-1987)ء کی ہدایت پر مولانا محمد فاروق خان نے قرآن کریم کا ہندی زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ ادارہ الحسنات سے شائع ہوا، یہ مولانا محمد فاروق خان کا سب سے بڑا کارنامہ بھی ہے اور سب سے بڑا تعارف نامہ بھی۔ ہندی ترجمہ قرآن کی اشاعت کے بعد جماعت اسلامی ہند کے پہلے امیر جماعت مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی نے ان کی خدمات جماعت اسلامی ہند کے لیے حاصل کیں۔

اس کے بعد مولانا محمد فاروق خان نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے اردو ترجمہ قرآن کا بھی ہندی میں ترجمہ کیا۔ وہیں انھوں نے قرآن مجید کی عام فہم زبان میں تفسیر بھی لکھی تھی، جو ان کی زندگی میں شائع نہ ہوسکی۔ امکان قوی ہے جلد ہی ان کی تفسیر مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز (نئی دہلی) کی جانب سے شائع ہو۔ اطلاعات کے مطابق ان کے تفسیر کی کمپوزنگ اور پروف ریڈنگ کا کام مکمل ہو چکا ہے۔

ایسا لگتا ہے مولانا محمد فاروق خان کو قرآن مقدس سے عشق تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ترجمہ وتفسیر کے علاوہ انھوں نے قرآن مجید کے موضوع پر مزید کتابیں مثلاً قرآن مجید کے ادبی محاسن، شاہ عبدالقادر کی قرآن فہمی،

قرآن کے تدریسی مسائل، قرآن کا صوتی اعجاز وغیرہ۔

قرآن مجید پر تحریری کام کرنے کے علاوہ انھوں نے مسلسل قرآن کا درس بھی دیا ہے۔ انھوں نے دہلی کی جامع مسجد میں سنہ 1990ء سے درس دینا شروع کیا۔ مولانا محمد رضی الاسلام ندوی کی تحقیق کے مطابق انھوں نے درس کے دوران پانچ دفعہ قرآن مکمل کیا۔ جامع مسجد (دہلی) کے علاوہ وہ جماعت اسلامی ہند کے دونوں مرکز یعنی چتلی قبر (دہلی) اور ابوالفضل انکلیو (نئی دہلی) میں بھی قرآن کا درس دیتے رہے۔ آخری دنوں میں طبیعت ناساز ہونے کے سبب یہ سلسلہ انھیں بند کر دینا پڑا۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ ان کے درس قرآن میں بڑی تعداد میں لوگ شرکت کر کے ان کے بیانات سے استفادہ کرتے تھے۔

مولانا محمد فاروق خان جہاں قرآن پر گہرائی سے غور وفکر کیا اور کتابیں لکھی تو وہیں انھوں نے احادیث مبارکہ کی شرح وضاحت میں بھی خون پسینہ ایک کر دیا۔ سات جلدوں پر مشتمل احادیث کا ایک منتخب ذخیرہ 'کلامِ نبوت' کے نام سے شائع کیا۔ یہ کتاب عام فہم زبان میں مختلف احادیث پر گفتگو کرتی ہے، جو عام وخاص سبھی کے لیے مفید ہے۔ اس کا انگریزی ترجمہ پروفیٹ اسپیکس (Prophet Speaks) کے نام سے ڈی عبدالکریم (میسور، کرناٹک) نے کیا ہے۔

کلام نبوت کے علاوہ انھوں نے پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کلام پر مزید کتابوں میں بھی اظہارِ خیال کئے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی کتابیں مثلاً مطالعۂ حدیث، دعائیہ چہل حدیث، آثار صحابہ، انتخاب احادیث قدسیہ، حکمتِ نبوی احادیث کی روشنی میں، آں حضور کی دعائیں اور علم حدیث: ایک تعارف وغیرہ اہمیت کی حامل ہیں۔

مولانا محمد فاروق خان سے میرا غائبانہ تعارف مولانا وحیدالدین خاں کے ماہنامہ الرسالہ کے ذریعہ ہوا۔ مولانا محمد فاروق خان کا نام پہلی مرتبہ میں نے ماہنامہ الرسالہ کے ابتدائی شماروں میں دیکھا تھا جس میں ان کی ایک ہندی کتاب 'پرلوک کی چھایا میں' پر انتظار نعیم کا تحریر کردہ تبصرہ اردو میں شائع ہوا تھا (دیکھیے ماہنامہ الرسالہ مارچ 1977ء، صفحہ: 63-62)، اس تبصرے کو پڑھ کر اس کتاب کو پڑھنے کی خواہش پیدا ہوئی تھی مگر یہ بڑا عجیب اتفاق ہے کہ اس کتاب کا آج تک میں مطالعہ نہ کر سکا۔

اس کے بعد ماہنامہ الرسالہ کے ایک اور شمارے میں مولانا محمد فاروق خان کے شائع شدہ خط پر پڑی۔ یہ خط دراصل ایک نوجوان کے والد کے انتقال پر بطور تعزیت انھوں نے لکھا تھا۔ یہ خط نہیں بلکہ ایک نصیحت نامہ تھا، جس نے مجھ کو متاثر کیا اور بار بار میں نے اس کا مطالعہ کیا۔ خیال رہے کہ یہ خط مولانا محمد فاروق خان نے 30 دسمبر 1976ء کو تحریر کیا تھا اور اس خط کے ساتھ انھوں نے ایک نوٹ بھی لکھا۔ جس میں انھوں نے درج کیا کہ میں اپنے ایک رفیق کے والد کے انتقال پر تعزیتی خط لکھنے بیٹھا تو ایسا محسوس ہوا جیسے میں خود اپنے آپ

سے کچھ کہنے چلا ہوں۔ جب ہم کسی سے کچھ کہتے ہیں تو اس شخص سے کہیں زیادہ اس کا مخاطب خود ہم ہوتے ہیں۔مکتوب الیہ کے والد کا انتقال 23 اور 24 دسمبر 1976ء کی درمیانی شب میں ہوا:

آپ کے والد محترم کے انتقال کی خبر ملی۔ والد کا انتقال زندگی کا ایک خاص تجربہ ہوتا ہے۔ اس تجربہ سے آپ کو گزرنا تھا گزرے۔ خدا مرحوم کو جوارِ رحمت میں جگہ عطا فرمائے، آمین!

دنیا سے ان کی واپسی درحقیقت زندگی کے مزید امکانات کی خبر ہے۔ پھر زندگی میں اگر یہ واپسی نہ ہوتو زندگی اجیرن ہو جائے، دشوار ہو جائے۔ جیون میں رس تو اسی واپسی کی وجہ سے ہے یہ واپسی محض واپسی نہیں ایک بڑے امکان کی طرف پیش قدمی ہے۔ موت زوال نہیں کمال کی خبر ہے۔ اس کمال کی خبر جس کی متحمل موجودہ دنیا نہیں ہوسکتی۔ موجودہ دنیا تو صرف اس کی طرف ہمارا ذہن موڑ سکتی ہے۔ بشرطیکہ ہم اس کے لیے تیار ہوں، بیدار ہوں۔ بصورت دیگر ہم اس کے اشاروں کو سمجھنے سے قاصر ہی رہیں گے۔

موت زندگی کی شام نہیں۔ زندگی کی صبح ہے۔ صبح ہونے سے ہم غم زدہ کیوں ہوں۔ ہمارا دل تو اتنا وسیع ہونا چاہیے، جس میں دنیا اور مابعد دنیا دونوں ہی سما جائیں۔ جو دنیا کے بعد ہے اسے ہم اپنی ذات سے الگ نہ دیکھیں۔ ساری کلفتوں اور غموں کا سبب یہ ہے کہ ہم اپنے دل کو اتنا تنگ و تاریک رکھتے ہیں کہ اس میں ہمیں دنیا تو دکھائی دیتی ہے۔ اس کے آگے جو ہے نظر نہیں آتا، وہ اس سے چھوٹ جاتا ہے۔ باہر جاتا ہے، دیارِ غیر معلوم ہوتا ہے۔ حالاں کہ وہ اپنا دیار ہے۔ اس دنیا سے کہیں زیادہ اپنا ہے۔

اس دنیا میں تو ہم بہت تھوڑا ظاہر ہو پاتے ہیں۔ کامل اظہار تو وہاں ہی ممکن ہے۔ دنیا ہی کو سب کچھ سمجھ لینے کی غلطی سے سب سے بڑا نقصان یہ نہیں ہوتا کہ آدمی عام معنی میں دنیا پرست ہو جاتا ہے بلکہ اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ آدمی کا فکر اور اس کا نظریہ غلط ہو جاتا ہے۔

مومن ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ آدمی کو معلوم ہو جائے کہ وہ اس دنیا میں غیب کی مخلوق ہے۔ بظاہر وہ دنیا میں دکھائی دے، لیکن دنیا میں رہتے ہوئے بھی وہ حقیقت میں عالمِ غیب میں رہنے لگے۔ نماز اسی بڑی حقیقت کو ظاہر کرتی ہے۔ نماز وہ خوشبو ہے جو اس عالم کی نہیں ہے۔ یہ ایسی روشنی ہے جس کا تعلق کسی دوسرے عالم سے ہے، جس کو ہم عالم غیب سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کا کوئی اور نام بھی تجویز کیا جاسکتا ہے۔ نماز کے ذریعہ سے ہم دنیا میں اس عالم کو اتار لاتے ہیں۔ یہ اتارنے کا عمل بار بار دہرانے کا منشاء صرف یہی نہیں ہے کہ اس عالم میں رہنے کی مشق ہو بلکہ دنیا میں رہتے ہوئے اس عالم میں رہنا تمہیں آجائے۔ امید ہے ان باتوں پر غور فرمائیں گے۔ آپ جیسے ذہین آدمی اگر اس طرف توجہ نہ دیں تو ذوق صحیح اپنا ٹھکانہ کہاں ڈھونڈے گا۔

(ماہنامہ الرسالہ، مئی 1977ء صفحہ:60)

یہاں میں الرسالہ کا بھی ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں، کیوں کہ اسی کے توسط سے مولانا محمد فاروق خان

تک میری رسائی ممکن ہوسکی۔ یہ میری زندگی کا بڑا عجیب اتفاق ہے کہ ماہنامہ الرسالہ کے مطالعہ کی کسی نے بھی ترغیب نہیں دی تھی بلکہ بذات خود میں نے اس کا مطالعہ شروع کردیا۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ اللہ تعالیٰ کی خصوصی عنایت تھی کہ میں نے کسی ترغیب کے بغیر الرسالہ سے استفادہ کرنا شروع کردیا۔ عام اُردو پرچوں کے برعکس میں نے ماہنامہ الرسالہ کی فکرانگیز تحریروں کو قابلِ استفادہ پایا۔ اس لیے ہر ماہ اس کا مطالعہ پابندی سے کرنا میرے لیے ناگزیر ہوگیا۔ اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب کہ میں نے ریاست بہار کے ضلع مونگیر میں وقتی قیام کے دوران ماہنامہ الرسالہ کے تمام شماروں کو لمبی محنت ومشقت کے بعد حاصل کرکے اُس کی ایک ایک سطریں پڑھیں۔

ماہنامہ الرسالہ کے مطالعہ کے دوران میں نے دیکھا کہ مولانا وحیدالدین خاں نے متعدد دفعہ مولانا محمد فاروق خان کا ذکر کیا اور بار باران کے شعری مجموعہ 'حرف وصدا' کا یہ شعر پڑھتے اور لکھتے رہے ہیں:

گلو میں بو نہ ملی سنگ میں شرر نہ ملا
مرا مذاق جدا تھا کہ ہم سفر نہ ملا

اس کے علاوہ مولانا محمد فاروق خان کے تعلق سے ہمیشہ مولانا وحیدالدن خاں نے مثبت رائے رکھی ہے۔ اس سلسلہ میں ماہنامہ الرسالہ بابت دسمبر 1994ء میں شائع سفرنامہ 'لکھنؤ کا سفر' (صفحہ:50-11) کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ مولانا وحیدالدین خاں لکھتے ہیں کہ مولانا محمد فاروق خان ایک روحانی مزاج کے آدمی ہیں۔ ان کے پاس بیٹھ کران کی باتیں سننا بہت روحانی سکون کا باعث ہوتا ہے۔ (ماہنامہ الرسالہ دسمبر 1994ء، صفحہ:14)

الرسالہ کے اسی شمارے میں مولانا محمد فاروق خان کے تعلق سے دوسبق آموز باتیں بھی درج ہیں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسے بھی یہاں نقل کیا جائے:

ایک گفتگو کے درمیان مولانا محمد فاروق خان نے کہا کہ ایک بھکاری بھیک مانگ رہا تھا۔ اس نے ایک راہ گیر سے سوال کیا۔ اتفاق سے اس راہ گیر کی جیب میں اس وقت پیسے موجود نہ تھے۔ اس بھکاری پر ترس آیا۔ اس نے آگے بڑھ کر بھکاری کو اپنے سینہ سے لگالیا۔ بھکاری اس سے اتنا زیادہ متاثر ہوا کہ اس کی زبان سے نکلا: بھگوان جتنا تونے آج دلایا اتنا تو کبھی نہیں دلایا تھا۔

آدمی کے پاس اگر دوسروں کے لیے کوئی مادی چیز نہ ہو۔ مگر اس کے دل میں دوسروں کے لیے سچی محبت ہو، تو اس کی یہ محبت یقیناً 'فاتح عالم' بن جائے گی۔

مولانا محمد فاروق خان نے بتایا کہ ایک بار وہ لکھنؤ کے علاقہ میں بس سے سفر کررہے تھے۔ بس میں ایک ہندو سے ملاقات ہوئی گفتگو کے دوران دونوں کو ایک دوسرے سے دلچسپی ہوگئی۔

مولانا محمد فاروق خان نے اس ہندو بھائی کا پتہ لکھ لیا اور کہا کہ میں کبھی آپ کے پاس آؤں گا۔ اس کے بعد ایک سفر کے دوران مولانا اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ مذکورہ ہندو کے گاؤں میں گئے۔ رات ہوچکی تھی۔ پوچھتے

ہوئے ہندو کے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ ہندو بھائی گھر پر موجود نہیں ہیں۔ وہ کہیں چلے گئے ہیں۔ کچھ دیر کی حیص بیص کے بعد ایک اور ہندو نے آ کر ان سے ملاقات کی۔

انھوں نے کہا کہ اب رات ہوگئی ہے اس لیے آپ یہیں ٹھہریے۔

انھوں نے پوچھا کہ یہاں کوئی مسلمان یا کوئی مسجد ہے؟

معلوم ہوا کہ یہاں نہ کوئی مسلمان ہے اور نہ کوئی مسجد۔ ہندو نے گھر کے ایک حصہ میں سب لوگوں کو ٹھہرایا۔ انہیں کھانا کھلایا۔ اس کے بعد وہ لوگ عشاء کی نماز پڑھ کر سو گئے۔

صبح کو نماز فجر کے بعد وہ ہندو دوبارہ آیا۔ اس نے مولانا محمد فاروق خان اور ان کے ساتھیوں کو دیہات کے طریقہ پر ناشتہ کرایا۔ جب وہ لوگ ناشتہ کر رہے تھے تو ہندو نے ہنستے ہوئے بتایا کہ میرا اس خاندان سے تعلق نہیں ہے۔ البتہ میں ان کا پڑوسی ہوں۔ رات کو جب آپ لوگ یہاں آئے تو گھر کی عورتوں نے مجھ کو بلایا اور کہا کہ کچھ مسلمان آئے ہیں۔ رات کی وجہ سے ان کو لوٹایا بھی نہیں جا سکتا۔ ہم ان کو جانتے بھی نہیں کہ وہ کون ہیں، ایسی حالت میں کیا کیا جائے۔

مذکورہ ہندو نے گھر کی عورتوں سے کہا کہ ان لوگوں کو کھانا کھلا کہ یہاں سلا دو۔ کیوں کہ یہ ہمارا انسانی فریضہ بنتا ہے۔ البتہ جہاں تک ان کی طرف سے ڈر کا سوال ہے تو میں آج کی رات نہیں سوؤں گا۔ رات بھر پہرہ دوں گا۔ چنانچہ آج میں رات بھر لاٹھی لے کر پہرہ دیتا رہا ہوں۔

ان لوگوں نے ایک طرف نو وارد مسلمانوں کے ساتھ انسانی فرض ادا کیا۔ دوسری طرف ان کے امکانی خطرہ سے بچنے کے لیے رات بھر لاٹھی لے کر پہرہ دیتے رہے۔ (ماہنامہ الرسالہ دسمبر 1994ء، صفحہ: 16-14)

ایس آئی او یعنی اسٹوڈنٹ اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا جماعت اسلامی کی طلبہ تنظیم کا نام ہے۔ اس تنظیم کے تعلق سے کچھ باتیں یاد آ رہی ہیں۔ میں وقتی طور پر ایس آئی او سے وابستہ ہوا اور پھر اس سے الگ ہوگیا۔ 2 مارچ 2005ء کو ایس آئی او مونگیر یونٹ کا مجھے ناظم سرکل بنایا گیا۔ اور ایک ماہ بعد 3 اپریل 2005ء کو میں نے اس تنظیم سے علاحدگی اختیار کر لی۔

اس درمیان ایس آئی او حلقہ بہار کے صدر شبلی ارسلان سے میری خط و کتابت بھی ہوئی۔ میرے پاس اس خط و کتابت کی نقل موجود نہیں ہے۔ شبلی ارسلان نے بار ہا چاہا تھا کہ میں ایس آئی او سے وابستہ ہو کر کام کرتا رہوں، مگر میری فطرت نے اس بات کی اجازت نہ دی کہ میں کسی ایک تنظیم کا رکن بن کر اپنی زندگی کو قید خانے میں ڈال دوں۔ مجھ کو آزاد ہو کر کام کرنا اچھا لگتا ہے، اس لیے میں نے کسی تنظیمی وابستگی سے الگ ہو کر زندگی گزارنا مناسب سمجھا۔ میں نے اپنے ایک خط میں شبلی ارسلان سے ایس آئی او اور جماعت اسلامی سے متعلق کئی سوالات کیے۔ ان دنوں نے شبلی ارسلان ایس آئی او حلقہ بہار کے صدر تھے۔ انھوں نے میرے سوالات

کے جواب نہیں دیے؛ البتہ 27 مارچ 2005ء کے تحریر کردہ اپنے خط میں انھوں نے صرف اتنا لکھا کہ 'آپ کے تاثرات اور احساسات آپ کے زرخیز اور تخلیقی ذہن کا مظہر ہیں۔'

مجھ کو ناظم سرکل 2005ء میں بنایا گیا تھا کہ حالاں کہ گزشتہ ایک سال سے ایس آئی او کے اجتماعات میں، میں شرکت کرتا رہا تھا۔ مثلاً جون 2004ء کو مونگیر میں ایس آئی او کا ایک اجتماع ہوا۔ میں نے بھی اس موقع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ اس کی رپورٹ قومی تنظیم میں 'ایس آئی او کا اجتماع' کے عنوان سے 14 جون 2004ء کو شائع ہوئی تھی۔ خبر یہاں نقل کی جارہی ہے:

اسٹوڈنٹ اسلامک آرگنائزیشن آف انڈیا کا ہفتہ وار اجتماع شاہ فصیح اللہ مسجد (دلاور پور، مونگیر) کی دوسری منزل پر منعقد ہوا۔ اجتماع کی کارروائی حسب معمول درس قرآن سے شروع ہوئی ایس آئی او کے فعال رکن محمد نواز نظام نے سورہ ق کی ابتدائی پانچ آیات کی تلاوت کرنے کے بعد تفہیم القرآن (حصہ پنجم) سے اس کا ترجمہ تفسیر پڑھی۔ اس موقع پر محمد نواز نظام نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ مرنے کے بعد زندہ ہونا اب بعید از قیاس نہیں بلکہ سائنس نے تو اس کو ثابت بھی کر دیا ہے۔

جب کہ محمد فضل معراج نے حقوق العباد اور صدقہ سے متعلق حدیث پڑھنے کے بعد اس کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں یہ نہیں دیکھنا چاہئے کہ ہم صدقہ کس کو دے رہے ہیں بلکہ ہمیں اپنے ارادوں کو دیکھتے ہوئے کسی کی مدد کرنی چاہئے۔

اس موقع پر انجمن حمایت اسلام کے مدرس شاہ عمران حسن نے مولانا وحید الدین خاں کے افکار و خیالات کا ترجمان الرسالہ کا ایک صفحہ پڑھ کر سامعین کو سنایا۔ یہ جولائی 1982ء کا شمارہ تھا۔ اس کا ایک مضمون مومن کیسا ہوتا ہے (صفحہ: 11)، انھوں نے پڑھا۔ اِس موقع پر شاہ عمران حسن نے کہا کہ ہمیں ہر تحریر و تقریر کو سنتے و پڑھتے ہوئے؛ اپنی زندگی کا جائزہ لینا چاہئے کہ ہماری زندگی اس کے مطابق گزر رہی ہے یا نہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہمیں ہر واقعہ سے سبق حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ تبھی ہماری زندگی صحیح رخ پر چلے گی۔

اجتماع کی کارروائی جماعت اسلامی سے وابستہ محمد نور الحق انصاری کی دعا پر ختم ہوئی۔ اس اجتماع میں جن لوگوں نے شرکت کی ان میں محمد محبوب عالم، محمد تابش، محمد سراج ہاشمی عرف کیفی کے نام شامل ہیں۔
(روزنامہ قومی تنظیم، پٹنہ، 14 جون 2004ء)

سنہ 2004ء نصف آخر میں جماعت اسلامی ہند سے وابستہ محمد نور الحق انصاری اور مقیم زریاب نے ہفت روزہ اجتماع شروع کیا۔ یہ اجتماع جمعہ کے بعد نماز مغرب محمد نور الحق انصاری کی قیام گاہ (دلاور پور، مونگیر) پر ہوتا تھا۔ اس اجتماع میں، میں مستقل طور پر شرکت کرنے لگا۔ یہاں مجھ کو مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے ساتھ

ساتھ جماعت اسلامی ہند سے وابستہ دیگر محترم شخصیات کی کتابوں سے بھی استفادہ کا موقع ملا۔ ان میں مولانا محمد فاروق خان کی کتابیں بھی تھیں۔ اجتماع میں اکثر مولانا محمد فاروق خان کی کتاب ’کلام نبوت‘ سے کوئی حدیث پڑھی جاتی اور پھر اس پر تبادلۂ خیال ہوتا تھا۔ اکثر کلام نبوت کو پڑھنے کی ذمہ داری میرے سپرد کی جاتی تھی، اس طرح میں برابر اس سے استفادہ کرنے لگا تھا۔

میں نے تقریباً تین سالوں تک جماعت اسلامی ہند کے ہفتہ وار اجتماع سے استفادہ کیا، اس کے بعد سنہ 2007ء میں مجھ کو حصولِ علم کی غرض سے نئی دہلی منتقل ہونا پڑا۔ یہاں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں میرا داخلہ ہوا اور یونیورسٹی میں ہاسٹل نہ ملنے کے سبب مجھ کو جامعہ سے متصل علاقے ’ابوالفضل انکلیو‘ میں کمرہ کرائے پر لے کر رہنا پڑا۔ اتفاق کی بات یہ ہے کہ جماعت اسلامی ہند کے ہیڈکوارٹر سے قریب ہی میری رہائش تھی، اس لیے بار بار مرکز جماعت اسلامی ہند کے کیمپس کی مسجد ’مسجد اشاعت اسلام‘ میں نماز ادا کرنے اور جماعت کے اجتماعات سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔

اور اتفاقی طور پر مسجد اشاعت اسلام میں مولانا محمد فاروق خاں سے یکم ستمبر 2007ء کو ملاقات ہوگئی۔ یہ ان سے میری باضابطہ پہلی ملاقات تھی، ان سے میں نے کہا کہ کوئی نصیحت کریں۔ انھوں نے حسب ذیل انگریزی عبارت میری ڈائری میں بطور نصیحت لکھ کردی:

Man is rich according to what he is, not according to what he has.

کسی مخلص مسلمان سے مل کر ہمیشہ خوشی کا احساس ہوتا ہے، ان سے مل کر بھی مجھ کو یہی احساس ہوا۔ میں ان سے پہلی مرتبہ مل رہا تھا مگر انھوں نے اپنائیت کا جو مظاہرہ میرے ساتھ کیا وہ بیان سے باہر ہے۔ اس کے بعد جب بھی میں مولانا سے ملا، انھوں نے ہمیشہ اخلاقِ عالیہ کا عمدہ ثبوت دیا۔ ان جیسا سادگی پسند طبیعت والا انسان میں نے اپنی زندگی میں ان کے علاوہ کسی کو نہیں دیکھا۔ وہ لاثانی روحانی شخصیت کے علم بردار تھے۔ انھوں نے اپنی سادگی پسند طبیعت سے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنالیا تھا۔

جب وہ پرانی دہلی کے اپنے کمرہ (دفتر، جماعت اسلامی ہند، 1353، چتلی قبر، جامع مسجد) میں رہا کرتے تھے، ان کے پاس گیا۔ وہ خود سے چائے بنا کر پلایا کرتے تھے، جو بھی آتا تھا ان سے ملاقات کرتے تھے، وہ ہر قسم کی تصنع سے پاک شخصیت تھے۔ ایک ہی کمرہ کے اندر کتابوں کے سمندر میں انھوں نے برسہا برس زندگی گزار دی۔

مولانا محمد فاروق خان سے جو بھی ملنے آتا وہ اپنے مہمانوں کو اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلایا کرتے تھے۔ ان کے پاس ایک چھوٹی سے ایک الیکٹرک کیتلی تھی، جس میں وہ چائے بنا کر نووارد کی ضیافت کرتے تھے۔ اس معمول میں کبھی فرق نہیں آیا، جب بھی میں ان سے ملا انھوں نے چائے بنا کر میری ضیافت

کی۔ جب میں 6 فروری 2023ء کو ان سے آخری دفعہ ملا تو انھوں نے اس وقت بھی وہ بہت ہی اخلاق سے پیش آئے، حسب معمول چائے پلائی اور اپنی کتاب 'آئینۂ اسلام' تحفتاً عنایت کی۔

یہاں میں یہ بات عرض کرتا چلوں کہ میں نے سنہ 1999ء سے مولانا وحیدالدین خاں کا ماہنامہ الرسالہ پڑھنا شروع کر دیا تھا اور سنہ 2001ء سے الرسالہ کی ایجنسی بھی شروع کر دی تھی۔ یہ بات شہر مونگیر (بہار) کے لوگوں کو بہت جلد پتہ چل گئی کہ میں مولانا وحیدالدین خاں کی فکر و خیال کی تشہیر کر رہا ہوں، کیوں کہ میں نے یہ کام اعلانیہ کیا تھا۔

جب میں نے سنہ 2004ء سے جماعت اسلامی ہند کے اجتماعات میں شرکت شروع کی تو کئی لوگوں کی جانب سے یہ بات مجھ سے گوش گزار کی گئی کہ مولانا وحیدالدین خاں نے اپنی بیٹی ڈاکٹر فریدہ خانم کا نکاح مولانا محمد فاروق خان سے کر دیا تھا، پھر جماعت سے علاحدگی کے بعد اپنی بیٹی کا خلع کروا دیا۔

جب بارہا یہ باتیں مجھ سے کہی گئیں تو میں نے اصل بات جاننے کی کوشش کی۔ میں نے براہِ راست مولانا محمد فاروق خان سے اس کی حقیقت جاننی چاہی، اس سلسلے میں، میں نے ستمبر 2006ء میں ان سے خط و کتابت بھی کی، میں نے انھیں خط میں لکھا کہ لوگ ایسا اور ایسا ڈاکٹر فریدہ خانم اور آپ کے رشتہ کے تعلق سے کہتے ہیں، آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھا کہ مولانا محمد فاروق خان اس نجی مسئلہ کی وضاحت انتہائی صاف گوئی سے کریں گے مگر انھوں نے اپنے دستخط کے ساتھ بذریعہ خط اس کی وضاحت کی تھی۔ ان کے خط کا عکس سنہ 2015ء میں شائع ہونے والی مولانا وحیدالدین خاں کی خودنوشت سوانح حیات 'اوراقِ حیات' میں دیکھا جا سکتا ہے۔

مولانا محمد فاروق خاں نے 5 اکتوبر 2006ء کو اپنے دستخط کے ساتھ راقم الحروف کے نام ایک خط ارسال کیا۔ اس خط میں وہ لکھتے ہیں: 'یہ صحیح ہے کہ میری شادی ڈاکٹر فریدہ خانم سے ہوئی تھی۔ یہ میری بدقسمتی ہے کہ نباہ نہ ہو سکا اور علیحدگی ہو گئی۔ آپ اس سے زیادہ تفصیل میں نہ جائیں'۔ (اوراقِ حیات، شاہ عمران حسن، صفحہ: 166)

اسلام کا ایک اصول یہ ہے کہ جب کسی معاملہ میں شبہ ہو یا کسی کے خلاف لایعنی پروپگینڈا کیا جائے تو اس کی تحقیق کر لی جائے، مثلاً ڈاکٹر فریدہ خانم کی ازدواجی زندگی کے تعلق سے میں نے فوراً تحقیق کی اور زیر مسئلہ شخص سے دریافت کیا تو حقیقت میرے سامنے آ گئی، ورنہ میں بھی دیگر لوگوں کی طرح مولانا وحیدالدین خاں پر الزام لگاتا رہتا کہ انھوں نے اپنی بیٹی کا خلع کروایا ہے۔

جماعت اسلامی ہند حلقہ بہار کی جانب سے ہفتہ تعارفِ قرآن 12 تا 19 فروری 2006ء منایا گیا۔ اس موقع پر مولانا محمد فاروق خان کا ہندی ترجمہ قرآن بڑی تعداد میں ہندی داں طبقہ کے درمیان مفت تقسیم کیا گیا۔ اس طرح بڑی تعداد میں ہندی داں طبقے کے درمیان مولانا کا ہندی ترجمہ قرآن پہنچا۔

اس سلسلے میں، مونگیر میں جماعت اسلامی ہند کے سکریٹری مولانا محمد رفیق قاسمی کی صدارت میں ایک اجلاس 13 فروری 2006ء کو منعقد ہوا۔ زاہد کریم (بھاگل پور) ناظم حلقہ، جماعت اسلامی ہند (بہار) کی دعوت پر میں بھی اس اجلاس میں شریک ہوا اور ایک مختصر سی تحریری تقریر بعنوان 'قرآن کی عظمت' کی۔ یہ تقریر حافظ محمد امتیاز رحمانی (مونگیر) کی مرتب کردہ کتاب 'قرآن کے پیغام' (صفحہ:78-75) میں موجود ہے، جو کہ ادارہ قرآنی مجلس (مونگیر) کی جانب سے سنہ 2014ء میں شائع ہوئی۔ میری اس تقریر کو سامعین کی ایک بڑی تعداد نے پسند کیا۔ یہ پہلا موقع تھا، جب کہ میں نے شہر مونگیر کے اندر براہ راست خطاب کیا تھا۔

جب میں نے 18 اپریل 2016ء کو اپنی کتاب 'اوراقِ حیات' مولانا محمد فاروق خاں کی خدمت میں پیش کی تو انھوں نے بہت خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ آپ نے سمندر کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔

مولانا محمد فاروق خان سے دیر تک میری گفتگو جاری رہی۔ یہ طویل ملاقات تھی، دوبارہ اتنی دیر تک مجھ کو ان سے پھر کبھی استفادہ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ان دنوں وہ ناساز تھے، اس کے باوجود انھوں نے مجھ کو وقت دیا۔ گفتگو کے دوران انھوں نے مجھ سے کہا کہ میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں، اب پہلے کی طرح کام نہیں ہو پاتا ہے۔

میں نے کہا کہ آپ خود کو بوڑھا کیوں سمجھ رہے ہیں، آپ سے بہت سینئر مولانا وحید الدین خاں ہیں، وہ آج بھی بہت ہی منظّم انداز میں کام کرتے ہیں۔ ہمہ وقت متحرک نظر آتے ہیں، آپ کی تو ان سے عمر کم ہے، پھر ایسا کیوں سوچ رہے ہیں۔

جب میں نے ان سے اس قسم کی باتیں کی تو ان کے چہرے پر چمک لوٹ آئی، انھوں نے مسکرا کر میری بات کی تائید کی۔ اس موقع پر انھوں نے مجھ سے کہا کہ آپ نوجوان ہیں، آپ کام کر سکتے ہیں۔ دیکھئے حضرت علیؓ نوجوان تھے، انھوں نے اسلام کی خدمت کی۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی جب نوجوان تھے تو انھوں نے تحریک شروع کی تھی، اسی طرح اور بھی شخصیات ہیں جنھوں نے نوجوانی میں کام کیا اور انقلاب کا سبب بنے۔

ہماری دلچسپ گفتگو جاری تھی کہ عصر کی نماز کا وقت آ گیا۔ انھوں نے کہا کہ چلیں نماز پڑھ لیتے ہیں۔ وہ اوپر کے حصے میں رہا کرتے تھے، نیچے نماز کے لیے جگہ بنی ہوئی تھی۔

جب میں زینہ سے نیچے اُترنے لگا تو انھوں نے کہا دیکھئے عمران صاحب زینے پر چینٹیاں ہیں، ان پر پاؤں نہ پڑنے پائے۔

انھوں نے عصر کے نماز کی امامت مجھ سے کروائی۔ انھوں نے مجھ کو نماز پڑھانے پر مجبور کر دیا۔

جب میں ان سے ملا تھا ان کا چہرہ مضمحل نظر آ رہا تھا، جب میری واپسی کا وقت آیا تو ان کا نورانی چہرہ چمک رہا تھا، ایسا لگ ہی نہیں رہا تھا کہ چند ساعت پہلے جس شخصیت کی طبیعت ناساز تھی، اب وہ چاک و چوبند ہو گئی ہے۔

واپسی کے وقت انھوں نے اپنے کتب خانہ کی متعدد کتابیں مجھ کو تحفتاً دی تھیں۔اس کے علاوہ انھوں نے اپنا شعری مجموعہ 'حرف وصدا' بھی مجھ کو اپنے دستخط کے ساتھ عنایت کیا۔

مولانا محمد فاروق خان خوبصورت اشعار موزوں کرتے تھے، ان کا تخلص 'فرآز' تھا اور وہ 'فرآز سلطان پوری' بھی لکھا کرتے تھے۔ان کا شعری مجموعہ بھی فرآز سلطان پوری کے نام سے ہی شائع ہوا۔اس میں بہت سے ایسے اشعار ہیں جو ذہن کو محظوظ کرتے ہیں، یہاں چند اشعار نقل کئے جا رہے ہیں:

یہ کس نے کہا مت خطا کیجیے
جب خطا کیجیے رو لیا کیجیے

ہم نے بھی فرآز آخر اک عمر گزاری ہے
ڈوبے ہوئے سورج کو اُگتے ہوئے دیکھا ہے

ڈرے جس سے کوہ، خائف رہا جس سے آسمان بھی
ہوا سرفراز انساں اسی نعمت و عطا سے

جیتے ہیں تو جینے کا مفہوم بھی کچھ ہوگا
ہنگامۂ ہستی میں کم لوگوں نے سوچا ہے

جہاں ان کی یورشیں ہیں وہیں آشیاں بنے گا
کوئی جا کے بجلیوں کو میرا فیصلہ سنا دے

اسی کو دی ہم نے دعائیں بارہا
زندگی میں جس نے تڑپایا بہت

کیا دل پر گزرتی ہے سوچا کریں
آئینہ جب کبھی آپ دیکھا کریں

اسی ملاقات میں، میں نے ان سے یہ بھی درخواست کی تھی اپنے بارے میں کچھ ایسا مواد فراہم کریں،

جس کی مدد سے میں آپ کے علمی وتحریری کام سے متعلق ایک مضمون مرتب کروں۔

انھوں نے حامی بھری تھی مگر عملاً میں خود اس پر دوبارہ پیش رفت نہ کر سکا۔ کیوں کہ اس کے بعد میری دوبارہ ان سے ملاقات نہ ہوسکی اور میں قومی دارالحکومت نئی دہلی سے اچانک جنوبی ہندوستان منتقل ہوگیا۔ ریاست تلنگانہ کے دارالحکومت حیدرآباد میں منتقل ہونے سے مولانا محمد فاروق خان سے جو علمی استفادہ کا سلسلہ جاری تھا وہ منقطع ہوگیا۔ جب میں کئی سال بعد سنہ 2021ء میں نئی دہلی واپس آیا تو معلوم ہوا کہ مولانا محمد فاروق خان اب چتلی قبر کے بجائے ابوالفضل انکلیو میں رہتے ہیں۔ میں اپنی مصروفیات کے سبب استفادہ کی غرض سے ان کی خدمت میں حاضر نہ ہوسکا کہ یہاں کہ تک 6 فروری 2023ء کی شام آگئی۔

میں نے اپنی تازہ کتاب 'مولانا وحیدالدین خاں: اہل قلم کی تحریروں کے آئینے میں' ان کی خدمت میں پیش کی۔ پہلے کے مقابلے میں اب وہ مزید ضعیف ہوچکے تھے، تاہم ان کی گفتگو میں وہی جلال اور حکمت کے پہلے نمایاں تھے۔ میری کتاب کو انھوں نے خوش دلی کے ساتھ لیا اور میرے سامنے عینک کے بغیر فہرست دیکھی اور اس تعلق سے گفتگو بھی۔ یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔

میں نے ان سے کہا کہ میں لکھنے پڑھنے کا کام کرتا ہوں، اس تعلق سے آپ مجھ کو نصیحت کریں۔

مولانا محمد فاروق خان نے کہا کہ آپ اس طرح سے کام کریں کہ وہ دوسروں کے لیے مفید ہو، وہ کسی کا وقت اور پیسہ برباد کرنے کا سبب نہ بنے۔ نیز آپ غیر ضروری کتابوں کے مطالعہ سے خود کو بچائیں۔

مولانا محمد فاروق خان نے اپنی عمر کا ایک بڑا حصہ پرانی دہلی کے محلہ چتلی قبر میں گزارا، جہاں جماعت اسلامی ہند کا قدیم دفتر واقع ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی عمر کے چند سال جماعت اسلامی ہند کے مرکزی ہیڈ کوارٹر آکر رہنے لگے اور اپنی بقیہ زندگی جماعت اسلامی ہند کے ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں گزار دی۔

مسجد اشاعت اسلام میں مستقل نماز ادا کرنے والوں کے افراد کے مطابق مولانا محمد فاروق خان پنج گانہ نماز مسجد میں ادا کرتے رہے حالاں کہ ان پر ضعف طاری ہوچکی تھی۔ اپنی زندگی کے آخری سانس تک وہ نماز ادا کرتے رہے۔ اور تو اور آخری نماز پڑھ کر اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

...

Shah Imran Hasan

New Delhi-110076,

E-mail:sihasan83@gmail.com,

Mob:9810862382

والدِ محترم: چند تاثرات و واقعات

مولانا محمد ذکوان ندوی

(ایڈیٹر ماہنامہ اشراق ہند، ممبئی)

18اپریل 2007ء کو راقم (محمد ذکوان ندوی) کے والد محمد عثمان علی انصاری کا لکھنؤ میں انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت اُن کی عمر تقریباً 65 سال تھی۔ 18اپریل کو ظہر کی نماز کے بعد میں نے اُن کی نماز جنازہ پڑھائی۔ اور اندرا نگر (لکھنؤ) کے قبرستان اَمر پالی میں تدفین ہوئی۔

والدِ محترم کی صحت عموماً ٹھیک رہتی تھی۔ تاہم جنوری 2007 میں اُن کو ٹھنڈک لگ گئی اور پھر وہ بڑھ کر خطرناک شکل اختیار کر گئی۔ کوئی علاج اِس میں مفید ثابت نہ ہو سکا۔ اِس دوران سانس کی تکلیف بھی بڑھ گئی تھی۔ تکلیف کی شدت کی بنا پر وہ کئی ماہ سے بالکل لیٹ نہیں سکتے تھے۔ اُن کی ساری رات تکلیف اور دعا اور مناجات میں بیٹھ کر گزر جاتی تھی۔ تاہم آخری دنوں میں اُن کی صحت کچھ بہتر ہو گئی تھی۔

13اپریل 2007ء کو ہماری بہن کے پاس وہ جے پور گئے ہوئے تھے۔ وہاں پہنچ کر اُن کے ساتھ ایک حادثہ پیش آ گیا۔ اِس کی وجہ سے اُن کی تکلیف مزید شدت اختیار کر گئی۔ مجھے معلوم ہوا تو 13اپریل کو نئی دہلی سے روانہ ہو کر رات کو میں جے پور پہنچا۔ کافی دیر تک اُن سے دینی موضوعات پر باتیں ہوتی رہیں۔ دینی موضوعات پر تبادلہ خیال اُن کو بہت محبوب تھا۔ صبح کو اچانک اُن کی طبیعت زیادہ بگڑ گئی۔ میں ڈاکٹر کے پاس گیا۔ ڈاکٹر نے انھیں دوبارہ دکھانے کے لیے کہا۔ میں نے اگلے دن ڈاکٹر کے پاس چلنے کے لیے کہا تو انھوں نے منع کر دیا۔ میں نے بہت اصرار کیا تو انھوں نے کہا: نہیں، میں اب کسی ڈاکٹر کے پاس نہیں جاؤں گا، اب میں صرف اللہ کے پاس جاؤں گا۔ میں نے دوبارہ اصرار کیا تو انھوں نے سختی کے ساتھ منع کرتے ہوئے کہا: تم بس اب مجھے کسی طرح لکھنؤ پہنچا دو۔

میں نے برادرم مولانا محمد حسان ندوی کو لکھنؤ سے جے پور بلایا۔ چنانچہ 16اپریل کی شام کو ہم انھیں لے کر لکھنؤ کے لیے روانہ ہوئے اور بارہ گھنٹے کا طویل سفر طے کر کے اگلے دن صبح کو لکھنؤ پہنچ گئے۔ یہ سفر بہت تکلیف دہ اور اکثر نیم بے ہوشی کی حالت میں طے ہوا۔ تاہم لکھنؤ پہنچ کر اُن کی طبیعت میں ایک عجیب سا اطمینان پیدا ہو گیا تھا۔ اِس کے آثار اُن کے چہرے پر نمایاں تھے۔ البتہ کمزوری اب بہت زیادہ بڑھ گئی تھی اور اُن پر ایک طرح کی غفلت جیسی کیفیت طاری تھی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اب اُن کو دنیا کی کسی چیز سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہ گئی ہے۔ سخت بے چینی کے عالم میں انھوں نے مجھ سے کہا: اب مجھے کسی اور چیز کی فکر نہیں ہے۔ بس دعا کرو کہ ایمان پر خاتمہ ہو جائے۔ میں نے اطمینان دلانا چاہا تو کہنے لگے: کیا خبر، خدا کے ہاں کیا معاملہ ہو، خدا بہت بے نیاز ہے۔ اُن کی تکلیف بڑھتی جا رہی تھی، مگر شدید تکلیف کے باوجود وہ سراپا صبر و شکر بنے ہوئے تھے۔ دعا اور

ستغفار کے سوا اور کوئی لفظ میں نے اُن کی زبان سے نہیں سنا۔ بیماری کے ذریعے خدا نے اُن کو عجز کے شعوری مقام تک پہنچا دیا تھا اور شعوری سطح پر عجز کا تجربہ بلاشبہ سب سے بڑی چیز ہے۔ بار بار وہ آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر کہتے: خدایا، میں نے جان لیا کہ سب کچھ صرف تیرے اختیار میں ہے، کچھ بھی اپنے بس میں نہیں۔ خدایا، میں اِس سے زیادہ تکلیف کا مستحق ہوں۔ تو ارحم الراحمین ہے۔ مجھ پر رحم فرما اور مجھ کو معاف کر دے۔

مغرب کے بعد سے اُن کی زبان پر مسلسل ذکر اور دعا کے الفاظ جاری تھے: 'یا ربّ لك الحمد كما ينبغي لجلال وجهك و لعظيم سلطانك . اور جزى الله عنا محمدًا ما هو أهله صلى الله عليه وسلم ' اُن کی پسندیدہ دعا تھی، جو زبان پر بار بار جاری ہو رہی تھی۔

عشاء کے بعد سے ہی والدِ محترم کے اندر بولنے کی طاقت بہت کم رہ گئی تھی۔ وہ صرف اشارے سے کوئی بات کہہ سکتے تھے۔ اُن کی آنکھیں مسلسل طور پر بند تھیں۔ میں اُن کے سرہانے بیٹھا ہوا تھا۔ انھوں نے اشارے سے مجھے اپنے قریب کیا اور مسکراتے ہوئے اپنے سینے سے لگا لیا۔ والدہ محترمہ (وفات: 2011ء) کو قریب بلا کر بھی اِسی طرح کا اظہارِ محبت فرمایا۔ پھر رات کو قریب ایک بجے میں نے دیکھا کہ اچانک وہ آنکھیں پھاڑ کر اوپر کی جانب دیکھنے لگے۔ میں نے سورۂ یاسین کی تلاوت شروع کر دی۔ ابھی میں چوتھی آیت (علیٰ صراطِ مستقیم) تک ہی پہنچا تھا کہ اُن کی روح پرواز کر گئی۔ إنا لله و إنا إليه راجعون۔

چند واقعات

والدِ محترم کی زندگی کے بہت سے واقعات اِس وقت ذہن میں آ رہے ہیں۔ ان شاء اللہ کبھی اُن کے حالات و واقعات کا تفصیلی تذکرہ کروں گا۔ سردست یہاں صرف چند واقعات سپردِ قلم کر رہا ہوں۔

والدِ محترم کی تعلیم پوری طرح کالج میں ہوئی تھی۔ تاہم اپنے ذوق و شوق کی بنا پر اردو اور دینیات سے نہ صرف اچھی واقفیت، بلکہ اِس قدر بصیرت حاصل کر لی تھی کہ دین کے نام پر انھیں کوئی شخص دھوکا نہیں دے سکتا تھا۔ انھوں نے غالباً 1965 میں لکھنؤ کے مشہور پالی ٹیکنک کالج (اندرا نگر) سے آئی ٹی آئی کیا تھا۔ تاہم، وہ ایک دینی مزاج کے آدمی تھے۔ مادیت سے اُنھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سادگی اور زہد اُن کی فطرت کا حصہ تھا۔ وہ نہایت کھرے اور صاف گو آدمی تھے۔ وہ ایک ذہین اور وسیع الفکر آدمی تھے۔ مزاجی طور پر اُن کے اندر غصہ تھا، مگر وہ حق کے آگے فوراً جھک جانے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ اپنے چھوٹوں سے بھی معافی مانگنے میں وہ کبھی عار محسوس نہیں کرتے تھے۔ خدا کی یاد اور شکر کی وہ ایک زندہ مثال تھے۔ اُن پر ایسے لمحات اکثر طاری ہوتے، جب وہ سراپا شکر بن جاتے۔ خدا کی یاد اُن کی زبان سے ابلنے لگتی، آنکھیں نم ہو جاتیں اور پھر وہ ایک ایک نعمت کو سوچ کر اور اُس کا نام لے کر خدا کا شکر ادا کرتے۔

والدِ محترم کی زندگی کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو اپنی اولاد کے دینی مستقبل کی فکر تھی۔ یہ اُن کا سب سے بڑا کنسرن (concern) تھا کہ اُن کی اولاد صراطِ مستقیم پر قائم رہے اور اُن کی زندگی آخرت رخی زندگی

ہو۔ اِسی کو وہ اپنا سب سے بڑا سرمایہ سمجھتے اور رات دن اِسی فکر میں جیتے تھے۔ نماز کے معاملے میں وہ ہم لوگوں کے ساتھ بالکل رعایت نہیں کرتے تھے۔ خدا کی نعمتوں کو یاد دلا کر وہ کہتے کہ ہم پر خدا کے بے پناہ احسانات ہیں۔ کیا احسان شناسی کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ ہم خدا کے سامنے جھک کر اُس کا شکر و اعتراف کریں!؟

والدِ محترم کا طریقہ مروجہ قسم کے لاڈ پیار کا طریقہ نہیں تھا۔ انھوں نے ہمیشہ ہم لوگوں کو ڈانٹ کر رکھا۔ وہ ہم لوگوں کو ہمیشہ اِس کی تعلیم دیتے تھے کہ مادیت کے فتنے سے بچنا اور ہر لمحہ آخرت کو اپنے سامنے رکھنا۔ انھوں نے ہم لوگوں کے لیے کبھی پراپرٹی بنانے اور بینک بیلنس اکٹھا کرنے کی فکر نہیں کی۔ وہ کہتے تھے کہ میرا کام صرف تعلیم و تربیت ہے۔ آگے تم لوگ خود محنت کرو اور خدا کے اوپر بھروسہ رکھو۔ والدِ محترم دعوتی مزاج کے آدمی تھے۔ وہ بہت تاکید کے ساتھ بار بار مجھ سے کہتے کہ میں دینی تعلیم صرف اِس لیے دلا رہا ہوں، تاکہ خدا تم سے دین کا کام لے اور تم کو انسانوں کی ہدایت کا ذریعہ بنائے۔ اُن کی زبان پر اکثر یہ دعا جاری رہتی تھی: خدایا، تو قیامت تک آنے والی میری نسلوں سے دین کا کام لے اور اُنھیں اپنا فرماں بردار رکھ: ربّنا ھب لنامن أزواجناو ذریاتنا قرّۃ أعین، واجعلنا للمتقین إماما (الفرقان 25:74)۔ یہ اُن کی محبوب دعا تھی۔

یہ 1995ء کی بات ہے۔ اُس وقت میں حفظِ قرآن مجید سے فارغ ہو کر ندوۃ العلما، لکھنؤ میں عالمیت کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ ایک بار والدِ محترم مجھے اپنے ایک بے تکلف دوست (ماسٹر چنّا، لاؤڈ اسپیکر، بہرائچ) کے پاس لے کر گئے۔ ماسٹر صاحب نے اپنے اسٹوڈیو میں ہماری تلاوت اور نعت ریکارڈ کی۔ بعد کو دورانِ گفتگو ماسٹر صاحب نے والدِ محترم کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: عثمان بھائی، ہم بہت پریشان رہتے ہیں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ کس عالم کی بات مانیں اور کس کی بات نہ مانیں، کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ...؟

والد صاحب نے فرمایا: اِس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ آدمی کو چاہیے کہ وہ خود دین کا ضروری علم حاصل کرے، اور اگر کسی وجہ سے وہ ایسا نہیں کر سکتا تو اُسے چاہیے کہ وہ اپنے گاڑھے پسینے کے حلال پیسے خرچ کر کے اپنے بیٹے کو دین کا علم پڑھائے اور اپنی تنہائی میں دل کی گہرائیوں سے یہ دعا کرے کہ خدا اُس کو سچا علم عطا فرما دے۔ اِس کے بعد اُس کا بیٹا دین کی جو تعلیم اُسے دے، وہ علیٰ وجہ البصیرت اُس کو مانے۔

بیٹا باہر والوں کو دھوکا دے سکتا ہے، مگر وہ اپنے باپ کو دھوکا نہیں دے سکتا۔ وہ اُسے وہی بات بتائے گا جسے وہ درست سمجھتا ہوگا۔

والد صاحب نے فرمایا: میں نے یہی دوسرا طریقہ اختیار کیا ہے۔ مجھے اللہ کی ذات سے کامل امید ہے کہ میرا بیٹا مجھ کو دین کے صحیح راستے کی طرف رہنمائی کرے گا۔ مزید یہ کہ خدا کے فضل سے، نہ صرف میں نے اپنے بیٹے، بلکہ اپنے ایک چھوٹے بھائی (محمد نعمان قاسمی) کو بھی اِسی نیت سے علمِ دین کی تعلیم دلوائی ہے۔ میں نے کبھی اِن سے دنیا حاصل کرنے کی کوئی نیت اور کوئی خیال ہر گز دل میں گزرنے نہیں دیا۔ مجھے اِن سے صرف علمِ نافع اور اجرِ آخرت کی امید ہے۔ ماسٹر صاحب بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے کہا: یہ بڑا فطری اور

پریکٹکل طریقہ ہے۔ اب ہمیں بھی یہی کرنا چاہیے۔

والدِ محترم ایک دوررس آدمی تھے۔ وہ اکثر باتوں کی تہ تک پہنچ جاتے تھے۔ انھوں نے پہلی بار جب مولانا وحید الدین خاں مرحوم کی ایک مختصر تحریر پڑھی تو مجھ سے کہا کہ مولانا کا کیس حسد کا کیس ہے۔ جو شخص ایسی اعلیٰ تحریریں لکھے، اکثر لوگ ضرور اُس سے حسد کریں گے۔ لوگ کسی ایسی چیز کا اعتراف نہیں کر پاتے جس کا اعتراف اپنی نفی کے ہم معنی ہو، اِس لیے وہ اپنی بے اعترافی کو چھپانے کے لیے ایک داعیِ حق کی جھوٹی مخالفت کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ انبیا کی پوری تاریخ اِس تلخ حقیقت کا زندہ ثبوت ہے۔

والدِ محترم کا معمول تھا کہ وہ فجر کے بعد ترجمہ وتفسیر کے ساتھ قرآن کی تلاوت کرتے تھے۔ انھوں نے تفسیر قرآن کے کئی دور پورے کر لیے تھے۔ اِدھر کئی برس سے وہ اہتمام کے ساتھ 'تذکیر القرآن' اور تفسیر عثمانی کا مطالعہ کر رہے تھے۔ ایک بار انھوں نے مجھ سے کہا کہ تذکیر القرآن پڑھنے کے بعد مجھے ایسا لگا جیسے میں نے اپنی ساری عمر ضائع کر دی۔ گویا اب میں پہلی بار معرفتِ خداوندی کا تجربہ کر رہا ہوں۔

میرے لیے اطمینان کی سب سے بڑی بات یہی ہے کہ والدِ محترم اِس دنیا سے ایمان کے ساتھ رخصت ہوئے۔ اس دنیا کی رفاقت اور جدائی کی کوئی حقیقت نہیں۔ اصل رفاقت صرف آخرت کی رفاقت ہے۔ اُن کی وفات نے موت کو میرے لیے ایک زندہ حقیقت بنا دیا ہے۔ یہی اِس حادثے کا سب سے بڑا سبق ہے۔ خدا کی رحمت سے امید ہے کہ وہ اُن کو اپنے مومن بندوں میں شامل کرے گا اور جنت کے ابدی باغوں میں جگہ عطا فرمائے گا۔

والدِ محترم کے نام یورپ سے ایک خط

میں ابتدا ہی سے والدین اور دیگر احباب کے نام ہمیشہ خط لکھتا رہا ہوں۔ تقریباً اِن تمام خطوط کی نقل ہمارے پاس محفوظ ہے۔ یہاں میں والدمحترم کے نام اپنا ایک خط نقل کر رہا ہوں۔ یہ خط میں نے آج (2023) سے 21 سال پہلے، سویڈن (شمالی یورپ) کے دار الحکومت اسٹاک ہوم (Stockholm) پہنچنے کے بعد تحریر کیا تھا۔

باسمہ سبحانہ وتعالیٰ

والدِ گرامی قدر و مرتبت! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ آپ بخیر وعافیت رہ کر میرے لیے دعا گو ہوں گے۔

الحمد للہ بعافیت تمام میں 20 ذی الحجہ 1422ھ (11 اپریل 2002ء) کو اسٹاک ہوم پہنچ گیا۔ اللہ تعالیٰ اِس دور دراز سفر اور ہر طرح اجنبی ملک وماحول میں ہمارا حامی وہم دم رہا اور ہر قدم پر اُس کی کرم فرمائی اور کھلی مدد شامل حال رہی: الحمد لله الذي بعزته وجلاله تتم الصالحات. اللهم لا أحصي ثناءً عليك، أنت كما أثنيت على نفسك۔

ہمارا یہ سفر شیین ایئر ویز (ایروفلوٹ) کے ذریعے طے ہوا۔ نئی دہلی سے تقریباً تین بجے شب پرواز ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد دہلی اور اُس کے اطراف کی دنیا بالکل اِس طرح دکھائی دینے لگی جیسے ایک وسیع قبرستان میں چراغاں کی غرض سے جا بجا بے شمار دیے روشن کر دیے گئے ہوں۔ فلک بوس عمارتیں بچوں کے اُن گھروندوں جیسی معلوم ہو رہی تھیں جن میں صرف تماشے کی غرض سے کچھ شمعیں روشن کر دی گئی ہوں۔ یہ منظر دیکھ کر بے ساختہ یہ آیت زبان پر آ گئی: وما هذه الحياة الدنيا إلا لهو ولعب.

اب ہم تقریباً 28 ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ چکے تھے۔ ہم آسمان کی اِن لامتناہی وسعتوں میں گم ہوا کے دوش پر رفتہ رفتہ آگے بڑھتے اور اندھیروں کے مسافر بنتے جا رہے تھے۔ فضا تاریک ہو رہی تھی، چنانچہ آسمان پر جا بجا کچھ ستارے روشن نظر آنے لگے۔ افلاک کی اِس خاموش فضا میں ہم برابر اپنی منزل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ سفر میں مجھے نیند نہیں آتی، لہٰذا رات تو آنکھوں آنکھوں ہی میں کٹ گئی۔ اِس طرح تقریباً ساڑھے چھ گھنٹے کی مسلسل پرواز کے بعد صبح ہم بحمدللہ عافیت سے ماسکو (Mosco) پہنچ گئے۔ ایئر پورٹ قریب آیا تو پورا شہر گویا برف کے گالوں میں لپیٹا ہوا ایک حسین منظر پیش کر رہا تھا۔

چاروں طرف سفیدی کا راج تھا۔ یہاں سے ہم ایک کنکٹنگ فلائٹ کے ذریعے جہاز بدل کر روانہ ہوئے۔ بالآخر ڈھائی گھنٹے کی مسلسل پرواز کے بعد ہم اسٹاک ہوم پہنچے۔ یہاں میں نے دیکھا کہ مغربی لوگ اپنی قوتِ مشاہدہ کا بھرپور استعمال کرتے ہیں۔ وہ آنکھیں کھلی اور دماغ حاضر رکھتے ہیں اور مشاہدے کے ذریعے وہ اُن چیزوں تک پہنچ جاتے ہیں، جہاں تک عموماً دوسرے لوگ کم پہنچتے ہیں۔ مجھے اس کا ایک تجربہ اُس وقت ہوا، جب مجھے ضروری کاغذی کارروائی کے لیے اپنے ساتھ یہاں کی دو مغربی کارکن خواتین کاؤنٹر کی طرف باہر لے جا رہی تھیں۔

انگریزی میں کچھ سوالات کرنے کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا: کیا یہ آپ کا پہلا سفر ہے؟

میں نے کہا: ہاں، اِسی لیے تو مجھے رہنمائی کی ضرورت پڑ رہی ہے۔

اِن میں سے ایک خاتون نے کہا: ہم لوگ آپ کے ہاں، ہندوستان میں، پہلا سفر کرتے ہیں۔ کوئی تجربہ نہیں ہوتا، مگر ہم بالکل اجنبیت محسوس نہیں کرتے۔ ہم کسی سے کچھ نہیں پوچھتے، بلکہ اپنے مشاہدے سے اپنی منزل تلاش کر لیا کرتے ہیں۔

میں نے سوچا کہ اُن کی اِس مادی اور صنعتی ترقی کی بڑی وجہ اُن کی یہی خود اعتمادی اور اُن کا ذوقِ مشاہدہ و تجسس ہے۔

کاؤنٹر پر یحییٰ نامی ایک عرب بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے کاغذات دیکھے اور باہر نکل کر مجھ سے کہا: 'أنا مسلم' اور اپنے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے مجھ کو ایئر پورٹ کے باہر تک پہنچا دیا۔

باہر سید شمس الحسن زیدی اپنے رفقا کے ساتھ منتظر تھے۔ میں اُن کے ساتھ پہلے اُن کے گھر کے لیے روانہ

ہوا، پھر تھوڑی دیر کے بعد اپنی جائے قیام دیکھنے نکلا۔ یہاں سردیوں کا موسم اختتام پر تھا اور موسمِ گرما کی آمد آمد تھی۔ البتہ ابھی یہاں سڑکوں کے کنارے اور درختوں پر برف جمی ہوئی تھی، اور چاروں طرف سفیدی ہی سفیدی تھی۔ یہاں آج کئی روز کے بعد سورج دکھائی دیا تھا۔

یہاں کے لوگوں کے لیے دھوپ بڑی نعمت ہوا کرتی ہے۔ ایسے موقع پر اسکولوں اور دفتروں میں چھٹیاں کردی جاتی ہیں، تاکہ لوگ کھل کر دھوپ کا لطف اُٹھاسکیں۔

الحمدللہ ایسے وقت میں یہاں پہنچا کہ موسم معتدل ہو رہا ہے، اور اِس طرح ان شاء اللہ آئندہ سردیوں تک یہاں کے سخت زمستانی موسم میں رہنا بڑی حد تک آسان ہوجائے گا۔ اب گرمیاں شروع ہوچکی ہیں، لیکن یہاں کی گرمیاں بھی تقریباً اپنے ہاں کی سردیوں جیسی ہیں، کبھی دھوپ، کبھی بادل اور کبھی بادو باراں۔

یہ پورا شہر گویا ایک خوب صورت جزیرہ ہے، جو سخت چٹانی اور کوہستانی علاقے کو انتہائی مہارت اور سلیقے مندی کے ساتھ تراش خراش کر آباد کیا گیا ہے۔ یہ ملک دنیا کے انتہائی ترقی یافتہ ملکوں میں سے ایک ہے۔ یہ اپنے تمدن، صنعتی ترقی، بلند معیارِ زندگی اور اپنے بے مثال امن وتحفظ کی وجہ سے یورپین ملکوں میں بھی ایک ممتاز مقام رکھتا ہے۔ سماجی کرپشن نہیں کے برابر ہے۔ سوڈش لوگوں نے 175 سال سے کوئی جنگ نہیں لڑی اور اپنی ساری صلاحیت تعمیری پہلوؤں پر صرف کی۔ یہاں ہر قوم د مذہب کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ عرب بکثرت اور سرگرم وفعال ہیں۔ دارالسلطنت اسٹاک ہوم میں مرکزی مقام پر 'رابطہ عالم اسلامی سینٹر' اور اُس کی ایک عظیم الشان و پرشکوہ مسجد قائم ہے۔ یہاں ہر ہفتے جمعہ کے دن کئی بندگانِ خدا برابر مشرف بہ اسلام ہوتے ہیں۔ ملک کی کل نوملین (90 لاکھ) آبادی میں مسلمانوں کی آبادی صرف چار لاکھ کے قریب ہے۔ یہاں مکمل طور پر مذہبی آزادی ہے۔ یہ ایک انتہائی خوش آئند بات ہے کہ یہ لوگ قطعاً کسی تفریق کے بغیر غیر ملکیوں کو برابر کا شہری مانتے اور اُنھیں ہر طرح کے پورے حقوق عطا کرتے ہیں۔ ایک عجیب بات یہ معلوم ہوئی کہ یہاں کے ملکی دستور میں یہ بات درج ہے کہ ـــــ اِس ملک کو سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کے منہج پر چلانا ہے۔

دستِ قدرت نے یہاں کے باشندوں کو ظاہری حسن وجمال کے ساتھ باطنی اور جوہری صفات مثلاً: شرافت، سنجیدگی، نرم مزاجی، خودمستی، عالی ظرفی، وفاشعاری، محنت کوشی اور بلند حوصلگی، وغیرہ بڑی فیاضی سے عطا فرمائے ہیں۔ یہ احساس کے اظہار میں سرد وکم گو، مگر عمل میں چاق وچوبند اور راست باز ہیں۔ وہ ایک دوسرے کے معاملات میں دخل در معقولات سے اجتناب کرتے ہیں۔ اجتماعیت اِن کی شرست ہے، جس کی وجہ سے انفرادیت پرسکون وخوش حال ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اِن اقوام میں شاید دعوتِ حق کا کام مطلوب معیار اور حکمت ودل سوزی کے ساتھ نہ ہوسکا، ورنہ بھٹکا ہوا تو اکثر منزل کا پتا ہی چاہتا ہے اور بس۔ افسوس کہ ہمارے بیش تر رہنما یہاں آکر بھی وہی فرسودہ قسم کے مذہبی مسائل چھیڑ دیتے ہیں، جن کا اسلامی روح ومزاج اور یہاں کے مذاق وماحول سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً مسلکی اختلافات، وغیرہ۔ برا ہو اِس تعصب وتنگ

نظری کا، کہ یہ دین ودنیا کے نہ معلوم کتنے سفینے ڈبو چکی ہے۔

یہاں سب سے پہلا اور بنیادی کام باشندگانِ سویڈن کو محبوبِ حقیقی کا جلوہ دکھانے اور اُن کے بیچ شمعِ ایمان وتوحید جلانے کے بجائے اپنی خاکستر میں دبے شرارِ ایمان کو بچانے اور خود اپنوں کی آنکھ میں سرمۂ خاکِ مدینہ ونجف لگانے کی شدید ضرورت ہے، تاکہ جلوۂ فرنگ انھیں خیرہ نہ کرسکے۔ وہ آج ایک ایسی منزل پر پہنچ چکے ہیں، جس کا حاصل لذتِ جنس ومعاش کے سوا اور کچھ نہیں۔ وہ ایک ایسی تمنا میں جینے پر مجبور کردیے گئے ہیں، جس کا اِس دنیا میں پوری ہونا نہ صرف مشکل، بلکہ آخری حد تک ناممکن ہے۔

بلند معیارِ زندگی کی ہوس اور جنسی انفجار نے اِس مغربی معاشرے کی اکثریت کو نہ صرف معاشی اور جنسی حیوان بنا کر رکھ دیا ہے۔ موہوم جنسی تسکین کو خدا، اور فرضی آسودہ حالی کو عیشِ جنت کا بدل تسلیم کرلینے پر انھیں رضامند ومجبور کردیا ہے: بئس للظالمین بدلًا، تاکہ وہ ایک ناممکن شے کو اپنی تمام ممکن جدوجہد صرف کرنے کے باوجود حاصل نہ کرسکیں۔ اور یہ تشنہ کام منزل مقصود پر پہنچانے کے بجائے 'ضل سعهم في الحياة الدنيا' کی پاداش میں آکر 'لا نقيم لهم يوم القيامة وزناً' کے ابدی عتابِ الٰہی کے سزاوار بن کررہ جائیں: 'اللهم إني أعوذ بك من فتنة المسيح الدجال'

دنیا (مادیت) یہاں ممکن حد تک ہر طرف پھیلی ہوئی ہے۔ وقتی اضطراری، دعوتی اور مقصدی اقامت کے لیے مغرب بڑی حد تک قابل انگیز ہوسکتا ہے، مگر صرف حصولِ 'زینتِ حیاتِ دنیا' اِس کا جواز شاید ہرگز نہ ہو۔ یہ افکارِ پریشاں محض جذباتی بہاؤ کا نتیجہ یا غیر متوازن طرزِ فکر کی پیداوار نہیں، بلکہ یہ اِس آگ میں ڈالے گئے ایک محرم رازِ درونِ مے خانہ کے فطری اور تجرباتی احساسات ہیں۔

ایک تجربہ یہ ہوا کہ اگر ایک آدمی کو غیر متعصب ذہن اور بے لاگ نگاہ عطا ہوئی ہے تو یہاں اُسے بہت سی اسلامی اقدار، روایات، اور اساسات کو اُن کے اصل معنوں میں سمجھنا اور اُن کی قدر وقیمت پہچاننا نسبتاً آسان ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ مروجہ اعمال وافکارِ اسلامی کی تفہیم اور اُن کی تشکیلِ جدید، اصل اسلامی روح کے ساتھ یہاں زیادہ ممکن العمل اور قابلِ قبول نظر آتی ہے۔ اِس کی ایک بڑی وجہ یہاں کا ثقافتی تنوع اور تمدنی عروج وارتقا ہے۔

مسلم معاشرے میں مذہب کے نام پر رائج بے شمار روایات واعمال کا انتہائی غیر اسلامی ہونا یہاں صاف محسوس ہوتا ہے۔ چونکہ اسلام فرد اور اجتماع دونوں سطحوں کے لیے ایسے رہنما اصول اور ایسے بلند معیار واقدار عطا کرتا ہے جن کا کامل ظہور صرف انفرادی ماحول اور غیر اجتماعی زندگی میں ناقابلِ فہم بھی ہے اور ناممکن العمل بھی۔ ایک خصوصی احساس یہ ہوا کہ یہاں یہ عارضی اور ارضی عکسِ آئینۂ جنت دیکھ کر اُس ابدی، اصلی اور موعود جنت کی ناقابلِ تصور اور بے بہا نعمتوں کی قدر وعظمت مزید بڑھ رہی ہے۔

یہاں بار بار دل یہ سوچنے پر مجبور ہے کہ خدا کی جنت اِن تمام ممکن معیارِ زندگی کی رونقوں اور بظاہر بے

مثال چیزوں سے بھی نہ صرف بہت بڑھ کر بلکہ ان کے مقابلے میں ناقابلِ تصور ہی ہے۔ اللّٰــه أكبر. فتبارك الله أحسن الخالقين. یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام اور صادقین کے لیے راہِ حق میں بڑی سے بڑی قربانی دینے، حتیٰ کہ جان تک داؤں پر لگا دینے کے لیے صرف محبوبِ حقیقی کی خوش نودی اور جنت کی خوش خبری کافی ہوا کرتی تھی۔ اللّٰهمّ إني أسئلك رضاك والجنّة.

میں یہاں جن لوگوں کے درمیان مقیم ہوں، خدا کے فضل سے، وہ دین کے تئیں مخلص ہیں۔ یہاں اُن پر ہمارے مشرقی معاشروں جیسا کوئی خارجی یا سماجی قسم کا مذہبی دباؤ نہیں ہے، اِس لیے جس حد تک بھی اُن کا تعلق دین سے ہے، وہ سچا اور حقیقی ہے۔

سردست یہاں ایک اسلامی مرکز (Islamiska Kultur Foreningen) کی دعوتی اور تعلیمی ذمے داری میرے سپرد ہے۔ اِس میں جمعہ اور پنج وقتہ نمازوں کے علاوہ، بچوں کو تعلیم، بڑوں کو تلقین، خواتین کو نصیحت، اپنوں کے ساتھ شفقت اور دوسروں کے ساتھ دعوت و محبت شامل ہے۔

احباب بحمد للہ اعلیٰ ظرف، باذوق، قدرداں، علم دوست اور روشن دماغ و وسیع الفکر ہیں۔ کام کے لیے آزادی اور ہم مزاجی حاصل ہے۔ استخفاف واستحصال (exploitation) کا یہاں ماحول نہیں ہے۔ تاہم میرے لیے اِس حسین تہذیبی گھوارے میں حقیقی وجہِ اطمینان اِس آرزو کی تکمیل کے سوا اور کچھ نہیں، جو مجھے مسلسل بے چین کیے ہوئے تھی، یعنی کچھ کر گزرنے کی آرزو: لعل الله يحدث بعد ذلك أمراً.

بس دعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ اخلاص واستقامت عطا فرمائے۔ اپنی مرضی، اسوۂ نبوی اور صحابہ کرام و صادقین کے نمونے کے مطابق، اپنی رضا اور انسانیت پناہی کے کچھ کام مجھ بے علم و عمل شخص سے لے لے:

این سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

میری طرف سے تمام اعزہ واحباب، بھائیوں اور بہنوں کو سلام عرض ہو۔ والدہ محترمہ سے خصوصی دعاؤں کی درخواست ہے۔

استاک ہوم، سویڈن
22 محرم الحرام 1423ھ (13 اپریل 2002ء)

والسلام
محمد ذکوان ندوی

...

Muhammad Zakwan Nadvi
Masjid Al Badar, # 111 / 30,31
Say Sam Layout, Old Siddeshwara Mill Area
Nitvvali Davengere-577002 (Karnataka)
E-mail: mznadvi@gmail.com, Mob: 9125012013

ڈاکٹر مظفر حنفی: کڑے راستوں کا مسافر

عشرت قادری

وقت کی گرد اور دھند میں کھوئے ہوئے ماہ وسال دیوار پر آویزاں آئینے پر اٹی ہوئی دبیز تہیں، جب ہوا کے نرم جھونکوں سے منتشر ہو کر کوئی گوشہ روشن کرتی ہیں تو بیتے ہوئے دن رات ذہن کے پردے پر کوئی تصویر ابھار دیتے ہیں۔ ایسے میں کبھی پلکوں پر شبنمی قطرے جھلملاتے ہیں تو کبھی آپ ہی آپ ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تیر جاتی ہے۔ خوابوں کی پرچھائیاں متحرک ہو کر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہیں۔ ذہن کی سطح پر ایک عجیب قسم کا ارتعاش سا محسوس ہونے لگتا ہے اور یہی ارتعاش ابھرنے والے چہروں کو دور تک دائرہ در دائرہ پھیلاتا ہوا آنکھوں سے اوجھل کر دیتا ہے۔ لیکن کچھ صورتیں، کچھ تصویریں پوری آب و تاب کے ساتھ چمکتی رہتی ہیں۔ ان کا عکس آئینے پر گرد وغبار کے باوجود ماند نہیں پڑتا۔ ماضی اور ماضی سے وابستہ یادیں جہاں کلیجہ کاٹ کر رکھ دیتی ہیں، وہیں سورج کی پہلی کرن کے ساتھ شروع ہونے والے نئے سفر کے لیے زادِ راہ بھی ثابت ہوتی ہیں۔

ڈاکٹر مظفر حنفی کا سراپا ان کی طویل رفاقت، محبت اور بے لاگ خلوص کے رویے کے سبب میرے وجود کا ایک حصہ بنا ہوا ہے۔ انہوں نے بھوپال میں جو ماہ وسال گزارے ہیں، وہ سب کے سب یادگار ہیں۔ ان دنوں کا لمحہ لمحہ خوشبوؤں سے مہک رہا ہے۔ انہیں یادگار شب و روز، ماہ وسال اور لمحات کو میں آئندہ سطور میں سنہ اور تاریخ کے تسلسل کے بغیر کاغذ پر سمیٹ رہا ہوں۔ خلا میں تیرتی ہوئی بے شمار آوازوں میں سے ایک آواز اشتیاق عارف (مدیر روزنامہ افکار، بھوپال) کی میرے کانوں میں گونجتی ہے 'عشرت صاحب! مظفر حنفی کو میں نے بھوپال آنے کو کہا ہے اب وہ یہیں رہیں گے۔ یہ تو واقعی اچھی خبر ہے، میں نے کچھ عرصہ قبل ہی ان کا ایک افسانہ 'ہم شریف ہیں' کردار (بھوپال) کے افسانہ نمبر میں پڑھا ہے۔ وہ شعر بھی خوب کہتے ہیں اور شاعر بھی بڑے تیکھے ہیں۔ یہ بات بیسویں صدی عیسوی کی پانچویں اور چھٹویں دہائی کے بیچ کی ہے۔

اس طرح پہلی بار مظفر حنفی بھوپال آئے اور بہت جلد یہاں کے ادیبوں، شاعروں اور صحافیوں کے بڑے حلقے میں گھل مل گئے۔ یوں بھی ادبی حلقوں کے لیے وہ اجنبی نہیں تھے۔ ان کی شاعری اور افسانے اردو کے مقتدر ادبی رسائل میں چھپ رہے تھے۔ اگرچہ اُس وقت وہ اپنے نام کے آگے وطنی نسبت 'ہسوی' لکھتے تھے لیکن کھنڈوہ کے تعلق سے اکثر دوستوں کو ان سے ایک تعلق خاطر تھا۔ ویسے بھی ادبی رشتہ کسی حصار یا نسبت

سے کوئی منفی اثر قبول نہیں کرتا۔اس وقت تک مظفر حنفی افسانہ نگار کی حیثیت سے کافی مشہور ہو چکے تھے۔ان کے افسانے خواجہ احمد عباس، سہیل عظیم آبادی، کرشن چندر، کوثر چاند پوری، دیو بندر ستیارتھی، ٹھاکر پونچھی، رام لعل، زکی انور، غیاث احمد گدی، ستیہ پال آنند، ہیرانند سوز، پشکر ناتھ، موہن یاور، اقبال مجید، عابد سہیل اور ابراہیم یوسف وغیرہم جیسے نامور ادیبوں کے ساتھ چھپ رہے تھے۔

ان کی اس شہرت اور ادبی وقعت نے انہیں بھوپال کے ادبی خاندان میں بھی محبوبیت عطا کر دی اور وہ بیک وقت علامہ محوی صدیقی، کوثر چاند پوری، حکیم سید قمر الحسن، باسط بھوپالی، شعری بھوپالی، ڈاکٹر ابو محمد سحر، حامد سعید خاں، ممنون حسن خاں، اختر سعید خان، اظہر سعید خان، سید محمود حسینی، ایم عرفان، جوہر قریشی، عبدالاحد خاں تخلص، گوپی کشن شوقؔ، اسد بھوپالی، مقصود عرفان، سید محسن علی، قمر جمالی، جہانقدر چغتائی، رمزی ترمذی، کیف بھوپالی، سید اسرار مسعود، کرنل محبوب، محمد علی تاج، پروفیسر مرتضیٰ علی شاد، پروفیسر حامد جعفری، فضل تابش، واحد پریمی، امیر احمد خسرو، رہبر جونپوری، ڈاکٹر شفا گوالیاری، وفا صدیقی، زہرہ جمال، اشفاق مشہدی، نجیب رامش، شاہد اختر، عرفان پرویز، عمیق حنفی، خاں شاکر علی خاں، شہاب اشرف، ظفر صہبائی، عیسیٰ صدیقی، محمد خالد عابدی، مقصود عمرانی، ظفر نسیمی وغیرہم نئے پرانے اور نوجوان قلم کاروں، سیاسی اور سماجی شخصیات کی آنکھ کا تارا بن گئے۔

اس بار بھوپال میں ان کا قیام عارضی رہا اور وہ ملازمت کے سلسلے میں مدھیہ پردیش کے کالا پانی لاڑکوئی چلے گئے لیکن چھٹیوں میں بھوپال آتے جاتے رہے۔ پھر کچھ عرصہ بعد معلوم ہوا کہ مظفر صاحب ملازمت ترک کر کے واپس کھنڈوہ چلے گئے وہ وہاں جا کر پوری گرمجوشی کے ساتھ ادبی میدان میں سرگرم عمل ہو گئے۔ انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم کی۔ اردو زبان کی تعلیم و ترقی کے لیے اردو کے اسکول قائم کئے اور ماہنامہ 'نئے چراغ' کا اجراء کیا۔مشاعروں، مباحثوں اور سیمیناروں کا انقاد کیا۔

کھنڈوہ میں ان کے دیرینہ رفقائے کار حسن بشیر، قاضی حسن رضا، قاضی انصار، حبیب عالم منشی جلیس، شوق، ماہری، ڈاکٹر خوشتر کھنڈوی، ڈاکٹر خورشید احمد صدیقی اور دوسرے بہت سے لوگ جوان کے کھنڈوہ چھوڑنے سے ٹوٹ گئے تھے پھر سے ایک نئے عزم اور حوصلے کے ساتھ زبان وادب اور ثقافت کے فروغ میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ 'نئے چراغ' کی روشنی پھیلی تو آس پاس کے علاقوں برہانپور، ہرسود اور ہردہ میں بھی ادبی چہل پہل شروع ہو گئی۔ کھنڈوا سے نکلنے والا مظفر حنفی کا 'نئے چراغ' اردو شاعری میں جدیدیت اور عصری حسیت کا پہلا نمائندہ بن کر سامنے آیا جس نے ہندوستان کے وسیع ترین ادبی حلقوں میں ہلچل مچا دی۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس وقت تک شمس الرحمٰن فاروقی کے 'شب خون' کا اجراء عمل میں نہیں آیا تھا۔

ہندوستان میں چند ہی شاعر حلقہ ارباب ذوق لاہور کی روش پر تازہ تازہ وارد ہوئے تھے۔اس اعتبار سے 'نئے چراغ' کھنڈوہ نے صحیح معنوں میں اردو شاعری میں جدیدیت اور نئے میلانات کو پروان چڑھانے میں جو حصہ ادا کیا، اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔اس کے قلم کاروں میں اختر الایمان، راج نرائن رازؔ، عمیق حنفی، حکیم منظور وغیرہ نے جدیدیت کے حوالے سے شہرت، مقبولیت اور امتیاز حاصل کیے۔

اس بار کھنڈوہ میں مظفر حنفی نے جو کارہائے نمایاں انجام دیے، اُن کے سبب مدھیہ پردیش کی راجدھانی بھوپال سے بھی اس کا ادبی اور تہذیبی رشتہ پائیداری کے ساتھ استوار ہوا کیونکہ وہ کھنڈوہ میں منعقد ہونے والی کسی بھی بڑی سے بڑی کانفرنس، آل انڈیا اور صوبائی سطح کے مشاعروں میں بھوپال کے ادیبوں اور شاعروں کو بہت خلوص اور اپنائیت کے ساتھ ضرور مدعو کرتے تھے۔ وہاں انہوں نے اردو مدارس کے علاوہ ایک بڑی لائبریری قائم کی ہوئی تھی۔ ادبی مشاغل کے علاوہ اپنے عم زاد بڑے بھائی سیٹھ مظہر الدین صاحب کے کاروبار میں بھی ان کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔

مظہر بھائی کھنڈوہ میں فروٹ کے ایک بہت بڑے تاجر تھے۔اسی اعتبار سے انہیں سیٹھ مظہر بھائی کہا جاتا تھا۔مظہر بھائی شاعری اور مشاعروں کے بھی بڑے رسیا تھے۔ کسی بھی بڑے مشاعرے کی تجویز پر سب سے پہلے انہیں سے داعیان مشاعرہ مشورہ اور حسب ضرورت مالی اعانت حاصل کرتے تھے۔مشاعرے کے بعد بھی اکثر مشاہیر شعرا دِنوں مظہر بھائی کے ہاں مہمان رہتے تھے۔سیر وشکار کے پروگرام بنتے تھے اور جاتے وقت فروٹ کی ٹوکریاں انہیں تحائف کے طور پر دی جاتی تھیں۔

مظہر بھائی سیدنا غوث پاک حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کے زبردست عقیدت مند تھے۔گیارہویں شریف کے موقع پر تین تین دن تک فاتحہ خوانی اور ضیافتوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا جس میں ہر ذات اور فرقے کے لوگ ہزاروں کی تعداد میں شریک ہوتے تھے۔کھنڈوہ کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ چھوٹے بڑے مشاعروں اور ادبی تقریبات میں اردو والوں کے دوش بدوش غیر مسلم حضرات کی کثیر تعداد نہایت شوق وذوق کے ساتھ دام، درم، قدم، سخن سمیت شریک رہتی ہے۔اب یہ فضا اور یہ ماحول شاید ہی کسی شہر میں موجود ہو۔

کھنڈوہ کے مشاعروں کی تاریخ کا ایک دلچسپ واقعہ میرے علم میں آیا۔صبح چار بجے جب ایک آل انڈیا مشاعرہ ختم ہوا تو میں بھوپال کے شعراء محمد علی تاجؔ، رفعت الحسینیؔ اور کچھ دوسرے دوستوں کے ساتھ مظفر صاحب کے ہمراہ مظہر بھائی کے مکان پر پہنچے۔ وہاں ان کے کمرے میں کچھ یادگار مشاعروں کی بڑی بڑی تصاویر دیواروں پر آویزاں تھیں۔ میں ان تصاویر کو دیکھنے لگا۔ان میں ایک تصویر ایسی تھی جس میں اسٹیج کے دائیں بائیں کونوں پر، ماہر القادری اور ساغر نظامی اپنے اپنے دواوین 'محسوساتِ ماہرؔ' اور 'بادۂ مشرق' سامنے کھولے

بیٹھے تھے۔ مظہر بھائی نے جب دیکھا کہ میں تصویر کو غور سے دیکھ رہا ہوں تو انہوں نے بتایا کہ یہ ایسا مشاعرہ تھا جس میں ماہر القادری اور ساغر نظامی کے درمیان مقابلہ آرائی ہو گئی تھی۔

سامعین کی تعداد بھی ہزاروں سے متجاوز تھی جو انھیں دونوں شعرا کو سننے پر بضد تھی۔ چنانچہ جب تک دونوں کو زبانی کلام یاد تھا، سناتے رہے اور پھر دونوں نے اپنے مجموعے سامنے رکھ کر سنانا شروع کر دیا اور صبح فجر کی اذان کے وقت مشاعرہ ملتوی ہو کر دوسری رات بھر پھر چلا۔ اس طرح کھنڈوہ کا یہ مشاعرہ یادگار بن گیا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ کھنڈوہ میں کوئی مشاعرہ، مباحثہ یا ادبی جلسہ ناکام ہوا ہی نہیں۔ سیاست گردی سے ہٹ کر عام لوگوں میں جو محبتیں، یگانگت اور خلوص پایا جاتا ہے، وہ مثالی ہے۔ فرقہ وارانہ اتحاد اور ہم آہنگی کے جو مظاہر کھنڈوہ میں مشاہدے میں آئے، ان پر رشک کیا جاسکتا ہے اور یہ فضا بنی ہے تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں سے جن میں خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر مظفر حنفی کے موروثی اور ادبی خاندان کا اہم حصہ رہا ہے۔

بظاہر مظفر حنفی کھنڈوہ میں پرسکون، مصروف و مطمئن زندگی گزار رہے تھے لیکن ان کے اندر کا فنکار جن بلندیوں کو چھونا چاہتا تھا، اس کے لیے کھلا آسمان دور کا تھا۔ یہی جذبہ، لگن اور اضطراب ایک بار انہیں پھر بھوپال کھینچ لایا۔ اس مرتبہ وہ تنہا نہیں تھے۔ ان کے پسینے سے 'ابٹن' کی بھینی بھینی خوشبو پھوٹ رہی تھی۔ کشادہ پیشانی سے موگرے کے پھولوں سے گندھے ہوئے سہرے کی سلوٹیں نمایاں تھیں۔ سانولے چہرے کی دمک میں گلابی رنگ جھلک رہا تھا۔ آنکھوں کی چمک میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ نوعروسہ عاصمہ بھابی کا زرتار گھونگھٹ پھولوں کی پنکھڑیوں پر آ کر ٹھہر گیا تھا اور وہ پورے انہماک اور رفاقت کے جذبات واحساسات سے سرشار ہو کر اپنے تاجدار سے قدم سے قدم ملا کر زندگی کے پرخار راستوں میں اپنی دلآویز مسکراہٹ سے تازہ تازہ پھول بکھیر رہی تھیں۔ شاعر مظفر حنفی اب پورے پورے شاد عارفی کے رنگ میں رنگ چکے تھے۔ ان کے لہجوں اور تحریروں میں بھی وہی کاٹ، طنز کا تیکھا پن اور قدرے تلخی محسوس کی جاسکتی تھی۔ پہلے جو لوگ ان کی قربت حاصل کر چکے تھے، مظفر حنفی ان پر تنقیدی نظر ڈال رہے تھے۔

میں مطمئن تھا کہ ان کی تنقید کا نشانہ نہیں بن سکا بلکہ کچھ اور بھی قریب سے قریب تر آ گیا۔ اس عرصے میں وہ اپنا جائزہ بھی مکمل کر چکے تھے۔ ان کی منتخب فہرست میں مقصود عرفان، مقصود عمرانی، سید محمود الحسینی، سلطان محمد خان، حکیم سید قمر الحسن، اختر سعید خاں، اظہر سعید خاں، ایم عرفان، محمد علی تاج، قاسم نیازی، مسعود قمر تاباں، گوپی کرشن شوق، کیف بھوپالی، شعری بھوپالی، باسط بھوپالی، پروفیسر ایم اے شاد، ظفر صہبائی، رفعت الحسینی فضل تابش، واحد پریمی، وغیرہ پروقار منصب پا چکے تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ یہی بھوپال کا ادبی خاندان اس وقت عملی میدان میں سرگرم تھا۔ کوثر چاند پوری کا قائم کردہ

'حلقۂ دانشوران' کل ہندا انجمن ترقی پسند مصنفین، فضل تابش کی 'بزم فنکار' اور نعیم کوثر اور اظہر راہی کی 'شمع ادب' وغیرہ باقاعدگی کے ساتھ پندرہ روزہ اور ماہانہ ادبی تنقیدی نشستیں منعقد کر رہی تھیں۔ حلقۂ دانشوران کے جلسے عام طور پرست پرکاش سنگر کے بنگلے پر یا کوثر چاند پوری کے مکان پر ہوتے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے زیادہ تر جلسے اختر سعید خاں کے یہاں منعقد ہوتے تھے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین، حلقہ دانشوران اور مرکز ادب، بھوپال کے جلسوں کا ایک معیار اور وقار ہوتا تھا جن میں ہر کوئی نہیں پڑھ سکتا تھا کیوں کہ جلسے میں پڑھی گئی کہانیوں، افسانوں، نظموں، غزلوں اور مضامین پر نہایت باریک بینی سے بحث اور تنقید ہوتی تھی۔ نثر پڑھنے والوں میں خود کوثر چاند پوری، ڈاکٹر ستیہ پرکاش سنگر، قمر جمالی، عیسیٰ صدیقی، نعیم کوثر، اظہر راہی، ڈاکٹر شفیقہ فرحت، ایم عرفان، ابراہیم یوسف، اختر سعید خاں، ڈاکٹر سعید حامد حسین، ڈاکٹر مظفر حنفی وغیرہ پابندی کے ساتھ شریک ہوتے تھے۔ تنقید کے لیے جو شعرا اپنی تخلیقات پیش کرتے تھے، ان میں شفا گوالیاری، محمد علی تاج، ارشد صدیقی، اظہر سعید خاں اور راقم الحروف (عشرت قادری) حصہ لیتے تھے۔ ان جلسوں میں صحت مند تنقید کے ساتھ ساتھ طنز و تکرار اور لطیفے بھی ہوتے تھے۔

ایک بار کیف بھوپالی نے اپنی ایک نظم سنائی۔ اس کے ایک مصرع:

اجنبی ہاتھ کی چٹکی میں لگام آج بھی ہے

اس پر ابراہیم یوسف نے مشورہ دیا کہ چٹکی کی جگہ انگلی کر دیجیے۔

کیف صاحب نے برجستہ جواب دیا کہ یہ کام میں نہیں کر سکتا۔ اس پر زبردست قہقہہ پڑا۔ ابراہیم یوسف کی ذرا دیر میں بات سمجھ میں آئی۔

ایسے متعدد واقعات ہیں جن کی صرف یادیں باقی رہ گئی ہیں۔ نہ وہ لوگ ہیں نہ وہ محفلیں۔ ہر طرف اک سکوت اور سناٹا ہے۔ جو لوگ باقی رہ گئے ہیں، وہ ماضی کی ورق گردانی میں کھوئے ہوئے ہیں۔

حنفی صاحب کا ذہن ہمیشہ سے تعمیری رہا ہے۔ کسی مفید کام کے سلسلے میں ان کی پلاننگ کا بھی جواب نہیں۔ ایک شام مرکز ادب میں چائے کے دوران انھوں نے ایک اچھے ماہنامے کے اجراء کی تجویز رکھی جس کی میں نے پرزور تائید کی اور رسالے کا نام 'جوئبار' تجویز کیا جو حنفی صاحب کو بھی پسند آ گیا۔ ایک ماہ کے اندر ڈکلریشن بھی حاصل ہو گیا۔ بدھوارے میں واقع تاج بلڈنگ کے ایک وسیع کمرے میں دفتر قائم ہو گیا۔ ہندو پاک کے قلم کاروں سے ان کی تخلیقات حاصل کرنے کے لیے جوئبار کے چھپے ہوئے لیٹر پیڈ پر خطوط لکھے جانے لگے۔ ابتدائی طور پر اخراجات کے لیے حنفی صاحب نے اور میں نے اپنی اپنی جیبوں سے ڈیڑھ ہزار روپے دے دیے۔ رسالے کے اجراء کی خبر دور دور تک پھیلتی گئی۔ ہمارے ایک دوست نے اسپانسر شپ کی تجویز پیش

کی تو حنفی صاحب نے ان سے شرائط دریافت کیں۔

اُنہوں نے جواب میں صرف اتنا کہا کہ آپ لوگ اردو زبان کی خدمت میں ہمہ تن مصروف ہیں، میرے دل میں بھی یہی جذبہ اور امنگ ہے۔ جب رسالہ چلنے لگے گا تو میں پیسہ تھوڑا تھوڑا کر کے لیتا رہوں گا۔ حنفی صاحب نے مجھ سے تنہائی میں اس مسئلے پر گفتگو کی تو میں نے بتایا کہ پیسہ تو لگا سکتے ہیں اور اگر ایک سال تک جوئبار پابندی کے ساتھ شائع ہوتا ہے تو ادارہ اس قابل بھی ہو جائے گا کہ ہم پیسہ لوٹا دیں۔ حنفی صاحب مطمئن ہو گئے اور مجھ سے کہا کہ پھر ایسا کرتے ہیں کہ مجلس ادارت میں ان کا نام شامل کر لیتے ہیں۔ تجویز نہایت معقول تھی مگر صاحب موصوف سے اس کا ذکر کیا تو وہ کسی طرح رضا مند نہیں ہوئے کہ نہ میں ادیب ہوں نہ شاعر، مجلس ادارت میں میری شمولیت کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ میں تو اس سے خوش ہوں کہ آپ لوگوں نے میری پیش کش قبول کر کے میری عزت افزائی کی۔ رسالے کا کام اور تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ تاج بلڈنگ کے پتے پر ڈھیروں ڈاک آنا شروع ہوگئی۔ ان میں سارے خطوط یا تو حنفی صاحب کے نام ہوتے تھے یا میرے نام۔ ظاہر ہے یہ سب خطوط مشاہیر ادیبوں کے ہوتے تھے۔ اس بات کو سرمایہ کار خاموشی سے محسوس کر رہے تھے جب کہ ہم لوگ ہر طرف سے بے پروا مضامین کی کتابت، پروف ریڈنگ اور پریس وغیرہ کے کاموں میں مصروف تھے۔

وہ چھٹی کا دن تھا۔ حنفی صاحب اُس روز فاریسٹ آفس نہیں گئے تھے۔ میں پہلے سے ہی جوئبار کے دفتر میں موجود تھا۔ حنفی صاحب بھی آ گئے اور گذشتہ دن کی آخری ڈاک دیکھنے لگے جس میں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، ساحر لدھیانوی، مہندر ناتھ، جاں نثار اختر، قتیل شفائی، علامہ نجم آفندی، نشور واحدی، ظ انصاری، صہبا لکھنوی، میرزا ادیب وغیرہ کے خطوط تھے۔

ابھی وہ لفافے چاک بھی نہ کر پائے تھے کہ ایک بہت ہی اپنائیت بھری آواز کانوں میں آئی۔

مظفر صاحب، عشرت بھائی! اسلام علیکم میں صلاح الدین پرویز ہوں۔ شاعری بھی کرتا ہوں اور افسانے بھی لکھتا ہوں۔

آپ لوگ 'جوئبار' نکال رہے ہیں، میری شاعری چھاپیں گے؟

آواز کی نرمی اور شائستگی میں جو انکسار، لجاجت اور معصومیت تھی، بہت بھلی لگی۔ میں نے نگاہیں اٹھا کر دیکھا تو ایک چھریرے بدن کا نہایت ہی حسین، خوبصورت جوان رعنا سامنے کھڑا تھا۔ میں اس کی نسائی لطافتوں اور نزاکتوں سے حد درجہ متاثر ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ذہانت کی کچھ ایسی رمق تھی کہ کم ہی لوگوں میں نظر آتی ہے۔ حقیقت ہے کہ میں صلاح الدین پرویز کے حسن و جمال سے مرعوب سا ہو چکا تھے اور اس

عرصے میں یہ بالکل بھول گیا تھا کہ برابر والی کرسی پر حنفی صاحب بیٹھے ہوئے ہیں۔ جن کی چشمے کے پیچھے چھپی ہوئی اوپر کو چڑھی ہوئی آنکھیں سوال کر رہی ہیں کہ یا اللہ یہ کہاں کی مصیبت اور بلا نازل ہوگئی لیکن وہ میرے ندیدے پن اور جمالیاتی مزاج سے بھی واقف تھے اور میں نے ان کی طرف دیکھے بغیر نہایت اپنائیت کے ساتھ کرسی پر بیٹھنے کو کہا۔

صلاح الدین پرویز نے بھی حنفی صاحب کی اکتاہٹ اور بیزاری کو محسوس کر لیا تھا اس لیے وہ مجھ سے مخاطب ہوئے عشرت بھائی میں ادیبوں، شاعروں اور خواتین افسانہ نگاروں سے شناسا ہوں۔ علی گڑھ میں ایک ادیبہ انجمن آرا انجم افسانے بھی ہیں، میں ان سے بھی آپ کے پرچے کے لیے افسانے منگوا سکتا ہوں۔ وہ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ صلاح الدین پرویز ان دنوں بھوپال میں تعلیم پا رہے تھے۔ وہ دوران کی زندگی میں بڑی آزمائش کا تھا لیکن کبھی اس باہمت نوجوان کے ماتھے پر شکن نہیں ابھری اور تین سال کا عرصہ انہوں نے بھوپال میں نہایت جواں مردی عالی حوصلگی اور استقلال کے ساتھ بسر کیا۔ آہستہ آہستہ وہ مجھ سے اس قدر مانوس ہو گئے کہ میرے بیٹوں جاوید اور نوید کی طرح میری بیوی خورشید کو بھی بہت زیادہ محبوب ہو گئے۔ جب چاہتے، بے تکلف گھر میں چلے آتے اور خورشید سے کہتے 'بھابی بہت زور سے بھوک لگ رہی ہے، جلدی سے کھانا دیجئے۔ صلاح الدین پرویز جب تک بھوپال میں رہے، میری اور خورشید کی آنکھوں کا تارا بن کر رہے۔ مجھ سے زیادہ خورشید انہیں اپنے بیٹوں کا سا پیار اور ڈلار دیتی رہیں۔ تعلیم کے سلسلے کو جاری رکھنے کے لیے ہمیشہ حوصلہ دیتی رہیں لیکن وہ بھوپال میں رہ کر ادیب اور شاعر تو نہیں بن سکے۔

مجھے یہ بھی نہیں معلوم ہو سکا کہ وہ کب علی گڑھ چلے گئے اور وہاں کیا کر رہے ہیں۔ کچھ عرصہ بعد نہ جانے کہاں سے ایک کتاب تو کیا کتابچہ میرے ہاتھ لگ گیا جس کا نام تھا 'ژاژ'۔ ایک طویل نظم تھی جس کا دیباچہ بشیر بدر نے لکھا تھا جو شاید نظم سے بھی زیادہ طویل تھا اور یہ پہلی مطبوعہ نظم تھی صلاح الدین پرویز کی جسے میں نے ایک سے زیادہ مرتبہ پڑھا لیکن نہ تو دیباچہ ہی میرے پلے پڑا اور نہ ہی نظم کی تفہیم تک ذہن نے رسائی کی۔ پھر کئی سال بعد امریکہ سے مجھے ایک خط ملا جس میں پانچ ہزار روپے کا ایک ڈرافٹ بھی میرے نام تھا۔ صلاح الدین پرویز کا خط پڑھ کر میری آنکھیں چھلک پڑیں۔ یہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ ان کی متعدد کتابیں غیر ممالک میں چھپ چکی ہیں پاکستان اور کنیڈا وغیرہ میں ان پر بڑے بڑے سمینار بھی ہو چکے ہیں۔ شاعر اور ادیب کی حیثیت سے انہیں خاصی شہرت حاصل ہو چکی ہے۔ میرے لیے یہی بہت تھا کہ وہ مجھے اور بھوپال کو اب تک اپنی یادوں میں بسائے ہوئے ہیں۔

صلاح الدین پرویز کا ذکر کچھ زیادہ ہی ہو گیا ہے لیکن اس میں غلط ایک بات بھی نہیں ہے۔ حنفی صاحب

کے تیور دیکھ کر بھی وہ بھی ان سے شاکی نہیں ہوئے اور نہ ہی ان کی عزت و احترام میں کوئی کمی کی۔ 'جوئبار' کی کتابت پروف ریڈنگ اور طباعت کا کام زور شور سے چل رہا تھا۔ پہلے ہی شمارے کے لیے ہندوپاک کے اہم قلم کاروں کی تخلیقات موصول ہو چکی تھیں۔ تجارتی اداروں سے اشتہارات بھی حاصل ہو رہے تھے۔ حنفی صاحب کے دیرینہ مراسم کے نتیجے میں اجین میں واقع مالوہ اسٹیل فیکٹری کا بھی بڑا اشتہار موصول ہو چکا تھا جو مستقل بھی تھا۔ پرچے کا پہلا جزو (16 صفحات) پریس سے چھپ کر آچکا تھا کہ اسی دوران ہمارے مشترکہ دوست اقبال احمد نے اچانک یہ تجویز پیش کی کہ اب میں آپ ایسے ادیبوں کے ساتھ شامل ہی ہو گیا ہوں تو میری خواہش ہے کہ مجھے ایڈیٹر بنا دیں۔

ان کی اس تجویز سے مجھ پر جو بیتی سو بیتی، حنفی صاحب کا پارہ چڑھ گیا۔ وہ بھلا کہاں برداشت کرنے والے تھے دہکتے ہوئے لاوے کی طرح ایک دھماکے کے ساتھ پھٹ پڑے 'ہرگز نہیں! اب یہ کسی صورت ممکن نہیں ہے۔ عشرت قادری کے نام ڈکلریشن آچکا ہے، اب اس میں کوئی ترمیم نہیں ہوگی۔ پھر آپ کیا اور آپ کی حیثیت کیا، آپ نے ہمیں دفتر فراہم کر دیا اور کچھ سرمایہ پرچے کی اشاعت میں لگا رہے ہیں تو اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ آپ کے دست نگر ہو گئے ہیں۔

حنفی صاحب بولتے جا رہے تھے جب ہم نے ابتداء میں آپ کا نام مدیر کے لیے تجویز کیا تھا تو آپ نے اس وقت کیوں انکار کر دیا تھا؟ اور اب یہ خیال آپ کے ذہن میں کیسے آگیا۔ یقیناً آپ کی نیت صاف نہیں ہے۔ میرا فیصلہ ہے کہ اب 'جوئبار' نہیں نکلے گا۔ اٹھائیے یہ آپ کے پانچ سو روپئے جو آپ نے دو ریم کاغذ کی خریداری کے لیے دیے ہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے جیب سے پانچ سو روپے نکال کر میز پر پٹخ دیے اور میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے جوئبار کے دفتر سے باہر لے آئے۔ اس کے بعد ہم دونوں میں سے کسی نے بھی نہ تو اس موضوع پر کبھی بات کی اور نہ ہی 'جوئبار' کے دفتر کی جانب رخ کیا۔

مجھے یہ افسوس ضرور ہوا کہ ایک اچھے خاصے ادبی ماہنامے کا بھوپال سے اجراء ہو رہا تھا، اب اس کا تصور بھی محال ہوگا۔ جوئبار تو نہیں نکل سکا لیکن اس کے اجراء کی خبر سے تحریک پا کر کچھ ادیب اور شاعر ضرور اس میدان میں سرگرم ہو گئے۔ چنانچہ علامہ نیاز فتح پوری کے ماہنامہ 'نگار' کوثر چاند پوری کے ماہنامہ 'جادہ' اور مفتی صدیقی کے ماہنامہ 'کردار' کے بعد ایک ساتھ دو ماہناموں 'مزاج اور زنجیر' کا اجراء ضرور عمل میں آیا۔

اوّل الذکر مزاج کے سرمایہ کار اور ایڈیٹر مشہور ترقی پسند افسانہ نگار عیسیٰ صدیقی تھے۔ پروفیسر شمیم احمد، قمر جمالی اور فضل تابش وغیرہ مجلس ادارت و مشاورت میں شامل تھے جب کہ زنجیر کے ایڈیٹر ممتاز شاعر مقصود عرفان تھے اور ان کے ساتھ پروفیسر قاسم نیازی ادارے میں شریک تھے۔ زنجیر کے اجراء کے محرک بھی مقصود

عرفان تھے اوراس کی اسپانسر شپ جید عالم اور ساری دنیا میں مشہور بھوپال کی تاج المساجد کی از سر نو تعمیر کا بیڑا اُٹھانے والے مولانا عمران خان ندوی کے قریبی عزیز سابق میونسپل چیئر مین جلال الدین قریشی کے ذمے تھی۔ ان دونوں رسائل کے اجراء سے حنفی صاحب اور میں مطمئن تھے کہ 'جو بَبار' ہم لوگ نکال نہیں سکے مگر کم از کم کچھ لوگوں کو تحریک تو ملی۔ یہ دوسری بات ہے کہ عیسیٰ صدیقی اور مقصود عرفان کے بار بار تقاضوں کے باوجود حنفی صاحب نے اپنی کوئی بھی تخلیق اِن دونوں رسائل میں چھپنے کے لیے نہیں دی۔ مجھ سے ضرور نوح ناروی پر ایک مضمون پروفیسر قاسم نیازی نے اصرار کر کے لکھوالیا تھا اور اسے زنجیر میں اہتمام سے شائع بھی کیا تھا۔ افسوس کہ زنجیر اور مزاج زیادہ عرصے تک نہیں چل سکے۔ مالی خسارے کے سبب بند ہو گئے اور پھر وہی جمود طاری ہونے لگا۔

اس دوران حنفی صاحب کا تبادلہ سیہور ہو گیا اور میں خود کو بے حد تنہا محسوس کرنے لگا حالاں کہ حنفی صاحب ہفتے کی چھٹی پر اتوار کے دن صبح دس بجے بھوپال آجایا کرتے تھے اور شام کو واپس ہو جاتے تھے۔ ان کے سیہور تبادلے سے وہاں جو کچھ شاعر تھے ان میں ایک نیا جوش پیدا ہو گیا اور وہ حنفی صاحب کی رہنمائی میں سرگرم ہو گئے۔ سیہور کے جو شاعر حنفی صاحب کے آس پاس تھے ان میں خاص طور پر عباس علوی، حیدر شاہین اور فاروق عندلیب وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔

عباس علوی حنفی صاحب کے زبردست ارادت مند تھے جب کہ ڈاکٹر حیدر شاہین کو شاعری کی بساط پر سجانے والے ہی حنفی صاحب ہیں۔ اتوار کے دن حنفی صاحب کا بھوپال آنا ایک معمول بن گیا تھا۔ اس کی خبر بھوپال کے ایک ٹھیکیدار مشتاق کو تھی جن کی پتھروں کی کھدانوں کا کیس جنگلات کے محلے میں عرصے سے التواء میں پڑا ہوا تھا۔ اتفاق سے ان کی فائل حنفی صاحب کی ٹیبل پر رکھی ہوئی تھی۔ ٹھیکیدار موصوف مشتاق سے میں بھی واقف تھا۔ ایک اتوار کو مشتاق صاحب صبح صبح میرے گھر آگئے اور اپنے کیس کی ساری تفصیلات بتا کر کہا کہ میرا لاکھوں کا کاروبار ڈھیر ہو کر رہ گیا ہے اور اگر مظفر صاحب چاہیں تو فائل پر دو سطریں لکھ کر مجھے ڈوبنے سے بچا سکتے ہیں۔ اس کے عوض نذرانے میں میں حنفی صاحب کو اتنے پھول پیش کر سکتا ہوں کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ میں نے سوال کیا کیا دس پانچ ہزار؟۔ انہوں نے فوراً ہی کہا جی اس سے بھی کئی گنا زیادہ۔

میری آنکھیں چمک اٹھیں لیکن مجھ میں ہمت نہیں ہوئی کہ حنفی صاحب سے ان کی سفارش کر سکوں۔ میں ان کے قلندری مزاج اور درویشانہ صفات سے اچھی طرح واقف تھا۔ میں جانتا تھا کہ از راہ ہمدردی تو وہ بڑے سے بڑا کام کر دیں گے لیکن اگر انہیں رشوت وغیرہ کا اشارہ بھی مل گیا تو طے ہے کہ مشتاق صاحب ڈوب ہی جائیں گے۔ اب مشتاق صاحب کا بھی یہ معمول بن گیا کہ اتوار کے دن میرے یہاں چلے آتے۔ حنفی صاحب

کے تیور دیکھ کر بھی وہ بھی ان سے شاکی نہیں ہوئے اور نہ ہی ان کی عزت واحترام میں کوئی کمی کی۔ 'جوئبار' کی کتابت پروف ریڈنگ اور طباعت کا کام زور شور سے چل رہا تھا۔ پہلے ہی شمارے کے لیے ہندو پاک کے اہم قلم کاروں کی تخلیقات موصول ہو چکی تھیں۔ تجارتی اداروں سے اشتہارات بھی حاصل ہو رہے تھے۔ حنفی صاحب کے دیرینہ مراسم کے نتیجے میں اجین میں واقع مالوہ اسٹیل فیکٹری کا بھی بڑا اشتہار موصول ہو چکا تھا جو مستقل بھی تھا۔ پرچے کا پہلا جزو (16 صفحات) پریس سے چھپ کر آ چکا تھا کہ اسی دوران ہمارے مشترکہ دوست اقبال احمد نے اچانک یہ تجویز پیش کی کہ اب میں آپ ایسے ادیبوں کے ساتھ شامل ہی ہو گیا ہوں تو میری خواہش ہے کہ مجھے ایڈیٹر بنا دیں۔

ان کی اس تجویز سے مجھ پر جو بیتی سو بیتی، حنفی صاحب کا پارہ چڑھ گیا۔ وہ بھلا کہاں برداشت کرنے والے تھے دہکتے ہوئے لاوے کی طرح ایک دھماکے کے ساتھ پھٹ پڑے 'ہرگز نہیں! اب یہ کسی صورت ممکن نہیں ہے۔ عشرت قادری کے نام ڈکلریشن آ چکا ہے، اب اس میں کوئی ترمیم نہیں ہو گی۔ پھر آپ کیا اور آپ کی حیثیت کیا، آپ نے ہمیں دفتر فراہم کر دیا اور کچھ سرمایہ پرچے کی اشاعت میں لگا رہے ہیں تو اس کا یہ مقصد نہیں ہے کہ آپ کے دست نگر ہو گئے ہیں۔

حنفی صاحب بولتے جا رہے تھے جب ہم نے ابتداء میں آپ کا نام مدیر کے لیے تجویز کیا تھا تو آپ نے اس وقت کیوں انکار کر دیا تھا؟ اور اب یہ خیال آپ کے ذہن میں کیسے آ گیا۔ یقیناً آپ کی نیت صاف نہیں ہے۔ میرا فیصلہ ہے کہ اب 'جوئبار' نہیں نکلے گا۔ اٹھائیے یہ آپ کے پانچ سو روپئے جو آپ نے دو ریم کاغذ کی خریداری کے لیے دیے ہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے جیب سے پانچ سو روپے نکال کر میز پر پٹخ دیے اور میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے جوئبار کے دفتر سے باہر لے آئے۔ اس کے بعد ہم دونوں میں سے کسی نے بھی نہ تو اس موضوع پر کبھی بات کی اور نہ ہی 'جوئبار' کے دفتر کی جانب رخ کیا۔

مجھے یہ افسوس ضرور ہوا کہ ایک اچھے خاصے ادبی ماہنامے کا بھوپال سے اجراء ہو رہا تھا، اب اس کا تصور بھی محال ہو گا۔ جوئبار تو نہیں نکل سکا لیکن اس کے اجراء کی خبر سے تحریک پا کر کچھ ادیب اور شاعر ضرور اس میدان میں سرگرم ہو گئے۔ چنانچہ علامہ نیاز فتح پوری کے ماہنامہ 'نگار' کوثر چاند پوری کے ماہنامہ 'جادہ' اور مفتی صدیقی کے ماہنامہ 'کردار' کے بعد ایک ساتھ دو ماہناموں 'مزاج اور زنجیر' کا اجراء ضرور عمل میں آیا۔

اوّل الذکر مزاج کے سرمایہ کار اور ایڈیٹر مشہور ترقی پسند افسانہ نگار عیسیٰ صدیقی تھے۔ پروفیسر شمیم احمد، قمر جمالی اور فضل تابش وغیرہ مجلس ادارت و مشاورت میں شامل تھے جب کہ زنجیر کے ایڈیٹر ممتاز شاعر مقصود عرفان تھے اور ان کے ساتھ پروفیسر قاسم نیازی ادارے میں شریک تھے۔ زنجیر کے اجراء کے محرک بھی مقصود

عرفان تھے اوراس کی اسپانسر شپ جید عالم اور ساری دنیا میں مشہور بھوپال کی تاج المساجد کی از سر نو تعمیر کا بیڑا اُٹھانے والے مولانا عمران خان ندوی کے قریبی عزیز سابق میونسپل چیئر مین جلال الدین قریشی کے ذمے تھی۔ ان دونوں رسائل کے اجراء سے حنفی صاحب اور میں مطمئن تھے کہ 'جوئبار' ہم لوگ نکال نہیں سکے مگر کم از کم کچھ لوگوں کو تحریک تو ملی۔ یہ دوسری بات ہے کہ عیسیٰ صدیقی اور مقصود عرفان کے بار بار تقاضوں کے باوجود حنفی صاحب نے اپنی کوئی بھی تخلیق اِن دونوں رسائل میں چھپنے کے لیے نہیں دی۔ مجھ سے ضرور نوح ناروی پر ایک مضمون پروفیسر قاسم نیازی نے اصرار کر کے لکھوالیا تھا اور اسے زنجیر میں اہتمام سے شائع بھی کیا تھا۔ افسوس کہ زنجیر اور مزاج زیادہ عرصے تک نہیں چل سکے۔ مالی خسارے کے سبب بند ہو گئے اور پھر وہی جمود طاری ہونے لگا۔

اس دوران حنفی صاحب کا تبادلہ سیہور ہو گیا اور میں خود کو بے حد تنہا محسوس کرنے لگا حالاں کہ حنفی صاحب ہفتے کی چھٹی پر اتوار کے دن صبح دس بجے بھوپال آجایا کرتے تھے اور شام کو واپس ہو جاتے تھے۔ ان کے سیہور تبادلے سے وہاں جو کچھ شاعر تھے ان میں ایک نیا جوش پیدا ہو گیا اور وہ حنفی صاحب کی رہنمائی میں سرگرم ہو گئے۔ سیہور کے جو شاعر حنفی صاحب کے آس پاس تھے ان میں خاص طور پر عباس علوی، حیدر شاہین اور فاروق عندلیب وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔

عباس علوی حنفی صاحب کے زبردست ارادت مند تھے جب کہ ڈاکٹر حیدر شاہین کو شاعری کی بساط پر سجانے والے ہی حنفی صاحب ہیں۔ اتوار کے دن حنفی صاحب کا بھوپال آنا ایک معمول بن گیا تھا۔ اس کی خبر بھوپال کے ایک ٹھیکیدار مشتاق کو تھی جن کی پتھروں کی کھدانوں کا کیس جنگلات کے محلمے میں عرصے سے التواء میں پڑا ہوا تھا۔ اتفاق سے ان کی فائل حنفی صاحب کی ٹیبل پر رکھی ہوئی تھی۔ ٹھیکیدار موصوف مشتاق سے میں بھی واقف تھا۔ ایک اتوار کو مشتاق صاحب صبح صبح میرے گھر آگئے اور اپنے کیس کی ساری تفصیلات بتا کر کہا کہ میرا لاکھوں کا کاروبار ڈھیر ہو کر رہ گیا ہے اور اگر مظفر صاحب چاہیں تو فائل پر دو سطریں لکھ کر مجھے ڈوبنے سے بچا سکتے ہیں۔ اس کے عوض نذرانے میں میں حنفی صاحب کو اتنے پھول پیش کر سکتا ہوں کہ آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔ میں نے سوال کیا کیا دس پانچ ہزار؟۔ انہوں نے فوراً ہی کہا جی اس سے بھی کئی گنا زیادہ۔

میری آنکھیں چمک اٹھیں لیکن مجھ میں ہمت نہیں ہوئی کہ حنفی صاحب سے ان کی سفارش کرسکوں۔ میں ان کے قلندری مزاج اور درویشانہ صفات سے اچھی طرح واقف تھا۔ میں جانتا تھا کہ از راہ ہمدردی تو وہ بڑے سے بڑا کام کر دیں گے لیکن اگر انہیں رشوت وغیرہ کا اشارہ بھی مل گیا تو طے ہے کہ مشتاق صاحب ڈوب ہی جائیں گے۔ اب مشتاق صاحب کا بھی یہ معمول بن گیا کہ اتوار کے دن میرے یہاں چلے آتے۔ حنفی صاحب

آتے اور ہم لوگ چائے، بیڑی، سگریٹ کے ساتھ شاعری کی باتیں کرتے رہتے یا ہفتے میں آئے نئے رسائل کی ورق گردانی کرتے رہے۔

حنفی صاحب کے پاس سیہور میں جو رسائل اور کتابیں آتیں، کبھی کبھی وہ بھی مجھے پڑھوانے کے لیے ساتھ لیتے آتے۔ بیچارے مشتاق صاحب ایک کونے میں کرسی پر بیٹھے رہتے۔ نشست برخاست ہوتی تو حنفی صاحب اتنی تیزی کے ساتھ کمرے کے باہر نکل جاتے کہ مشتاق صاحب کو ان کے اٹھنے کا اندازہ بھی نہ ہو پاتا۔ تین اتوار گذر چکے تھے اسی طرح۔ چوتھے اتوار کو حنفی صاحب آئے تو حسب معمول مشتاق ٹھیکیدار میرے کمرے میں جسے میں نے 'مرکز ادب' کا نام دیا ہوا تھا موجود تھے۔ اس بار حنفی صاحب نے آتے ہی نہایت شگفتگی اور زیرلب تبسم کے ساتھ ان کی طرف بڑھتے ہوئے گرم جوشی کے ساتھ مصافحہ کیا اور کہا میں نے آپ کی فائل پر نوٹ لکھ دیا ہے۔ آنے والے منگل کے دن آپ سیہور دفتر آکر اپنی کواریوں (کھدانوں) سے پتھر نکالنے کا آرڈر لے لیجئے۔ میں نے دیکھا مشتاق صاحب بے حد مجنوں کی طرح سر سے پاؤں تک لرزاں ہیں اور ان کا داہنا ہاتھ دائیں جانب کوٹ کی جیب میں جاتا ہے اور خالی واپس آجاتا ہے۔ آج مجھے محسوس ہوا کہ ان کے کوٹ کی جیب پھولی ہوئی کیوں رہتی تھی۔ حنفی صاحب سمجھ چکے تھے۔

ایک لمحے میں وہ ساری شگفتگی جو ابھی اُن کے چہرے پر نظر آرہی تھی، غائب ہو چکی تھی۔ شیام رنگ ماتھے پر شکنیں ابھر آئی تھیں۔ تیوری پر بل ڈال کر مشتاق ٹھیکیدار سے تلخ لہجے میں کہا جناب آپ فوراً یہاں سے چلے جایئے ورنہ میں اپنا لکھا ہوا نوٹ فائل پر بدل بھی سکتا ہوں۔

یہ دور حنفی صاحب کے اور میرے لیے بھی انتہائی صبر آزما اور آزمائشوں کا تھا۔ وہ محکمہ جنگلات میں ملازم تھے اور میں قطعی بے روزگار لیکن خدا کا شکر ہے کہ کردار کی صلابت پر کوئی حرف نہیں آنے دیا۔ بھوپال میں تو کچھ عرصہ یوں بھی گذرا ہے کہ وہ جس مکان میں رہتے تھے وہ سفالہ پوش تھا۔ مٹی کی دیواریں تھیں اور بارش کے موسم میں چھت ٹپکتی تھی۔ دیواروں میں نمی اتر کر فرش اور آنگن میں تمیز نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس مکان میں ان کا کتنا ہی سامان اور نایاب کتابوں کا ذخیرہ ضائع ہو گیا اس کے باوجود انہوں نے کبھی بھی اپنے بانکپن اور سلامت روی میں کوئی فرق نہیں آنے دیا اور تخلیقی عمل جاری رہا۔ وہ حال سے باخبر تھے اور سنہرا مستقبل ان کی نگاہوں کے سامنے تھا۔

آفریں ہے عاصمہ بھابی کی قابلِ رشک رفاقت بردباری، حوصلہ مندی اور تمکنت پر کہ انہوں نے اپنے زندگی کے ہمسفر کے تخلیق کار ذہن پر اپنی مزاج دانی سے جو جلا کی ہے، اس کی مثال بھی اس عہد میں ممکن نہیں۔ میں نے 1946ء سے 'مرکز ادب' بھوپال کے نام سے ایک ادبی ادارہ قائم کیا تھا اور 1952ء سے اسی مرکز

ادب سے کتابوں کی اشاعت کا کام انجام دے رہا تھا۔

کتابوں کی اشاعت میرے شوق دلچسپی اور کتابت طباعت میں نفاست پسندی کو حنفی صاحب پسندیدگی سے دیکھتے تھے۔ سیماب اسکول کے ایک نمائندہ شاعر طرفہ قریشی کا پہلا شعری مجموعہ 'پہلی کرن' کیف بھوپالی کا بھی پہلا مجموعہ 'شعلہ حرف' اور ڈاکٹر شفا گوالیاری ط'نبضِ حیات' مرکز ادب سے شائع ہو چکے تھے۔ ایک روز حنفی صاحب سیہور سے آئے تو انھوں نے کاغذات کا بنڈل مجھے تھماتے ہوئے کہا کہ یہ میرے افسانوں کا مسودہ ہے 'اینٹ کا جواب'۔ اسے آپ مرکز ادب سے شائع کریں گے۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی کہ حنفی صاحب کا پہلا مجموعہ وہ بھی افسانوں کا مرکز ادب سے شائع ہوگا۔

'اینٹ کا جواب' کی طباعت کے کل اخراجات حنفی صاحب نے اپنی جیب سے ادا کئے۔ اس سے پہلے کی کتابیں بھی اسی طرح چھپی تھیں۔ میں تو صرف ترتیب کتابت پروف ریڈنگ اور طباعت کے کاموں کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ یہ میرا شوق بھی تھا اور خود کو مصروف رکھنے کا ایک وسیلہ بھی تھا۔ ان دنوں لیتھو پریس کا رواج تھا۔ لیتھو پریس سے چھپائی اور اس کی کتابت انتہائی دیدہ ریزی دردسری اور جاں سوزی کا کام تھا۔ کاتب کے گھر اور پریس کے چکر لگاتے لگاتے ٹوٹ کر رہ جاتا تھا۔ اسی سبب سے اینٹ کا جواب چھپنے میں ضرورت سے زیادہ تاخیر ہوگئی جس سے حنفی صاحب کو کچھ ناگواری سی ہوئی۔ اس کا اثر اتوار کے دن خوش گپیوں، لطیفوں اور خوش مذاقیوں پر بھی مرتب ہوا لیکن یہ سب عارضی تھا۔

ہمارے مراسم کے درمیان کوئی خلیج حائل نہیں ہوسکی۔ یاد نہیں رہا کہ اینٹ کا جواب ایک سال کے عرصے میں چھپ کر تیار ہوئی یا اس سے کم مدت میں۔ میرے لیے انتہائی مسرت کا وہ لمحہ تھا جب میں نے 'اینٹ کا جواب' کی پہلی مکمل جلد حنفی صاحب کو پیش کی۔ کتاب کا گیٹ اپ کتابت کاغذ اور طباعت دیکھ کر حنفی صاحب بھی بہت خوش ہوئے۔ دیر تک مجھے گلے سے لپٹائے رہے۔ کھنڈوہ میں نئے چراغ اور حنفی صاحب کے دیرینہ رفقائے کار قاضی حسن رضا، قاضی انصار حسن بشیر وغیرہ نے مظہر بھائی کی سرپرستی میں شاندار پیمانے پر 'اینٹ کا جواب' کی تقریب اجراء کا پروگرام آراستہ کیا اور کل ہند مشاعرہ کا اہتمام کیا۔

'اینٹ کا جواب' کے بعد حنفی صاحب نے شآد عارفی سے متعلق ایک اور مضامین کا ضخیم مجموعہ 'نثر و غزلدستہ' اشاعت کے لیے مجھے دیا جس کی تیاری میں زیادہ وقت صرف نہیں ہوا اور اینٹ کا جواب کی طرح چند ہی ماہ میں 'نثر و غزلدستہ' بھی ہند و پاک کے ادبی حلقوں میں ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہیں سے ان کی تصانیف اور تالیفات کی جانب بڑے بڑے پبلشر متوجہ ہوئے۔ ڈاکٹر مظفر حنفی مسلسل جدوجہد کی بے نظیر مثال ہیں۔ وہ ملازمت کے دوران اپنے علمی قد کو بڑھانے کے لیے بھی فکر مند رہے۔ چنانچہ سیفیہ کالج

بھوپال سے انہوں نے امتیازی حیثیت سے اردو میں ایم اے کیا اور پھر اپنے مشفق ترین استاذ محترم مشہور محقق اور مقتدر ادیب پروفیسر عبدالقوی دسنوی کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے اپنے استاد شاد عارفی پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ میں نے کبھی انہیں فارغ نہیں دیکھا۔

بیک وقت ملازمانی مصروفیات تحقیقی مقالے کی تکمیل، شاعری، افسانہ نویسی موصولہ کتابوں پر تبصرے دوسری زبانوں سے ترجمے ہم عصر قلم کاروں کی فرمائشوں پر شخصی مضامین اور رسائل کو اپنی تخلیقات کی باقاعدگی کے ساتھ ترسیل یہ سارے کام ان کے معمولات بن گئے تھے۔ رسائل میں چھپنے والے مضامین پر گہری نظر رکھنا متنازع مباحث پر اپنی دوٹوک اور بے لاگ رائے کا اظہار ہمیشہ ان کی طبیعت کا حصہ رہا۔ انہوں نے کبھی کسی کے ساتھ برتی جانے والی زیادتی کج بحثی یا قدر تراشی کو برداشت نہیں کیا۔ اس ضمن میں مجھے ایک واقعہ کبھی نہیں بھولے گا۔ عمیق حنفی اور سید احتشام حسین کے درمیان ماہنامہ پونم (حیدرآباد) میں بحث چل رہی تھی جسے پڑھ کر ہم لوگ سمجھ رہے تھے کہ عمیق حنفی کا استدلال بے وزن ہے اور وہ بلاوجہ احتشام صاحب سے الجھ رہے ہیں۔

چنانچہ ایک روز شام کو حنفی صاحب ملے تو ایک مضمون میرے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ یہ آپ کے نام سے پونم حیدرآباد میں چھپے گا اس کو کل ہی بھیج دیجیے'۔ اس مضمون کا چھنا تھا کہ عمیق حنفی پٹڑی پر آ گئے اور انہوں نے اندور سے ایک پوسٹ کارڈ میں تحریر کیا کہ میں سمجھ گیا آپ اور ڈاکٹر مظفر حنفی مجھے آسمان جھکانا چاہتے ہیں۔ بحث کے سلسلے میں یہ مضمون اس قدر مدلل تھا کہ پھر عمیق حنفی سے کوئی جواب نہیں بن پڑا اور وہ خاموش ہو گئے لیکن ہم تینوں دوستوں کے مراسم اور دوستی میں کوئی تلخی پیدا نہیں ہوئی۔ اس قسم کے متعدد واقعات ہیں جن میں مظفر حنفی نے ہمیشہ مثبت رول ادا کیا اور بازی مارتے رہے۔ چونکھی لڑنے میں بھی ان کا جواب نہیں۔ انہیں مشاہدات اور تجربات کے نتیجے میں کچھ دوست مظفر حنفی کو ادب کا 'کالا ناگ' کہنے لگے تھے۔

اور اب تنقیدی جلسوں اور مشاعروں کے کچھ لطیف اور دلچسپ واقعات۔ بھوپال میں مرکز ادب، انجمن ترقی پسند مصنفین اور کوثر چاندپوری کا قائم کردہ حلقہ دانشوران ایسے ادارے تھے جہاں پڑھی گئی تخلیقات پر تنقید بھی ہوتی تھی۔ کیف بھوپالی سے متعلق ایک واقعہ ترقی پسند مصنفین کے جلسے کا اوپر لکھ ہی چکا ہوں۔ اب دو واقعات 'حلقۂ دانشوران' سے متعلق ہیں۔ جلسے کی صدارت کوثر چاندپوری فرما رہے تھے اور جلسہ تھا ستیہ پرکاش سنگر کے مکان پر۔ اس جلسے میں ایک کہنہ مشق لیکن بہت ہی منہ پھٹ شاعر ذکری بھوپالی نے اپنی غزل تنقید کے لیے پڑھی۔ غزل کچھ اس طرح تھی؛ اداس ہوتا ہے پاس ہوتا ہے وغیرہ۔

اس کا ایک مصرعہ 'پھول کھل کر گلاس ہوتا ہے' پر کوثر صاحب نے قافیہ بدلنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ آپ کے سب اشعار اچھے ہیں گلاس کا قافیہ آپ کے مزاج کی نمائندگی نہیں کرتا۔ ذکری بھوپالی جلسہ گاہ میں تو

خاموش رہے۔ جیسے ہی مظفر حنفی صاحب اور میں کمرے سے باہر آئے تو انہوں نے ہم دونوں کا ہاتھ پکڑ کر غصے سے کہا دیکھا آپ نے ماں کے....نے گلاس کی....دی۔

ذکری بھوپالی نے دیکھا نہیں کہ دروازے میں پاس ہی کوثر صاحب اور ستیہ پرکاش سنگر بھی کھڑے ہیں۔ ذکری بھوپالی تو ہم دونوں کو اپنا غصہ دکھا کر چلے گئے۔ ہم لوگ جو دوبارہ کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ کوثر چاند پوری صاحب کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا ہے اور مارے غصے کے برا حال ہے۔ ستیہ پرکاش سنگر سے انہوں نے سوال کیا کہ ایسے آدمی کو حلقۂ دانشوران میں کس نے مدعو کیا تھا؟ کہ اتنے میں دیکھا کہ ڈاکٹر شفا گوالیاری جوہری دروازے کے پاس ہی اوٹ میں بیٹھے تھے، چپکے سے باہر نکل گئے۔

حلقۂ دانشوران کا ہی ایک دوسرا واقعہ۔ یہ تنقیدی جلسہ بھی ہمایوں منزل میں ستیہ پرکاش سنگر کی رہائش گاہ پر ہو رہا تھا۔ اس میں ایم عرفان کئی ماہ سے نہر سوئیز پر اپنا طویل مضمون سناتے آرہے تھے اور سارا وقت انہیں کی نذر ہو جاتا تھا۔ اس سلسلے کو منقطع کرنے کی کوئی تدبیر سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ یہ اتفاق ہی تھا کہ جلسے میں ایک اور 'بھوپالی دادا' آصف شاہمیری بھی موجود تھے۔ واضح ہو کہ ایم عرفان اور آصف شاہمیری کو سارا بھوپال ہی دادا کہتا تھا۔ ایم عرفان کا مقالہ قریب دو گھنٹے میں ختم ہوا تو آصف شاہمیری نے ازخود اپنی کہانی یہ کہہ کر پڑھنا شروع کردی کہ نہر سوئز پر تو تنقید نہیں ہو رہی ہے اس لیے میں اپنی کہانی تنقید کے لیے پیش کرتا ہوں۔ بھلا دادا کو کون روک سکتا تھا کہانی پڑھنے سے؟ کہانی شروع ہوئی اور ختم ہوگئی۔ تنقید بہر حال ہوئی ہی تھی۔ کہانی سننے والوں کو کچھ یاد رہا ہو نہ یاد رہا ہو، یہ ضرور یاد رہا کہ ابتدائی حصے میں جو ایک گونگے کا کردار ہے وہ کہانی سے اچانک غائب ہو جاتا ہے۔ کسی نے دادا کے تلفظ پر اعتراض کیا۔ کسی نے کہا کہ اس میں سرے سے کہانی پن ہی نہیں ہے۔

ابراہیم یوسف کوثر چاند پوری، قمر جمالی، زہرہ جمال، قمر انشاء وغیرہ کی رائے تھی کہ کہانی کا کوئی پلاٹ ہی نہیں ہے۔ دادا آصف شاہمیری جواب دیتے دیتے پریشان ہو چکے تھے۔ بار بار پیشانی سے پسینہ پونچھتے جاتے تھے۔ غصے کا یہ عالم تھا کہ منہ سے جھاگ نکل رہے تھے کہ مظفر حنفی نے آہستہ سے کہا اور وہ گونگا کہاں چلا گیا۔ ہم دونوں سے آگے گھر ومیاں (جی ایم نفی) بیٹھے تھے، انہوں نے زور سے سوال جڑ دیا' دادا! وہ گونگا کہاں گیا؟ دادا کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ یوں بھی گھر ومیاں اور دادا آصف شاہمیری میں بنتی نہیں تھی۔

دادا نے تقریباً چیختے ہوئے انتہائی حقارت سے کہا تیری ماں کے....میں گیا۔ دادا کا گالی بکنا تھا کہ جلسے میں موجود خواتین زہرہ جمال، قمر انشاء وغیرہ اپنے ڈوپٹوں اور ساڑیوں کے پلو منہ میں ٹھونس کر ہال سے بھاگ کر زنان خانے میں چلی گئیں۔ کوثر چاند پوری اور ستیہ پرکاش سنگر کی جو حالت ہوئی ہے بیان سے باہر ہے

جب کہ دوسرے لوگ قہقہے لگاتے ہوئے باہر نکل رہے تھے۔ اس کے بعد حلقۂ دانشوران کے تنقیدی جلسوں کا ایجنڈا خود کوثر چاندپوری نے ترتیب دینا شروع کر دیا تھا۔

ڈاکٹر مظفر حنفی صاحب کے مزاج میں جو بے باکی، تیکھاپن اور شعلگی ہے، وہ روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے تلخ تجربات منافقت کے بڑھتے ہوئے رجحان اور عمومی طور پر دوستوں میں غیبت کے رویے کا نتیجہ ہے۔ انہوں نے اپنے استاذ شادؔ عارفی کی زندگی سے بھی اثرات قبول کئے ہیں۔ مظفر حنفی کی تقریر اور تحریر میں طنز کی جو کاٹ ہے وہ تلوار کی دھار سے بھی زیادہ تیز ہے۔

انہوں نے 'شیو' کی طرح 'سمندر منتھن' کی نیت سے جو زہر پیا ہے اس کی تلخی ان کے سارے وجود میں خون بن کر دوڑ رہی ہے۔ زندگی کے سفر میں وہ لوہے کے راستے سے بھی گذرے ہیں اور 'پانی کی زبان میں' گفتگو کرتے ہوئے 'کھل جا سم سم' کہہ کر 'چل چنبیلی باغ میں' داخل ہوئے ہیں۔ وہ فرش گل پر محو خرام ہیں لیکن کسی نے ان کے تلووں میں سلگتے ہوئے آبلوں کو شاید نہیں دیکھا۔

جاں نثار اختر نے جب 'فن اور شخصیت' کا جاں نثار اختر نمبر زیر ترتیب تھا کہا تھا کہ عشرت قادری صاحب یوں ہی یہ منزل کسی کو نہیں مل جاتی۔ اس ایک 'یوں ہی' میں جو گہری معنویت ہے، اس کی اہمیت اور تہ داری کو موجودہ عہد کا کوئی ادب فروش کیونکر پا سکتا ہے؟ (بشکریہ مژگاں 2006، کتابی سلسلہ-1، صفحہ:75-85)

...

ڈاکٹر عابد رضا بیدار

پروفیسر محمد اقبال

(سابق پروفیسر اور وائس چانسلر، جامعہ ہمدرد، نئی دہلی)

زمانۂ طالب علمی میں 'عابد رضا بیدار' نام تو احقر کے لیے نیا نہیں تھا لیکن موصوف کے بارے میں بس اتنا ہی جانتا تھا کہ یہ صاحب پٹنہ (بہار) کی ایک پبلک لائبریری کے منتظم اعلیٰ ہیں۔ یہ کوئی بہت اہم یا منفرد بات نہ تھی کیوں کہ ہر ادارے کا کوئی نہ کوئی سربراہ تو ہوتا ہی ہے۔ قیام علی گڑھ کے دوران ایک مرتبہ موصوف کی مرتب کردہ کتاب 'ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل' نگاہ سے گزری تو احساس ہوا کہ اردو ادب سے بھی موصوف کا کچھ تعلق ہے، برسہا برس تک معلومات کا دائرہ بس یہیں تک محدود رہا، سائنس کا طالب علم ہونے کے ناطے احقر کو اردو ادیبوں کے بارے میں جاننے کا زیادہ شوق بھی نہیں تھا۔

بہر حال سنہ 1990ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو خیر باد کہہ کر جامعہ ہمدرد آیا تو یہاں کی مرکزی لائبریری میں بیدار صاحب کی چند مزید تصنیفات کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، اور تب ان کے دل کی تڑپ، ذہن کی پرواز اور قلم کی روانی کا بھی کچھ اندازہ ہو سکا۔ ان کی تحریروں میں بلا کی بے ساختگی نظر آئی اور طرزِ بیان یکسر جداگانہ محسوس ہوا۔ وہ مروّجہ تحریری آداب وقواعد کے چکر میں بالکل نہیں پڑتے، جن الفاظ میں وہ سوچتے ہیں انہیں کو من وعن کاغذ پر اتار دیتے ہیں، شاید نظر ثانی کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے اور اس کی کوئی ضرورت بھی نظر نہیں آتی۔

ایک طرح سے وہ اپنے دل کے دریچے کو براہِ راست آپ کے سامنے کھول دیتے ہیں، یعنی من کی بات پیش کرنے کا ہنر انہیں آتا ہے جو کہ ہر ایرا غیرا کے بس کی بات نہیں ہے۔ تصنّع آمیز خطاب کبھی بھی 'من کی بات' نہیں بن سکتا، نشر واشاعت اور ذرائع ابلاغ کی مدد سے بھی نہیں۔ بیدار صاحب کی تحریر ایک گفتگو معلوم ہوتی ہے، تصنّع اور تکلّف سے بالکل پاک، جس پر بعض اوقات 'خود خطابی' کا گمان ہوتا ہے۔ آپ ان کا کوئی بھی مضمون اٹھالیں اور خود فیصلہ کریں کہ میرے اس خیال میں کتنی سچائی ہے۔

جامعہ ہمدرد میں قیام کے دوران احقر کو نہ صرف بیدار صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا بلکہ ان کی رفاقت سے فیض یابی کا بھی کچھ موقع مل گیا۔ ابتدائی دور میں علمی اعتبار سے جامعہ ہمدرد ایک بونوں کی بستی تھی، یہاں کا محض فارمیسی کالج مشہور تھا، باقی تمام سرگرمیاں ابتدائی مراحل میں تھیں نہ تو تحقیق واشاعت کا کوئی ماحول تھا اور نہ ہی لوگ محنت ومشقت میں یقین رکھتے تھے۔ گنتی کے چند مخلص لوگ تھے جن کی کوششوں سے بانی جامعہ 'حکیم عبدالحمید' کی پر جوش رہنمائی میں کاروانِ جامعہ منزلِ مقصود کی جانب گامزن تھا، بہر حال وقت گذرنے

کے ساتھ ساتھ بہت سے لائق وفائق حضرات اس کارواں میں شامل ہوتے گئے۔ان میں سے جن چند لوگوں نے اپنی منفرد خصوصیات کے باعث احقر کو متاثر کیا، ان میں ڈاکٹر عابد رضا بیدارؔ کا نام کافی نمایاں ہے۔

بیداری کا یہ سورج جامعہ ہمدرد کے افق پر کئی بار نمودار ہوا۔ دراصل حکیم عبدالحمید کی خواہش تھی کہ جامعہ کے شعبۂ مطالعاتِ اسلامی میں کچھ ایسے انقلابی کام ہوجائیں جو ملتِ اسلامیہ کے بکھرتے ہوئے شیرازہ کو سنبھالنے میں معاون ثابت ہوں، جن سے مسلمانوں میں مسلکی تفرقات کی بیخ کنی ہوسکے؛ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان چلی آرہی بہت سی بے بنیاد غلط فہمیوں کو جو بسا اوقات نفرت وعداوت پر منتج ہوتی ہیں، ختم کیا جاسکے۔ 1992ء میں جب پروفیسر رشید الظفر کو جامعہ ہمدرد کی سربراہی سونپی گئی تو اس سلسلے میں خاصی ہلچل دکھائی دی۔ انھوں نے شعبۂ اسلامیات اور اس سے منسلک عظیم الشان لائبریری کو صحیح سمت میں فروغ دینے کے لیے کچھ لوگوں کو علی گڑھ سے بلایا اور ساتھ ہی بیدار صاحب کو بھی مدعو کیا۔ جامعہ ہمدرد میں بیدار صاحب کے آنے کی خبر پاکر احقر کو بے حد خوشی ہوئی۔ یہ احساس ہی انتہائی فرحت بخش تھا کہ ہماری سوئی ہوئی قوم میں کوئی بیدار بھی موجود ہے۔

مسلم مسائل اور تعلیمی سروے سے متعلق کچھ منصوبے ہمیشہ حکیم صاحب کے ذہن میں کلبلاتے رہتے تھے جنھیں روبہ عمل لانے کے لیے وہ بے تاب تھے۔ اس ضمن میں بیدار صاحب سے بھی ان کی کافی امیدیں وابستہ تھیں۔ ایک جگہ فرماتے ہیں:

'وہ اصحاب جن سے میں ان پروجیکٹس پر کام کرکے تکمیل تک پہنچا دینے کی امید لگائے بیٹھا ہوں اور جن کو میں نے اپنے اعتماد میں لے رکھا ہے، وہ ہمارے وائس چانسلر پروفیسر رشید الظفر اور خدابخش لائبریری پٹنہ کے ڈاکٹر عابد رضا بیدار ہیں۔ بیدار صاحب سے تو میں نے ایک بار ان کی جائے قیام پر خاصی کھل کر باتیں کیں اور ان پروجیکٹوں میں مضمر اثرات کو بھی واضح کرنے کی کوشش کی، لیکن اس کوشش کا عملی نتیجہ اب تک سامنے نہیں آیا۔ بس وعدے ہی وعدے ہوتے رہے۔ حال ہی میں، میں نے ان کو جو خط لکھا ہے وہ میری بے چینی کی منہ بولتی تصویر ہے۔ اس خط میں، میں نے کئی متبادل تجویزیں بھی پیش کیں اور یہاں تک لکھ دیا کہ وہ فی الحال دو ماہ کے لئے میرے ساتھ لگ جائیں تاکہ میں ان پروجیکٹوں کی ابتدائی چولیں تو بٹھادوں۔ کاش ان کے دل اور دماغ میں یہ بات کسی نہ کسی طرح اتر جائے کہ اب تک انھوں نے اپنی زندگی میں جو کام کیے ہیں وہ پیش نظر پروجیکٹوں پر کام اور ان کی تکمیل کے سامنے ماند ہوکر رہ جائیں گے...اب رہا ہمارے وائس چانسلر صاحب کا مسئلہ، ان سے میں ان پروجیکٹوں کے بارے میں کبھی کبھی باتیں کرتا رہا ہوں، لیکن وہ بھی ان کے لیے اب تک اپنے آپ کو یکسو نہیں کرسکے۔ اس کام کے ذریعہ ہمارے وائس چانسلر صاحب چار پانچ سال کے اندر اندر کہاں سے کہاں پہنچ جائیں گے۔ اس کا اندازہ وہ میری طرح کرلیں تو معلوم نہیں کیا کیا قربانیاں

کرنے کے لیے تیار ہو جائیں... میری پیاری والدہ صاحبہ بچپن میں میری مجنونانہ باتوں کی وجہ سے مجھے 'جن' کہتی تھیں۔ وہ 'جن پنا' مجھ میں اب بھی باقی ہے لیکن بڑھاپے کی وجہ سے ذرا سہارے کی ضرورت پڑنے لگی ہے۔ اگر پروفیسر رشید الظفر اور ڈاکٹر عابد رضا بیدار جن میں یہ 'جن پنا' تھوڑا بہت موجود ہے، مجھ کو اپنے ساتھ لے لیں یا میں ان کے ساتھ لگ جاؤں تو ہم تینوں تین چار سال ہی میں وہ کام کر لیں گے، جو 'جن' ہی کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ میری مہلت کے دن بھی تو اب گنے چنے ہی رہ گئے ہیں۔'

حکیم صاحب کے پاس تو کچھ دن نکل بھی آئے لیکن پروفیسر رشید الظفر کے دن بہت ہی گنے چنے ثابت ہوئے، دورۂ سعودی عرب کے دوران نومبر 1994ء میں وہ اچانک ایک کار حادثے کا شکار ہو گئے اور حکیم صاحب کے جوش جنوں پر گویا اوس پڑ گئی۔ ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے بھی عرصۂ دراز تک عملی بیداری کا کوئی ثبوت نہ دیا۔ 1996ء میں کولہے کی ہڈی ٹوٹ جانے کے باعث حکیم صاحب کی چابکدستی کو بھی گرہن لگ گیا، 1998ء میں چھوٹے بھائی حکیم محمد سعید کی کراچی میں شہادت کے بعد تو ان کی ہمت بالکل ہی جواب دے گئی اور 22 جولائی 1999ء کو حکیم صاحب بھی بہت کچھ کر دکھانے کے بعد اور مزید کچھ ارمانوں کو دل میں لیے ہوئے، اس دار فانی سے رخصت ہو گئے (1)۔

حکیم صاحب کے انتقال کے بعد جامعہ ہمدرد کے چانسلر کی حیثیت سے سید حامد صاحب کو منتخب کیا گیا۔ انہوں نے بیدار صاحب کو خط لکھا کہ حکیم صاحب تو چلے گئے، اب ہمیں ان پر کچھ کام کرنا ہے۔ نئی دہلی آ جایئے، بیدار صاحب نئی دہلی آئے بھی، شاید وزیٹنگ پروفیسر کی حیثیت سے، کچھ کام شروع بھی کیا لیکن بیل منڈھے نہیں چڑھ پائی اور کوششوں کا کوئی ٹھوس نتیجہ سامنے نہ آ سکا۔ حالاں کہ بیدار صاحب کا کہنا تھا کہ مولانا آزاد، ڈاکٹر ذاکر حسین اور حکیم عبدالحمید پر لکھنے لکھانے کی ان کی دیرینہ خواہش رہی ہے۔ مولانا پر ایک کتاب 'مولانا ابوالکلام آزاد' اور ذاکر صاحب پر ایک کتاب 'متاع فقیر' وہ پہلے ہی تحریر کر چکے تھے، لیکن حکیم صاحب کے تعلق سے ان کی خواہش ہنوز تشنۂ تکمیل تھی۔

برسوں بعد غالباً 2007 میں ایک بار پھر یہ شور بلند ہوا کہ جامعہ ہمدرد میں بیداری نے پاؤں پسارے ہیں، پتہ چلا کہ اس مرتبہ موصوف لنگر لنگوٹ کس کے کافی تیاری کے ساتھ میدان عمل میں اترے ہیں۔ شاید یہ سید حامد کے مسلسل دباؤ اور اصرار کا نتیجہ تھا۔ بہر حال اس مرتبہ تحریک بیداری کے اثرات غیر متوقع طور پر خاکسار تک بھی آ پہنچے۔ سید حامد صاحب نے طے کیا کہ ڈاکٹر عابد رضا بیدار کا قیام مستقل طور پر یونیورسٹی کے مہمان خانہ 'اسکالرز ہاؤس' میں رہے گا۔ حکیم صاحب سے متعلق تمام دستاویزات اور اسٹینوگرافر یا ٹائپسٹ وغیرہ کی مطلوبہ خدمات حسب ضرورت یونیورسٹی ان کو فراہم کرے گی اور حیاتِ حمید پر لٹریچر کی تیاری کے اس منصوبے کی مجموعی دیکھ بھال خاکسار کے ذمہ رہے گی۔

اس ضمن میں مجوزہ منصوبے کے خدوخال کی وضاحت کے لیے ایک میٹنگ رکھی گئی جس میں چانسلر سیّد حامد، وائس چانسلر شمیم احمد، ڈاکٹر عابد رضا بیدار اور احقر نے شرکت کی۔ بیدار صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ ان کے عزائم اور خیالات جان کر مجھے محسوس ہوا کہ عمر رسیدہ جسم کے اندر ایک نوجوان اور توانائی سے بھرپور ذہن انگڑائیاں لے رہا ہے جو بہت کچھ کر گذرنے کے لئے بے تاب ہے۔ کچھ عرصہ بعد جب ڈاکٹر غلام نبی قاضی جامعہ ہمدرد کے وائس چانسلر بنے تو احقر کچھ دنوں کے لیے سعودی عرب چلا گیا۔ ڈیڑھ برس بعد واپسی ہوئی تو بیدار صاحب کو پوری تندہی سے اپنے کام میں مصروف پایا۔

اب تک ہوئے کام کا جائزہ لینے کے لیے حامد صاحب نے پھر وہی چار لوگوں کی میٹنگ طلب کی، اس بار وائس چانسلر کی حیثیت سے ڈاکٹر شمیم احمد کی جگہ ڈاکٹر جی این قاضی موجود تھے۔ دورانِ گفتگو یہ بات سامنے آئی کہ یونیورسٹی انتظامیہ کی جانب سے بیدار صاحب کو مطلوبہ تعاون نہیں مل سکا ہے۔ اسی دوران جب قاضی صاحب نے حسب عادت اپنی افسری کا مظاہرہ کرنا چاہا تو یہ حقیقت بھی عیاں ہوئی کہ بیدار صاحب کے معمر جسم میں ریڑھ کی ہڈی کافی مضبوط ہے اور انھیں بلاوجہ حالت رکوع میں رہنے کی یا غیر ضروری تحکمانہ لب ولہجہ برداشت کرنے کی عادت نہیں ہے، انجام کار قاضی صاحب کو جلد ہی آدمیت کا جامہ پہننا پڑا۔ بیدار صاحب کی ان تمام خوبیوں سے واقف ہونے کے بعد احقر کو ان کے ہاتھ پر بیعت کر لینے میں کسی تأمل کی کوئی گنجایش نظر نہیں آئی۔

بیدار صاحب کو صبح کے اوقات چہل قدمی کی عادت تھی۔ ٹہلتے ٹہلتے بعض اوقات وہ احقر کے غریب خانہ تک آجاتے تھے اور ناچیز کو ان کی رفاقت کے چند لمحات میسر ہو جاتے تھے۔ احقر کی رہائش تیسری منزل پر تھی۔ کبرسنی کے عالم میں بھی انھیں تیزی سے سیڑھیاں چڑھتے دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی تھی۔ چائے کی چسکیاں لیتے ہوئے کبھی کبھی وہ کچھ تعریفی جملے بول جاتے تھے، مثلاً 'اوہو' یہ تو بالکل مولانا آزاد والی چائے ہے، یا 'لیموں' کی چائے تو بہت پی ہے لیکن اس چائے کی بات ہی کچھ اور ہے، وغیرہ۔

ایسے اقوال زرّیں گوش گذار ہونے پر میری اہلیہ پھولے نہیں سماتی تھیں۔ سیدھی سادی خاتون خانہ کو شاید یہ اندازہ نہیں تھا کہ آداب ملاقات میں کچھ رسمی جملے بھی شامل ہوتے ہیں۔ جن کا عام طور پر کوئی مطلب نہیں ہوتا ہے۔ ویسے اُس بے چاری کی بھی کیا خطا، جملوں کا سحر ہی عجیب ہوتا ہے۔ گذشتہ دنوں تو ہندوستان کے سبھی شہری ایک جملے کا شکار ہو کر 'پندرہ لاکھ' کا انتظار کر رہے تھے۔ جو کچھ حلقوں میں آج تک برقرار ہے۔ بہر کیف کبھی طویل عرصہ تک بیدار صاحب تشریف نہ لاتے تو ناچیز کو یاد دلایا جاتا تھا کہ 'بہت دنوں سے بیدار صاحب نہیں آئے ہیں، ان کو چائے پر مدعو کر لیا کرو۔ پورے جامعہ ہمدرد میں ایک وہی تو آپ کے ہمدرد نظر آتے ہیں'۔

کئی برس کی مسلسل کوششوں کے نتیجہ میں بیدار صاحب نے حکیم صاحب کی تحریریں، ان کی خط و کتابت

اور ان کے بارے میں دوسروں کے لکھے ہوئے درجنوں مضامین اکٹھا کر کے ان کو ضروری ترمیم و تنسیخ اور ادارتی تصحیح کے بعد ایک لڑی میں پرونے کا مشکل کام مکمل کیا اور آخر کار 2011ء میں تین ضخیم اردو کتابیں یعنی حیاتِ حمید: حکیم عبدالحمید کی سرگذشتِ حیات، 'حمید نامے اور احباب نامے'، 'عبدالحمید: طبیب نہیں حکیم' شائع ہوئیں۔ اس کے علاوہ ایک انگریزی کتاب بھی منظر عام پر آئی، جس کا نام ہے:

Hakim Abdul Hameed: A Role Model for Leaders of Change in *India*

یہ مستند دستاویزات ان شاء اللہ رہتی دنیا تک حکیم صاحب کی شخصیت، فہم و فراست اور خدمات پر روشنی ڈالتی رہیں گی۔ اس زبردست کام کے لیے بیدار صاحب نے ہمدرد یا جامعہ ہمدرد سے کوئی اجرت نہیں لی، بلکہ مسودات کی ٹائپنگ وغیرہ پر خود اپنی جیب سے ایک خطیر رقم خرچ کر ڈالی جس کا نہ تو کبھی کسی سے تذکرہ کیا اور نہ ہی اس ضمن میں یونیورسٹی سے کوئی مطالبہ کیا۔

مورخین کا دعویٰ ہے کہ ڈاکٹر عابد رضا 4 فروری 1933ء کو ریاست اتر دیش کے شہر رام پور میں بیدار ہوئے تھے۔ اس عزم صمیم کے ساتھ کہ زندگی بھر نہ چین سے بیٹھوں گا، نہ بیٹھنے دوں گا۔ پہلے تو خالق حقیقی نے ہی ان کے فراخ شانوں پر نصب کرنے کے لیے ایسی کھوپڑی کا انتخاب کیا جس میں تا حیات متحرک اور فعال رہنے کا غبار بھرا ہوا تھا، پھر اس پر طرہ یہ کہ زندگی کے ہنر سیکھنے کا آغاز موصوف نے کارخانۂ سرسید سے کیا جہاں بیدار و ہوشیار کی تو بات چھوڑیے، ہم جیسے خرفہم افراد کے کند اذہان کو بھی صیقل کر دیا جاتا ہے۔ فرزندان علی گڑھ کی سدابہار صحبت و رفاقت کے حوالے سے موصوف اشکؔ رامپوری کی زبانی یوں فرماتے ہیں:

اک دن وہ مل گئے جو سر رہ گذر کہیں
پھر دل نے بیٹھنے نہ دیا عمر بھر کہیں (2)

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بیدار صاحب نے پہلے اردو میں اور پھر اسلامیات میں ایم اے کیا، بعد ازاں 'مصر میں قومی تحریک کا ارتقاء' کے زیر عنوان تحقیقی کام مکمل کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے علاوہ لائبریری سائنس میں گریجویشن اور خارجی امور میں ڈپلومہ پروگرام مکمل کیا۔ اس طرح 1953ء سے 1959ء تک کا وقت موصوف نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں گذارا، اس کے بعد نئی دہلی کا رخ کیا اور وہاں نیاز فتحپوری، عتیق صدیقی اور حیات اللہ انصاری جیسے عظیم صحافیوں کی معیت میں کئی برس تک اخبار نویسی سے وابستہ رہے۔

سنہ 1964-1972 تک جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے اسکول آف انٹرنیشنل اسٹڈیز میں لیکچرر کی حیثیت سے کام کیا۔ سنہ 1972ء میں وہ پٹنہ کی معروف خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری کے ڈائرکٹر مقرر ہوئے اور یہیں سے ان کے تحقیقی اور تصنیفی کاموں کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ موصوف کے دورِ اقتدار میں خدابخش لائبریری کی کایا پلٹ ہوگئی، فرض بیزار ملازمین کو کام کرنے پر مجبور ہونا پڑا، نماز کے بہانے گھنٹوں غایب رہنے

والوں کو اپنی نمازوں کے اوقات متعین کرنا پڑے، اخبارات میں اشتہار کی قیمت گیارہ سو کی جگہ گیارہ ہزار دکھلانے والوں کو اپنا حساب دہرانا پڑا، جن کی عمر کے کاغذات میں دسیوں برس کا فرق پایا جاتا تھا انہیں اپنی حقیقی تاریخ پیدائش کا پتہ لگانا پڑا، چھوٹے بڑے سبھی ملازمین کو پابندیٔ اوقات پر کاربند ہونا پڑا۔ پھر ایسے میں مخالفت کا بگل تو بجنا ہی تھا۔

اسی دوران اے این سنہا انسٹی ٹیوٹ (پٹنہ) میں فہم قرآن سے متعلق پروفیسر محمد محسن کی تحریر کردہ ایک کتاب کی تقریب اجرا کا انعقاد ہوا۔ اس موقع پر کی گئی تقاریر کا موضوع یہ تھا کہ کیا قرآن کریم کی ہدایات کو سمجھنے کے لیے مفسرین پر انحصار ضروری ہے؟ مقررین میں بیدار صاحب بھی شامل تھے۔ یہ تو ناممکن ہے کہ مذہب کے بارے میں بات کی جائے اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف رائے اور جارحیت کا مظاہرہ نہ ہو۔

لہٰذا افواہوں اور الزامات کا بازار گرم ہوا۔ اسلام کے خودساختہ ٹھیکیدار میدان کارزار میں اتر آئے۔ چند ایسے اخباری نمائندوں نے بھی مورچہ سنبھال لیا جنھیں شکایت تھی کہ ایک کل ہند مشاعرے میں شرکت کے دعوت نامے نہ دے کر بیدار صاحب نے ان کے بنیادی حقوق کو پامال کرنے کی جسارت کی تھی۔ لہٰذا تقاریر کے متن سے حسب منشا نتائج اخذ کر کے اور بیدار صاحب کی تصنیف 'سیما کی تلاش' سے آدھے ادھورے اقتباسات نقل کر کے اخبارات میں گمراہ کن مضامین شائع کئے گئے اور یہ تأثر دینے کی کوشش کی گئی کہ بیدار صاحب اسلام مخالف افکار کے حامی اور قابلِ اعتراض سرگرمیوں کے مرتکب ہیں۔

اللہ سلامت رکھے ہمارے علمائے دین کو کم از کم اپنے چند مخصوص فرائض کو یہ بخوبی پہچانتے ہیں۔ تفہیم دین یا تبلیغ دین کے تعلق سے تو آج بحمداللہ کافی مواد مطبوعہ شکل میں دستیاب ہے، اللہ جسے توفیق دے وہ اسلامی ادب کے اس عظیم ذخیرے سے استفادہ کر سکتا ہے، لیکن کچھ کام ایسے ہیں جنھیں محض علمائے کرام ہی انجام دے سکتے ہیں، مثلاً ملت کی فلاح کے لیے چندے اور نذرانے اکٹھے کرنا، گنڈے تعویذ اور جھاڑ پھونک کے ذریعہ قوم کی مشکلات کو رفع کرنا اور ممکنہ ابہام سے ملت کو محفوظ رکھنے کے لیے وقتاً فوقتاً فتوے جاری کرنا وغیرہ۔

لہٰذا اس موقع پر بھی آخرالذکر ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے کچھ فرض شناس علماء نے بیدار صاحب کو اسلام کی چہار دیواری سے باہر دھکیل دینے میں کسی کوتاہی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ لیکن بحث و مباحثہ کے ایک طویل دور کے بعد جب زیر بحث کتاب کا پورا متن اخبار میں شائع ہوا تو کسی کو کوئی قابل اعتراض نکتہ نظر نہ آسکا اور مخالفین کو منہ کی کھانی پڑی۔ بیدار صاحب ہر سرد و گرم کو صبر و سکون کے ساتھ برداشت کرتے گئے۔ شاید ان کی نظر ہمیشہ اس پیغام پر مرکوز رہی کہ:

تندیٔ باد مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہیں تجھے اونچا اڑانے کے لیے

لہٰذا تمام تر فتنہ سامانی کے باوجود وہ ٹس سے مس نہ ہوئے بلکہ ان کی اڑان دِن بہ دِن اونچی ہی ہوتی گئی۔ ان کی سربراہی میں خدابخش لائبریری کو بین اقوامی شہرت حاصل ہوئی۔ انھوں نے انتہائی اہم موضوعات پر عالمی سطح کے متعدد سیمینار منعقد کئے جن میں بہت سے غیر ملکی مندوبین کی بھی شرکت رہی۔ وہ خود بھی اپنے تحقیقی کاموں کے تعلق سے انگلینڈ، اسکاٹ لینڈ، روس، فرانس، مصر، ترکی، ایران، دوبئی، سعودی عرب، پاکستان، آذربائیجان اور ازبکستان جیسے ممالک میں گھومے پھرے اور چہار دانگ عالم میں خدابخش کی نمائندگی کی۔ ان دنوں 'ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل' پر مرکوز ایک سیمینار کا بڑا شہرہ ہوا۔ اُس میں پیش کردہ مقالات بعد میں اسی عنوان سے کتابی شکل میں بھی شائع کیے گئے۔ سید حامد صاحب کے اُس مقالہ کا بھی اسی سیمنار سے تعلق ہے جس کا محض نصف حصہ انھوں نے تحریری شکل میں پڑھا تھا اور بقیہ نصف فی البدیہہ پیش کیا تھا لیکن نہ اُس وقت سامعین کو اور نہ ہی بعد میں قارئین کو معیار بیان میں کہیں کوئی فرق محسوس ہوسکا۔

25 سالہ محنت ومشقت کے نتیجے میں خدابخش لائبریری کو جدید تکنیکی سہولیات سے آراستہ کرنے کے بعد بیدار صاحب نے 1996ء میں پٹنہ کو خیر باد کہا اور اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو کر وطن (رام پور) واپس آگئے۔ پھر کچھ برس بعد 2007ء میں سید حامد صاحب کی صدا پر لبیک کہتے ہوئے وہ نئی دہلی آگئے اور تن من دھن سے حکیم عبدالحمید (مرحوم) سے متعلق تصنیف وتالیف کے کام میں جُٹ گئے۔ رام پور میں اپنے چند سالہ قیام کے دوران بھی وہ خالی نہیں بیٹھے۔ انہیں کوئی ایسا نسخہ ہاتھ لگ گیا تھا جو ٹی بی کے مریضوں کے لیے تیر بہدف تھا۔ لہٰذا اس عرصہ میں تقریباً آٹھ سو مریض ان کے ہاتھوں شفایاب ہوئے۔

جامعہ ہمدرد میں حیات حمید پروجیکٹ سے فراغت پانے کے بعد بیدار صاحب علی گڑھ چلے گئے جہاں مسلم یونیورسٹی میں صد سالہ تقریبات کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ موصوف کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے وائس چانسلر جنرل ضمیر الدین شاہ نے 2016ء میں ایک 'مرکز برائے تفہیم بین المذاہب' قایم کیا جس کے تحت بیدار صاحب کی سرپرستی میں متعلقہ موضوعات پر کئی بیش قیمت کتابچے شائع کئے گئے، سر سید احمد خان اور ان کے رفقاء کی متعدد پرانی تحریروں کو بھی اعلیٰ درجہ کی کتابت وطباعت سے مزین کر کے ازسرنو شائع کیا گیا۔ غرضیکہ موصوف کی زندگی میں ٹھہراؤ کی کیفیت کبھی نہیں دیکھی گئی، وہ ہمیشہ کچھ نیا کرنے کے لیے کوشاں نظر آئے۔ ایک مختصر تحریر میں انہوں نے اعتراف بھی کیا کہ فطری طور پر وہ تبدیلی کے دلدادہ ہیں (3)۔

جب کرنے کو کچھ نہ بچا تو دنیا بھر میں بکھری ہوئی علیگ برادری کو ذہنی غذا فراہم کرنے کی غرض سے موصوف نے مسلم یونیورسٹی سے متعلق شخصیات و واقعات پر مشتمل ایک الیکٹرانک مجلّہ علی گڑھ ڈایاسپورا (Aligarh Diaspora) کے نام سے جاری کرنے کا پلان بنا ڈالا اور دسمبر 2021 سے اس کی اشاعت کا آغاز بھی ہو چکا ہے۔ اس کا کچھ حصہ انگریزی میں اور بیشتر اردو میں ہوتا ہے۔ خدا کرے موصوف کی اس محنت

کو سراہنے والے کچھ قدردان دکھائی دینے لگیں ورنہ جس طرح اردو رسالوں کے مدیران گرامی کے لیے بداخلاق ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح اردو قارئین کے لیے بھی مطالعہ کے تئیں بے حس اور بے ذوق ہونا اب کچھ لازمی سا ہو گیا ہے۔

بیدار صاحب کی نئی پرانی تصنیفات و تالیفات کا سلسلہ کافی دراز ہے جسے دیکھ کر ان کے ہمہ جہت رجحانات کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ حالاں کہ نہ تو ایک طبقۂ مخصوص کے مانند ڈاڑھی، ٹوپی اور جبہ و دستار سے ان کا کوئی واسطہ رہا اور نہ ہی انہوں نے اردو بولتے ہوئے عربی انداز میں کبھی 'ح' اور 'ع' کو حلق کے نچلے حصہ سے نکالنے کی کوشش کی، لیکن کام وہی کر دکھایا جس کی توقع عام طور پر اور بجا طور پر اس طبقۂ مخصوص سے کی جاتی ہے۔ ان کی توجہ ہمیشہ بین مذاہب اور بین مسالک افہام و تفہیم اور اتحاد و بھائی چارے پر مبذول رہی۔

ان کی تصانیف مثلاً 'ہندوستانی مسلمان قیادت کی تلاش میں'، 'قومی تہذیب اور ہندوستانی مسلمان'، 'سیما کی تلاش'، 'تلاش کی سیما'، 'شیعہ سنّی دوریاں نزدیکیاں اور عصر حاضر میں اسلام سے متعلق دستاویزات' وغیرہ اس حقیقت کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ انھوں نے ہندوستان میں اسلام کے موضوع پر 20 کتابیں، ہندو دھرم کا احاطہ کرتی ہوئی درجن بھر کتابیں، سکھ مذہب، جین مت اور بودھ دھرم سے متعلق ایک ایک کتاب شائع کر کے مذہبی تحقیق کو نئی سمتوں سے آشنا کیا اور مختلف ادیان کے تقابلی مطالعہ پر بیش بہا لٹریچر فراہم کیا۔ ہندوستان کی تحریک آزادی سے متعلق بھی نصف درجن کتابیں شائع کیں (3)۔

علمی و ادبی میدان میں اور لائبریری سائنس سے وابستہ موضوعات پر بیدار صاحب کی خدمات قابل ستائش ہیں، قدیم مخطوطات پر ان کی خصوصی توجہ رہی ہے۔ بیدار صاحب کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ 'نئے اور پرانے چراغ'، بہت مقبول ہوا۔ اسی طرح 'اردو نثر کا حسن'، 'مقدمہ طلسم ہوشربا'، 'قندیل حرم کا تنقیدی جائزہ'، 'شریکِ غالب' اور 'مشاہیر کے اوّلین صحیفے'، جیسی معیاری تصنیفات کو ادبی حلقوں میں آج تک یاد کیا جاتا ہے۔

بیدار صاحب کی تخلیقات کے بارے میں معروف صحافی فاروق ارگلی لکھتے ہیں:

'ڈاکٹر عابد رضا بیدار کی تصنیفات، تالیفات اور تراجم کی تعداد کتنی ہے، یہ شاید بیدار کو خود بھی ٹھیک سے یاد نہ ہو۔ تعجب کی بات ہے کہ لائبریری سائنس کے اتنے بڑے ماہر، بڑے بڑے ادارے چلانے کی تنظیمی صلاحیتوں کے مالک، کتابوں کے سائنٹفک رکھ رکھاؤ اور فہرست سازی میں لاثانی ڈاکٹر عابد رضا بیدار نے خود اپنی کتابوں کی فہرست سازی، ان کی تشہیر اور عوام تک پہنچانے کی جہت میں کوئی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ انھوں نے علمی و ادبی دنیا میں خود کو نمایاں کرنے کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں دی۔ انھوں نے صرف کام کیا اور ایک کام ختم کر کے دوسرے میں مصروف ہوتے گئے۔' (4)

جس طرح آجکل مذہبی وضع قطع کے بہت سے لوگ نیک نہ ہونے کے باوجود نیک نظر آنا اور نیک کہلانا

پسند کرتے ہیں۔ اسی طرح زبان وادب سے معمولی واقفیت رکھنے والے اور کسی اخبار یا رسالہ میں محض چند صفحات شائع کر لینے والے اصحاب بھی تحقیق وتشریح کی ابجد ہوز سے نابلد ہونے کے باوجود یہ خواہش رکھتے ہیں کہ علمی دنیا میں انھیں 'مصنف' اور 'مفکر' کی حیثیت سے جانا جائے۔

لیکن تعجب ہے کہ بیدار صاحب کو نام ونمود حاصل کرنے کا چسکہ کبھی نہ لگ سکا، علمی وادبی دنیا کے ایک اہم اور باوقار شہری ہونے کے باوجود وہ عمر بھر کچھ شہرت بیزار سے دکھائی دیے۔ نہ تو موصوف نے ادبی محفلوں کی دھما چوکڑی میں کوئی دلچسپی دکھائی، نہ ہی شعری نشستوں میں واہ واہی لوٹی اور 'تو تو' اور 'رفقاء کی غیبت'، ہم عصروں کی تنقید وتنقیص یا ارباب اقتدار کی چاپلوسی جیسے مقبول عام مشاغل کے لیے بھی کبھی وقت نہ نکال پائے بلکہ فرصت کے تمام لمحات کتب بینی، غور وفکر اور تحریر وتسطیر کی نذر کر بیٹھے۔ چند برس میرا بھی ان سے ملنا جلنا رہا، انھوں نے کبھی کھل کر اپنی علمی اور ادبی سرگرمیوں کے بارے میں بات نہیں کی، نہ ہی کبھی اپنی کسی تخلیق (کتاب، فہرست، ترجمہ یا مضمون) کا حوالہ دیا۔

ہر ملاقات میں گفتگو محض حالات حاضرہ تک ہی محدود رہی۔ ایک مرتبہ ماہنامہ افکار ملی (نئی دہلی) کے کسی شمارے میں بیدار صاحب کے بارے میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں ان کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر ہونے کا تذکرہ تھا۔ جب میں نے موصوف سے اس سلسلے میں جاننا چاہا تو نہ تو انھوں نے کسی جذباتیت کا مظاہرہ کیا، نہ ہی کوئی گلہ شکوہ۔

اپنے مخصوص انداز میں مسکراتے ہوئے محض اتنا کہا کہ میں نے 'سیما کی تلاش' لکھی تو کچھ لوگ خفا ہو گئے تھے۔

میں نے پوچھا 'پھر کیا ہوا؟'

فرمایا کچھ نہیں، میں نے 'تلاش کی سیما' لکھ دی۔

اپنی ستائش کے تعلق سے تو موصوف ہمیشہ محتاط رہے ہیں لیکن دوسروں کی حوصلہ افزائی میں کبھی کوئی کنجوسی نہیں کی بلکہ کچھ زیادہ ہی فیاضی کا مظاہرہ کیا۔ میری ہی مثال لے لیجیے، احقر سائنس کا طالب علم ہے جسے نہ تو اردو ادب کی کوئی خاص سمجھ ہے اور نہ ہی زبان وبیان کی باریکیوں سے واقفیت ہے، اللہ مغفرت فرمائے اسرار احمد (ابن صفی) کی، جن کے دلچسپ جاسوسی ناولوں کو بچپن میں چوری چھپے پڑھتے رہنے کی وجہ سے اردو املا درست ہو گیا۔ اگرچہ تلفظ تو کئی الفاظ کا آج تک مشکوک ہے۔ بہر حال اپنے ذوق کی تسکین کے لیے کبھی کبھی میں کاغذ کو سفید سے سیاہ کر بیٹھتا تھا، انجام کار کچھ بزرگوں کے شخصی خاکے وجود میں آگئے جو وقتاً فوقتاً ماہنامہ تہذیب الاخلاق (علی گڑھ) میں شائع ہوئے اور بیدار صاحب کی نگاہ سے بھی گذرے۔

میں نے کوشش کی تھی کہ یہ خاکے محض قصیدہ خوانی پر مشتمل نہ ہوں بلکہ مبنی بر حقیقت ہوں۔ ہم میں سے آج کوئی بھی نبی پیغمبر تو ہے نہیں، اگر کسی میں دس بیس خوبیاں موجود ہیں تو ایک آدھ خامی بھی ہو سکتی ہے اور اگر اس پر

نظر جا پڑے تو یہ کوئی جرم بھی نہیں ہے بلکہ شاید یہ اتفاق اس شخصیت کے تذکرے کو مزید معتبر ہی بناتا ہے۔ بہر حال اس صورت حال کو بیدار صاحب نے 'پلٹ وار' کا نام دیا۔ کہتے تھے کہ تمہاری تحریروں میں پلٹ وار کا عنصر بڑا خطرناک ہے۔ اچھے بھلے دوستانہ ماحول میں پیش قدمی کے دوران اچانک پلٹ کر ایسا وار کرتے ہو کہ بے چارہ مضروب ہکّا بکّا دیکھتا رہ جاتا ہے۔ حالاں کہ میں تین میں نہ تیرہ میں، میری اوقات ہی کیا؟ مگر بیدار صاحب نے اتنی حوصلہ افزائی کی کہ میں شرمندہ ہونے کے ساتھ ساتھ مزید کچھ لکھنے کے لیے ترغیب بھی پاتا رہا۔

اس بات سے شاید کم ہی لوگ واقف ہوں گے کہ بیدار صاحب کی اردو لکھنے کی رفتار کسی اسٹینوگرافر کو بھی مات دیتی ہے۔ ایک مرتبہ انھوں نے پٹنہ میں سید حامد صاحب کی تقریر کو اور راشٹر پتی بھون (نئی دہلی) میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی تقریر کو سننے کے ساتھ ساتھ ہی من وعن کاغذ پر اتار دیا تھا یعنی جب متعلقہ مقرر نے اپنی تقریر ختم کی تو وہ پوری کی پوری تحریری شکل میں بیدار صاحب کے پاس موجود تھی۔ ایسی گوناگوں خوبیوں کے حامل انسان آج کی دنیا میں ذرا کم ہی نظر آتے ہیں۔ خداوند کریم موصوف کی عمر میں برکت دے اور انھیں لمبی اور صحت مند زندگی عطا فرمائے!

حوالہ جات:

(1) اقبال، محمد (2011): عصر جدید کا ایک انسان دوست مفکر: ماہنامہ معارف، اعظم گڈھ، ستمبر 2011ء، صفحہ: 231-218

(2) بیدار، عابد رضا (2019): مرشد اولین کی یاد میں، ماہنامہ فکر نو، علی گڈھ، اکتوبر 2019ء، صفحہ: 13-10

(3) بیدار، عابد رضا (2019): تبدیلی زندگی ہے: ماہنامہ فکرنو، علی گڈھ، اگست 2019، صفحہ: 22

(4) ارگلی، فاروق (2013): عابد رضا بیدار: ماہنامہ تہذیب الاخلاق (مشاہیر علی گڈھ نمبر' جلد: 7)، علی گڈھ، اگست 2013ء، صفحہ: 62-55

...

Professor Muhammad Iqbal

Former Professor & Vice Chancellor

Jamia Hamdard (Deemed University)

101-New Horizon Apartments, RZ-2677A/28,

Tughlakabad Extension, New Delhi - 110019

Mob:9873137770, E-mail:iqbalg5@yahoo.co.in

اختر آصف...ایسا کہاں سے لاؤں

ڈاکٹر وسیم افتخار انصاری
(گوالیار، مدھیہ پردیش)

اختر آصف 16 اکتوبر 2008ء کو اس دارِ فانی سے رخصت ہوئے۔ ہم کو، آپ کو اور متعلقین کو گہرا صدمہ ہوا۔ ہم سب نے محسوس کیا کہ

بچھڑا ہے اِس ادا سے کہ رُت ہی بدل گئی

مرورِ ایّام کے ساتھ غم والم میں کمی واقع ہوئی۔ دھیرے دھیرے صبر آیا۔ پھر یوں ہوا کہ وقت دبے پاؤں گزرتا گیا۔ احساسِ مفارقت کا اثر کم سے کم ہوا۔ بے قراریوں کو قرار آتا گیا۔ کہاں تک حقیقت سے آنکھیں چرائیں؟ کیوں کہ کون آیا ہے اس دنیا میں رہنے کے لیے۔ سب کو ایک نہ ایک دن اِس جہانِ فانی سے چھٹی مل جائے گی۔ چلیے قصّہ ختم ہوا...!

اختر آصف کے ساتھ ایسا ممکن نہیں ہے۔ کچھ قصّے ختم ہو جانے کے باوجود بھی پہلے سے کچھ کم مگر چلتے رہتے ہیں۔ مرحوم کے ذہن و دل پاکیزہ، انداز اور مزاج شگفتہ، طبیعت خوش گوار، فکر ونظر بالیدہ، صالح اور تعمیری تھی۔ پھر اُن کے لیے موت کیا معنی رکھتی ہے؟ میری نظر میں ایسی فنا بھی بقاء کی ضامن ہے۔ موت کی وسعت بدن کی حد تک ہے۔ ہم نے اختر آصف کے جسم کو سپردِ خاک کیا ہے۔ اُن کی خوبیاں، اُن کی نیکیاں، یادیں، باتیں، نصیحتیں، عنایتیں، شفقتیں، خدمات اور کارنامے زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ اس کا تذکرہ ہم بھی کریں گے اور ہمارے بعد آنے والے بھی۔ یہ کہانی کبھی ختم نہیں ہوگی۔ چاہے جتنی نشستیں، مجلسیں، محفلیں سجالیں، سمینارس منعقد کرالیں...!

اختر آصف کی شخصیت کے کئی پہلو اور کئی حیثیتیں ہیں۔ ویسے بھی ایک شخص ہمہ وقت، ایک مقام پر اپنی تمام تر خوبیوں اور حیثیتوں کے ساتھ موجود نہیں رہتا ہے۔ وہ کہیں دوست کی حیثیت سے رہتا ہے۔ کہیں شاعر کی صورت میں دکھائی دیتی ہے۔ کبھی استاد کی شکل میں نظر آتا ہے۔ کبھی بھائی، کہیں شوہر، باپ، داماد، بہنوئی وغیرہ وغیرہ۔ جب تک سارے پہلو آشکار نہ ہو جائیں؛ کوئی لاکھ کوششیں کر لے؛ وہ شخص پورا پورا کبھی نظر نہیں آسکتا... جب تک قطرہ قطرہ سمیٹ نہ لیا جائے۔ یہ تحریر بھی ایسے ہی سمندر کے ایک قطرے کی مانند ہے۔

عجیب بات ہے کہ انسان جب تک زندہ رہتا ہے۔ اس سے ملاقاتیں کیجیے۔ اس کی باتیں سنیے۔

خیالات جانیے۔ مستقبل کا لایحہ عمل سمجھئے؛ حتیٰ کہ ایک ملاقات میں بہت کچھ سیکھنے، سمجھنے، جاننے کا موقع مل جاتا ہے۔لیکن اگر وہ شخص دنیا سے چل بسے تو اس کا ہاتھ آنا بڑا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ وہ شخص پھیلتا چلا جاتا ہے۔ طویل ہوتا جاتا ہے۔ایک بات یاد آتی ہے پھر اور بھی باتیں یکے بعد دیگرے یاد آتی رہتی ہیں۔رشتوں میں زیادہ کشش ہو تو یادوں، باتوں کا سیلاب؛ آگے پیچھے، منتشر اور بے ترتیب ہو کر سامنے آنے لگتا ہے۔ایسے عالم اور ایسی حالت میں اُس کی یادوں کو سمیٹنا، انتشار سے بچنا، مخصوص باتوں کو یکجا کرنا، محفوظ کرنا: مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن سا محسوس ہونے لگتا ہے۔کبھی کوئی اچھی بات یاد آتی ہے۔ وہ ختم بھی نہیں ہو پاتی کہ دوسری اور اچھی؛ زیادہ بہتر بات یاد آنے لگتی ہے۔اختر آصف کی حیات و شخصیت، اعمال و کردار، خدمات اور کارناموں کو بیان کرنا؛ مذکورہ مشکلوں سے عبارت ہے۔

مشکل یہ پیش آتی ہے کہ بات کہاں سے شروع کی جائے۔کون سا پہلو پہلے سامنے لایا جائے۔اُن کی شخصیت کے متعلق سب سے پہلے کیا بیان کریں، کیا درمیان میں اور کیا بعد میں۔آغاز کریں تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں سے نہیں وہاں سے۔یہ نہیں بلکہ وہ۔ایسے نہیں بلکہ ویسے...!

اختر آصف کو لڑکپن سے دیکھا۔یادش بخیر...! غالباً 25-30 سال پہلے شہرِ عزیز برہان پور (مدھیہ پردیش) میں طلباء و طالبات کے لیے اسکول اور کالج سطح پر تحریری، تقریری، گیت، نظم و غزل سرائی کے مقابلے وقتاً فوقتاً منعقد ہوتے رہتے تھے۔فی الحال یہ شہر ایسی محفلوں، نشستوں اور جلسوں سے پاک ہے۔شاید:

بے حس بنا چکی ہے بہت زندگی ہمیں

بہر حال اکثر بزمِ اُردو سیوا سدن کالج اور نیشنل اُردو لٹریری سوسائٹی وغیرہ کے ذریعے منعقدہ تقریبات میں مرحوم کو مذکورہ مقابلوں کے ممتحن کی حیثیت سے دیکھا۔وہ دیکھنے میں ہمیں اختر الایمان اور اُجین کے احمد کمال پروازی کے ہم شکل اور ہم شبیہ معلوم ہوتے تھے۔فرق تھا تو اتنا کہ اختر الایمان کے چہرے پر رات کے بارہ بجتے تھے اور مرحوم کے چہرے پر دِن کے بارہ۔تینوں کے گیسو قدرے دراز تھے۔بالوں کے جنگلوں کو درمیان سے پاٹ رکھتے تھے۔تینوں اشخاص کی ہیئر اسٹائل ایک ہی سی تھی۔بس اک امتیاز یہ تھا کہ اختر الایمان صاحب کے بال کھچڑی، کالے اور سفید تھے۔اس کے برعکس احمد کمال پروازی اور مرحوم کے بال دستِ حنائی کی طرح سرخ تھے۔

اُن کی آنکھوں میں گہرائی، چہرے پر سنجیدگی، گفتگو میں نرمی، آواز میں آہستگی، انداز میں شائستگی، خلوص کی گہرائی، جذبات میں گرمی، ذہانت کی شگفتگی، باتوں میں ذرا سی شوخی لیکن خیالات میں تازگی اور فکر میں پاکیزگی تھی۔شیخی کا شائبہ تک نہ تھا۔لباس سادہ مگر دیدہ زیب، زیبِ تن رہتا۔اکثر سفید کرتا پاجامہ اور اس پر

کالی صدری پہنا کرتے تھے۔ آنکھیں ہلکی نشیلی تھیں، جس سے شبہ ہوتا کہ موصوف کہیں کوئی اور نشہ تو نہیں کرتے۔ البتہ بیڑی اور چائے پینے کی عادت تھی۔ چائے حد سے زیادہ مرغوب تھی۔ اچھی چائے پینا پسند کرتے تھے۔ چہرے کی طمانیت اور مزاج کی خوش گواری سے چائے کی تدریجی خوبیوں کا اندازہ ہوجاتا تھا۔ فرماتے تھے کہ 'چائے کی مقدار اور معیار بہتر اور اُس کا دَور بار بار ہونا چاہیے' موصوف چائے ہر حال میں پی سکتے تھے۔ دیر رات تک جاگنے کے لیے چائے۔ زیادہ بہتر نیند لانے کے لیے چائے۔ یعنی مرحوم چائے سے پہلے چائے اور چائے کے بعد چائے پی سکتے تھے۔

قد درمیانہ تھا۔ رنگ صاف گندمی۔ جلد خشک، اعضاء متناسب، آنکھیں چھوٹی تھیں۔ انہی آنکھوں سے جذبات خیالات، حالات اور احساسات کے نشیب و فراز کا اندازہ ہوتا تھا۔ چلتے آہستہ تھے۔ قدم بھی آہستہ اور بوجھل رکھتے تھے۔ جیسے کوئی فلسفی کسی گہری فکر میں ڈوبا نڈھال چال سے چلتا چلا جارہا ہو۔

مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ مختلف اور متضاد قسم کی چیزیں مطالعے میں رہتی تھیں۔ تاریخ، فلسفہ، تنقید کے ساتھ ہومیو پیتھی (Homeopathy) کی کئی کتابیں اُن کے ذاتی کتب خانے میں موجود تھیں۔ مرض، مریض، علاج، معالجہ سب کچھ اپنا خود کا تھا۔ مختلف قسم کے ڈائجسٹ کے علاوہ جرائم اور جنتری جیسے ماہنامے اور رسالے بھی زیر مطالعہ رہتے تھے۔ فرماتے تھے کہ 'وکیل، ڈاکٹر، مفکر، رہنما وغیرہ کے فرائض شاعر پر بھی عائد ہوتے ہیں۔ سارے کردار اُسے نباہنے آنے چاہیے۔ اچھی اور سچی شاعری علاوہ طبعی شرافت کے اور بغیر مطالعے کے بہت دیر تک نہیں کی جاسکتی۔ اعتبار اور معیار مطالعے ہی سے حاصل ہوسکتے ہیں' تلقین فرماتے تھے کہ 'پڑھو زیادہ اور لکھو کم' افسوس کہ ایسی مشفق و مہربان شخصیت ہمارے درمیان میں موجود نہیں ہے۔

برہان پور سے خلیق برہان پوری کے بعد ہندوستان گیر پیمانے پر مشاعروں کے ذریعے اپنی شناخت قائم کرنے والے ہر دل عزیز شاعر 'اختر آصف' تھے۔ نام تو اختر حسین انصاری تھا لیکن قلمی نام اختر آصف ہی سے شہرت پائی۔ آزادیِ ہند سے قبل یکم جنوری 1939ء میں سردار عباداللہ انصاری کے یہاں آنکھیں کھولیں۔ والد بزرگوار کا ذریعۂ معاش ہینڈ لوم (handloom)، جس پر کپڑا تیار کرکے وہ تجارت بھی کیا کرتے تھے۔ اختر آصف کی بنیادی تعلیم گھر پر پھر استاذ الاساتذہ مولانا محمد محسن سے فارسی کی تعلیم پائی اور حضرت سعدی شیرازی کی مایہ ناز تالیف 'گلستاں' کا درس لیا۔

انھوں نے سنہ 1956ء میں سبھاش ہائیر سیکنڈری اسکول، برہان پور سے ہندی ذریعہ تعلیم سے میٹرک کا امتحان بھی پاس کیا۔ طالبِ علمی کے زمانے سے طبیعت شعر گوئی کی طرف مائل تھی لیکن 1958ء میں باقاعدہ شاعری کا آغاز کیا اور فاضل انصاری کے شاگرد پھر اپنی صلاحیتوں سے جانشین فاضل ہوئے۔ آصف صاحب

کا سلسلۂ شعری فاضل انصاری، منشی حشمت اللہ ریاضی، علیم اللہ خیالی، وزیر لکھنوی، قلق لکھنوی سے ہوکر امام بخش ناسخ سے ملتا ہے۔ قادرالکلام تھے سب کچھ کہہ سکتے تھے لیکن اُردو شاعری کی آبرو غزل کو جانِ شاعری تسلیم کرتے ہوئے نصف صدی سے زیادہ مشاعروں کے علاوہ لال قلعہ دہلی، دوردرشن دلّی (ٹی وی) اور متعدد ریڈیو اسٹیشن سے بقول پروفیسر آلِ احمد سرور ُچاول پر قل ھواللہ' لکھنے کا کام کرتے رہے۔ 2005ء میں شعری مجموعہ 'آزاد پرندے' طباعت کی روشنائی سے منور ہوکر شائع ہوا۔ نثر نگاری کے میدان کی بھی آب یاری کچھ تبصرے، کچھ ادبی مضامین لکھ کر کی اور صحافت میں ادارت کا بوجھ بھی برداشت کیا۔

اختر آصف کی راست بیانی اور صاف گوئی میں محبت اور خلوص کی چاشنی تھی۔ گفتگو سے محبت و مرحمت ٹپکتی تھی۔ موصوف کو کبھی گول مول باتیں بناتے نہیں پایا۔ جو کہنا ہوتا، جس سے بھی کہنا ہوتا، بغیر کسی لاگ لپیٹ کے کہہ دیتے تھے۔ جو معلوم ہوتا اس کے بارے میں تفصیل سے بتاتے، سناتے اور سمجھاتے تھے۔ اگر معلوم نہیں ہوتا تو صاف طور سے فرما دیتے کہ مجھے اس بات کا علم نہیں ہے۔

مرحوم کی ایسوں سے بھی دوستی تھی؛ جن کا سیاست میں گہرا دخل تھا۔ لیکن انہوں نے اس شناسائی کو مالی منفعت کا کبھی ذریعہ نہیں بنایا۔ ایسے لوگوں کو بھی موصوف کے قریب پایا؛ جن کا کہیں کوئی اثر ورسوخ نہ تھا۔ پھر بھی اُن کے ساتھ مرحوم کا سلوک مشفقانہ تھا۔ جانے کیا بات تھی؛ اُن لوگوں میں جو موصوف کے قریب تھے۔ یا جانے کون سی خوبیاں موصوف میں ایسی تھیں جو وہ لوگ کھنچے چلے آتے تھے۔ اُن کے تعلقات ایسے عالموں سے بھی تھے جو شہر عزیز اور بیرون شہر احترام واحتشام کے درجے پر فائز تھے۔ اُن کے چند تلامیذ بھی اکثر مرحوم کے ساتھ ساتھ رہتے تھے۔ لیکن جس سے طبیعت نہ ملتی، مزاج لاگ نہیں کھاتا؛ وہ چاہے جتنی کوششیں کرلے، موصوف کی محبتوں اور شفقتوں سے محروم ہی رہتا تھا۔ لیکن جن سے محبت تھی یا جنہیں عزیز رکھتے تھے۔ اُن پر جان نچھاور کرتے تھے۔ اُن کی خوشی سے خوش اور اُن کے دکھ درد کو اپنا سمجھ کر بے چین اور مضطرب رہتے تھے۔

اختر آصف کی زندگی میں ایسے حسین مواقع بھی آئے، جہاں وہ ابرِ بہار بن کر مشاعروں پر چھائے رہے۔ اخوت ومحبت، بھائی چارگی، اپنائیت اور اپنے چاہنے والوں کی فصلیں اگاتے رہے۔ شہرتوں نے بڑھ کر اُن کا دامن تھاما۔ آکاش نے جھک کر سلام کیا۔ لیکن صحافتی ذمے داریوں اور خاص طور پر ہندی اخبار کو اُردو کے قالب میں ڈھالنے کی مشقت نے اُن کی تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کو زبردست نقصان پہنچایا۔ محبت، شرافت اور مروّت میں موصوف نے اپنی زندگی کا بڑا حصّہ صرف کیا:

ہے ہمارا گھر جلانے میں ہوا کا ہاتھ بھی

مورِدِ الزام آصف صرف چنگاری نہیں

ہفت روزہ برہان پور ٹائمز اور ہفتہ وار اخبار الم نشرح جب تک شائع ہوتے رہے؛ موصوف ہی کے کاندھوں پر سوار رہے۔ گویا اُن کا قلم مقامی اخباروں کو زندہ رکھنے کے لیے لاٹھی کا کام انجام دیتا رہا:

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

اختر آصف تنہائی سے زیادہ محفل پسند تھے۔ اکثر محلّہ مومن پورہ، حریر پورہ کا درمیانی علاقہ چار کھمبا میں ایک اونچے ٹیلے پر اپنے مخلصین و محسنین کے ساتھ شطرنج کھیلا کرتے تھے۔ رات میں دس بجے کے بعد سے دیر رات تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ وقفے وقفے سے چائے کے دور بھی چلتے رہتے تھے۔ احباب سے ملاقاتیں بھی ہوتیں۔ تلامذہ کے کلام پر اصلاح کے فرائض بھی انجام دیے جاتے تھے۔ مختلف ادبی مسائل پر گفتگو کا کبھی نہ ختم ہونے والا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ افتخار عارف سے معذرت کے ساتھ:

روز اک تازہ معمہ نئی تمہید کے ساتھ چلا آتا

اور بات سے بات نکلتی اور گفتگو جاری رہتی تھی۔

ان کے احباب کا حلقہ بھی بڑا وسیع تھا۔ دیر رات تک محبان کا مجمع جمع رہتا تھا۔ کوئی آتا تو اس پر محبت آمیز فقرہ چست کرتے، کسی کے حلیے، لباس پر کوئی توصیفی بات کہہ دیتے۔ کسی کی کارگزاری کی تعریف کرتے۔ کسی کے کلام کو داد و تحسین سے نوازتے۔ کبھی کبھی کسی اہم ادبی مسئلے پر لطیف شاہد اور جمیل اصغر صاحبان سے رائے لیتے۔ کوئی کسی مسئلے پر رائے طلب کرنا چاہتا؛ تو کھیل روک کر ہمہ تن سماعت کرتے۔ اس کی اُلجھن کو سلجھاتے۔ جب مطمئن ہو کر وہ شخص چلا جاتا تو پھر وہی محفلیں، وہی چائے کے دور اور پھر وہی دیر رات تک شطرنج کا کھیل۔

اختر آصف کو کسی پر ناراض ہوتے یا بگڑتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ویسے وہ اس طرح کے تھے بھی نہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر کان دھرنا، اُن کا شیوہ نہیں تھا۔ اکثر لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں کو 'اَنا' کا مسئلہ بنالیتے ہیں۔ خفا ہو جاتے ہیں۔ ناراضگی سے رشتوں میں اختلاف اور ناچاقی ہو جاتی ہے۔ مگر مرحوم ایسے نہ تھے۔ اگر اُن کے سامنے کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اس پر ایک بار ٹوکتے، اصلاح فرمادیتے۔ لیکن اگر وہ شخص غلطی پر نادم نہ ہو کر ضد پر اڑا رہے تو بات کو بڑی صفائی اور ستھرائی سے ٹال دیتے تھے۔ بجائے گفتگو جاری رکھنے کے لب پر قفل ڈال لیتے تھے۔ بات رفع دفع کر کے دھیرے سے گردن گھما کر آہستہ سے کہتے 'بھائی یہ اپنے داؤ کا نہیں ہے۔'

ان کی سیرت و شخصیت کا انوکھا پہلو یہ تھا کہ بڑے سے بڑا شخص یا چھوٹے سے چھوٹا آدمی اُن کی شفقت و محبت آمیز ملاقات، تشفی و تسلی بخش گفتگو اور نرم آہنگ اندازِ تکلم سے خود کو شاداں و فرحاں محسوس کرتا تھا۔ اُن کی

آہستہ وشائستہ گفتگو میں اپنائیت کی ایسی کشش ہوتی کہ مزید ملاقات کرنے کو جی چاہتا تھا۔ موصوف سے ملاقات کرنا کوئی فروماندگی یا کسی طرح کی درماندگی یا مجبوری کا مسئلہ نہ تھا۔ بلکہ اس سے طبیعت میں تازگی اور شادمانی کا احساس ہوتا تھا۔ کچھ نہ کچھ نیا سیکھنے، سننے کا موقع ملتا تھا۔ موصوف سے ملاقات کر کے گویا دل کو ایک طرح کی طمانیت ملتی تھی۔

آصف صاحب کے بے پناہ خلوص کا جیتا جاگتا ثبوت اور اُن کے بڑے ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ وہ دنیائے ادب کے نوواردوں، نوآموزں یا اپنے سے پست حالوں سے بڑے مشفقانہ انداز میں ملتے تھے۔ بڑے لوگ جب اس انداز سے ملتے ہیں تو ہم ایسوں کی احساسِ خوداعتمادی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس طور کی خوداعتمادی پیدا کرنے والی میرے نزدیک شہرعزیز میں چند ہی ہستیاں تھیں اور ہیں۔ مخدوم جابر برہانی، استاد جمیل اصغر، پروفیسر خلیل احمد انصاری ایڈوکیٹ، پروفیسر محمد شفیع مہوبوی جیسے صاحبان ومہربان۔ کسی کے یہاں طرح داری اور لطف اندوزی تھی۔ کوئی علمی وقار، خاموشی اور عصری طوفان کا مشترکہ شاہ کار۔ کسی کے یہاں لکھنوی تہذیب اور دلّی کی ٹکسالی زبان ہے۔ کوئی معلم سے زیادہ مکرم اور معاشرے میں سربلند ہونے کا ہنر رکھتا تھا۔ لیکن اختر آصف کا معاملہ قدرے مختلف تھا۔ وہ تھے بھی چیزے دیگر۔

اُن کی شخصیت کو ڈیفائن کرنا اور اُن کی تصویر کو ڈیزائن کرنا ٹیڑھی کھیر ہے۔ یوں سمجھئے کہ شاعر، صحافی، مدرس، معالج، مفکر اور فلسفی کو ایک ساتھ جوڑ کر جو تعمیر وتشکیل ہو جائے وہ اُن کی شخصیت اور مختلف ومتضاد رنگوں سے جو صورت سامنے آئے وہ اُن کی تصویر ہے۔

سنہ 2005ء کے بعد آصف صاحب سے ملاقاتیں کم کم ہونے لگی تھیں ۔ ملازمت اور ازدواجی زندگی کی مصروفیات اور ذمے داریاں بڑھتی گئیں اور برہان پور آنا جانا کم ہو گیا۔ شہرعزیز آنا ہوتا بھی تو ایک دوروز کے لیے۔ لیکن مجھے موصوف کے متعلق اور انہیں میرے تعلق سے معلومات کسی نہ کسی طرح فراہم ہوتی رہتی تھیں۔ ایک مرتبہ سُنا کہ مرحوم کو کسی سے گہرا صدمہ پہنچا ہے۔ اس بات کا اظہار مشاعرے میں پڑھی گئی غزل سے بھی ہوا۔ وقت نکال کر اُن سے ملنے گیا۔ گھر ہی پر مل گئے۔ لیکن طبیعت اُچاٹ اُچاٹ معلوم ہوتی تھی۔ پہلے بھی آہستہ چلتے تھے لیکن اس بار جیسے بڑھاپا دستک دینے لگا تھا۔ وہ کوئی اور بات شروع کرتے اس سے پہلے ہی کبیدہ خاطر ہونے کا سبب دریافت کرنا چاہا؟... یک لخت خاموش ہو گئے ۔توقف کے بعد فرمایا:

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

خلافِ معمول کافی دیر خاموش رہے۔ کچھ سوچتے رہے۔ جیسے کہنا چاہتے ہوں کہ بقول خلیق برہان پوری:

بادۂ تلخ کا ہم جام پئے بیٹھے ہیں
بس میں حالات نہیں صبر کیے بیٹھے ہیں

اکثر جب کسی گہری سوچ میں ڈوب جاتے تو آنکھیں کم کم کھلی رہتیں۔ البتہ جب گفتگو میں گرمی اور روانی پیدا ہو جاتی یا بہت دل چسپ باتیں ہوتیں تو آنکھیں دھیرے دھیرے کھل جاتی تھیں۔ برہان پور کی شعری تاریخ پر کچھ عرض کرتے تو آنکھیں زیادہ روشن اور بڑی بڑی ہو جاتی تھیں۔ اُس دن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ سر جھکائے، آنکھیں بند کیے، فکر میں کھوئے رہے۔ پھر کچھ دیر بعد جیسے اُنہیں محسوس ہوا کہ میرے پاس کوئی جواب طلب کرنے بیٹھا ہوا ہے تو آہستہ سے گردن اٹھائی۔ آنکھیں آدھی کھول کر گویا ہوئے ...صبر...وسیم صبر... پھر کسی قدر تامل کے بعد کچھ کہنا چاہتے تھے لیکن کچھ کہا نہیں گیا۔ آنکھیں ہلکی سی بھیگی ہوئی تھیں۔ بہر حال جب اُنہیں ایسا محسوس ہوتا کہ بات کرنے سے بات بڑھ سکتی ہے تو خاموش رہنا پسند کرتے تھے۔ اس تعلق سے فرماتے تھے کہ 'بات مناسب بھی ہو مگر ماحول غیر مناسب تو نہ کہنا زیادہ بہتر ہے۔'

ایسی اور اس طرح کی باتیں؛ اُن کی فکر و فرزانگی، متحمل مزاجی، پاک روی، صاف دلی کی بہترین مثالیں ہیں۔ یہ ایسے خواص واوصاف ہیں جہاں مرحوم ہم سے آپ سے اور دوسروں سے منفرد و ممتاز نظر آتے ہیں۔

وہ منفرد و ممتاز شخص جو ناکردہ جرم کی سزا قید پانے والے پرندوں کو آزاد کر دیتا تھا۔ محفل کا خورشید مبیں؛ جس کے اطراف زمیں پر کہکشاں بکھری رہتی تھی۔ اس آباد خرابے کی شب غم گزار کر خاموشی سے منوں مٹی تلے سو گیا۔ آنکھیں اُسے ڈھونڈتی ہیں۔ رنجیدہ ٹیلے پر، ویران محفلوں میں، بے رونق مشاعروں، اداس چائے خانوں، بے نور گلیوں میں۔ اب اِن سب کو زندگی دینے والا کہاں سے لائیں!

...

Dr. Waseem Iftekhar Ansari
Head, Department of Urdu, Government Kamla Raja Girls
P. G. Autonomous College, Gwalior-474001(Madhya Pradesh)
E-mail:waseemansari1979@gmail.com, Mob:9827333039

انٹرویو

پروفیسر ظفر حبیب سے ایک اہم گفتگو

ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی

(بتیا، بہار)

للت نارائن متھلا یونیورسٹی (دربھنگہ، بہار) کے سابق صدرِ شعبۂ اردو پروفیسر ظفر حبیب کا تعلق ریاست بہار کے تاریخی ضلع بیگوسرائے کی زرخیز مٹی 'لکھمنیا' سے ہے۔ لکھمنیا شروع سے ہی اردو ادب کا گہوارہ مانا جاتا ہے، اصناف ادب کے تمام متوالے یہاں موجود ہیں، جنھوں نے اردو زبان و ادب میں اہم خدمات انجام دی ہیں۔ اس علاقے کے باشندے اُردو کے دلدادہ ہیں اور عمومی گفتگو میں بھی فصیح اُردو کا استعمال کرنا پسند کرتے ہیں۔ زبان و ثقافت اور تہذیب و تمدن کے اعتبار سے اس بستی کو بہار کا 'لکھنؤ' کہا جاتا ہے اور یہاں اُردو کی اعلیٰ علمی روایت زندہ و تابندہ ہے، یہی سبب ہے کہ اِس بستی کے معروف شاعر طارق متینؔ نے اپنے شعر میں یوں کہا ہے:

جو لکھنؤ سے ہے موسوم شہرِ لکھمنیا
اسی دیارِ محبت نشاں کے ہم بھی ہیں
جو ابتدا سے ہی تہذیب کا ہے گہوارہ
بڑا غرور ہے ہم کو، وہاں کے ہم بھی ہیں

پروفیسر ظفر حبیب نے پوری زندگی اردو زبان و ادب کے گیسو کو سنوارنے اور سجانے میں صرف کردی، ان کی سبکدوشی کو ایک دہائی سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا مگر اپنی پیرانہ سالی کے باوجود آج بھی وہ اردو کی خدمت کے لیے جوان نظر آتے ہیں۔ بیک وقت وہ شاعر، افسانہ نگار، محقق و نقاد ہیں، ایک درجن سے زائد ان کی کتابیں موصوف کی ان خصوصیات پر شاہد عدل ہیں۔ اردو کے کلاسیکی ادب کی تدوین و اشاعت ان کا خاص میدان رہا، یہ کام انھوں نے خود بھی کیا اور اپنے اسکالروں سے بھی کرایا ہے، جس کے نتیجے میں اردو ادب کے بہت سے نوادرات سامنے آئے۔ وہ ادب برائے ادب کے بجائے ادب برائے زندگی کے قائل ہیں۔

ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی نے پروفیسر ظفر حبیب سے ایک طویل گفتگو کی ہے، یہاں ان کی گفتگو کے متعلقہ حصہ سوال جواب کی شکل میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ (ادارہ)

ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی: سب سے پہلے میں آپ کے خاندانی پس منظر سے متعارف ہونا چاہوں گا؟

پروفیسر ظفر حبیب: اس سلسلے میں کچھ عرض کرنے سے پہلے میں اپنی اس آبادی سے آپ کو چند جملوں میں روشناس کرانا چاہوں گا جو ریاست بہار ہی نہیں اس سے باہر بھی لکھمنیا کے نام سے مشہور و معروف

ہے۔ جب پہلی بار شہنشاہ اکبر نے بہار کی باضابطہ سرحد بندی کر کے اسے ایک صوبہ کی حیثیت عطا کی تھی تو اس وقت اس پوری ریاست کو انتظامی سہولت کی رو سے سات سرکاروں اور 199 پرگنوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ انہیں سرکاروں میں سے ایک، سرکار مونگیر بھی تھا جس کا ایک پرگنہ بلیا تھا۔ یہ واقعہ 1580ء کا ہے۔ اسی بلیا سے متصل مشرق میں اورنگ زیب کے زمانہ میں 1685ء کے آس پاس سلسلۂ نقشبندیہ مجددیہ کے مشہور زمانہ عالم دین اور مرشد وقت حضرت آدم بنوریؒ خلیفہ حضرت مجدد الف ثانیؒ کے خلیفہ ومجاز شیخ محمد سلطان بلیاوی کے وجود و ورود نے لکھمنیا کو آباد کیا جس کا پرانا نام 'سلطان پور چک مکھن' تھا ان دو متصل آبادیوں (بلیا اور لکھمنیا) میں اردو شاعری کا جرثومہ 1699ء سے 1779ء کی درمیانی مدت کا دستیاب ہے۔

جہاں تک ہمارے خانوادہ کا تعلق ہے۔ ہمارے پاس نہ تو کوئی قدیم شجرۂ نسب دستیاب ہے اور نہ ہمارے اسلاف واجداد سے لے کر آج تک کسی نے بھی کچھ ہیر پھیر کر کے بھان متی کا پٹارہ تیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم بس اتنا جانتے ہیں کہ خیرات علی کے کئی بیٹوں میں سے ایک رحیم اللہ تھے ان کے تین بیٹوں میں چھوٹے کا نام عبدالحسیب تھا ان کے دو بیٹوں میں بڑے کا نام ڈاکٹر حبیب الرحمن تھا۔ جو میرے پدر بزرگوار تھے۔ حبیب الرحمن کے چھوٹے بھائی کا نام عبدالصمد تپش اور میرے چھوٹے بھائی محمد نذر الاسلام تھے جو جواں مرگی کے شکار ہو گئے۔

اب اس دنیا میں میرے حصہ میں ایک بیٹا ڈاکٹر معراج الاسلام رباب ہیں جو اس وقت مانو کے صدر دفتر حیدرآباد میں شعبۂ علم نباتات میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ ابھی چند ماہ قبل رباب پروردگار کی جانب سے ایک فرزند ارجمند الحان سے نوازے گئے ہیں۔ رباب کے ہمراہ کل نو بہنیں تھیں جن میں سب سے بڑی کو خالقِ حقیقی نے اپنے پاس بلا لیا۔ اور برادر عزیز مرحوم مغفور کو رب العالمین نے تین بیٹوں سے نوازا ہے۔ یہ منہاج الاسلام سحاب، وہاج الاسلام شہمہ اور مصباح الاسلام شاداب ہیں۔ ان کے علاوہ دو بیٹیاں بھی ہیں۔ سب کے سب زیرِ تعلیم ہیں۔ ظفر حبیب میرا قلمی نام ہے جب کہ اسناد میں میرا نام ایس ایم ظفر الاسلام درج ہے۔

میں یہ جانتا ہوں کہ ہمارے اسلاف کا ذریعہ معاش کاشتکاری تھا۔ زرعی زمین حسبِ ضرورت ان کے پاس تھی۔ میرے دادا عبدالحسیب مرحوم کے اندر حصولِ علم کا بالیدہ جذبہ تھا جسے انہوں نے آج سے تقریباً سو سال پہلے آئی۔ کلکتہ یونیورسٹی سے کام کی سند لے کر تسکین عطا کی تھی۔

میرے نانا جان ماسٹر سید عارف الحق کا تعلق لکھمنیا کے معروف خاندان 'چودھری گھرانہ' سے تھا۔ یہ گھرانہ اپنی زمیندارانہ شان کے لیے مشہور و معروف تھا لیکن میرے نانا کے یہاں کوئی زمینداری نہیں تھی۔ البتہ جہانِ علم کی زمینداری سے سرفراز تھے۔ اپنے وقت کے مشہور استاد اور معلم کی حیثیت سے انہوں نے زندگی بسر کی جس کا اثر ان کے نورِ نظر ابو محمد شبلی (لکھنؤ) میں نظر آیا اور جو بطور وراثت ڈاکٹر طیبہ نسرین ایسوسی

ایٹ پروفیسر آف اسلامک اسٹڈیز اے ایم یو علی گڑھ کے پاس محفوظ نظر آرہا ہے۔

ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی: آپ اپنی تعلیم اور مشاغل پر کچھ روشنی ڈال دیں؟

پروفیسر ظفر حبیب: میری تعلیم کا آغاز انتہائی سادہ اور سیدھے انداز میں ہوا۔ حروف شناسی کا آغاز والدہ کی زبان مبارک کی نقالی سے ہوا۔ لکھمنیا میں ایک انتہائی درویش صفت، ایثار نفس اور فرشتہ خصال استاد ہوا کرتے تھے جن کا نام نامی مولوی تمیز الدین تھا۔ جمعرات کے دن دو پیسہ (اس زمانہ میں چونسٹھ پیسے کا ایک روپیہ ہوا کرتا تھا) اور ہر ہفتہ میں ایک دن ایک وقت کا کھانا یہی تھا ان کی علمی خدمت کا صلہ۔ اسی مکتب عرفانی میں تقریباً دو سال رہ کر قرآن کریم ناظرہ مکمل کیا، اردو کی چوتھی کتاب (مطبوعہ انجمن حمایت اسلام لاہور) فارسی کی پہلی، آمدنامہ اور ریاضی کے تمام ابتدائی اسباق جمع تفریق، ضرب، تقسیم وغیرہ مکمل کر کے اسکول چلا گیا۔ یہ معاملہ 1951ء سے 1953ء تک کا تھا۔ 1962ء میں مقامی ایس اے ایس ہائی اسکول سے میٹریکولیشن کی سند لے کر 1966ء میں گنیش دت کالج بیگوسرائے سے انٹرمیڈیٹ اور اردو آنرز کی سند حاصل کی اور تب بہار یونیورسٹی مظفر پور چلا گیا جہاں سے 1968ء میں ایم اے پاس کر لیا۔ نتیجۂ امتحان کی اشاعت کے بعد چند ماہ کے اندر ستمبر 1969ء میں اے پی ایس ایم کالج برونی ضلع بیگوسرائے میں اردو لکچرار کی جگہ پا کر مطمئن ہو گیا۔

اسی کالج میں رہ کر ریڈر اِن اردو (1981ء) اور یونیورسٹی پروفیسر آف اردو (1995ء) تک کی ترقیاتی منزلیں طئے ہو گئیں۔ ملازمت کے آخری برسوں میں للت نرائن متھلا یونیورسٹی دربھنگہ کے شعبۂ اردو (پی جی) کی صدارت کی کرسی پر بیٹھنا مقدر تھا سو وہ بھی ہو گیا۔ وہ زندگی جو از روئے سند 31 اکتوبر 1947ء سے شروع ہوئی تھی اس کے تقریباً 21 سال حصولِ سند میں صرف ہو گئے اور 40 سال تک 'پیشۂ آبا معلّمی' سے وابستہ رہا۔

الحمدللہ اپنے واحد نورِ نظر ڈاکٹر معراج الاسلام ربابؔ کے کاندھوں پر اب یہ بارِ امانت ڈال کر مطمئن ہوں۔ گرچہ ان سے پہلے میرے یکتائے معاشرہ برادر عزیز محمد نذر الاسلام یہ بوجھ میرے ساتھ ساتھ ڈھو رہے تھے۔ لیکن خالق ارض وسماوات نے 14 دسمبر 2010ء کو انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ وہ شہر کلکتہ کے ایک سرکاری ہائی اسکول میں ہیڈ ماسٹر بن کر فروغِ تعلیم کی مہم میں مصروف تھے۔

ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی: میں آپ کی علمی و ادبی سرگرمیوں کا پس منظر اور پیش منظر رقم کرنا چاہوں گا؟

پروفیسر ظفر حبیب: میں اس کے لئے بھی آپ کو لکھمنیا لے چلوں گا کہ جہاں 1944ء سے ایک اردو لائبریری الموسوم بہ 'اسٹوڈنٹس اردو لائبریری' تھی۔ اس قدیم علمی اور ادبی آبادی کی تمام سرگرمیوں کا وہ مرکز ومحور تھی۔ میں عہد طفلی ہی سے اس ادارہ کی سرگرمیوں کا حصہ دار رہا۔ پہلے بزرگوں کی ایما پر چائے لاؤ، فلاں کو بلاؤ، انتظامیہ کے افراد کو نوٹس پہنچاؤ۔ بدلے میں بچوں کے رسائل اور کتابچے پڑھ لیا کرو کا حکم بجا لاتا رہا۔ اس

تعلیم وتربیت نے میرے اندر کی تشنگی کونمی عطا کردی اور وجود کی زمین میں زرخیزی پیدا کردی۔

اکتوبر کا مہینہ اس لائبریری کے حوالہ سے صرف لکھمنیا ہی نہیں پورے علاقہ کی آبادی کے لئے جشن منانے کا مہینہ ہوا کرتا تھا۔اسی ماہ میں لائبریری کی سالگرہ منائی جاتی تھی جو مختلف النوع علمی، ادبی مقابلوں کے جلو میں صوبائی سطح کے مشاعروں پر ختم ہوا کرتا تھا۔انہیں سرگرمیوں میں شامل رہ کر میں نے شاعری بھی شروع کی اور افسانہ نویسی بھی۔تقریباً بارہ برسوں تک اس کی انتظامیہ کا جوائنٹ سکریٹری اور سکریٹری بھی رہا:

میں کیا بتاؤں تم سے محبانِ علم و فن
لکھمنیا جو ایک شہر تھا صوبہ میں انتخاب
رہتے جہاں تھے منتخب روزگار کے
اس کو خود ہم نے لوٹ کر برباد کر دیا
ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے

یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ شاعری اور ادبی سرگرمی ہمارے خانوادہ کی خانہ زاد تھی۔ناموں کی فہرست طویل ہے۔بس یہ سمجھ لیجئے کہ لکھمنیا پر ایک طویل عرصہ ایسا گذرا کہ جب درجن بھر سے زیادہ اہلِ قلم اس کی گود میں کھیلتے رہے اور ان میں تین چوتھائی کھلاڑی اسی خانوادہ کے چشم وچراغ تھے۔گذشتہ تقریباً پندرہ برسوں سے یہ ماحول بھی مسلسل طور پر زوال پذیر ہے۔اس کا واحد سبب لائبریری کی ویرانی ہے:

میں کیا بتاؤں تم کو محبانِ علم وفن

مقالہ نویسی کا آغاز باضابطہ 1967ء سے ہوا جب میرا پہلا مقالہ ماہنامہ 'مریخ' پٹنہ (مدیر ڈاکٹر عبدالمغنی) میں 'اختر قادری کی غزل گوئی' کے زیر عنوان شائع ہوا۔اسی کے آس پاس ایک ادبی مضمون امداد امام اثر کی تنقید نگاری کے موضوع پر آل انڈیا ریڈیو پٹنہ نے نشر کیا۔اس وقت ڈاکٹر مظہر امام پی ای ایکس (PEX) تھے۔اس کے بعد سے عالمی سطح کے افسانہ نگاروں کے افسانوں کا ترجمہ انگریزی سے اردو میں شائع ہونا شروع ہوا پھر طبع زاد افسانے شائع ہونے لگے۔

شاعری کم شائع ہوئی، اس کی دنیا مشاعروں کی محفلوں تک تھی جو مقامی سے لے کر چند صوبائی اور ملکی سطح کے مشاعروں تک ہے۔میں اکثر بڑے مشاعروں کی نظامت بھی کرتا رہا۔میں نے خود ڈاکٹریٹ کی سند حاصل نہیں کی لیکن تقریباً چالیس سال قبل سے میرا تحقیقی کام چل رہا ہے۔میں نے اپنے ضلع بیگوسرائے کی جغرافیائی حدود کے اندر زبان وادب کی سرگرمیوں کو منظر عام پر لانے کا بیڑا اٹھالیا ہے۔

میری ان کوششوں نے یہ ثابت کردیا ہے کہ اس دور افتادہ علاقہ میں 1969ء سے شعر گوئی کا سلسلہ جاری ہے۔یہ زمانہ ولی دکنی کی معاصرت کا ہے اس موضوع پر میرے تحقیقی مقالے کم شائع ہوئے ہیں۔البتہ

میری نگرانی میں اسکالرس کے مقالے ضبطِ تحریر میں لائے جا رہے ہیں۔ چند مقالات کتابی شکل میں شائع ہو چکے ہیں جو سب کے سب تاریخ ساز ہیں۔

میری پہلی تصنیف ترجمہ کردہ افسانوں کا مجموعہ 'آنگن آنگن' 1981ء میں منظر عام پر آئی۔ افسانوں کا دوسرا مجموعہ 'جنگل کا سفر' 1985ء میں، تیسرا مجموعہ 'بدلتے رُت کی کہانیاں' 2009ء میں، مقالوں کا پہلا مجموعہ 'تفہیمات وتنقیدات' 2008ء میں، شعری مجموعہ 'نور، نکہت، نوا' 2014ء میں اور مقالوں کا دوسرا مجموعہ 'تنقید اور تفہیم' 2015ء میں شائع ہو چکا ہے۔ مقالوں کا تیسرا مجموعہ 'فنکارانِ بہار' اور تبصروں کا پہلا مجموعہ 'المیز ان' زیر طبع ہے۔ ان کے علاوہ تقریباً ایک سو مختلف النوع تحریریں اشاعت کی راہ دیکھ رہی ہیں۔ الحمدللہ دو کے سوا تمام تصانیف بہار اردو اکیڈمی پٹنہ اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے شائع ہوئی ہیں۔ تحریر اور تحقیق کا سلسلہ جاری ہے۔

ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی: ادبی دنیا میں آپ کی شناخت افسانہ نگار، ناقد اور شاعر تینوں کی حیثیت سے ہے۔ آپ نے زمانۂ طالب علمی ہی میں انگریزی افسانوں کا ترجمہ کیا اور انہیں شائع بھی کرا دیا لیکن ان تینوں اصناف میں آپ کی ترجیح کس کو حاصل ہے اور آپ کسے زیادہ مفید سمجھتے ہیں؟

پروفیسر ظفر حبیب: دیکھئے جناب! آپ نے تین جہتوں کی بات کہی ہے۔ میں چاہوں گا کہ آپ ان میں کم از کم ایک کا اضافہ کر دیں۔ میرا تحقیقی کام بھی بہت وسیع اور وقیع ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے۔ انشاءاللہ وہ وقت آئے گا اور آپ ہی کے معاصر قلم کاروں کے ہاتھوں آئے گا کہ جب تاریخ ادبیات اردو میں 'تاریخ ادبیاتِ بیگوسرائے' کا ایک باب قائم کیا جائے گا اور اس باب کی تحقیق کا سہرا اسی ناچیز کے سر باندھا جائے گا۔

یہ بھی عرض کروں گا کہ میں عصری مسائل اور موضوعات پر بھی درجنوں مضامین لکھ چکا ہوں، جو اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں اور جن پر پسندیدگی کی مہریں لگتی رہی ہیں۔

ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی: مجموعہ مضامین 'تفہیمات وتنقیدات' میں آپ نے تخلیق وتنقید کو لازم وملزوم اور توأم قرار دیا ہے۔ قلم سے نکلنے کی حد تک تو یہ بات ٹھیک لگتی ہے کہ دونوں قلم کار کے طویل مطالعہ ومشاہدہ کا نتیجہ ہوتے ہیں لیکن میرے خیال میں ایک تخلیق کار کے لیے پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے اور ایک ناقد کے لیے بہت پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے اس لیے کہ مالی خوبصورتی کے ساتھ ساتھ باغ کو سجا دیتا ہے اور ایک نرسری کے ماہر کو اس کے مالہٗ وماعلیہ سے واقف ہونا بھی ضروری ہوتا ہے؟

پروفیسر ظفر حبیب: تخلیق اور تنقید کے رشتے پر جو بحث میں نے کی ہے اس میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ایک تنقید نگار بھی تخلیقی ذہن ومزاج کا حامل ہوتا ہے اور ہر تخلیق کار تنقیدی شعور رکھتا ہے۔ آپ

دورانِ مطالعہ یہ محسوس کریں گے کہ جو تنقید نگار وجدان شعری کا مالک ہوتا ہے وہ شعریات پر، اس کی لفظیات پر اور اس کے اندر موجود حسیات پر خوبصورت بحثیں کرتا ہے اور اس کے بخیے بھی سلیقے سے ادھیڑتا ہے۔

اسی طرح ہر تخلیقی فنکار اپنی تخلیق کا خود ناقد ہوتا ہے۔ وہ خود اپنی تحریروں کا تنقیدی جائزہ لیتا ہے۔ وہ الفاظ کے دروبست کو سمجھ سمجھ کر مناسب مقام پر رکھتا ہے اور اس اعتماد کے ساتھ اسے قاری کے سامنے لاتا ہے کہ اس کا ہر کلام اور ہر جملہ حرف آخر ہے۔ اس کے اندر یہ خود اعتمادی اس کے تنقیدی شعور کی دین ہوتا ہے۔

جہاں تک تخلیق کار کے پڑھا لکھا ہونے کی بات ہے۔ یہ لازمہ نہیں ہے۔ اس میں مستثنیات بھی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ کالی داس بہت کم پڑھا لکھا تھا اور نظیر اکبر آبادی کے ان مکاتب و مدارس کا سراغ نہیں ملتا کہ جہاں انہوں نے اکتساب علم کیا ہو۔ احسان دانشؔ راج مستری تھے اور رمزؔ عظیم آبادی سائیس (گھوڑوں کی دیکھ بھال کرنے والا) تھے اور ان کے شاگرد کیفؔ عظیم آبادی کی درزی کی دکان تھی۔

گذشتہ دنوں فریادؔ باروی کی حیات اور شاعری پر ایک تحقیقی کتاب منظرِ عام پر آئی ہے جس کے مطالعہ سے یہ اندازہ ملتا ہے کہ موصوف بہت کم پڑھے لکھے ہونے کے باوجود اردو کے ایک بڑے اور معتبر شاعر تھے۔ شاعر کی حیثیت سے یہ سب کے سب مستند اور معیاری قرار دئے گئے ہیں۔

جہاں تنقید نگار کا بہت پڑھا لکھا ہونا آپ کی نظر میں ضروری ہے تو اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اس کے اندر تخلیقیت کا کا عنصر لازم ہے۔ ورنہ وہ تخلیق کے ساتھ انصاف نہیں کر سکے گا۔ اگر بے ایمان نہیں ہوگا تب بھی اس کی تنقید سکتہ کا شکار ہو جائے گی یا پھر حشو و زواید سے بھر جائے گی۔ سپاس نامہ، خراج عقیدت اور تِل کا تار بنانا تنقید نہیں:

تعریف میں قطرے کو سمندر سے ملا دوں
ذرّے کو جو دوں آب تو گوہر سے ملا دوں

یہ شاعری ہو سکتی ہے تنقید نہیں۔ تنقید تو انتہائی سنجیدہ اور ذمہ دارانہ منصب ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ اس منصب پر فائز ہونے کے لئے وسیع المطالعگی ہونی ہی چاہئے۔

ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی: ادب میں آپ کسی خاص نظریے کے قائل ہیں؟

پروفیسر ظفر حبیب: ہاں! اس نظریۂ حیات کے جو ازلی اور ابدی ہے۔ انسان ایک مخلوق ہے جو اپنے خالق کے ہاتھوں کا کھلونا ہے:

چاہا مجھے گھٹا دیا، چاہا مجھے بڑھا دیا

اس لیے انسان کو اپنی اس حیثیت کا استحضار رہنا چاہئے اور خالق کے منشا کو نظر میں رکھ کر اس پر عمل کرنا چاہئے۔ انسان اس کائنات کو فساد زدہ کرنے نہیں آیا بلکہ اس دنیا کو سجا سنوار کر رکھنا اس کا فریضہ ہے تا کہ پوری

مخلوق کے لیے یہ دنیا 'قابلِ رہائش' بنی رہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب انسان کے پیشِ نظراس کائنات کی تعمیر کا تصور ہو۔اس لیے میں 'تعمیر پسند' ادبی تحریک کا مؤئید ہوں اور اس کائنات کی تعمیر نو کا آرزومند ہوں۔ میں نے کہا ہے:

یہ متاعِ لوح و قلم تمہیں جو حضورِ حق سے عطا ہوئی
وہی تم سے پوچھے گا ایک دن یہ سمجھ کے شعر لکھا کرو

ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی: آپ کی تحریر بطورِ خاص افسانوں میں مذہب کا گہرا رنگ دکھائی دیتا ہے۔ اسلامیت کے ساتھ ساتھ، پریم چند کی اصلاح پسندی بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔کس حد تک ادب کے لیے یہ چیزیں مفید ہیں؟

پروفیسر ظفر حبیب: میرا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ادب بہ حیثیت مجموع افادی اور غیر افادی ہوتا ہے۔علامہ اقبال کے بقول:

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کا دل جس سے دہل جائے وہ طوفاں

میں اسی کا قائل ہوں۔شاعری اور افسانہ نگاری خالص وجدانی کیفیت کا مظہر ہے۔ایک معیاری قلم کار یہ دونوں کام قصداً نہیں کرتا ہے؛ یہ اس سے ہو جاتا ہے۔اس لیے ان دونوں کی رسائی دلوں کی راہ سے دماغوں تک ہوتی ہے جب کہ مقالہ نویسی، مضمون نگاری اور تحقیق وغیرہ اکتسابی اور اختراعی عمل ہے۔ان کے لیے مسلسل مطالعہ اور گہرے مشاہدہ کی ضرورت ہوتی ہے۔طویل اور کثیر مطالعہ اور مشاہدہ کے بعد جو کچھ لکھا جاتا وہ دماغ کے دروازوں پر دستک دیتا ہے اور اسی راہ سے داخل ہو کر دلوں تک پہنچتا ہے۔

گرچہ ان اصناف کو تخلیقی اور غیر تخلیقی کے خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے جب کہ میری نظر میں کوئی بھی تخلیق غیر تخلیقی نہیں ہوتی۔تخلیق کاری کا ملکہ رب العالمین جسے عطا کرتے ہیں تحریری جذبہ اور صلاحیت بھی اسی کے اندر پیدا ہوتی ہے۔اسی تخلیقی اور غیر تخلیقی کے چکر میں اردو والوں کی پوری توجہ دنیا کے دیگر علوم سے ہٹ گئی ہے۔ہاں جو تخلیق خالص ادب کے زمرے میں آتی ہے ان میں آخر الذکر اصناف ادب کو میں زیادہ مفید سمجھتا ہوں۔تنقید تخلیق کے بیش و کم کا جائزہ لیتی ہے۔تخلیق کاروں کی رہنمائی اور ہمت افزائی کرتی ہے۔

تخلیقات کا محاکمہ کر کے اس کی تفہیم کی راہیں ہموار کرتی ہیں۔کم معیاری کی نشاندہی کر کے معیار پسندی کا ذوق پیدا کرتی ہے۔تنقید کے بغیر نہ تخلیق میں نکھار پیدا ہو سکتا ہے اور نہ تحقیق میں وقعت نظر آئے گی۔اس کے باوجود وجدانی اصنافِ ادب بھی اپنی افادیت کی حامل ہوتی ہے۔

تحقیق نئے جہان کی تلاش کرتی ہے۔نا آشنائی کی دبیز چادر ہٹا کر شخصیات اور ان کے کارناموں کو

روشناس خلق کرتی ہے۔ بیچاروں کی چارہ گری کرتی ہے۔ دل و دماغ کو تلاش و تجسس کی جانب آمادہ کرتی ہے۔ نامعلوم اور غیر معروف کو معروف اور معلوم بناتی ہے۔ انسانی شعور کو ترقی کا زینہ بنا کر عروج کی منزلیں طے کراتی ہے۔ اگر اس میں تنقیدی شعور کی کارفرمائی بھی ہو تو یہ کام تنقید سے بھی زیادہ کارِ ہمت بھی ہے اور کارآمد بھی۔

مضمون نگاری ادبی دنیا سے ہٹ کر زندگی اور دنیا کے تمام تر معاملات اور مسائل کا احاطہ کرتی۔ اس میں سیاست، معیشت، عمرانیات، تواریخ، جغرافیہ، سائنس اور ٹکنالوجی سب کچھ شامل ہے۔ آج اردو ادب کے معنی صرف ادبی تحریریں رہ گئی ہیں اور وہ بھی گھٹتی گھٹتی محض شعر و شاعری تک پہنچ چکی ہے جب کہ مذکورہ بالا تمام شعبۂ علم اردو کی راہ دیکھ رہا ہے۔ اردو زبان کو زندہ رکھنے کے لیے مضمون نگاری کا رواج عام کرنا لازم ہے اس لئے اس کی افادیت کو ذہن نشیں کرایا جانا چاہئے۔

ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی: کیا ادب اور مذہب دو متضاد چیزیں ہیں؟

پروفیسر ظفر حبیب: قطعی نہیں۔ دنیا کا تمام بڑا ادبی کارنامہ مذہب کی روح کی آمیزش کا نمونہ ہے۔ ملٹن اور ٹی ایس ایلیٹ کی شاعری ہو یا شیکسپئر اور برناڈ شاہ کا ڈرامہ۔ کالی داس کی شکنتلا ہو یا سورداس کا رام چرت مانس۔ بیشتر الہامی کتابیں ترمیم شدہ اور مسخ شدہ حالت میں ہمارے پاس ہیں اس لیے ان کا حوالہ نہیں دیا جا سکتا البتہ قرآن مقدس پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میری جیسی تین آیات بھی لکھ کر لے آؤ تو دیکھیں۔ قرآن کریم عربی زبان اور اس کی انشاء پردازی کا ناقابلِ تقلید و تردید نمونہ ہے۔ اسے تمام اہلِ زبان نے تسلیم کرلیا ہے۔ اردو زبان میں جو اس کے تراجم ہیں وہ بھی بے مثل ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے تراجم اور تفاسیر پڑھ کر دیکھئے۔ ان کا گہرا شعوری مطالعہ آپ کو ایک بہترین انشاء پرداز بنا کر چھوڑے گا۔ مولانا مودودی کا یہ دعویٰ کہ انہوں نے 'عربی مبین کا ترجمہ اردو مبین' میں کردیا ہے بہ بانگ دُہل ہے۔ نثر کے معیاری ہونے کی پہچان کیا ہے؟ صرف اس کی انشاپردازی جس سے اس میں جاذبیت، اثر پذیری، دلنشینی اور دلربائی پیدا ہوتی ہے۔ ان تفاسیر و تراجم کو بہترین انشاء پردازی کی مثال کے بطور پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے ادب کو مذہب اور مذہب کو ادب میں داخل کر کے شاہکار تخلیقات کو جنم دیا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں متضاد نہیں ایک دوسرے کے معاون اور جلیس ہیں۔

ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی: مذہبی لٹریچر آج ادب بدر کیوں ہے؟

پروفیسر ظفر حبیب: ہماری اپنی غلطی سے۔ سر سید احمد خاں، مولانا حالی، مولانا شبلی نعمانی، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا مودودی، مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا صدرالدین اصلاحی، مولانا صباح الدین عبدالرحمٰن، ڈاکٹر عبدالمغنی، ڈاکٹر سید عبدالباری وغیرہ نثر نگاروں میں۔ شاعروں میں

مولانا حالیؔ، اکبر الہ آبادی، اسمٰعیل میرٹھی، علامہ اقبال، حفیظ جالندھری، نعیم صدیقی، ابوالمجاہد زاہدؔ، حفیظ الدین احسنؔ جیسے ایک سو سے زیادہ شعراء اس وقت اپنی تمام تخلیقی تابانیوں کے ساتھ اردو زبان وادب کے منظر نامہ پر موجود ہیں۔ ان کے بغیر اردو زندہ نہیں رہ سکتی اور یہ سب کے سب تعمیر پسند قلم کار ہیں۔

یہ ضرور ہے کہ ادب مقصدیت کے بغیر وجود نہیں پا سکتا لیکن صرف مقصدیت کی گنگا اگر بہنے لگی تو اس میں سفینۂ ادب کا ڈوب جانا اس کا مقدر ہو جائے گا۔ ترقی پسند ادبی تحریک کا حال دیکھئے ایک بدمست ہاتھی 'پروفیسر کلیم الدین احمد' اس مکان میں داخل ہو گیا اور ساری عمارت ایسی زمین بوس ہو گئی کہ آج تک کسی کے سنبھالے نہ سنبھلی۔ جدیدیت کو دیکھئے مابعد جدیدیت نے اس کے محل کو منہدم کر دیا۔

مابعد جدیدیت اپنی موت آپ مرگئی۔ اب نئی شاعری نئی فکشن نویسی اور نئے ادبیات کا زمانہ آگیا ہے جس کے خمیر میں مذہب پسندی کا آمیزہ نظر آرہا ہے۔ اسے پوری احتیاط اور فنکارانہ صلاحیتوں سے بروئے کار لانے کی ضرورت ہے۔

اور یہ کام اس نئی نسل کے ہاتھوں انجام پذیر ہوگی جو بیسویں صدی عیسوی کے اواخر اور اکیسویں صدی کے اوائل سے رونما ہو رہی ہے یعنی جس کی عمر ابھی پچیس سے پینتیس سال کی ہے۔

ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی: ایک تخلیق کار کے لیے داخلی تحرک کے ساتھ ایکسٹرنل فیکٹرس (External Factors) بھی ضروری ہیں مطلب یہ ہے کہ اہلِ ادب کی جانب سے تخلیقات کی سنجیدہ تفہیم، اس کے حسن و قبح کا برملا اظہار اور حوصلہ افزائیاں وغیرہ؟ اس سلسلے میں اپنا تجربہ بیان کریں؟

پروفیسر ظفر حبیب: تخلیق کار یقیناً داد و ستائش کا تمنائی ہوتا ہے۔ دراصل یہ محرکات داخلی کو مہمیز کرتی ہیں، تشویق کا کام کرتی ہیں اور قلم کاری کا صلہ بنتی ہیں ہمیشہ سے ہی تخلیق کار کا یہی مقدر رہا ہے۔ ان کے علاوہ جو عہدے، اعزازات اور انعامات وغیرہ ہیں ان کی اہمیت کے باوجود وہ سب ضمنی اور فروعی چیزیں ہیں:

بنا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اِتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے؟

کسی شاعر اور ادیب کو اگر 'آبروئے شہر' مل گئی تو ساری محنت اور سر مغزنی کا اسے صلہ مل گیا۔ اس لیے میرے خیال سے ان خارجی محرکات کو زیادہ اہمیت نہیں دی جانی چاہئے۔ جہاں تک معاملہ کاوشوں کے سراہے جانے کا ہے اور اسے داد و ستائش سے نوازنے کی بات ہے تو اب اس کا دائرہ بھی محدود تر ہو چکا ہے۔

اس کے لیے پڑھا لکھا ہونا ضروری نہیں بلکہ یہاں کسی تحریک سے وابستگی، کسی بڑے عہدہ کی فائز المرامی، مال و دولت کی فراوانی وغیرہ کی شرطیں لگی ہوئی ہیں۔ اس کے باوجود جو اچھا اور معیاری ادب ہے وہ کسی نہ کسی دن لائق اعتناء ہو کر رہے گا۔ میں ایک گوشہ میں بیٹھ کر اس پر تجربہ کر رہا ہوں اور کرتا جا رہا ہوں:

تمام عمر کتابوں کے درمیاں گذری
میں ہو سکا نہ کبھی صاحبِ نصاب میاں

جو ہو اصیل حفاظت بھی اس کی لازم ہے
صفات عظمیٰ کبھی بے مقام مت رکھنا

قدم پہ اہلِ نظر کے ہنر کو رکھ دینا
متاعِ فن کو برائے انعام مت رکھنا

آپ نے میرے افسانوں میں گہری مذہبیت کے ساتھ ساتھ پریم چند کا رنگ بھی دیکھا اور اس کے مفید ومضر ہونے کی بات پوچھی ہے۔

میں چاہوں گا کہ گہری کی بجائے مذہبی شعور کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ درسی خطبات میں یہ ایک رسم ہے کہ جسے میں بھی کلاس روم میں ادا کیا کرتا تھا۔ اردو میں افسانہ نگاری کی بات پریم چند کے نام سے شروع کی جاتی ہے اور پریم چند کے اثرات دور تک اور دیر تک تلاش کئے جاتے ہیں۔ ترقی پسندوں نے پریم چند کو اپنا مال ڈکلیر کردیا جب کہ پریم چند خود ایک مذہب پسند فکشن نگار تھے۔ وہ آریہ سماجی تھے۔ راجہ رام موہن رائے کی سماجی اصلاحی تحریک کے پیرو تھے۔ وہ ہندوتو وادی نہیں تھے لیکن ہندو معاشرہ کی خرابیوں کی جڑ اکھاڑنے کے آرزومند تھے۔ تلک اور جہیز کی قبیح رسموں کی قباحت کو انہوں نے اجاگر کیا۔ بیوہ کی حالتِ زار کو بدلنے کی کوشش کی۔ جاگیردارانہ نظام کے استبدادی قدم سے مظلوموں کو نجات دلانے کے آرزومند رہے۔

یہ سب ان کے زمانہ کے نمایاں مسائل تھے لیکن اسی وقت مسلم معاشرہ کا تصور مساوات، اہتمام حیاداری اور انصاف پسندی کی روش بھی قابلِ توجہ تھی۔ فرنگیوں کے مقابلے میں مسلمان جان کی بازی لگائے کھڑا تھا لیکن پریم چند کو مسلمان قصاب نظر آیا، نکاح کی سادگی اور بیوہ کی سرپرستی ودلجوئی کے تصور سے انہوں نے چشم پوشی کی۔ اس لئے میں اعلانیہ یہ کہنا چاہوں گا کہ مجھ پر پریم چند کا کوئی اثر نہیں ہے۔ حقیقت بیانی، سماجی مسائل کا ذکر اور بے حیائی کے نتائج میرے موضوعات ہیں جس میں سب کچھ میرا ہے اور اپنا ہے۔

میری کہانیوں کو ذرا توجہ سے پڑھ کر دیکھئے۔ ہاں! ہمارے ابتدائی افسانوں میں مقصدیت غالب نظر آتی ہے۔ بعد کے دنوں میں آپ دیکھیں گے کہ اس میں احتیاط برتی گئی ہے اور قصہ بُننے کی کوشش زیادہ کی گئی ہے۔ تمام قلم کاروں کے یہاں ایک ارتقائی کیفیت ہوتی ہے وہ میرے یہاں بھی ہے۔

یہ بھی یاد رکھئے کہ میرے بیشتر افسانے پہلے آکاشوانی سے نشر ہوئے ہیں بعد کے دنوں میں رسائل کی

زینت بنے ہیں ۔آ کا شوانی بے حد محتاط ادارہ ہے۔ وہاں سے کسی خاص مذہب کی براہِ راست تبلیغ و تشہیر ممکن نہیں۔ پھر بھی میرے افسانوں کی نشریات یہ ثابت کرتی ہے کہ میں نے مقصدیت کا دامن چھوڑا بھی نہیں ہے اور اس کا ڈھنڈھورا بھی نہیں پیٹا ہے۔ جہاں تک میری تحقیقی کاوشوں کا سوال ہے میں نے یہ عرض کیا ہے کہ یہ کام میں نے حصولِ سند کے لیے نہیں کیا ہے۔ یہ محض میرا ذوق اور جستجو تھا اور آج بھی ہے۔ تقریباً گذشتہ چالیس برسوں سے میں یہ کام کرر ہا ہوں ۔ میرے پاس اس قدر مواد جمع ہو گیا ہے کہ اب ان کی شیرازہ بندی میرے اختیار سے باہر ہو چکی ہے۔ اسی لیے میں نے ریسرچ اسکالروں کا سہارا لیا ہے۔ پانچ کتابیں تیار ہو چکی ہیں اور تقریباً اتنی ہی زیر ترتیب ہیں اس کے باوجود سینکڑوں صفحات میرا منہ تک رہے ہیں۔

اس طرح کا کام بہار کے کئی اضلاع میں ہوا ہے لیکن جس شرح وبست سے میری کاوشیں منظر عام پر آ رہی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں اور جس اعلیٰ پایہ فنکاروں کی دستیابی یہاں ہوئی ہے وہ بھی ایک مثال ہے۔ آپ نے خود ہی فریاؔد باروی، مبارکؔ مونگیری اور مرحوم شعرائے بیگوسرائے کا مطالعہ کیا ہے اور پسند بھی کیا ہے (آپ کے بقول) آپ کے دانشور اساتذۂ کرام نے بھی ان کوششوں کو سراہا ہے۔ یہ ایماندارانہ تحقیقی کوششوں کی داد ہے جسے پا کر قدرے مطمئن ہوں۔

یہ آپ نے سچ فرمایا ہے کہ اس وقت لکھنے والوں کی کثیر تعداد منظرِ عام پر نظر آ رہی ہے۔ البتہ معیاری تصانیف کمیاب ہیں۔ اس کا پہلا سبب نشر و اشاعت کی جدید سہولیات ہیں ۔ دوسری وجہ خاص طور پر زبان وادب کا معلم بننے کے لئے صاحبِ کتاب ہونے کی شرط ہے۔ تیسری سہولت مالی امداد فراہم کرنے والے اداروں کی متعدبہ تعداد ہے اور کبھی کبھی ان اداروں کی بے جا جانبداریاں بھی ہیں۔ انہیں وجہوں سے معیاری تصانیف کم ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی: اردو کا مستقبل؟

پروفیسر ظفر حبیب: اس سوال کا جواب دینے سے قبل میں ایک شعر عرض کرنا چاہوں گا:

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
ادھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

اس وسیع اور عریض کائنات کے لامتناہی آفاق میں اردو کا سورج ہمیشہ کے لیے کبھی نہیں ڈوبے گا۔ ضرورت صرف اس کی ہے کہ اردو والے اس کی اہمیت سمجھیں اس کا حق پہچانیں اور اسے ادا کرنے کی عملی کاوشوں کا مظاہرہ کریں۔ جس سے اردو والے بے نیاز اور بے فکر ہو کر اپنی نسلوں کو بے جڑ کا پودا بنا رہے ہیں۔ اردو سے ان کی یہ بے تعلقی ان کی نسل کو مستقبل کے عفریت کا لقمۂ تر بنا دے گا:

قبضے سے بیچاری امت کے دیں بھی گیا، دنیا بھی گئی

ڈاکٹر فاروق اعظم قاسمی: ادب کے نئے ستاروں کے لئے کچھ پیغام؟

پروفیسر ظفر حبیب: 'ادب کے نئے ستاروں' سے بس یہی عرض کرنا چاہوں گا کہ عجلت پسندی سے کام نہ لیں۔ سیاسی حمایت اور چاپلوسی و خوشامد سے حاصل کردہ شہرت کی جوانمرگی کے تماشے ہر روز ہوتے رہتے ہیں۔ مطالعہ، مسلسل مطالعہ، گہرا مطالعہ اور ہمہ گیر مطالعہ دانشوری کی مرغوب غذا ہے۔

یہ غذا تواتر سے زیر استعمال رہے اور مذکورہ پرہیز کا اہتمام رہے تو پھر جو صحت مند ادب ان قلم کاروں کی رشحات بن کر صفحۂ ابیض پر نمودار ہوں گی ویسا ادب خوش کار بھی ہوگا، خوش گوار بھی ہوگا، قوی الجثہ بھی ہوگا، طرحدار بھی ہوگا اور دیو قامتی بھی اسے نصیب ہوگی۔ اخیر میں خاکسار کے یہ چند اشعار بطورِ توشہ رکھ لیں:

اک حادثہ گذرا ہے کھویا ہے تجھے پاکر
پانے کا ترے ارماں پھر دل میں مچلتا ہے

مانند شمع میں بھی اب عمر گذاروں گا
ہمراہ مرے دیکھوں اب کون پگھلتا ہے

مجھے کتنا مٹاؤ گے اے لوگو
تمہارے بالمقابل صف بہ صف ہوں

چھین لے مجھ سے میرا رختِ سفر
میری جھولی میں آن رہنے دے

سروری مقصدِ حیات نہیں
مجھ کو مولا شِبان رہنے دے

...

Dr Md Farooque Azam Qasmi
RLSY College,Bettiah,
West Champaran-845438(Bihar)
E-mail:faqasmijnu@gmail.com, Mob: 9718921072

ڈاکٹر ریاض توحیدی سے ادبی مکالمہ

شبیر احمد مصباحی

(دراس، کرگل)

عصر حاضر کے علمی وادبی منظرنامے میں ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری اپنی تخلیقی وتنقیدی صلاحیت کی بدولت نہ صرف کشمیر بلکہ عالمی سطح پر اپنی منفرد پہچان بنا چکے ہیں۔

ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری اگرچہ بنیادی طور پر اقبالیات میں ڈاکٹریٹ کر چکے ہیں اور ان کی پہلی تنقیدی کتاب 'جہانِ اقبال' ہی ہے تاہم ایک ادب شناس شخصیت کی حیثیت سے وہ اقبالیات کے علاوہ فکشن اور تنقید میں بھی ایک ممتاز مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔

اب تک ان کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں، جن میں کچھ کے ایڈیشن پاکستان میں بھی شائع ہوئے ہیں اور کئی مقالے اردو کے معیاری رسائل کی زینت بن چکے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب تنقید وتخلیق میں یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ سوشل میڈیا خصوصاً فیس بک کے بین الاقوامی تنقیدی اور افسانوی فورمز میں میں شاذ ہی کوئی ایسا فورم ہو جس میں توحیدی صاحب کو بحیثیت افسانہ نگار اور ناقد مدعو نہ کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں انہیں سیمینارز میں بھی مدعو کیا جاتا ہے۔

ان کا اصل نام اگرچہ 'ریاض احمد بٹ' تاہم وہ اپنے قلمی نام 'ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری' سے مشہور ہیں۔ ان کا تعلق جموں وکشمیر کے ضلع کپوراہ سے ہے اور وہ محکمہ تعلیم (جموں وکشمیر) میں اردو کے سینئر لیکچرر ہیں۔ ان سے ای میل اور موبائل سے براہِ راست رابطہ کیا جا سکتا ہے:

Mob:7006544358, E-mail:drreyaztaeheedi777@yahoo.co

ان سے شبیر احمد مصباحی (دراس، کرگل) نے ان کی ادبی زندگی کے حوالے سے گفتگو کی ہے، یہاں اس گفتگو کے متعلقہ حصہ سوال وجواب کی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

شبیر احمد مصباحی: آپ کی ادبی زندگی کی شروعات کب اور کیسے ہوئی؟ کیا آپ کی زندگی میں کچھ ایسے محرکات ہیں جنہوں نے آپ کو لکھنے پر مجبور کیا؟

ڈاکٹر ریاض توحیدیؔ: کالج سطح پر میں نے مضامین اور افسانے لکھنے شروع کئے جو پہلے مقامی اردو اخبارات میں نکلتے رہے۔ان میں ادبی اور سماجی موضوعات ہوتے تھے۔اس کے بعد یونیورسٹی میں پڑھائی کے دوران ادبی ذوق میں نکھار آیا کیوں کہ وہاں پر ادبی محفلوں اور سیمیناروں میں شمولیت کے محرکات نے علمی وادبی بصیرت میں اضافہ کیا اور معیاری ادب پڑھنے اور لکھنے کی راہیں استوار کر دیں۔

شبیر احمد مصباحی: ادب میں آپ کی پسندیدہ اصناف کون کون سی ہیں؟

ڈاکٹر ریاض توحیدیؔ: شاعری، فکشن، طنز ومزاح، تنقید

شبیر احمد مصباحی: ادب کے علاوہ آپ کن کن موضوعات پر لکھا کرتے ہیں؟

ڈاکٹر ریاض توحیدی: سماجی و دینی موضوعات پر بھی کبھی کبھی لکھا کرتا ہوں۔ کیوں کہ ان موضوعات کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

شبیر احمد مصباحی: آپ نے اپنی ادبی زندگی میں کچھ ہٹ کر لکھنے کی کوشش کی ہو یا آپ کو لگتا ہو کہ آپ نے ایسا کیا ہے تو تھوڑی تفصیل؟

ڈاکٹر ریاض توحیدی: سماجی و دینی مسائل خصوصاً نوجوانوں کی حوصلہ افزائی سے متعلق مضامین جیسے میرا پہلا مضمون روز نامہ سرینگر ٹائمز میں بعنوان 'آج کا اداس نوجوان' شائع ہوا تھا۔

شبیر احمد مصباحی: کن ادباء سے آپ متاثر ہیں؟

ڈاکٹر ریاض توحیدی: طٰہٰ حسین، خلیل جبران، نارتھروپ فرائی، محمود درویش، قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر حامدی کاشمیری، پروفیسر ارتضیٰ کریم۔ پروفیسر قدوس جاوید

شبیر احمد مصباحی: آپ کے پسندیدہ شعراء؟

ڈاکٹر ریاض توحیدی: زہیر ابن سلمی، رومیؔ، سعدیؔ، میرؔ، غالبؔ، علامہ اقبالؔ، جان ڈن، ورڈس ورتھ، مہجورؔ کشمیری وغیرہ۔

شبیر احمد مصباحی: آپ کے ادبی ذوق کو بڑھانے میں کن کن لوگوں کا کردار اہم رہا ہے؟

ڈاکٹر ریاض توحیدی: سبھی لوگوں کا۔ کیوں کہ والد صاحب کی مطالعہ کرنے کی عادت نے مجھے بھی کتاب اور اخبار پڑھنے کا عادی بنا دیا اور اسی عادت کا یہ نتیجہ نکلا کہ میں خود دسویں جماعت سے کتابیں خرید کر

پڑھنے لگا اور اب یہ میرا مشغلہ بن گیا تھا کہ بازار میں شاپنگ کرنے کے دوران میں اولین ترجیع کتاب خریدنے کو دیتا تھا۔ اس کے بعد اساتذہ میں کئی لوگ ایسے ملے جو خود بھی اچھے ادیب اور قلمکار تھے تو ان کی تربیت اور مشوروں سے بھی میرا ادبی ذوق بڑھ گیا۔ جب میری تحریریں رسائل، اخبارات اور سوشل سائٹس پر آنے لگیں تو باذوق لوگوں کی حوصلہ افزائی بھی کارگر ثابت ہوئی۔

شبیر احمد مصباحی: اس طویل ادبی سفر میں کیا آپ کو کبھی یہ محسوس ہوا کہ یہ سب کارِزیاں ہے؟

ڈاکٹر ریاض توحیدی: نہیں، کیوں کہ کسی بھی باشعور سماج کے شعور کو بڑھانے اور پختہ کرنے کے لیے ادب کا ایک اہم رول ہوتا ہے۔

ادب تو خود سماج کا حصہ ہوتا ہے۔ اس لیے میں نے محسوس کیا ہے کہ اچھے اور معیاری ادب کی سماج میں مناسب پزیرائی ہوتی ہے تو میں نے کبھی بھی یہ محسوس نہیں کیا کہ یہ کارزیاں ہے بلکہ اسی کی وجہ سے میری پہچان بن گئی۔ کیوں کہ بہت سارے لوگ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اچھے اچھے عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود گمنام جیسی زندگی گزارتے ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ کاغذ و قلم سے رشتہ استوار نہیں کر سکے۔

شبیر احمد مصباحی: آپ اپنی ادبی زندگی سے کتنے مطمئن ہیں؟ اگر نہیں تو وجہ کیا رہی؟

ڈاکٹر ریاض توحیدی: بے شک مطمئن ہوں۔ کیوں کہ ایک تو مجھے ادب سے رشتہ رکھنے میں ذہنی سکون ملتا ہے جو کہ آج کی اس تیز رفتار زندگی میں کسی نعمت سے کم نہیں ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ ادب یا میری ادبی تحریر کو پڑھنے اور پسند کرنے کا حلقہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جارہا ہے۔ قارئین کی ایک بڑی تعداد کا نہ صرف مثبت رسپانس آتا ہے بلکہ اب تو بیرون ملک حتی کہ یورپ میں بھی میری کتابوں کی ڈیمانڈ ہو رہی ہے۔ تو میں کیسے عدم اطمنانیت کا اظہار کروں۔

شبیر احمد مصباحی: بحثیتِ ایک ادیب آپ کی کوئی ایسی خاصیت جو آپ کو لگے کہ یہ میرے ساتھ ہی خاص ہے؟

ڈاکٹر ریاض توحیدی: اردو سے پیار... کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے اردو میں آگے بڑھنے، روزگار ملنے اور اپنی صلاحیتوں کو سامنے لانے کا موقع ملا۔

شبیر احمد مصباحی: آپ کا پسندیدہ لباس، مشغلہ، رنگ، موسم اور غذا، عطر کون سی ہیں؟

ڈاکٹر ریاض توحیدی: سوٹ، پڑھنا لکھنا، براؤن، نیلا، بہار، چاول اور گوشت، عطر گلاب۔

شبیر احمد مصباحی: اُردو کی موجودہ صورتِ حال سے آپ کتنے مطمئن ہیں؟

ڈاکٹر ریاض توحیدی: ساٹھ فیصدی کیوں کہ نئی نسل نہ صرف اردو کے ساتھ جڑی ہوئی ہے بلکہ اس میں لکھنا پڑھنا اور بولنا بھی پسند کرتی ہے۔ کسی بھی زبان کی زندہ رہنے کی علامت نئی نسل ہوتی ہے۔ اگر وہ اس زبان کو اپناتی اور ارتقا دینے میں عملی حصہ ادا کرتی ہے تو یہ اس زبان کی زندگی کو دوام بخشنے کا عملی ثبوت ہوتا ہے۔ اس لیے میں اردو زبان کے حال اور روشن مستقبل سے بہت حد تک مطمئن ہوں۔

شبیر احمد مصباحی: آپ کی پوری زندگی کا کوئی دلچسپ واقعہ شیئر کریں؟

ڈاکٹر ریاض توحیدی: جب میں دنیا میں آیا۔ ویسے بہت سارے واقعات ہیں۔ تاہم ایک شیئر کرتا ہوں۔ میں جب آٹھویں میں تھا تو میں نے سنا کہ اسکول میں مشاعرہ ہونے جا رہا ہے۔ میں نے ایک ہم جماعت سے پوچھا کہ یہ کیا ہوتا ہے تو اس نے بھی نفی میں سر ہلایا۔ لیکن میرا تجسس برقرار رہا اور ایک استاد سے پوچھ بیٹھا۔ اس نے جب یہ کہا کہ اس میں شاعر لوگ اپنی شاعری سناتے ہیں تو مجھے اپنی نصابی کتابوں میں شامل حمد اور نعت یاد آ گئے۔ میں گھر پہنچ کر لکھنے بیٹھ گیا اور ایک دعا نظم کی صورت میں لکھ دی۔

دو تین دن کے بعد جب مشاعرہ شروع ہوا تو میں شاعروں کے اشعار سے بہت محظوظ ہوا۔ میں اسی استاد کے پاس چلا گیا اور اپنا نام لکھوانے کو کہا۔

وہ پہلے مسکرا دئے کہ کل تک تو اسے مشاعرہ کے بارے میں پتہ تک نہ تھا اور اب شاعر بن کر سامنے آنے کو کہہ رہا ہے۔ خیر اس نے بھی حوصلہ افزائی کی خاطر خود ہی مجھے کلام سنانے کے لئے ڈائس پر بلایا۔ میں بھی بلا سوچے سمجھے کاغذ کھول کر نظم پڑھنے لگا۔

میں حیران ہوا کہ نہ صرف دوسرے لوگوں نے میری ہمت کی داد دی بلکہ اس استاد نے میری نظم کی تعریف کرتے ہوئے کاغذ ہاتھ میں لیکر تصحیح بھی کر دی۔ یہ واقعہ آج بھی مجھے مسکرانے پر آمادہ کرتا ہے۔

شبیر احمد مصباحی: آپ کی کتابیں کہاں کہاں سے شائع ہوئی ہیں؟

ڈاکٹر ریاض توحیدی: میری کتابیں کشمیر، دہلی اور پاکستان سے شائع ہوئی ہیں۔

شبیر احمد مصباحی: نو آموز لکھاریوں اور قارئین کے نام کیا پیغام دینا چاہیں گے؟

جہانِ اردو میں خوش آمدید۔نو آموز لکھاریوں کے لیے میرا پیغام یہی ہے کہ وہ معیاری تحریریں پڑھا کریں۔کیونکہ کوئی بھی تحریر کسی بھی نو آموز کی ذہن سازی کے لیے بڑی اہم ہوتی ہے۔اور اگر انہوں نے غیر معیاری تحریر کا مطالعہ کیا تو ان کی تحریر بھی ایسی ہی بن سکتی ہے۔

اور قارئین کو یہ پیغام دینا چاہونگا کہ وہ اردو کتابیں، رسائل اور اخبارات خریدنے کی عادت ڈالیں اور اچھے ادب کو فروغ دینے میں اپنا سنجیدہ کردار نبھائیں۔علاوہ ازیں جینوئن ادباء وشعراء کی حوصلہ افزائی کرتے رہیں۔کیوں کہ مجموعی طور پر یہ سب اردو زبان وادب کی بقا اور فروغ کا مسئلہ ہے جس کو سبھی شائقین اردو بڑی ذمہ داری سے سمجھیں اور اپنی اپنی سطح پر مثبت رول نبھائیں۔

...

Shabbir Ahmad Misbahi
Dras,Kargil
Mob:8082713692

اسفار

ناقابلِ فراموش سفر

نیاز فتحپوری

سنہ 1909ء میں میرا تعلق ریاست باؤلی کدورہ (بندیل کھنڈ) سے ہوگیا تھا۔ نواب ریاض الحسن خان کا عہد حکومت تھا۔ اس وقت میرے بہنوئی محمد سلیمان خاں مودھا ر ضلع ہمیر پور کے تھانہ میں مامور تھے۔

اور میں ہر پندرہویں دن اپنی بہن کو دیکھنے وہاں چلا جاتا تھا۔ فاصلہ صرف دس بارہ میل کا تھا جسے میں گھوڑے پر طے کرتا تھا۔

میں شام کو کدورہ سے چلا۔ میں جا گیر بیری کے قریب پہنچا جو کدورہ سے صرف تین میل دور تھی۔ تو آفتاب غروب ہو چکا تھا اور رات کا دھندلکا شروع ہوگیا تھا۔ جا گیر بیری ایک اونچی پہاڑی پر دریا کے کنارے واقع ہے اور مودھا جانے کے لیے اس دریا کو عبور کرنا ضروری ہوتا ہے۔

اس دریا کے دونوں کناروں پر دور دور تک ریت پھیلی ہوئی ہے۔ میں ریت کے اس حصے کو معمولاً پیدل طے کرتا تھا تاکہ گھوڑے پر زیادہ بوجھ نہ پڑے۔ لیکن اس مرتبہ دیر ہو جانے کی وجہ سے میں گھوڑے پر سوار رہا اور اس کو تیز تیز چلانے لگا۔

اس دریا کے متعلق مشہور تھا کہ اس کے کناروں پر کہیں کہیں 'چور بالو' بھی پائی جاتی ہے۔ چور بالو سے مراد وہ ریتلا حصہ ہے۔ جو بظاہر صاف اور مسطح نظر آتا ہے لیکن پانی کی سطح سے قریب تر ہونے کی وجہ سے اس کے نیچے دلدل ہو جاتی ہے اور اس پر پاؤں رکھتے ہی آدمی ہو یا جانور اندر دھنسنے لگتا ہے۔

اس مرتبہ چوں کہ مجھے جلدی تھی اس لیے معمولی راستہ سے ہٹ کر میں نے مختصر راستہ اختیار کرنا چاہا اور گھوڑے کو اسی طرف ڈال دیا۔ تھوڑی دور چل کر مجھے ایک ریتلی گڑھا دکھائی دیا اور میں نے گھوڑے کو ایڑی لگائی تاکہ وہ اسے پھاند کر گزر جائے۔

میں تاریکی میں اس کی چوڑائی کا صحیح اندازہ نہ کرسکا۔ زیادہ سے زیادہ میں اسے تین گز کا سمجھتا تھا۔ حالانکہ وہ چھ گز سے کم نہ تھا۔ میرے ایڑ لگانے پر گھوڑے نے جست تو کی لیکن وہ اس فاصلہ کو عبور نہ کرسکا اور اس کے اگلے پاؤں ریتیلے حصے کے اندر ہی رہے۔

اس کے بعد دفعتاً گھوڑا اندر دھنسنے لگا تو مجھے پتہ چلا کہ میں 'چور بالو' میں پھنس گیا ہوں چور بالو سے جان بچانے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے، وہ یہ کہ اس سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں نہ مارے جائیں، ورنہ آدمی اور اندر دھنستا چلا جاتا ہے بلکہ اپنے آپ کو بالو پر چیت یا پٹ ڈال دیا جائے۔

گھوڑا سینہ تک دھنس چکا تھا اور میں بھی اس کے ساتھ گھٹنوں گھٹنوں بالو کے اندر غرق تھا۔ غور کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ گھوڑے کو بچانا تو ممکن نہیں اس لیے اس کے ساتھ اپنی جان کیوں گنوائی جائے۔

میں نے آہستہ آہستہ اپنے دونوں پاؤں رکاب سے الگ کر کے اوپر نکالے اور فوراً چور بالو پر بے حس و حرکت لیٹ گیا۔ اتفاق کی بات کہ اس وقت بیری کے دو راجپوت گھر لوٹتے وقت میرے پاس سے گزرے۔ اور میں نے انہیں آواز دی وہ دونوں دوڑے ہوئے آئے اور انھوں نے اپنی پگڑی کھول کر اس کا سرا میری طرف پھینکا کہ میں اسے مضبوط پکڑ لوں اور جب میں نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا تو انھوں نے مجھے آہستہ آہستہ گھسیٹنا شروع کیا اور میں اس چور بالو سے نکل گیا۔

اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوا کہ گھوڑے کو کیوں کر نکالا جائے۔ اس کے لیے انھوں نے یہ ترکیب نکالی کہ پگڑی کا ایک سرا پھندا بنا کر اس کی گردن میں ڈالا جائے اور اس کو بھی گھسیٹا جائے۔

میں لگام کا جھٹکا دینے لگا مگر گھوڑا تھک کر اس قدر بے جان ہو گیا تھا کہ جھٹکے سے بھی اس کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی اور آخر کار وہ دھنستے دھنستے غائب ہو گیا۔ (ماخوذ)
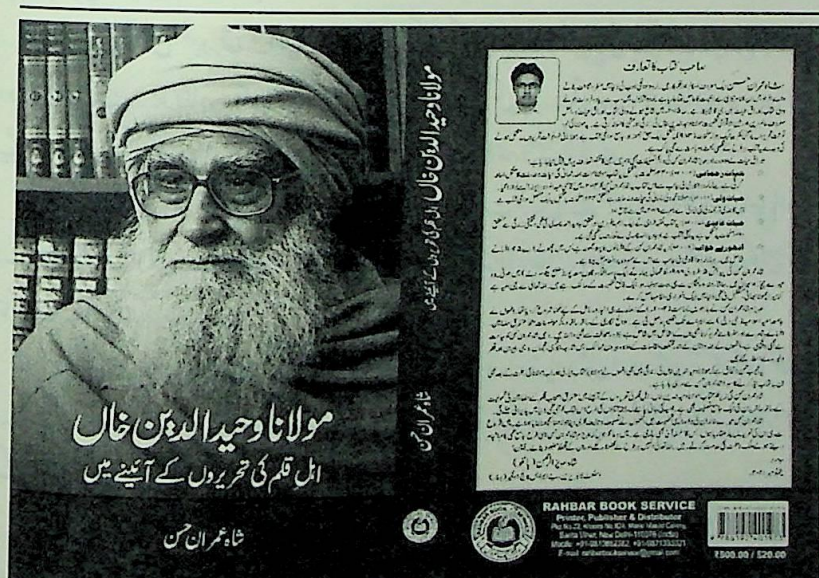
...

نئی دہلی میں بسیرا

شاہ عمران حسن
(ایڈیٹر کتابی سلسلہ آپ بیتی، نئی دہلی)

سنہ 2005ء میں قومی دارالحکومت نئی دہلی کے لیے میرا ایک تاریخی سفر ہوا۔ اس سفر میں متعدد باتیں میرے لیے نہایت اہم ہوئی تھیں۔ یہ پہلا اتفاق تھا کہ جب کہ میں نے نئی دہلی کا سفر کیا تھا، یہ سفر دراصل مولانا منت اللہ رحمانی سیمینار: حیات وخدمات' میں شرکت کے لیے ہوا تھا۔

یہ پہلا اتفاق تھا جب کہ میں کسی سیمینار میں شریک ہوا تھا اور جب میں سیمینار میں شرکت کر کے واپس لوٹا تو مونگیر شہر کے متعدد حضرات نے مجھے مبارک باد دی تھی۔ ریاست بہار کے ضلع مونگیر سے 17 مارچ 2005 کو روانگی ہوئی اور 22 مارچ 2005ء کو اس سفر کا اختتام مونگیر واپسی کے ساتھ ہوا۔ سفر کا پروگرام بننے کے بعد آخری مرحلہ طے ہونے سے قبل میں نے اپنے والد شاہ شبیر حسن کو اس کی اطلاع دی کہ نئی دہلی کے سفر پر جانا چاہتا ہوں، آپ کی کیا رائے ہے؟ میرے والد نے فوراً اس بات کی اجازت دے دی۔

اس سے پہلے میں نے کبھی ریزرویشن ٹکٹ پر سفر نہیں کیا تھا۔ اس لیے تذبذب کا شکار تھا۔ تاہم دوستوں کی رفاقت نے اس کو آسان کر دیا۔ میرے دوست شاہ نواز عالم نے میرے لیے ریلوے اسٹیشن جا کر وکرم شیلا ایکسپریس کا ٹکٹ بنوایا، کیوں کہ میں مصروف تھا۔ وہیں شہر مونگیر کے میرے محسن نصوح بھائی (پیدائش: 1960ء) نے مجھ کو ایک خوبصورت سا قلم دیتے ہوئے کہا کہ تمہیں یہ سفر بہت مبارک ہو، تمہاری زندگی کی کامیابی کا یہ سب سے پہلا قدم ہے۔

جامعہ رحمانی (مونگیر) کے استاذ مولانا حفظ الرحمٰن رحمانی کی امارت میں نئی دہلی کے لیے سفر ہوا۔ میں جمال پور ریلوے جنکشن پر نئی دہلی جانے والی ٹرین وکرم شیلا میں سوار ہو گیا۔ ٹرین وقت پر آئی تھی۔ تاہم پہلا سفر ہونے کے سبب میں ہر چیز کو تجسس بھری نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ سب کچھ بالکل نئی سی لگ رہی تھی۔

میں جس برتھ پر تھا۔ اس کے سامنے والی برتھ پر ایک نوجوان ایک ہندی اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا۔ میں نے اس سے پڑھنے کے لیے ہندی اخبار کا مطالبہ کیا۔ اس کے بعد دونوں کے درمیان حسب ذیل مکالمہ ہوا۔

کیا آپ کو ہندی آتی ہے اور کیا آپ اچھی طرح سے ہندی پڑھ لیتے ہیں؟ اس نے کہا۔

ہاں! میں ہندی پڑھنا لکھنا جانتا ہوں، تاہم آپ نے مجھ سے ایسا سوال کیوں کیا؟ یہ میرا جواب تھا۔

آپ ابھی اردو کی کتاب پڑھ رہے تھے، اس لیے میں نے سمجھا کہ آپ ہندی نہیں جانتے ہوں گے۔ اس نے جواباً عرض کیا۔

میں نے کہا: دیکھئے! ہندی اور اردو زبان دراصل ایک ہی زبان ہے، دونوں زبانوں میں تھوڑا سا فرق ہے۔ یا آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ دونوں زبان میں صرف رسم الخط کا فرق ہے۔ ابھی جو میں آپ سے باتیں کررہا ہوں۔ میں اردو بول رہا ہوں، آپ اس کو ہندی میں سمجھ رہے ہیں۔

میری اس وضاحت کے بعد مذکورہ نوجوان مطمئن ہو گیا۔ اس کا نام سوکیت کمار سنگھ تھا اور اتفاق سے وہ بھی میری طرح علم سیاسیات کا طالبِ علم تھا، اس فرق کے ساتھ میں بی اے کے آخری سال میں تھا اور وہ پہلے سال میں۔

اس نے بتایا کہ اس کا آبائی وطن ہندوؤں کی مقدس سرزمین دیوگھر (جھارکھنڈ) ہے اور وہ وہاں کے مقامی کالج میں زیرِ تعلیم ہے۔ اس کی خواہش پر میں نے اس کی ڈائری میں اردو رسم الخط میں اس کا نام لکھا۔

18 مارچ 2005ء کی صبح کو ٹرین ایک ریلوے اسٹیشن پر رکی۔ میں ٹرین سے پانی لانے کی غرض سے باہر نکلا مگر جب تک ٹرین میں سوار ہوا؛ ٹرین کھل چکی تھی۔ میں نے دوڑ کر ٹرین پکڑی۔ مگر پاؤں میں چوٹ لگ گئی۔ میرا پاؤں معمولی سا زخمی ہو گیا اور کچھ دیر تک اس سے ہونے والی تکلیف کا احساس ہوتا رہا۔

جھگی جھونپڑیوں اور گندی بستیوں کو چھوڑتی ہوئی میری ٹرین خوبصورت عمارتوں اور خوبصورت بازاروں کے شہر نئی دہلی پہنچ گئی۔ نئی دہلی کی سرزمین پر میں نے اپنا پہلا قدم دن کے 11 بج کر 15 منٹ پر رکھا۔ نئی دہلی میں زندگی مختلف آب وتاب کے ساتھ جاری تھی۔ ایک شخص موبائل ٹیلی فون پر گفتگو کرتا ہوا کسی کو دھمکی دے رہا تھا کہ میں تم کو دیکھ لوں گا۔ میں تم سے بہتر طریقے سے بدلہ لے سکتا ہوں۔ تم مجھ سے بچ نہیں سکتے۔

گویا نئی دہلی آنے کے بعد میری آنکھوں نے وہ منظر براہِ راست دیکھا جس کو ابھی تک میں نے فلموں میں دیکھا تھا۔ میں نئی دہلی ریلوے اسٹیشن سے نکل کر محلہ نبی کریم پہنچا۔ یہاں میں نے 'مسجد ہادی علی شاہ' میں جمعہ کی نماز ادا کی۔ اس کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن رحمانی کی امارت میں ایک سائیکل رکشا میں سوار ہو کر بس اسٹینڈ کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں ایک منظر دکھائی دیا۔ ایک شخص کسی کا موبائل فون لے کر بھاگ رہا تھا اور لوگ اس کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ مگر چور تیز دوڑتا ہوا بہت دور نکل گیا، لوگ اس کی رفتار تک نہ پہنچ سکے اور وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ یہ نئی دہلی کا پہلا تجربہ تھا جو مجھ کو حاصل ہوا۔ فلمی دنیا نے لوگوں کی عادتیں خراب کر دی ہیں۔ اگرچہ فلموں کے اندر بے شمار اچھی باتیں دکھائی جاتی ہیں لیکن لوگ بری باتوں کی طرف جلدی متوجہ ہو جاتے ہیں۔

میں نئی دہلی پہنچا تو مٹھو کی بہت یاد آئی۔ مٹھو میرا ایک قریبی دوست تھا، اس کا اصل نام محمد نیاز خان تھا، تاہم لوگ اس کے عرفی نام یعنی مٹھو کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ اس سے میری دوستی سنہ 1994ء میں اس وقت ہوئی تھی جب کہ میں اپنے بڑے چچا پروفیسر شاہ عظیم الرحمٰن کے گھر رہا کرتا تھا۔ جب تک وہ زندہ رہا وہ میرا قریبی دوست بنا رہا۔ وہ تعلیم اور کمائی کی غرض سے 2003ء کے وسط میں نئی دہلی آیا تھا؛ مگر وہ شدید بیمار ہوا اور 29 دسمبر 2003ء کو اس کا انتقال ہوگیا۔ اسے نئی دہلی کے علاقے بدر پور بارڈر کے قبرستان میں دفن کردیا گیا۔ میں نے اس پر ایک تاثراتی تحریر 'آخری خط' تحریر کی جو کہ میرے افسانوی مجموعہ 'ادھورے خواب' (صفحہ:56-39) میں شامل ہے۔

شام کو سات بجے میں نئی دہلی کے علاقہ نظام الدین پہنچا۔ یہاں الرحمٰن گیسٹ ہاؤس میں مولانا محمد ولی رحمانی سے ملاقات ہوئی۔ میں نے انھیں اپنا مقالہ 'مولانا منت اللہ رحمانی اور عالم اسلام' دکھایا۔ انھوں نے اس کو دیکھ کر کہا کہ آپ نے بہت ہی محنت سے یہ مقالہ لکھا ہے۔ میرا یہ مقالہ مولانا منت اللہ رحمانی کی حیات و خدمات پر لکھی گئی 240 صفحات پر مشتمل میری کتاب 'حیاتِ رحمانی' میں شامل ہے۔ رات کو میں نے مولانا حفظ الرحمٰن رحمانی کے ساتھ قیام کیا۔ جہاں میں نے معروف بالی ووڈ اداکار شاہ رخ خان اور اداکارہ پریتی زینٹا کی فلم 'ویرزارا' دیکھی، جو کہ 21 نومبر 2004ء کو ریلیز ہوئی تھی۔ اس فلم میں ایک پاکستانی مسلم لڑکی ایک ہندوستانی ہندو لڑکے سے پیار کرتی ہے۔ پوری فلم اسی کے اردگرد گھومتی رہتی ہے۔ ہندوستانی لڑکا پاکستان میں اپنی محبوبہ کی عزت وعصمت کو برقرار رکھنے کے لیے 22 برس جیل میں گزار دیتا ہے۔ 192 منٹ پر مشتمل اس فلم میں معروف نغمہ نگار جاوید اختر کا ایک نغمہ بہت مشہور ہوا، جس کے پہلے دو شعر یہ ہیں:

دو پل رُکا خوابوں کا کارواں
اور پھر چل دیے تم کہاں ہم کہاں
دو پل کی تھی دلوں کی داستاں
اور پھر چل دیے تم کہاں ہم کہاں

میں 19 مارچ 2005ء کی صبح بذریعہ کار جامعہ ملیہ اسلامیہ پہنچا، جہاں سیمینار ہونا تھا۔ میرے ساتھ کار کے اندر حافظ محمد امتیاز رحمانی اور مولوی ظفر عبدالروف رحمانی بھی سوار تھے۔ انھوں نے دورانِ سفر مجھ سے پوچھا کہ آپ نے کن علماء کرام کو تفصیل سے پڑھا ہے، میں نے کہا کہ مولانا وحید الدین خاں۔ میرے جواب کے بعد وہ خاموش ہوگئے، انھوں نے اس کے بعد مجھ سے پھر کوئی سوال نہ کیا۔

اس سیمینار میں شرکت کے لیے 'آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ' کے رکن شاہ محمد صدیقی بھی مونگیر سے آئے

تھے، جب میں اپنا مقالہ پڑھ کر اسٹیج سے نیچے آیا تو انھوں نے مجھ کو اپنی طرف بلا کر گلے لگا لیا اور شاباشی دیے لگے۔ سیمینار کے اکثر و بیشتر لوگوں نے میری تعریف کی، اس کی وجہ یہ تھی کہ اس سیمینار میں، سب سے کم عمر شخص میں ہی تھا، اس کے باوجود میں نے عمر کے حساب ایک بہتر مقالہ تیار کیا تھا، جس کو اہلِ علم و سیمینار کے شرکاء نے قدر کی نگاہ سے دیکھا تھا۔ سیمینار میں اکثر مقررین اور محررین مولانا منت اللہ رحمانی کی ذات کو آسمان کا فرشتہ ثابت کرنے میں حتی الامکان کوشش کرتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ ان میں بیشتر لوگوں کی باتیں صرف اور صرف لفاظی پر مبنی تھیں، کسی کسی شخص کی کسی بات میں کوئی کام کی بات نظر آ رہی تھی۔ جن لوگوں کے خطاب نے مجھ کو اپنی طرف متوجہ کیا ان میں جماعت اسلامی ہند کے امیر ڈاکٹر عبدالحق انصاری بھی تھے۔ انھوں نے سہل انداز میں مولانا منت اللہ رحمانی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے مراسلات پر گفتگو کی تھی۔

19 مارچ 2005ء کی شب میں نے مولانا حفظ الرحمٰن رحمانی کے ہمراہ ایک ہوٹل میں گزاری۔ ان سے میری باتیں ہو رہی تھیں۔ ٹی وی چل رہا تھا۔ ٹی وی پر پہلی مرتبہ مجھے معروف مفسر و مقرر ڈاکٹر اسرار احمد کی تقریر سننے کا اتفاق ہوا۔ یہ تقریر کیو ٹی وی پر آ رہی تھی۔

اس تقریر میں وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی دینی دعوت کی تفصیل بیان کر رہے تھے۔ اس کے بعد ڈاکٹر اسرار احمد کی تقریر میری نظر سے اکثر گزرتی رہیں۔ تاہم ان کی باتیں مجھ کو بہت زیادہ متوجہ نہ کر سکیں اور کبھی میں ان کو چاہ کر بھی پڑھ یا سن نہ سکا۔ ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک کتاب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کے بارے میں تھی، جس کا نام انھوں نے بڑا عجیب سا رکھا ہے، وہ کتاب میں نے پڑھی ہے، اس کا نام ہے: میں اور مولانا مودودی۔

میں 20 مارچ 2005ء کو مولانا وحید الدین خاں سے ملنے ان کی قیام گاہ پر چلا گیا۔ مولانا وحید الدین خاں کی طبیعت ان دنوں ناساز تھی، اس لیے مولانا کے سیکیورٹی گارڈ نے راقم الحروف سے کہا کہ مولانا صاحب ان دنوں کسی سے نہیں مل رہے ہیں۔ میں نے اصرار کیا اور کہا کہ میں ایک ہزار کلومیٹر دور سے آیا ہوں، اس لیے مولانا سے میرے لیے آج ملاقات کرنا انتہائی ضروری ہے، کیوں کہ کل میں واپس اپنے وطن لوٹ جاؤں گا۔ سیکیورٹی گارڈ کو مجھ پر رحم آ گیا پھر اس نے انٹرکام (intercom phone) کے ذریعہ میری بات مولانا سے کروائی۔ مولانا نے مجھے فوراً پہچان لیا، کیوں کہ میں مسلسل مولانا سے خط و کتابت ہوتی رہی تھی، اس لیے مولانا کو میرا نام از بر ہو گیا تھا اور پھر مولانا کشمیری لباس (فیرن) میں ملبوس سر پر سفید امامہ باندھے مجھ سے ملنے کے لیے ملاقات کے کمرہ میں آئے۔ ابتداً مولانا سے میرا حسب ذیل مکالمہ ہوا۔

السلام علیکم! میں نے مولانا سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔

وعلیکم السلام! مولانا نے مختصر سا جواب دیا۔

میں شاہ عمران حسن ہوں۔ میں مونگیر (بہار) سے آیا ہوں۔ میں نے مولانا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

کیا آپ شاہ عمران حسن کو جانتے ہیں، جو مونگیر میں رہتے ہیں؟ مولانا نے سوال کیا۔

مولانا صاحب! میں ہی شاہ عمران حسن ہوں۔ میں نے جواباً عرض کیا۔

وہ تو بہت سینئر آدمی معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی تحریروں سے ایسا ہی لگتا ہے۔ مولانا نے کہا۔

مولانا کو میری کافی وضاحت کے بعد یقین ہوا کہ یہ وہی شاہ عمران حسن ہے جو برسوں سے انھیں خطوط لکھتا رہا ہے۔ بات دراصل یہ تھی کہ میں جب بھی مولانا کو خطوط لکھتا تھا تو معیاری زبان استعمال کرنے کی کوشش کرتا اور خط کے آخر میں 'طالبِ دعا' کے بجائے 'دعا گو' لکھا کرتا تھا۔ اس لیے مولانا کو شبہ ہوا کہ میں ان سے بھی سینئر ہوں۔ واضح ہو کہ ان پانچ سال (2001 تا 2005ء) کے دوران؛ میں نے مولانا کے نام جو خطوط لکھے، ان کی تعداد تقریباً 250 ہے، شاید کسی اور نے مولانا کو اتنے خطوط اتنے کم وقت میں نہ لکھے ہوں۔ افسوس کہ میرے وہ سارے خطوط ضائع ہو گئے، اب ان میں سے کسی خط کی نقل میرے پاس موجود نہیں ہے۔

میں نے مولانا وحید الدین خاں کے ساتھ ایک گھنٹہ سے زائد وقت گزارا اور مولانا موصوف سے تبادلہ خیال کیا۔ مولانا محترم نے ملاقات کے دوران ایک اہم بات یہ کہی کہ تواضع علم کا دروازہ ہے۔ جس آدمی کے اندر تواضع نہ ہو وہ سچا عالم نہیں بن سکتا۔ علم اور احساس برتری دونوں ایک سینہ میں جمع نہیں ہو سکتے تواضع کی پہچان یہ ہے کہ جب بھی آدمی کو اس کی غلطی بتائی جائے تو وہ فوراً اس کو مان لے اور کہہ دے کہ میں غلطی پر تھا:

I was wrong.

مولانا محترم نے مزید کہا کہ اپنی غلطی کو ماننا کسی شخص کے آگے جھکنا نہیں ہے بلکہ وہ سچائی کے آگے جھکنا ہے، جس آدمی کے اندر اعتراف کا یہ مزاج ہو، اس کا ذہنی ارتقاء مسلسل جاری رہے گا اور جس آدمی کے اندر اعتراف کا مادہ نہ ہو اس کا ذہنی ارتقاء رک جائے گا۔

انھوں نے کہا کہ ایک اصولی بات یہ ہے کہ اگر کسی کی تعریف کرنا ہو تو اس کے لیے کوئی شرط نہیں ہے۔ لیکن اگر کسی پر تنقید کرنا ہو تو اس کے لیے دو کڑی شرطیں ہیں۔ ایک یہ کہ آدمی زیر تنقید مسئلہ کو پوری طرح اور آخری حد تک سمجھے۔ جو کچھ کہے وہ بھرپور معلومات کی بنیاد پر کہے نہ کہ ناقص معلومات کی بنیاد پر۔ دوسری شرط یہ ہے کہ جب آدمی کسی کے اوپر تنقید کرے تو وہ یہ سوچے کہ جو کچھ میں آج کسی کے بارے میں کہہ رہا ہوں کیا وہ خدا کے علم کے مطابق بھی درست ہے۔ ایسا تو نہیں کہ خدا کے یہاں یہ کہہ دیا جائے کہ تمہاری تنقید جھوٹی تھی۔ ان دو شرطوں کو پورا کیے بغیر کسی کے لیے تنقید کرنا جائز نہیں۔

میں نے مولانا سے خط وکتابت کے دوران ان پر نہایت سخت تنقید کی تھی لیکن مولانا سے ملاقات کے بعد میری ساری غلط نہی دور ہوگئی۔ اس ملاقات کے دوران میں نے مولانا موصوف کے سامنے خدا کو گواہ بنا کر حسب ذیل باتیں اپنی ڈائری میں لکھیں، جن کو من وعن یہاں نقل کیا جاتا ہے:

'آج نئی دہلی میں میری ملاقات مشہور عالم دین اور مفکر مولانا وحیدالدین خاں سے ان کی قیام گاہ (سی 29، نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی۔110013) پر ہوئی۔ میں نے ان کے ساتھ ایک گھنٹہ سے زائد وقت گزارا۔ مولانا سے مل کر مجھے از حد خوشی محسوس ہوئی، کیوں کہ مولانا نے مجھ سے بہت ساری نصیحت آموز باتیں کہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ کسی کے جھوٹا ہونے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ وہ کسی سے سنی ہوئی باتوں کو دہرانے لگے۔ انسان کو پہلے تحقیق کرنی چاہئے۔ انھوں نے مزید کہا کہ انسان کو کسی بھی آدمی کی نیت پر حملہ نہیں کرنا چاہئے، بلکہ کسی ثابت شدہ چیز پر بات کرنی چاہئے، کیوں کی کسی کی نیت پر حملہ کرنا خنزیر کا گوشت کھانے کے برابر ہے، اس لیے کہ دل کا حال تو خدا کو معلوم ہے۔ میں نے بھی مولانا وحیدالدین خاں کی ذات کو مجروح کرنے کی کوشش کی تھی۔ اور غلط فہمی کی بنا پر دل تنقید کے بجائے ان پر میں نے تنقیص کی، جس کا احساس مجھ کو آج ہو رہا ہے۔

مولانا موصوف نے اپنی گفتگو میں مجھ سے کہا کہ اب آپ آئندہ ایسی باتوں سے توبہ کریں کہ کسی کی نیت پر حملہ کریں، کیوں کہ نیت پر حملہ کرنا ایک جرم عظیم ہے۔ مولانا نے مزید کہا کہ آپ نے میری نیت پر حملہ کر کے مجھے ایک طرح سے ہلاک کر دیا۔ میں یہ بات تحریر کر رہا ہوں کہ اب میں آئندہ مولانا وحیدالدین خاں یا کسی بھی شخص کی نیت پر حملہ نہیں کروں گا بلکہ کسی ثابت شدہ بات پر پورے دلائل کے ساتھ اصلاح کی نیت سے تنقید کروں گا۔

میں آج بتاریخ 20 مارچ 2005ء کو مولانا موصوف کے سامنے اس بات کا عہد کرتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے ہمیشہ اس عہد پر قائم رہنے کی توفیق دے۔ آمین!

اس ملاقات کا تذکرہ مولانا وحیدالدین خاں نے اپنی ڈائری میں اس طرح لکھا ہے: 20 مارچ 2005ء کو مونگیر (بہار) کے شاہ عمران حسن ملاقات کے لیے آئے۔ 19 مارچ 2005ء کو نئی دہلی میں مولانا منت اللہ رحمانی پر سیمینار رہوا، اس میں شرکت کے لیے وہ نئی دہلی آئے تھے۔ شاہ عمران حسن مجھے 5 سال سے زیادہ مدت سے مسلسل خطوط لکھتے رہے ہیں۔ ان کے اکثر خطوط سخت تنقیدی ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ میری نیت پر بھی سخت حملے کرتے تھے۔ میں ان کے خطوط کا جواب نہیں دیتا تھا۔ ملاقات کے وقت میں نے ان کو سمجھایا کہ گفتگو سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ ابھی تک ایک ناپختہ نوجوان ہیں اور آپ کا مطالعہ بھی محدود ہے۔ آپ کی یہ لیاقت تنقید نگاری کے لیے ناکافی ہے۔ مزید یہ کہ آپ میری نیت پر سخت حملے کرتے ہیں۔ حالاں کہ نیت پر حملہ کرنا سرے سے جائز ہی نہیں۔ ان باتوں کو میں نے مثالوں کے ذریعہ سمجھایا۔

شاہ عمران حسن اپنی روش پر نادم ہوئے۔ انھوں نے اقرار کیا کہ میں غلطی پر تھا۔ اب میں ایسا نہیں کروں گا۔ میں نے ان کو مشورہ دیا کہ فی الحال آپ صرف اپنے 'مطالعہ' کو بڑھائیے۔ اپنے اندر تعلیمی لیاقت پیدا کیجئے۔ جب آپ پختہ عمر کو پہنچ جائیں اور آپ کا مطالعہ بھی زیادہ ہو جائے، اس وقت آپ تنقید کر سکتے ہیں۔ ابھی آپ کے لیے تنقید نگاری کا وقت نہیں آیا ہے۔ انھوں نے میری بات کو مکمل طور پر مان لیا۔

مولانا وحید الدین خیال ابتداً مجھ سے اپنے ملاقات کے کمرہ میں ملے، پھر مجھے وہ اپنے مطالعہ کے کمرہ میں لے گئے۔ مجھے پیاس لگ رہی تھی۔ میں نے کہا کہ مجھے پیاس لگ رہی ہے، مولانا خود اٹھ کر دوسرے کمرے میں گئے اور میرے لیے پانی لے کر آئے اور پانی کا گلاس میری طرف بڑھایا۔ میں نے شکریے کے ساتھ پانی پی لیا۔ جب میری واپسی کا وقت ہوا تو مولانا محترم نے میرے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا کہ آج سے آپ ایک نئی زندگی کی شروعات کریں، خدا آپ کو کامیاب کرے۔

مولانا وحید الدین خاں سے ملنے کے بعد میں نئی دہلی کے مسلم اکثریتی علاقہ بٹلہ ہاؤس گیا، جو کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قریب ایک کثیر آبادی والا محلہ ہے۔ وہاں اپنے بچپن کے دوست محمد افروز عالم اور ان کے بڑے بھائی محمد مناظر حسین سے ملا۔ دن کا کھانا ان کے یہاں کھایا۔

محمد افروز عالم دسویں جماعت میں فیل ہو گیا تھا۔ اس کے بعد اس کے بھائی نے اسے نئی دہلی بلا لیا۔ نئی دہلی سے اس نے دوبارہ اپنی تعلیم کا آغاز نویں جماعت سے کیا۔ فی الوقت وہ بی اے میں پڑھ رہا ہے۔ اس نے دوبارہ ہمت کی اور پھر سے تعلیم کا آغاز کیا۔ اس کی کہانی بتاتی ہے کہ اگر انسان ارادہ کر لے تو اپنی زندگی کا آغاز دوبارہ کر سکتا ہے اور دوبارہ کامیابی حاصل کر سکتا ہے۔

شام کو میں بٹلہ ہاؤس سے فٹ فٹ سیوا (جیپ) میں سوار ہو کر جامع مسجد پہنچا۔ وہاں سے لال قلعہ کے اندر گیا مگر دیر ہونے کے سبب مجھ کو وہاں سے جلدی نکلنا پڑا، کیوں کہ لال قلعہ میں گھومنے کا وقفہ ختم ہو چکا تھا۔ اس لیے لال قلعہ کے اندر گھومنا نہ ہو سکا۔ جامع مسجد اپنے وسیع ممبر و محراب کے ساتھ کھڑی ہوئی بہت ہی جاذب لگ رہی تھی، جس کو میں نے اب تک صرف ٹی وی پر دیکھا تھا۔ جامع مسجد کو جب میں اپنی نظروں سے دیکھ رہا تھا تو جامع مسجد کی پوری تاریخ میری نظروں کے سامنے میں گھومنے لگی کہ کس طرح شاہ جہاں نے اس مسجد کی تعمیر کروائی تھی اور آج یہ ہندوستان کی سب سے بڑی مسجد مانی جاتی ہے۔ ایک سروے کے مطابق اس مسجد میں بیک وقت 25 ہزار نمازی ایک ساتھ نماز پڑھ سکتے ہیں۔ جامع مسجد میں اس کی تاریخ سے متعلق ایک کتبہ دیکھا، جس کے مطابق جامع مسجد کا اصل نام 'مسجد جہاں نما' ہے۔ یہ ہندوستان کے پانچویں مغل بادشاہ شاہ جہاں نے اس کی تعمیر کروائی تھی۔

شاہ جہاں نے 6 اکتوبر 1650ء مطابق 10 شوال 1060 ہجری کو مسجد کا سنگ بنیاد رکھا۔ دنیا بھر کے اعلیٰ ترین ماہرین تعمیرات، بہترین نقاش، سنگ تراش، انجینئر اور بہترین خطاطوں، ممتاز فنکاروں کے علاوہ 6 ہزار مزدوروں نے اس جامع مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا اور 6 سال تک مسلسل اس پر کام ہوتا رہا۔ سنہ 1665ء میں جامع مسجد بن کر تیار ہوئی۔ اس مسجد کی تعمیر میں 10 لاکھ روپے صرف ہوئے۔

جامع مسجد کے پہلے امام سید عبدالغفور شاہ بخاری تھے جو شاہ جہاں کی درخواست پر حدیث شریف کی مشہور کتاب صحیح بخاری کے مرتب محمد بن اسماعیل البخاری (870-810)ء کے وطن بخارا (ازبکستان) سے ہندوستان تشریف لائے اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ وہ 'شاہی امام' کہلائے۔

آج بھی اس مسجد میں امامت کے فرائض انہی کی نسل کے خانوادے انجام دے رہے ہیں۔ جن دنوں میں پہلی دفعہ دہلی آیا تھا اس زمانہ میں جامع مسجد کی امامت کے فرائض مولانا سید عبداللہ بخاری انجام دے رہے تھا۔ ان کا انتقال 18 جولائی 2009ء کو ہو گیا۔ اب ان کے صاحبزادے مولانا سید احمد بخاری یہ فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

21 مارچ 2005ء کی صبح کو نئی دہلی میں زبردست بارش ہوئی۔ میں نے ہوٹل سے بارش کا منظر دیکھا۔ ایک صاحب بارش رکنے کے بعد مجھ کو درگاہ نظام الدین اولیا لے گئے۔ وہاں نظام الدین اولیاؒ کے ساتھ ساتھ ان کے شاگرد خاص امیر خسرو کے مزار کو بھی دیکھنے کا موقع ملا۔ میں جب درگاہ کے اندر داخل ہوا تو نظام الدین اولیا اور حضرت امیر خسرو کے بارے میں پڑھی گئی باتیں یاد آنے لگیں۔ جب شاعر مشرق علامہ اقبال نے محبوب الٰہی کہے جانے والے عظیم بزرگ نظام الدین اولیا کی درگاہ پر 1905ء میں حاضری دی تھی تو ایک طویل نظم 'التجائے مسافر' لکھی، جس کے چند اشعار یہ ہیں:

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا
بڑی جناب تری فیض عام ہے تیرا
ستارے عشق کے تیری کشش سے ہیں قائم
نظامِ مہر کی صورت نظام ہے تیرا
تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی
مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا
نہاں ہے تیری محبت میں رنگ محبوبی
بڑی ہے شان بڑا احترام ہے تیرا

میں نے بچپن میں نظام الدین اولیا کے بارے میں پڑھا تھا۔ انھوں نے کس طرح اپنی والدہ کے سایہ میں رہ کر تعلیم حاصل کی تھی کیوں کہ بچپن میں والد کا سایہ ان کے سر سے اٹھ گیا تھا۔ نظام الدین اولیاء کی پیدائش مختلف تاریخی روایات کے مطابق 27 صفر المظفر 634 ہجری کو ریاست اتر پردیش کے شہر بدایوں میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام سید احمد اور والدہ کا نام بی بی زلیخا تھا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم شہر بدایوں میں ہی حاصل کی۔ یہاں انھوں نے ناظرہ قرآن مکمل کیا۔ اس کے بعد انھوں نے دہلی جاکر مزید تعلیم حاصل کی۔ وہ تصوف وسلوک کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بابا فرید الدین گنج شکر کے دربار میں چلے گئے، وہاں وہ کئی برسوں تک رہے۔ پھر انھوں نے بابا فرید الدین گنج شکر سے بیعت بھی کر لی۔

ایسا کہا جاتا ہے کہ نظام الدین اولیا بابا فرید الدین گنج شکر کے خاص مریدوں میں سے ایک تھے، حتیٰ کہ انھیں خلافت بھی دی گئی۔ 18 ربیع الآخر 725 ہجری کو نئی دہلی میں وفات ہوئی۔ جہاں ان کی درگاہ ہے، وہاں ایک بڑی سی بستی آباد ہوگئی، جو 'بستی حضرت نظام الدین' کہلاتی ہے۔ ان کی زندگی کی کہانی سبق آموز اور کرامات سے بھری ہوئی ہے۔ وہیں ان کے شاگرد خاص امیر خسرو کا مزار ہے، جن کے دوہے میں نے بچپن میں پڑھے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے نظام الدین اولیا کے لیے فارسی میں ایک کتاب قصہ چہار درویش لکھی۔ جس کا اردو ترجمہ جان گلکرانسٹ کی ہدایت پر میر امن دہلوی نے 'باغ و بہار' کے نام سے کیا۔ یہ ترجمہ سنہ 1801ء میں شائع ہوا۔ اردو میں شائع ہونے والی یہ پہلی نثری کتاب بھی مانی جاتی ہے۔

جب میں نے ان عظیم ہستیوں کے مقبرے کا منظر دیکھا تو مجھے کو بہت ہی بھیانک لگا۔ یہاں ہر جگہ شرک کا غلبہ نظر آیا۔ کوئی مزار پر چادریں چڑھا رہا تھا تو کوئی مزار پر سجدہ کر رہا تھا۔ کوئی پھول چڑھا رہا تھا تو کوئی مزار کا طواف کرنے میں مصروف تھا۔

جب کہ دو چینی سیاح ان مقامات کی تصاویر کو اپنے کیمرہ میں قید کرنے میں مصروف نظر آیا۔ میں درگاہ کی زیارت سے باہر نکلا تو میرا ذہن اس سوچ میں غرق تھا کہ لوگ غیر اسلامی اور مشرکانہ حرکتیں اسلام کے نام پر کر رہے ہیں مگر ہمارے علماء دین اور اکابرین ملت کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

نظام الدین درگاہ سے نکلنے کے فوراً بعد قطب الدین ایبک کی بنوائی امارت 'قطب مینار' دیکھنے کی غرض سے میں ایک بس میں سوار ہو کر مہرولی چلا گیا۔ جب مہرولی بس اسٹیشن پر اترا تو دور سے قطب مینار نظر آیا۔ سب لوگ ٹکٹ لے کر اندر جا رہے تھے۔ صرف دس روپے میں ان دنوں انٹری ٹکٹ ہوا کرتا تھا۔ تاہم اندر جا کر قطب مینار کو دیکھنے کی خواہش نہ ہوئی۔ میں فوراً واپسی کے لیے ایک دوسری بس میں سوار ہوا اور بستی نظام الدین لوٹ آیا۔

21 مارچ 2005ء کی شام کو مگدھ اکسپریس سے میری نئی دہلی سے واپسی ہوئی۔ میرے ساتھ حافظ محمد امتیاز رحمانی، مولوی ظفر عبدالروف رحمانی، مولوی محمد اسلم، احتشام عالم رحمانی اور مولانا محمد ولی رحمانی کے باڈی گارڈ ہارون بھائی بھی ساتھ تھے۔ جب میں نے سفر نامہ میں ہارون بھائی کے ساتھ لفظ 'باڈی گارڈ' استعمال کیا تو اس پر مولوی ظفر عبدالروف رحمانی نے کہا یہ لفظ نہ لگایئے۔ حالاں کہ یہ حقیقت تھی کہ ہارون بھائی ان دنوں مولانا محمد ولی رحمانی کے باڈی گارڈ ہوا کرتے تھے۔

راستے میں مولوی ظفر عبدالروف رحمانی سے ان کی طالب علمانہ زندگی پر تفصیل سے گفتگو ہوئی، انھوں نے اپنی تعلیمی سفر کی روداد سنائی۔ وہ مولانا محمد ولی رحمانی سے بہت زیادہ متاثر نظر آئے۔ حتیٰ کہ انھوں نے وضع قطع بھی ان جیسا اختیار کر رکھا ہے۔ پٹنہ میں 22 مارچ 2005ء کی صبح کے وقت سبھی افراد ٹرین سے اتر گئے۔ مولانا محمد ولی رحمانی ایک دوسری ٹرین سے آرہے تھے۔ اس لیے سبھی لوگ ان کا انتظار کرنے لگے۔ برادرم حافظ محمد امتیاز رحمانی سبزی باغ (پٹنہ) جاکر سبھی کے لیے ناشتہ خرید لائے۔ یہ ناشتہ روٹی اور کباب پر مشتمل تھا۔

مولانا محمد ولی رحمانی کی ٹرین کے پٹنہ پہنچنے کے بعد سبھی افراد ان کے ہمراہ اے سی برتھ میں سوار ہو گئے۔ پہلی دفعہ مجھ کو اے سی ٹرین کا تجربہ بھی اسی سفر میں حاصل ہو گیا۔ ٹرین شام کو اندھیرا ہونے کے بعد جمالپور ریلوے جنکشن پہنچی۔ جہاں خانقاہ رحمانی مونگیر کی جانب سے گاڑی منتظر نظر آئی۔

خانقاہ رحمانی پہنچ کر میں نے مولانا محمد ولی رحمانی سے مصافحہ کر کے واپس اپنی قیام گاہ کی طرف جانے لگا تو انھوں نے خانقاہ کی گاڑی میں، مجھ کو گھر تک بھجوایا۔

اس سفر کو کامیاب بنانے میں برادرم حافظ محمد امتیاز رحمانی کا خصوصی تعاون رہا، اگر ان کا ساتھ اور ان کا تعاون بروقت نہ ملا ہوتا تو شاید یہ سفر میرے لیے ممکن نہ تھا۔

...

نئی دہلی کے پہلے سفر کے تقریباً دو سال بعد دوبارہ نئی دہلی جانے کا اتفاق ہوا۔ اس سفر کی مختصر روداد یہاں درج کی جاتی ہے۔ میرا یہ سفر اصلاً جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی میں بی ایڈ میں داخلے کے لیے اہلیتی امتحان دینے کے لیے تھا۔ اس سفر کا سب سے پہلا تجربہ یہ تھا کہ سفر پہ روانگی سے محض ایک دن قبل 8 جون 2007ء کو میرا پاسپورٹ بن کر آیا تھا۔ 9 جون 2007ء کو مونگیر سے نئی دہلی کے لیے روانگی ہوئی اور 16 جون 2007ء کو مونگیر واپسی ہوئی۔ جب مونگیر شہر میں میرے دوستوں کو معلوم ہوا کہ میں مونگیر چھوڑ کر جا رہا ہوں تو مختلف لوگ مجھ کو الگ الگ تحائف دینے لگے۔ میرے دوست محمد سلمان انصاری نے مجھ کو 8 جون 2007ء کو ایک خوبصورت سی

گھڑی تحفتاً عنایت کی، یہ گھڑی کافی دنوں تک میری ضرورت بنی رہی۔

جب میں 9 جون 2007ء کو سفر پر روانہ ہونے لگا تو میرا سب سے چھوٹا بھائی فیضان اداس ہوگیا۔ میں نے اس کو پیار بھری نظروں سے دیکھا اور بسم اللہ کہہ کر گھر سے نکل پڑا۔ 10 جون 2007ء کو میں حافظ خالد کے ساتھ نئی دہلی پہنچا۔ یہاں حافظ خالد کے بھائی شاہد الاسلام نئی دہلی ریلوے اسٹیشن ہمیں لینے آئے تھے۔ ان کے ساتھ روانہ ہوکر ہم ابوہریرہ کی قیام گاہ پر پہنچا۔ یہاں تین راتیں میں نے گزاریں۔

12 جون 2007ء کو جامعہ ملیہ اسلامیہ (نئی دہلی) میں بی ایڈ کا داخلہ امتحان ہوا۔ 13 جون 2007ء کو میں مولانا وحیدالدین خاں سے ملنے ان کی قیام گاہ پر پہنچا۔ ان سے وقت لے کر میں پہنچا تھا۔ یہ ان سے دوسری ملاقات تھی۔ میں وقت لینے کے باوجود تاخیر سے مولانا وحیدالدین خاں کے پاس پہنچا تھا۔ انھوں نے مجھ کو دیکھتے ہی کہا کہ آپ نے بہت دیر کر دی۔ میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ بس کی وجہ سے تاخیر ہوگئی۔ مولانا نے چائے کے سلسلے میں مجھ سے اجازت لینے کے بعد بیل بجائی اور کوئی نوکر آیا۔ انھوں نے، ان سے ڈیڑھ پیالی چائے منگوائی۔ آدھی پیالی انھوں نے خود لی اور ایک پیالی میری طرف بڑھائی۔

انھوں نے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ انسان کو کسی سے بھی شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ نہ مجھ سے نہ کسی اور سے آپ کو شکایت کرنی ہے اور نہ اللہ سے اور نہ رسول سے شکایت ہونی چاہیے۔

مولانا نے مزید کہا کہ بڑی ترقی صرف اس انسان کو ملتی ہے جو اپنے دل کو ہر قسم کی شکایتوں سے پوری طرح سے پاک کرلے۔ بظاہر شکایت کے اسباب موجود ہوں، تب بھی وہ اپنے دل میں کسی کے لیے شکایت کا جذبہ نہ رکھے۔

مولانا نے مجھ سے مزید کہا کہ دو برس پہلے بھی آپ آئے تھے تو میرے قریب ہوکر بیٹھے تھے اور آج بھی آپ آئے تو میرے قریب ہوکر بیٹھے۔ آپ لوگ قریب ہوکر بیٹھنا اچھی بات سمجھتے ہیں، حالاں کہ یہ آدابِ حیات کے خلاف ہے۔

13 جون 2007ء کی ملاقات میں مولانا وحیدالدین خاں نے اپنے رفیقِ خاص مولانا محمد ذکوان ندوی سے میری ملاقات کروائی۔ مولانا محمد ذکوان ندوی نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ یہ ملاقات بعد کے دنوں میں میرے لیے اس اعتبار سے تاریخی ثابت ہوئی کہ 'اوراقِ حیات' کی تیاری میں مولانا محمد ذکوان ندوی کا مجھ کو زبردست تعاون ملا۔

مولانا محمد ذکوان ندوی سے گذشتہ تقریباً ایک ڈیڑھ سال سے میری خط وکتابت ہوتی رہی تھی۔ وہ کئی

سالوں تک سویڈن کے دارالحکومت اسٹاک ہوم میں رہے۔ وہ سویڈش زبان بھی جانتے ہیں۔انھوں نے بذریعہ خط بہت سی باتیں مجھ کو بتائی تھیں۔مثلاً ان کے والد محمد عثمان علی انصاری (وفات:2007) کو اپنے بچوں کے دینی طرز کی بڑی فکر رہتی تھی، وہ دین کے تعلق سے اکثر متفکر رہا کرتا تھے۔اکثر وہ اُلجھ جایا کرتے تھے کہ کس کی فکر کو اپناؤں اور کسے ترک کردوں؟

بالآخر ایک شخص نے انہیں مشورہ دیا کہ اپنے ایک بیٹے کو عالم بنائیں، وہ جب عالم بن جائے اور وہ جو بات کہے اس کو درست مان لیجئے اور حقیقتاً انھوں نے اپنے سب سے بڑے بیٹے محمد ذکوان ندوی کو عالم فاضل بنایا اور جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے صاحبزادے نے ان کے جنازہ کی نماز پڑھائی تھی۔محمد عثمان کی زندگی عبرت انگیز ہے، اس کی تفصیل ماہنامہ الرسالہ جولائی 2007 میں شائع ہو چکی ہے۔

دو پہر کے وقت میں، حافظ خالد کے ساتھ شاہ جہاں کی تعمیر کردہ جامع مسجد کے علاقے میں گیا۔وہاں مسجد سے متصل مولانا ابوالکلام آزاد (1888-1958)ء کے مزار پر بھی گیا، جہاں ایک خوبصورت سا پارک بنا ہوا ہے۔جب میں ان کے مزار پر کھڑا ہوا تو مجھ کو مولانا آزاد کی وہ تقریر یاد آ گئی جو انھوں نے آزادی ہند کے وقت یعنی 1947ء میں کی تھی۔ان کی تقریر کے الفاظ آج بھی ہندوستانی مسلمانوں کو دعوتِ فکر دے رہے ہیں۔ان کی تقریر کا ایک حصہ یہ تھا:

"تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں پکارا اور تم نے میری زبان کاٹ لی۔میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کر دیے۔میں نے چلنا چاہا تم نے میرے پاؤں کاٹ دیے، میں نے کروٹ لینا چاہی تو تم نے میری کمر توڑ دی۔حتیٰ کہ پچھلے سات سال کی تلخ نوا سیاست جو تمہیں آج داغِ جدائی دے گئی ہے اس کے عہدِ شباب میں بھی میں نے تمہیں ہر خطرے کی شاہراہ پر جھنجھوڑا لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعراض کیا بلکہ منع وانکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں۔نتیجہ معلوم کہ آج اُنہی خطروں نے تمہیں گھیر لیا ہے جن کا اندیشہ تمہیں صراطِ مستقیم سے دور لے گیا تھا۔" سچ پوچھو تو اب میں ایک جمود ہوں یا ایک دور افتادہ صدا جس نے وطن میں رہ کر بھی غریب الوطنی کی زندگی گزاری ہے۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ جو مقام میں نے پہلے دن اپنے لیے چُن لیا تھا، وہاں میرے بال و پر کاٹ لیے گئے ہیں یا میرے آشیانے کے لیے جگہ نہیں رہی بلکہ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میرے دامن کو تمہاری دست درازیوں سے گلہ ہے۔میرا احساس زخمی ہے اور میرے دل کو صدمہ ہے۔سوچو تو سہی؛ تم نے کون سی راہ اختیار کی۔کہاں پہنچے اور اب کہاں کھڑے ہو؟ کیا یہ خوف کی زندگی نہیں اور کیا تمہارے حواس میں اختلال نہیں آ گیا۔یہ خوف تم نے خود فراہم کیا ہے۔میں نے ہمیشہ کہا اور آج پھر کہتا ہوں کہ تذبذب کا

راستہ چھوڑ دو۔ شک سے ہاتھ اٹھالو اور بے عملی کو ترک کر دو۔ یہ تین دھار کا انوکھا خنجر لوہے کی اس دودھاری تلوار سے زیادہ کاری ہے جس کے گھاؤ کی کہانیاں میں نے تمہارے نوجوانوں کی زبانی سنی ہیں۔'

'یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے، اس پر غور کرو۔ تمہیں محسوس ہوگا کہ یہ غلط ہے۔ اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو اور پھر دیکھو کہ تمہارے یہ فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں۔ آخر کہاں جارہے ہو اور کیوں جارہے ہو؟ عزیزو! تبدیلیوں کے ساتھ چلو۔ یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لیے تیار نہ تھے۔ بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے لیکن سورج تو چمک رہا ہے۔ اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے۔ آؤ عہد کرو کہ یہ ملک ہمارا ہے۔ ہم اسی کے لیے ہیں اور اِس کی تقدیر کے بنیادی فیصلے ہماری آواز کے بغیر ادھورے ہی رہیں گے۔'

'عزیزوں! میرے پاس تمہارے لیے کوئی نیا نسخہ نہیں ہے۔ 1400 برس پہلے کا نسخہ ہے۔ وہ نسخہ جس کو کائناتِ انسانی کا سب سے بڑا محسنؐ لایا تھا۔ وہی نسخہ تمہاری حیات کا ضامن اور تمہارے وجود کا رکھوالا ہے۔ اسی کا اتباع تمہاری کامرانی کی دلیل ہے۔'

اگر مولانا ابوالکلام آزاد کی باتوں پر عمل کیا جاتا تو آج ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ دوسری ہوتی۔ مولانا ابوالکلام آزاد جہاں تقسیم ہند کے مخالف تھے، وہیں وہ ہندوستانی مسلمانوں کی پاکستان ہجرت کے بھی سخت مخالف تھے۔ وہ ہرگز یہ نہیں چاہتے تھے ہندوستان کے مسلمان یہاں سے ہجرت کر جائیں۔ غرض کہ مولانا ابوالکلام آزاد ہماری ہندوستانی تاریخ کا ایک بہت ہی باوقار نام ہے۔

میں مولانا ابوالکلام آزاد کو بچپن سے ہی پڑھتا آیا ہوں۔ میں نے ان کی کتاب 'قولِ فیصل' اس زمانہ میں پڑھی تھی، جب کہ ابھی میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔

14 جون 2007ء کو حافظ خالد مونگیر (بہار) کے لیے روانہ ہوگئے۔ میں انہیں نئی دہلی ریلوے اسٹیشن پر چھوڑنے کے بعد واپس نظام الدین لوٹ آیا۔ میں نے تبلیغی جماعت کے ہیڈ کوارٹر بنگلہ بالی مسجد میں رات گزاری۔ یہ پہلا اور آخری موقع تھا جب کہ میں بنگلہ والی مسجد میں رات گزاری تھی۔ وہاں کا منظر بڑا ہی الگ تھے۔ یہاں لوگ ہمہ وقت عبادت میں مشغول نظر آئے۔ مسجد کے اندر بیشتر افراد جماعت میں آئے ہوئے تھے جب کہ میں تو ایک مسافر تھا، جو زبردستی مسجد میں رات بتانے کے لیے رک گیا تھا۔ مجھ پر رات بھر غنودگی طاری رہی، یہاں تک کہ فجر کا وقت ہوگیا، میں نے فجر کی نماز ادا کی، بیان سنے اور مسجد سے نکل پڑا۔

بنگلہ والی مسجد کی ہر چیز اچھی تھی مگر یہاں کی گندگی سے میں متوحش ہوگیا۔ کاش صفائی کو نصف ایمان

سمجھنے والی قوم عملاً صفائی کے لیے کمر بستہ ہوتی تو دیگر اقوام کو یہ کہنے کا موقع نہ ملتا کہ مسلمان عموماً گندی بستی رہتے ہیں۔

خیال رہے کہ ہندوستان کے اندر بیسویں صدی عیسوی کی ابتدا میں مسلمانوں کی اصلاح کے لیے جو تحریکیں و تنظیمیں شروع ہوئیں ان میں سے ایک اہم اسلامی اصلاحی تحریک 'تبلیغی جماعت' ہے، جسے اس وقت کے نامور عالم دین مولانا محمد الیاس کاندھلوی نے اپنی فہم و فراست سے شروع کیا۔ ابتداً اس کا کام ہریانہ (ہندوستان) کے دور اُفتادہ علاقہ 'میوات' سے شروع ہوا۔ اس کے بعد بہت جلد یہ اصلاحی تحریک دُنیا کی ایک بہت بڑی مسلم آبادی تک پہنچ گئی۔ مسلم آبادی کا شاید ہی کوئی خطہ اس دنیا میں موجود ہے جہاں اس تحریک کو کامیابی نہ ملی ہو۔ ساری دنیا میں اس کے کام کا استقبال کیا گیا کیوں کہ اس کا بنیادی کام مسلمانوں کو دین کے بنیادی احکام یعنی صوم و صلوٰۃ سے جوڑنا تھا۔

تبلیغی جماعت ایک اصول کے تحت اپنا کام کرتی ہے جسے چھ نمبر کہا جاتا ہے: (1) اخلاصِ نیت (2) اکرامِ مسلم (3) علم و ذکر (4) نماز (5) ایمان (6) دعوت و تبلیغ۔

تبلیغی جماعت اپنا سارا کام مذکورہ بالا اصول کے مطابق کام کرتی ہے۔ اس سے وابستہ افراد ایک مخصوص مدّت کے لیے اپنے گھر سے نکل کر مسجد میں قیام کرتے ہیں۔ ان کے دورے کی مدت تین دن، دس دن، چالیس دن اور چار ماہ تک ہے، جہاں فقہ حنفی کے مطابق انھیں دینی احکام سکھائے جاتے ہیں اور ان میں سب سے زیادہ نماز سیکھنے سکھانے پر زور دیا جاتا ہے اور فضائل والی باتوں پر بہت زیادہ توجہ دی جاتی ہے اور تبلیغی نصاب کے طور پر مولانا محمد ذکریا کاندھلوی کی مرتب کردہ کتاب 'فضائل اعمال' اجتماعی طور پر پڑھی جاتی ہے اور اس کی باتوں کو سمجھایا جاتا ہے کہ تبلیغی جماعت کے مطابق مسلمانوں کو کیسا ہونا چاہیے۔

تبلیغی جماعت کو تقریباً ہر علاقہ میں قبولیت ملی، ہند و پاک کے تقریباً تمام مکاتبِ فکر نے اِس کو ایک مستحسن اصلاحی دینی کوشش کے طور پر دیکھا اور مسلم عوام کی بہت بڑی تعداد نے اس کی دعوت پر لبیک کہا۔ ہند و پاک کے جن اہم اربابِ حل و عقد نے اس تحریک کو سراہا اور اس کو ایک مفید تحریک قرار دیا، ان میں مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا شاہ وصی اللہ، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا اسعد اللہ، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ظفر احمد تھانوی، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا سید یوسف بنوری، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا مفتی محمود الحسن، مولانا محمد ذکریا کاندھلوی، حکیم محمد سندیلوی، مولانا محمد منظور نعمانی، مولانا شاہ معین الدین ندوی، مولانا سعید الاعظمی ندوی، مولانا اخلاق حسین قاسمی، مولانا سعید احمد اکبر آبادی، پروفیسر خلیق

احمد نظامی، مولانا قاضی زین العابدین میرٹھی، مولانا محمد عاشق الٰہی بلند شہری، مولانا محمد ظفر احمد عثمانی، مولانا وحید الدین خاں، وغیرہ کا نام اہمیت کا حامل ہے کیوں کہ ان حضرات نے تحریری طور پر مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی جاری کردہ اصلاحی تحریک 'تبلیغی جماعت' کا تحریری طور پر اعتراف کیا۔

مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی زندگی ہی میں تبلیغی جماعت کو مقبولیت ملنی شروع ہوگئی تھی۔ 12 جولائی 1944ء کو ان کی وفات ہوگئی، ان کی وفات کے بعد تبلیغی جماعت کی امارت اُن کے صاحبزادے مولانا محمد یوسف کاندھلوی نے سنبھالی اور اس تحریک میں مزید وسعت دی۔ یہاں تک جب ان کی وفات 1965ء میں ہوئی تو یہ ایک معروف تحریک بن چکی تھی۔

مولانا محمد الیاس کاندھلوی کی وفات کے بعد 1946ء میں مولانا علی میاں نے ان کی حیات و خدمات پر 328 صفحات پر مشتمل مفصل سوانحی کتاب 'حضرت مولانا محمد الیاس اور اُن کی دینی دعوت' لکھی، جس پر مولانا علی میاں کے ساتھی مولانا محمد منظور نعمانی نے 30 مارچ 1946ء کو ایک مبسوط مقدمہ تحریر کیا اور جب 1947ء میں کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہونے لگا تو اس پر مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا علی میاں کی فرمائش پر مئی 1947ء میں اپنا تاثر کتاب اور تبلیغی جماعت کے حوالے سے لکھا۔ تبلیغی جماعت کو جاننے اور سمجھنے کے لیے یہ کتاب سب سے اہم مانی جاتی ہے، اس کتاب کی اشاعت کے بعد ہی تبلیغی جماعت پر کئی کتابیں شائع ہوئیں مگر مولانا علی میاں کی تحریر کردہ کتاب اس سلسلے میں نقشِ اوّل کا درجہ رکھتی ہے اور تبلیغی جماعت کو تاریخی تناظر میں جاننے کا یہ کتاب واحد ذریعہ ہے۔

تبلیغی جماعت کے تعارف پر دوسری کتاب وہ مانی جاتی ہے جسے عبدالمجید خطیب ویلوری نے تبلیغی جماعت سے متعلق ہندوپاک کے متعدد اہل قلم اور علماء کے مضامین اور مقالے کا مجموعہ بعنوان 'تحریک دعوت و تبلیغ' مرتب کیا جو ادارہ دارالخطیب، ویلور سے فروری 1985ء میں شائع ہوا۔ جس میں کل 128 صفحات ہیں۔

تبلیغی جماعت کے تعارف پر تیسری کتاب 'تبلیغی تحریک' جسے مولانا وحید الدین خاں نے تحریر کیا تھا۔ یہ کتاب 1986ء میں مکتبہ الرسالہ، نئی دہلی سے شائع ہوئی، اس کتاب میں کل 96 صفحات ہیں، اس کا انگریزی ایڈیشن بعنوان تبلیغی موومینٹ (Tablighi Movement) بھی شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہو چکا ہے۔ 1960ء کی دہائی میں مولانا وحید الدین خاں تبلیغی جماعت سے وابستہ ہوئے اور اس کے تحت کئی اسفار کئے اور اس پر اخبار و رسائل میں مضامین لکھے جو کتاب مذکور میں شائع ہوئے۔ تبلیغی جماعت کے تعلق سے یہ ایک معلوماتی، مفید اور اہم کتاب مانی جاتی ہے۔ تبلیغی حلقوں میں اِس کا مطالعہ خصوصیت سے کیا جاتا ہے کیوں کہ

اس میں سادہ انداز میں تبلیغی جماعت کی تاریخ اور خصوصیت اور افادیت کو بیان کیا گیا ہے۔ تبلیغی جماعت کے تعلق سے لکھا ہوا مولانا وحید الدین خاں کا 22 صفحات پر مشتمل مضمون 'دو دن نظام الدین میں' بہت مشہور ہوا جو متعدد اخبار ورسائل اور کتابوں میں نقل کیا گیا۔ جس میں انھوں نے لکھا: 'تبلیغی جماعت مسلمانوں میں دینی بیداری کا کام نہایت کامیابی کے ساتھ کررہی ہے۔ اس کی کامیابی کا خاص راز وہ 'تدبیر' ہے جس کو اس سلسلے میں اس نے اختیار کی ہے۔ اس کی تدبیر یہ ہے کہ لوگوں کو اُن کے ماحول سے نکال کر باہر لے جایا جائے، آدمی اپنے ماحول میں دنیوی مسائل میں مشغول رہتا ہے۔ اس کا ذہن دینی امور پر سوچنے کے لیے فارغ نہیں ہوتا۔ مگر جب وہ اپنے ماحول کو چھوڑ کر باہر کی دنیا میں آجاتا ہے تو اس وقت اس کا ذہن اس قابل ہو جاتا ہے کہ جو کچھ اس سے کہا جائے اس کو سُنے اور پکڑ لے۔' (تحریک دعوت وتبلیغ، عبدالمجید خطیب ویلوری، صفحہ:89، ماہنامہ الرسالہ، جولائی 1983ء، صفحہ:2)

مولانا وحید الدین خاں نے بنگلہ والی مسجد کے حوالے سے مزید لکھا تھا کہ نظام الدین آج ایک ملک گیر بلکہ عالم گیر تحریک کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اس کی مثال قلب کی سی ہے۔ جس طرح قلب سے خون چلتا ہے اور سارے جسم میں گھوم کر پھر قلب کی طرف واپس آتا ہے۔ اسی طرح بے شمار انسان بنگلہ والی مسجد سے نکل نکل کر دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلتے ہیں اور پھر واپس آکر نئی قوت لیتے ہیں اور دوبارہ اپنے تبلیغی سفر کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں۔ یہاں ایک ایسی حرکت کے سرے ملتے ہیں جس کا آغاز تو ہے مگر جس کا اختتام نہیں۔ (تبلیغی تحریک، مولانا وحید الدین خاں، صفحہ:60)

میرے علم کی حد تک تبلیغی جماعت کے بارے میں باضابطہ تین معتبر کتابیں شائع ہوئی ہیں، میں نے اس موضوع پر مزید کتاب حاصل کرنی چاہی مگر دستیاب نہ ہوسکی، ممکن ہے کہ شائع ہوئی ہوں اور میری رسائی نہ ہوسکی ہو، تاہم مذکورہ بالا تین کتابیں تبلیغی جماعت کو ہر اعتبار سے سمجھنے کے لیے کافی ہیں۔

15 جون 2007ء کو میں ایک ٹرین میں سوار ہو گیا۔ وہاں سے 16 جون 2007ء کو پٹنہ پہنچا۔ وہاں میں نے اپنے بھائیوں کے لیے کھانے پینے کی کچھ چیزیں خریدیں، پھر ٹرین میں مونگیر جانے کے لیے سوار ہو گیا۔ رات کو ساڑھے آٹھ بجے گھر پہنچا کھانا کھا کر تھوڑی دیر سب لوگوں سے باتیں کیں، اس کے بعد اپنے بستر پر آ گیا۔ مونگیر میں چند روز قیام کے بعد 21 جون 2007ء کو میں اپنے سب سے چھوٹے بھائی فیضان کو لے کر سعد پور گیا۔ وہاں 22 جون 2007ء کو فیضان کا ختنہ ہوا۔ 26 جون 2007ء کو واپس مونگیر لوٹ آیا۔

...

نئی دہلی میں مستقل قیام کی غرض سے میرا سفر 4 جولائی 2007ء کو ہوا۔ 5 جولائی 2007ء کو میں نئی دہلی پہنچ گیا۔ اس کے بعد میں مستقل طور پر نئی دہلی میں رہنے لگا۔ 3 جولائی 2007ء کو مونگیر میں میرے باضابطہ قیام کی آخری رات تھی، کیوں کہ اس کے بعد مجھے اپنے شہر چمن مونگیر کو چھوڑ کر ایک جنبی شہر کو اپنانا تھا۔ وہ رات بہت ہی بے چینی میں گزری۔

مونگیر میں گزاری ہوئی باتیں بے پناہ یاد آرہی تھیں۔ مجھ کو خاص طور پر اپنے گھر والوں سے دور جانے کا غم ستا رہا تھا۔ ان سب لوگوں سے دور جانا تھا، جن کے ساتھ میں ایک لمبی مدت تک رہا۔ میرا چھوٹا بھائی جو مجھ پر جان چھڑکتا تھا۔ ان سے دور جانا تھا۔ مجھے وہ بات بھی یاد آرہی تھی جب میری والدہ نے فیضان کے 'بھائی جان' کہنے پر ہی تھی، اب بھائی جان کہاں؟ اب تو وہ جا رہے ہیں۔

میں بھی نئی دہلی آنے سے پہلے کبھی کبھی فیضان کو بول دیتا تھا کہ اب میں دور چلا جاؤں گا، بہت دور چلا جاؤں گا۔ انتہائی اضطرابی کے عالم میں رات بتانے کے بعد میں 4 جولائی 2007ء کو ایک اجنبی سے شہر نئی دہلی کے لیے نکل پڑا۔ میرا دل غم گین تھا اور مستقبل کے اندیشے میرے ذہن کے اندر حساب و کتاب کرنے میں مصروف تھے۔

نئی دہلی میں قدم رکھنے کے بعد جب میں نے ابوالفضل انکلیو کی عمارت (جے۔68) کی تیسری منزل سے باہر کی دنیا کا منظر دیکھا تو میں نے سب سے پہلے یہی سوچا کہ میں اپنے بھائیوں کو بھی یہاں لاؤں گا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ مجھے خود یہ نہیں معلوم تھا کہ رات کو میں کہاں قیام کروں گا؟

جب میں مونگیر سے نئی دہلی کے لیے روانہ ہوا تو مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ میں رات کہاں بتاؤں گا، رات کو میرا قیام کس کے یہاں ہوگا؟ بے یار و مددگار اپنے رب کریم کے بھروسے مونگیر سے چل پڑا تھا۔ اگرچہ میرے پاس دس ہزار روپے نقد تھے۔ میرے ذہن میں اپنے والد کی ایک بات یاد آرہی تھی کہ اسٹیشن سے نکل کر شہر میں داخل ہونے والے لوگوں کی ضرورتیں خدا پورا کر رہا ہے، پھر وہ تمہاری ضرورت کیوں نہیں پوری کرے گا؟

جب میں نئی دہلی ریلوے اسٹیشن سے اترا تو مجھے نہیں معلوم تھا کہ میں کہاں جاؤں گا؟ میرے ساتھ حافظ خالد بھی تھے، ان کے چھوٹے بھائی شاہد الاسلام انھیں لینے آیا تھا۔ میں اُن کے ہمراہ جامعہ نگر کے ابوالفضل انکلیو (اوکھلا، نئی دہلی) چلا گیا۔ وہاں میں ان کے ساتھ پلٹو بابو (مونگیر) کے صاحبزادے ابو ہریرہ کی قیام گاہ (جے۔68) پر پہنچا۔ ابو ہریرہ نے مجھے کو دیکھ کر کسی سے کہا کہ میں نے یہاں لنگر نہیں کھول رکھا ہے کہ جو چاہے، آکر یہاں رہنے لگے۔

نئی دہلی آنے کے بعد جوسب سے تلخ تجربہ ہوا، وہ ابو ہریرہ کا جملہ تھا جو میری یادوں میں آج بھی محفوظ ہے اور شاید مرتے دم تک یاد رہے گا۔ ابو ہریرہ کی بات کا میں نے کوئی جواب نہیں دیا، بلکہ خاموشی سے اس کی بات سنی ان سنی کر دی، تاہم اس کے جملے نے ایک سبق کو تو ضرور دیا کہ اس دنیا میں اپنا وجود بنانا ہوگا، اس کے بعد لوگ آپ کو اہمیت دیں گے۔

نئی دہلی میں ان دنوں میرا ایک دوست محمد افروز عالم رہا کرتا تھا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں زیر تعلیم تھا۔ نئی دہلی کے اپنے پہلے سفر (2005ء) کے دوران میری ان سے ملاقات ہو چکی تھی۔

میں شام کے وقت بٹلہ ہاؤس (نئی دہلی) میں واقع ان کی قیام گاہ (ایم۔43) پر پہنچا۔ میرے پاس کوئی سامان نہیں تھا، بس ایک چھوٹا سا بیگ تھا۔ چند دنوں کے لیے رہنے کے لیے اس سے گفت وشنید ہوئی۔ محمد افروز عالم اور ان کے بڑے بھائی محمد مناظر حسین مجھے رات میں ٹھہرانے کے لیے راضی ہو گئے۔ اس طرح میں نے 5 جولائی 2007ء کی شب افروز عالم کی قیام گاہ پر گزاری۔ جن دنوں میں نئی دہلی آیا، میرا ایک قریبی دوست اعجاز احمد صدیقی مونگیر میں تھا۔

ان سے مونگیر میں میری یہ بات طے ہوگئی تھی کہ میں ان کے ساتھ نئی دہلی میں ان کے کرائے کی قیام گاہ پر مشترک طور پر رہوں گا اور انھوں نے بھی اس بات کے لیے رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ چنانچہ میرے آنے کے ایک ہفتہ بعد اعجاز احمد صدیقی جب مونگیر سے نئی دہلی آئے تو میں ان کے ساتھ منتقل ہو گیا۔

اعجاز احمد صدیقی کے نئی دہلی آنے سے قبل میں نے محمد افروز عالم کے یہاں مسلسل چار شب (5 تا 8 جولائی 2007ء) قیام کیا۔ اس کے بعد 9 جولائی 2007ء کو ابوالفضل انگلیو میں واقع اس کے کرائے کی قیام گاہ (کے۔84) میں منتقل ہو گیا۔ جہاں مسلسل 27 نومبر 2007ء تک ان کے ساتھ رہا بقول وسیم بریلوی:

رات تو وقت کی پابند ہے ڈھل جائے گی
دیکھنا یہ ہے چراغوں کا سفر کتنا ہے

...

Shah Imran Hasan
New Delhi-110076,
E-mail:sihasan83@gmail.com,
Mob:9810862382

معرفت کا سفر

حمید اللہ حمید
(بیروہ، بڈگام، جموں و کشمیر)

گاندھی گرام رورل یونیورسٹی (Gandhigram Rural University) اور دھرم بھارتی مشن (Dharma Bharathi Mission) کے تعاون سے دینڈی گُل (تمل ناڈو) میں یکم تا 3 فروری 2008ء ایک سیمینار منعقد ہوا۔ اس سیمینار میں مجھے شمولیت کا موقع نصیب ہوا۔ میں نے دعوتی جذبہ کے پیش نظر اس لمبے سفر کا فیصلہ کیا۔ دعوتی مقصد کے تحت عصری اسلوب میں تیار کردہ مولانا وحید الدین خاں کا لٹریچر کافی تعداد میں ساتھ اٹھایا۔

31 جنوری 2008ء کی شام، جب میں گاندھی گرام رورل یونیورسٹی پہنچا تو ایک خوف سا طاری ہوا؛ اکیلا مسلم ممبر اور وہ بھی شورش زدہ کشمیر سے۔ اس خیال نے مجھے پست ہمت کر دیا۔ کہتے ہیں کہ جب ارادے پختہ ہوں تو راستے خود بخود نکل آتے ہیں۔ یقین مانئے بالکل ایسا ہی ہوا۔ یونیورسٹی کے گیسٹ ہاوس میں فادر جوزف (Fr. Joseph) نے ایک گہرے دوست کا ساتھ نبھایا۔ فادر جوزف کو جب بھی پروگرام کے دوران بولنے کا موقعہ ملا۔ انھوں نے مجھے ایک سچے ہمدرد اور خیر خواہ کے طور پر پیش کیا۔ اس تعارف سے مندوبین میری طرف مائل ہوئے۔ اس کے بعد دعوتی لٹریچر کو شرکاء تک پہنچانے میں راہ ہموار ہوگئی۔ دینڈی گُل (Dindigul) میں جن اہم شخصات کو دعوتی لٹریچر دیا گیا، ان میں درج ذیل اہم شخصیات کے نام شامل ہیں:

(1) Dr.S.N.Subba Rao, New Delhi (2) Mr.Ajeet Saxena, IRTS Chenai (3) Mr.K.A.Prabhu, Maharashtra (4) Dr.S.Venkataraman, Kancheepuram (5) Dr.V.K.Veereshwaran, Chenai (6) Dr.Manghosat Kipgen, Manipur (7) Dr.Mohd.Saleem, Srilanka (8) Mr.Yogenda S.Prikh (Grand Son of Mahatama Gandhi) (9) Swami Sachidananda Bharathi, Wing Commander (10) Mr.Paramjeet Singh, IRS Commissioner of Incomtax, Mumbai.

کانفرنس کے دوران ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان نے اس لٹریچر کے ساتھ گہری دلچسپی کا اظہار کیا۔ میں نے جب اُن سے پوچھا: کیا آپ ہندو ہیں؟

Are you *Hindu*?

انہوں نے جواب دیا کہ نہیں! میرے والدین ہندو ہیں:

No.My parents are *Hindu*.

اس مختصر مکالمے سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ نئی نسل کے لوگ کس نہج پر سوچتے ہیں۔ اس سے کھلے دعوتی امکانات کا پتہ چلتا ہے۔

جب میں یونیورسٹی سے فادر جوزف کے ساتھ کنیا کماری کے لیے روانہ ہو رہا تھا تو میرے حوصلے کافی بلند تھے۔ تقریباً سو لوگوں کے درمیان کامیاب دعوتی کام کے بعد میرا اپنا تاثر یہ ہے کہ لوگ پیاسے ہیں لیکن ان کی روحانی پیاس بجھانے کے لیے کوئی موثر انتظام نہیں ہے۔ وقت کا شدید تقاضا ہے کہ ہم اپنی صلاحتوں اور سرمایہ کو 'دعوت الی اللہ' کے نتیجہ خیز میدان کی طرف موڑ دیں۔

کنیا کماری میں ہم لوگ سن رائز (sunrise) اور سن سیٹ (sunset) کا منظر دیکھنے کے لیے گئے۔ یہ منظر دیکھنے کے لیے ہزاروں ملکی اور غیر ملکی سیاح سمندر کے کنارے موجود تھے۔ جب سورج سمندر کی گود سے طلوع ہوتا ہوا دکھائی دیا تو لوگوں نے تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کیا۔ بے شک یہ منظر بہت ہی دلکش تھا۔

فطرت کے اس واقعہ سے یہ اشارہ (clue) ملتا ہے کہ ہمارا خالق کتنا باذوق ہے۔ وہ اپنے بندوں کو جس دنیا میں ابدی طور بسانا چاہتا ہے، وہ جنت کتنی حسین ہوگی۔

کنیا کماری میں چار دن قیام کے بعد میں چنئی کے لیے روانہ ہوا۔ اگلے دن میں اگمور ریلوے اسٹیشن پر پہنچا۔ یہاں بھی میں تنہا تھا۔ مجھے اگمور (Egmore) کے مسلم علاقے میں کسی بھی ہوٹل میں ے جگہ نہ ملی۔ شاید مجھ کشمیری مسلمان کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔ کتنے بے خبر ہیں یہ لوگ۔ اب میں کدھر جاؤں۔ میں مایوسی کی حالت میں سوچ رہا تھا۔ آگے بڑھا تو چنئی سنٹرل میں ایک ایسا کمرہ ملا جو ڈبل کرایہ پر بھی نہیں مل رہا تھا۔ یہ امکانات کی دنیا ہے۔ اس تلاش نے مجھے یہ سبق دیا کہ امکانات کبھی ختم نہیں ہوتے۔

چنئی میں اجیت سکسینہ (چیف جنرل مینیجر ریلوے ساوتھ) سے ان کے دفتر میں ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ وہ سارا لٹریچر ان کے زیر مطالعہ ہے جو میں نے ان کو گفٹ دیا ہے۔

انہوں نے مجھے چھوٹی سی کتاب ٹیچنگ آف اسلام (Teachings of Islam) دکھائی، جس کو جگہ جگہ اُنہوں نے انڈر لائن (Underline) کیا ہے۔ انہوں نے اپنے تاثر میں مذکورہ لٹریچر کو کافی دلچسپ اور حقیقت پسند بتایا۔ دورانِ گفتگو انہیں ایک کال اٹینڈ (attend) کرنا پڑی۔ مسٹر سکسینہ فون پر کسی سے کہہ رہے تھے:

I am wasting my 8 hours.

میرے استفسار پر انہوں نے بتایا کہ وہ موجودہ اعلیٰ عہدے پر مطمئن نہیں ہیں۔ ان کے پاس سرمایہ کی کمی نہیں۔ ان کی بیوی ماہر سرجن ہیں۔ ان دنوں مسٹر سکسینہ کسی غیر ملکی این جی او (NGO) میں کام کر کے روحانی سکون کی تلاش میں ہیں۔

چنئی کی جامع مسجد میں پرمٹ (permit) سے نماز جمعہ ادا کرنے کے بعد جب میں مسجد سے باہر آیا تو گیٹ کی سیڑھیوں غیر مسلم نوجوان عورتوں کی لمبی قطار دیکھی۔ کئی عورتوں کی گود میں ننھے منھے بچے اور کئی عورتیں

پنے چھوٹے بچوں کے ہاتھ پکڑے ہوئے کھڑی ہیں۔ میں نے انہیں بھکارن، سمجھ کرنظر انداز کیا۔ چند لمحوں کے بعد مجھے اس کی حقیقت جاننے کا تجسس ہوا۔ جب میں گیٹ کے قریب پہنچا تو ایک انقلاب آفریں منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ میری آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ میری زبان سے نکلا کہ خدایا مجھے چیزوں کو ویسا ہی دکھا جیسا کہ وہ فی الواقع ہیں و۔ اگر میں اس واقعے کا دوبارہ جائزہ نہ لیا ہوتا تو میرے ناقص تجربات میں ایک اور ناقص کا اضافہ ہو جاتا۔ نماز ادا کرنے کے بعد بزرگ لوگ ہر بچے پر شفقت کے ہاتھ رکھ کر پھونک مار رہے تھے۔ مائیں اس شُبھ گھڑی کے انتظار میں کھڑی تھیں۔ اس میں کوئی شک نہیں روحانی پس منظر میں ابھی مسلمان قابلِ اعتبار ہیں۔ یہ واقعہ ہندوستان میں اسلامی دعوت کے روشن امکانات کی عکاسی کرتا ہے۔

چنئی سے 70 کلومیٹر دور شری پر بھندر پور میں واقع معروف رضا کار تنظیم سیڈ (SEED) کے کیمپس میں داخل ہوا تو میرے میزبان اے آر پلاسوامی میرے انتظار میں تھے۔ جب میں ٹیکسی ڈرائیور کو کرایہ دینے لگا تو میرے میزبان نے مجھے روکا اور کہا کہ میں نے پہلے ہی آپ سے کمیٹمنٹ (commitment) کیا ہے کہ ٹیکسی کا کرایہ میں ادا کروں گا:

Cannot afford to break my contract.

اے آر پلاسوامی کے یہ الفاظ اب بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ پلاسوامی نے مجھے ادھیڑ عمر کے ایک انگریز جوڑے مسٹر جان اور مسز ماریہ سے ملایا۔ میں نے کچھ دعوتی لیف لیٹس (Leaflets) ان کو دیے۔ پیس ان قرآن (Peace in Quran) کے چند سطور پڑھ کر مسٹر جان چلا اُٹھے:

Very Amusing, Very Amusing.

اس کے بعد وہ ہاتھ جوڑ کر میری طرف جھکے۔ صد فصد مدعوئن کے تاثرات کم وبیش اسی قسم کے تھے۔ اس لمبے سفر کے دوران میں آنے پایا کہ لوگ روحانت یا سچائی کی تلاش میں ہیں۔ اپنی اس تلاش کی تسکین کچھ لوگ کمیونٹی ورک (community work) میں ڈھونڈتے ہیں، لیکن تجربہ بتاتا ہے کہ یہ 'تلاشِ حق' کا صحیح راستہ نہیں۔

مدر ٹریسا (1910-1997) نے اپنی ساری عمر اعلیٰ ترین سوشل سروس (social service) میں گذاری۔ مگر اُنھیں خدا نہیں ملا، جس کا اعتراف انہوں نے اپنے ایک خط میں کیا ہے۔ مدر ٹریسا کا یہ خط ٹائم میگزین میں ان کے ایک قریبی دوست نے شائع کیا ہے۔ خدمتِ خلق بے شک ایک اچھا کام ہے، جو انسانی معاملات میں اعلیٰ اقدار کی پہچان ہے۔ تاہم خدا کو فیزیکل آسپکٹ (Physical aspect) میں ڈھونڈنا صحیح راستہ نہیں۔ خدا انسان کو معرفت (Realization) میں ملتا ہے۔

جب میں چنئی سنٹرل ریلوے اسٹیشن کے لیے روانہ ہو رہا تھا تو مسٹر پربو نے ہنسی مذاق کے دوران ہمیں بتایا کہ پلاسوامی نے لو میرج (Love Marriage) کی ہے۔ پلاسوامی نے اس کا اعتراف کرتے ہوئے بتایا کہ میرے سامنے ایک منزل ہے لہٰذا ایک ایسے رفیق کی تلاش تھی جو ہم سفر بن سکے۔ یہی میری لو میرج کا

ماحصل ہے۔ پلاسوامی کے اس اسٹیٹمنٹ (statement) سے میری آنکھیں کھل گئیں۔ بامقصد لوگوں کی نظر ہمیشہ منزل پر ہوتی ہے۔ اُن کی ہر ایکٹیوٹی (activity) یہاں تک کہ شادی جیسا بندھن بھی مشن پرپس (Mission Purpose) ہوتا ہے۔

سنہ 2007ء میں حبیب بھائی کی صحبت میں رہ کر مجھے جو روحانی سکون ملا وہ نا قابلِ فراموش ہے۔ حبیب محمد نام ہے، پیشے کے لحاظ سے ایک کروڑ پتی تاجر ہیں۔ رواداری اور سادگی میں بے مثال۔ محبت و شفقت کا یہ مجسمہ اپنے وجود میں ایک انجمن ہے۔ وہ سارے انسانوں کے سچے خیر خواہ ہیں۔ اسی بے لوث جذبہ نے ان کو دیوانہ بنا دیا ہے۔ حبیب محمد اپنی پوری صلاحتوں کے ساتھ 'دعوت الی اللہ' کے کام میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ وہ یقیناً ایک سچے داعی ہیں۔

مجھے یاد آرہا ہے کہ جب حبیب بھائی 12 اپریل 2007ء کو میری رہائش گاہ 'بیروہ' میں میری بیٹی معروفہ اور اس کی غیر مسلم سہیلی کو اپنے مخصوص انداز میں کچھ باتیں بتائیں تو وہ کافی متاثر ہوئیں۔ جب غیر مسلم سہیلی کے پوچھے جانے پر میری بیٹی نے کہا کہ حبیب بھائی آج واپس حیدر آباد (تلنگانہ) جارہے ہیں تو غیر مسلم لڑکی کے آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ میری بیٹی 'معروفہ' اس واقعہ کی چشم دید گواہ ہے۔ یہی ہے ایک سچے داعی کی پہچان۔

حبیب بھائی کے ہمراہ حیدر آباد میں برلا پلانیٹوریم (Birla Plaintorium) دیکھنے کا موقعہ ملا۔ یہاں آکاش (sky) سے متعلق فلم دکھائی گئی۔ یہ فلم دیکھ کر میرا جسم پسینے سے شرابور ہوگیا۔ خدا کی عظمت اور خوف کا احساس شدت سے زندگی میں پہلی بار طاری ہوا۔ میں نے جب حبیب بھائی سے ان خیالات کا اظہار کیا تو وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور کہا میرا بھی یہی حال ہے۔ ایک وسیع کائنات جس کا احاطہ کرنا انسانی دماغ سے باہر ہے، بے شمار گلیکسیز (galaxies) اور گلیکسی (galaxy) میں زمین کی حیثیت ایک ڈاٹ (dot) کی ہے۔ اس (dot) میں میری کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ سُبحَانكَ مَاعَرَفنَا حَقَ مَعرِفَتكَ یعنی اے پاک خدا ہم نے تجھے نہیں پہچانا جیسا کہ تیرا حق پہچاننے کا تھا۔

انٹرنیشنل پیس سنٹر (International Peace Centre) حیدر آباد میں حسب معمول اتوار کے اسپریچول کلاس (Spritual Class) میں حبیب بھائی نے زندگی کی حقیقت پر ایک فکر انگیز تقریر کی۔ مسٹر پاٹل اور مسٹر پربو جنھیں میں نے مدعو کیا تھا، خاص طور سے اس پروگرام میں شریک ہوئے۔ مسٹر پربو نے بعد میں بعد اپنے اطمنان کا اظہار کیا۔ مسٹر پاٹل نے بتایا کہ وہ ہم وطنوں کو قرآن کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کرنے کی ترغب دیتے ہیں۔ ان سے جب پوچھا گیا کہ انھوں نے اپنے 'ایمان' کا اعلان کیا ہے تو مسٹر پاٹل نے جواب دیا مجھے آپ کے سامنے ڈیکلریشن (declaration) دینا ہے یا اللہ کے سامنے۔ بے شک یہی سچا ایمان ہے۔

مسٹر پاٹل مسلسل بارہ گھنٹے سفر کر کے صبح حیدر آباد پہنچے اور پروگرام میں شمولیت کے بعد شام کو واپس

نڈیر کے لیے روانہ ہوئے۔ اس سے ان کی گہری دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ نومسلموں کے پاس بے آمیز سلام ہے، کیوں کہ انہوں نے اسلام کو سچی تڑپ کے ساتھ دریافت کیا ہے۔

ہمیں اسلام کو از سرنو دریافت کرنے کے لیے اپنی کنڈیشنگ (conditioning) کو توڑنا ہے۔ اس مل سے ہماری سوچ کو ایک صحیح سمت ملے گی۔

18 فروری 2008ء کی صبح کو میں نئی دہلی کے لیے روانہ ہوا اور 19 فروری 2008 کی صبح کو نظام الدین ریلوے ٹیشن پہنچ گیا۔ نظام الدین میں ایک ہوٹل پر پہنچا تو آئی کارڈ (valid I Card) کے باوجود ہوٹل منیجر نے کمرہ ینے سے انکار کر دیا۔ وہ پاسپورٹ یا الیکشن کارڈ کا تقاضہ کر رہے تھے۔ اس سے پہلے بھی صدیقی سرائے (چنئی) میں سی نوعیت کا ایک واقعہ پیش آیا۔ وہاں پر مسافروں سے فنگر پرنٹ (Finger Print) لیے جاتے ہیں۔

'خدایا امریکہ کو برباد کر دے' یہ موٹے حروف سے لکھا ہوا بڑا بینر دہلی کی جامع مسجد کے دروازے پر صب تھا۔ دہلی پہنچنے کے بعد میں جب مسجد کے اندر داخل ہوا تو میری نظر سیاحوں کے ایک گروپ پر پڑی جو بالمقابل دروازے سے اندر آرہا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ امریکن تھے۔ گائڈ نے ان کو مسجد کی تاریخی اہمیت کی تفصیلات کے بعد بتانے کے بعد کہا کہ ابھی یہاں اذان ہوگی اور پھر نماز ادا کی جائے گی۔ گروپ میں سے ایک سیاح نے ہاتھ اوپر اٹھاتے ہوئے کہا:

I want to join the prayer.

گائڈ نے اس کے جواب میں کہا:

No You can't do itill you become Muslim.

کیسی عجیب بات ہے۔ مدعو داعی کے کے دروازے پر کھڑا ہے مگر داعی اس کو بددعا دینے میں مصروف ہے۔

20 فروری 2008ء کی صبح آٹھ بجے مولانا وحید الدین خاں سے ان کی رہائش گاہ (سی-29، نظام الدین، نئی دہلی) طویل ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں مولانا عبدالروف، ڈاکٹر فریدہ خانم، ڈاکٹر رجت ملہوترا اور مولانا محمد ذکوان ندوی بھی شامل ہوئے۔ میں نے اپنے لمبے سفر کے دوران پیش آئے حیرت انگیز تجربات و مشاہدات کو تفصیل سے بیان کیا۔ مولا موصوف نے اس سفر کو 'معرفت کا سفر' بتایا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ اس سفر نے دیکھنے کے لیے مجھے نئی روشنی دی اور سوچنے کے لیے امید افزا خیالات!

...

Hamid Ullah Hamid

C/o:Kashmir Welfare Centre,

Beerwah-193411, Distt: Badgam,

Jammu & Kashmir, Mob:9419488008,

E-mail:kwe.beerwah@gmail.com

تبصرے

شبلی کی فریاد

مولانا وحید الدین خاں

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے ہفت روزہ الجمعیۃ کے شماروں میں ایک طویل تبصرہ چھ قسطوں میں بعنوان 'شبلی کی فریاد' شائع ہوا۔ مولانا وحید الدین خاں نے یہ تجزیہ وتبصرہ دراصل مولانا محمد علی مونگیری (وفات: 1927ء) کی حیات وخدمات پر لکھی جانے والی مولانا سید محمد الحسنی الندوی کی کتاب 'سیرت مولانا محمد علی مونگیری۔ بانی ندوۃ العلماء' کے ذیل میں تحریر کیا تھا۔ یہاں اس طویل تبصرے کو افادہ عام کی غرض سے نقل کیا جارہا ہے۔ (ادارہ)

قسط اوّل

اپریل 1967 کے آخری ہفتہ میں مجھے مولانا عبد الباری ندوی مدظلہ (سابق صدر شعبہ فلسفہ، عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد) کی خدمت میں حاضر ہونے کا اتفاق ہوا۔ ایک روز دورانِ گفتگو مولانا کی زبان سے بے اختیار نکلا کہ 'شبلی کے ساتھ ندوہ والوں نے غداری کی ہے۔ مگر افسوس کہ کوئی نہیں، جو اس کا جواب دے۔'

مولانا کی زبان سے یہ جملہ میرے لیے خلاف توقع حد تک حیرت انگیز تھا۔

اس کا کیا مطلب ہے؟ میں نے دریافت کیا۔

کیا آپ نے اس کتاب کو نہیں دیکھا ہے جو 'سیرت مولانا محمد علی مونگیری... بانی ندوۃ العلماء' کے نام سے شائع کی گئی ہے؟

'نہیں مجھے اس طرح کی چیزیں پڑھنے کا موقع کہاں ملتا ہے؟'

'یہ کتاب ویسے تو مولانا محمد علی مونگیری کی سیرت پر ہے مگر اس میں ندوہ کی پچھلی تاریخ پر کافی مفصل گفتگو کی گئی ہے۔'

'تو اس میں ہرج کیا ہے؟ میں نے کہا۔

'بہت بڑا ہرج ہے۔'

مولانا نے مجھ کو گھورتے ہوئے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا 'اس کتاب میں ندوہ کی بالکل غلط تصویر پیش کی گئی ہے۔ موجودہ ندوہ اپنی تمام پر فخر علمی وادبی خصوصیات کے ساتھ تقریباً سو فی صدی مولانا شبلی نعمانی کی

دین ہے۔ مگر اس کتاب میں اس کو بالکل غلط طور پر مولانا محمد علی مونگیری کی طرف منسوب کر دیا گیا ہے۔ یہ مولانا شبلی نعمانی کے ساتھ شدید نا انصافی بلکہ غداری ہے اور ان کی روح اس وقت تک فریاد کرتی رہے گی جب تک اس کا مکمل جواب نہ دے دیا جائے۔ اس کے بعد مولانا نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ میں اس پر لکھوں۔

دار العلوم ندوۃ العلماء سے میرا کبھی براہِ راست تعلق نہیں رہا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی کی ذات اور ان کے کارناموں سے بھی زیادہ دلچسپی کی نوبت نہیں آئی۔ کیوں کہ مولانا مرحوم کا خصوصی میدان تاریخ تھا اور میری دلچسپی کا موضوع زیادہ تر جدید فلسفیانہ افکار ہیں۔ اس لیے مولانا عبد الباری ندوی مدظلہ کو ہر طرح اپنا بزرگ اور واجب الاتباع سمجھتے ہوئے میرے لیے مولانا کے اس احساس میں شریک ہونا مشکل تھا۔ مگر مولانا کے یہاں میں کئی روز رہا۔ اور وہ مختلف شکلوں میں بار بار اس درد اور خواہش کا اظہار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ میں نے طے کیا کہ مولانا کے ارشاد کو حکم سمجھتے ہوئے مجھے بہر حال اس کو انجام دینے کی کوشش کرنا چاہیے۔

جب میں نے مولانا عبد الباری ندوی کو اپنے فیصلہ کی اطلاع دی تو وہ بے حد خوش ہوئے۔

انھوں نے کہا کہ 'میں ندوہ کا قدیم ترین زندہ طالب علم ہوں، میں شوال 1319ھ میں ندوہ کے پہلے درجہ میں داخل ہوا اور تقریباً گیارہ برس وہاں مقیم رہا۔ میں ندوہ کو اس وقت سے جانتا ہوں جب ندوہ خاتون منزل (لکھنؤ) میں تھا۔ میں نے مولانا محمد علی مونگیری اور مولانا شبلی نعمانی دونوں کے زمانے دیکھے ہیں۔ میں ذاتی معلومات کی بنا پر کہتا ہوں کہ اس کتاب میں مولانا شبلی نعمانی کے ساتھ شدید نا انصافی بلکہ غداری ہوئی ہے۔ آپ اپنے مضمون میں میری یہ گواہی لکھ لیجیے۔ اور میرے کندھے پر بندوق رکھ کر چلائیے۔ اس معاملہ میں میں گالیاں تک سننے کے لئے تیار ہوں'۔

اب میں نے مسئلہ سے متعلق مطبوعہ ریکارڈ دیکھنے شروع کیے۔ مولانا کی خدمت میں رہ کر کئی روز تک ان کی دی ہوئی معلومات کو نوٹ کرتا رہا۔ حیات شبلی (مولانا سید سلیمان ندوی) پڑھی جو شبلی اور ندوہ، دونوں کا انتہائی محققانہ مطالعہ ہے، اس تمام تلاش و جستجو کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ مولانا کا احساس واقعی اتنی ہی شدت کے ساتھ صحیح ہے جس شدت سے مولانا عبد الباری ندوی اس کو بیان فرماتے ہیں۔

جب میں نے مولانا کو یہ بات بتائی تو وہ اور زیادہ خوش ہوئے۔

انھوں نے کہا مجھے بہت خوشی ہے کہ جو کام آپ نے محض میرے کہنے سے شروع کیا تھا وہ مطالعہ و تحقیق کے بعد خود آپ کا ذاتی فیصلہ نکلا۔ اب ان شاء اللہ آپ زیادہ بہتر طور پر اس موضوع کا حق ادا کر سکیں گے۔

اس ابتدائی روداد کے بعد اب میں اصل گفتگو کا آغاز کرتا ہوں۔

زیر تبصرہ کتاب مکتبہ دار العلوم ندوۃ العلماء (لکھنو) کی طرف سے خصوصی اہتمام کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔اس کتاب کے مصنف مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کے برادرزادہ سید محمد الحسنی ہیں۔450 صفحے کی یہ کتاب کھولنے کے بعد اس کی سب سے پہلی چیز جو سامنے آتی ہے وہ کتاب کا مقدمہ ہے جو خود جناب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے قلم سے ہے جو مصنف کے عم مکرم ہونے کے ساتھ ندوہ کے ناظم بھی ہیں۔اس مقدمہ میں مولانا محمد علی مونگیری کے واسطہ سے زیادہ تر ندوۃ العلماء کا تذکرہ ہے۔مقدمہ نگار کا نام بظاہر اس بات کی کافی ضمانت تھی کہ اس کے اندر تاریخی واقعیت اور علمی دیانت کا پورا لحاظ کیا گیا ہو۔مگر جب ہم اس کو پڑھتے ہیں تو ہمارے اس اعتماد کی تصدیق نہیں ہوتی۔قاری حیرت انگیز طور پر اس امر کا مشاہدہ کرتا ہے کہ 'رافع نجات' کے اس مقدمہ میں کہیں 'مولانا شبلی نعمانی' کا نام تک نہیں۔ندوہ کی تاریخ بیان کی جائے اور مولانا شبلی نعمانی کا نام نہ آئے۔یہ ایسا ہی ہے جیسے ہندوستان کی آزادی پر گفتگو ہو اور ان سرفروش علماء کا ذکر نہ کیا جائے جو اس وقت آزادی پر قربان ہو گئے؛ جب ہمارے موجودہ لیڈر پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔

یہ کتاب جو مقدمہ نگار کے الفاظ میں صرف 'ایک عظیم و برگزیدہ شخصیت' کی سوانح نہیں بلکہ ندوہ کی 'عظیم تحریک کی تاریخ' بھی ہے،اس کے مقدمہ میں ندوہ کے 'وسیع در فیع تخیل' کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے گویا وہ تمام مولانا محمد علی مونگیری کے 'اولیات و امتیازات' کی طویل فہرست کا صرف ایک باب ہے۔مقدمہ نگار کے نزدیک وہ مولانا محمد علی مونگیری ہی تھے جس نے انیسویں صدی عیسوی کے نصف آخر میں زمانہ کے جدید تقاضوں کو محسوس کیا اور 'ایک عالم گیر اور انقلاب انگیز دینی تعلیمی تحریک کی بنیاد رکھی جس کے آگے مصر و ترکی کے مصلحین بھی اس دور میں' نہ جا سکے تھے۔

انھوں نے مخالفینِ اسلام کے اعتراضات کا جواب دینے کے لیے فلسفہ جدید کے مطالعہ اور علوم جدیدہ کی تحصیل پر زور دیا اور ایک ایسی تحریک اور انجمن (ندوہ) کے بانی بنے جس نے 'بیسیوں مصنف اور اہلِ قلم' پیدا کیے۔

ان ساری خصوصیات میں مولانا محمد علی مونگیری اس درجہ منفرد تھے کہ نہ صرف زمانہ میں ان کا کوئی ہمسر نہ تھا بلکہ 'ان میں بہت سی چیزیں اپنے زمانہ سے آگے تھیں' وہ 'جامعیت و توازن کا ایسا نادر مرقع تھے جس کی مثال اس دور میں مشکل سے ملے گی'۔

مولانا محمد علی مونگیری کی یہ انفرادیت ایک ایسا 'حیرت انگیز واقعہ' ہے کہ مقدمہ نگار کے نزدیک اس کی توجیہ صرف یہ ہو سکتی ہے کہ اس کو عالم بالا کا فیض سمجھا جائے کیوں کہ زمانہ کے اندر اور گرد و پیش کے ماحول میں اس کی پوری توجیہ نہیں ملتی،مقدمہ نگار کے الفاظ یہ ہیں: 'یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کا خمیر و ضمیر تنہا اس ماحول

اور تعلیم وتربیت کا نتیجہ نہیں جو انھوں نے پائی تھی۔ بلکہ اس نسبت گرامی کا نتیجہ ہے جو ان کو نسبی وروحانی طریقہ پر حاصل تھی:

تری آگ اس خاک داں سے نہیں

(صفحہ:20)

گویا جس وقت 'خدا کا ایک برگزیدہ وعالی ہمت بندہ مستقبل کا یہ عظیم خواب' دیکھ رہا تھا (صفحہ:26)۔ اس وقت نہ مولانا شبلی نعمانی جیسے کسی شخص کا وجود تھا اور نہ اس کے کارنامے کہیں پائے جاتے تھے۔ وہ 'شبلی' جو انیسویں صدی کے خاتمہ اور بیسویں صدی کے آغاز کے وقت ملکی اخبارات در سائل میں، ندوۃ العلماء کی رودادوں میں، مکاتیب شبلی اور مقالات شبلی میں اور غدر کے بعد ہندوستانی مسلمانوں کی جدید دینی تاریخ سے متعلق تمام مطبوعہ ریکارڈ میں اپنی دینی تعلیمی خدمات کے لیے اہم ترین نام کی حیثیت رکھتا ہے، وہ 'سیرت مولانا محمد علی مونگیری' کے 'مقدمہ نگار' کے لیے ایک بالکل 'نا معلوم واقعہ' ہے حتی کہ وہ 'شبلی' جس کو خود ندوہ ہی کا لائق ترین فرزند مولانا سید سلیمان ندوی۔ اپنے 900 صفحات کے تحقیقی مطالعہ کے نتیجہ میں 'عہد جدید کا معلم اوّل' (حیات شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، صفحہ:9) قرار دے چکا تھا۔ وہ سید سلیمان ندوی جو مسلمہ طور پر سب سے بڑا ندوی ہے، جس نے شبلی سے تعلیمی کارنامے اور جدید وقدیم کی یکجائی سے تخیل میں ان کی اوّلیت کو 20 پہلے حیات شبلی (1943ء) میں انتہائی مکمل اور مدلّل شکل میں بیان کر دیا تھا، وہ 20 برس بعد بھی سیرت مولانا محمد علی مونگیری (1964ء) کے مقدمہ نگار کے لیے غیر معلوم رہا۔

اس مقدمہ کو پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہی گویا ہماری اسلامی دنیا ایک مہیب تاریخی خلاء سے دوچار تھی کہ بالکل ناقابلِ قیاس طور پر ایک معجزاتی شخصیت ظہور میں آگئی جس کا نام 'مولانا محمد علی مونگیری' تھا۔ یہی وہ عجیب وغریب ہستی ہے جس کی سوانح لکھنے کی سعادت روحانی اثرات (صفحات:25) کے تحت مقدمہ نگار کے ایک عزیز کو حاصل ہوئی۔

اگر یہ بے خبری ہے تو حیرت انگیز ہے اور اگر کچھ اور ہے تو میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس کو کیا نام دوں؟

ندوہ کا یہ پورا کریڈٹ جو مولانا محمد علی مونگیری کو دے دیا گیا ہے، اس کی وجہ اگر آپ 10 صفحات کے اس مقدمہ میں تلاش کریں تو وہ صرف ایک ہوگی... یہ کہ وہ ندوۃ العلماء کے 'ناظم اوّل' (صفحہ:17) تھے۔ 'ناظم اوّل ندوۃ العلماء' کا لفظ اس کتاب میں کچھ اس ذوق وشوق سے دہرایا گیا ہے جیسے ندوہ کے تخیل اور جدید وقدیم کی

یکجائی کے سلسلے میں مولانا محمد علی مونگیری کی اولیت ثابت کرنے کے لیے یہ کوئی 'برہان قاطع' ہے۔

سیرت مولانا محمد علی مونگیری اوراس کے مقدمہ میں مولانا محمد علی مونگیری کو'بانی ندوہ' کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ اوّل تو قومی اور اجتماعی کاموں میں کسی کو 'بانی' قرار دینا بجائے خود عجیب سی بات ہے۔ قومی اور اجتماعی کام، جیسا کہ مثال کے طور پر ندوہ ہے، اُس کی بنیاد میں سینکڑوں روحیں شامل رہی ہیں۔ اِس لیے سارے لوگوں کو نظرانداز کر کے کسی ایک شخص کو'بانی' کا لقب دینا کسی صحیح ذہنیت کی مثال نہیں ہوسکتی۔ یہ تو بلاشبہ ایک واقعہ ہے کہ مولانا محمد علی مونگیری ندوہ کے 'ناظم اوّل' تھے، مگر'بانی' اور ناظمِ اوّل دونوں ہم معنی الفاظ نہیں ہیں۔

تاہم عام حالات میں یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں تھا جس پر ردوقدح کی جائے۔ اگر کوئی اپنی پسندیدہ شخصیت کو ایک ٹائٹل دے کر اپنے دل میں خوش ہونا چاہے تو اُس کی خوشی میں کسی کو دخل انداز ہونے کی کیا ضرورت؟ مگر میں اِس کو زیر بحث لانا اِس لیے ضروری سمجھتا ہوں کہ اس ٹائٹل (title) کو ایک عجیب وغریب نظریہ کا نہایت کامیاب اور قطعی ماخذ سمجھ لیا گیا ہے۔ یعنی چوں کہ مولانا محمد علی مونگیری ندوہ کے'بانی' تھے، اِس لیے ندوہ کو انھیں کے خیالات کی عملی شکل ہونا چاہئے۔ اِس طرح وہ چیز جو محض خوش فہمی کا مسئلہ تھی اس کو ادارہ کے حال اور مستقبل کا مسئلہ بنا دیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ جس کی بنا پر ہم نے ضروری سمجھا کہ اِس مسئلہ کو زیر بحث لایا جائے۔

مجھے اِس واقعہ سے انکار نہیں کہ مولانا محمد علی مونگیری مجلس ندوۃ العلماء کے ناظمِ اوّل تھے مگر عہدہ کی اوّلیت کو فکر کی اوّلیت کا ثبوت فرض کر لینا ایسا ہی ہے جیسے آنجہانی ڈاکٹر راجندر پرشاد کے خاندانی منتسبین میں سے کوئی شخص راجندر پرشاد کی سوانحِ عمری لکھے اور وہ عظیم واقعہ جو بیسویں صدی کے نصف میں آزاد جمہوریہ ہند کی شکل میں اس خطہ زمین پر پیش آیا، اس کو تمام تر راجندر پرشاد کے خانہ میں لکھ دے... کیوں... صرف اس لیے کہ وہ ہندوستان کے پہلے صدر جمہوریہ تھے۔ اگر یہ کوئی دلیل ہے تو اس دلیل سے تاریخ میں ایسے ایسے عجائب کا انکشاف کیا جاسکتا ہے جو اب تک تمام مورخین کے لیے بالکل نا معلوم ہوں۔

اس سے پہلے میں نے محترم مقدمہ نگار مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی کتاب 'مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش' پڑھی تھی تو یہ دیکھ کر تعجب ہوا تھا کہ مولانا سید ابوالاعلی مودودی کا ذکر اس میں صرف آدھی سطر میں اور وہ بھی متن میں نہیں بلکہ حاشیہ کے اندر کیا گیا ہے۔ جب کہ اکبر الہ آبادی پر پورے دو صفحات وقف کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کے مصنف کے نزدیک اکبر الہ آبادی کا مقام تو یہ ہے کہ 'ہندوستان سے جدید اجتماعی

وادبی تصورات ورجحانات کی تشکیل میں ان کا بھی حصہ ہے؟ (صفحہ:86)

اس کے برعکس مولانا مودودی کی حیثیت صرف اتنا ہے کہ 'تنقیحات' اور 'پردہ' میں بھی مغربی فکر اور مغربی افکار واقدار پر تنقیدی مواد ملتا ہے (صفحہ:175)

مگر اس وقت اپنے تعجب کو میں نے یہ سوچ کر اطمینان میں تبدیل کرنے کی کوشش کی تھی کہ یہ کتاب 'اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش' کے عنوان پر ہے۔ ممکن ہے مصنف کے ذہن میں اسلامیت اور مغربیت کا کوئی ایسا تصور ہو جس کے خانہ میں مولانا مودودی کی کوششیں گھٹ کر نظر آتی ہوں اور اکبرالہ آبادی زیادہ بڑے نظر آتے ہوں۔ یہ ایک ذہنی حالت کا معاملہ ہے اور مطالعہ کے فرق سے نظریہ میں فرق کے امکان کی بنا پر ایک شخص کو معذور قرار دیا جاسکتا ہے، مگر جدید وقدیم علوم کی یکجائی کے سلسلہ میں مولانا شبلی نعمانی کے خیالات، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ساتھ ان کا تعلق، اس کی تشکیل وتعمیر میں ان کا حصہ تو ذہنی کیفیات نہیں بلکہ تاریخی واقعات ہیں پھر کوئی شخص کیسے ان سے بے خبر رہ سکتا ہے اور کس طرح ان کو نظر انداز کر سکتا ہے؟

ہوسکتا ہے کسی کے ذہن میں یہ خیال گزرے کہ یہ کتاب تو مولانا محمد علی مونگیری کی سوانحِ حیات ہے۔ پھر اس کے مقدمہ میں مولانا شبلی نعمانی کے ذکر کا کیا محل تھا؟ بظاہر منطقی طور پر یہ ایک وزنی بات معلوم ہوتی ہے؛ لیکن گہرائی میں اتر کر دیکھئے تو یہ منطق آپ کا ساتھ نہیں دے سکے گی۔

میں کہتا ہوں کہ اگر آپ آل انڈیا مسلم مجلس مشاورت اور اس کے کارہائے نمایاں کا ذکر کریں اور مولانا علی میاں کا نام نہ لیں تو کیا یہ نہیں کہا جائے گا کہ آپ نے بالواسطہ طور پر ایک ایسی شخصیت کی نفی کی ہے جو مسلم مجلس مشاورت کے اہم ترین معماروں میں سے ہے۔ اسی طرح انیسویں صدی کے آخر میں جدید دینی رجحانات اور ندوہ کی تعلیمی تحریک کا ذکر کرنا اور مولانا شبلی نعمانی کا نام نہ لینا صریح طور پر ایک ایسی شخصیت کی نفی کے ہم معنیٰ ہے جو کسی بھی دوسرے شخص کے مقابلہ میں ندوہ کی تعمیر وتشکیل میں زیادہ شریک رہا ہے۔ یہ ایک ایسا تاریخی واقعہ ہے جس کو کسی کے قلم کی سیاہی تاریخ کے درودیوار سے نہیں مٹا سکتی۔

پھر بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ جہاں تک مولانا شبلی نعمانی کا تعلق ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ مقدمہ میں ان کا نام کہیں اشارہ کنایہ میں بھی نہیں آنے پایا ہے۔ اس کے برعکس بعض ایسی شخصیتیں ہیں جن کا تعلق ندوہ سے نسبتاً کم رہا ہے۔ مگر کسی نہ کسی طور پر ان کو داخلِ مقدمہ کر دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر درج ذیل اقتباس میں مولانا حکیم سید عبدالحئی حسنی کا ذکر:

'ایک روز اچانک معلوم ہوا کہ برادرزادہ عزیز سید محمد الحسنی بغیر کسی کو بتائے ہوئے اپنے شوق سے

'سیرت مولانا محمد علی مونگیری' لکھنے کا کام شروع کر چکے ہیں اور ان کی بڑی تمنا ہے کہ یہ کام ان کے ہاتھوں انجام پائے۔ غالباً اس کا محرک یہ ہوگا کہ ان کے دادا (راقم السطور کے والد ماجد) مولانا حکیم سید عبدالحئی حسنی مولانا محمد علی مونگیری کے اولین معتمد اور طویل عرصہ تک ندوۃ العلماء کے کاموں میں ان کے دست و بازو رہ چکے ہیں اور ان کو مولانا محمد علی مونگیری سے منفرد وجوہ سے خصوصی مناسبتیں تھیں۔ شاید اسی قدیم و عمیق روحانی رشتہ نے، جس کے اثرات ان کے خون میں آئے ہیں؛ اثر کیا۔ (صفحہ:25)

اگر اس طرح کی تقریبات مقدمہ میں کسی شخص کا ذکر کرنے کے لیے کافی تھیں تو اس سے زیادہ قوی استبداد وجوہ تھے کہ مقدمہ میں مولانا شبلی نعمانی کا ذکر ہوتا اور ندوہ سے ان کے تعلق اور ان کی خدمات کا اعتراف کیا جاتا۔

یہاں میں دکھ کے ساتھ یہ اضافہ کروں گا کہ مقدمہ نگار کی نظامت کے عہد میں ندوہ کے اندر ایک خاموش تحریک چل رہی ہے۔ یہ اپنے محدود دائرہ کے اندر ٹھیک وہی تحریک ہے جو خروشچف (Khrushchev) کے زمانہ میں روس کے اندر چلی تھی۔ روس میں اس تحریک کا مطلب تھا... اشتراکی انقلاب کی تاریخ میں اسٹالن کو اس کے سابقہ مقام سے پیچھے لے جانا' ندوہ کے احاطہ میں اس تحریک کے معنی ہیں... ندوہ کی تاریخ میں شبلی کو جو جگہ ملی ہوئی ہے، وہاں سے کھسکا کر انھیں نیچے کر دینا۔ زیر نظر کتاب اسی اشتراکی تقلید کا ایک مظہر ہے۔ یہ تقلید صرف ایک کتاب کی حد تک نہیں ہے بلکہ مختلف شکلوں میں اپنا کام کر رہی ہے۔ حتیٰ کہ وہ اس پست سطح تک پہنچ گئی ہے جہاں وہ ماسکو میں پہنچی تھی۔

ایک زمانہ میں خود کمیونسٹوں نے اسکولوں کی دیواروں پر اسٹالن کا نام فخر کے ساتھ لکھا تھا۔ مگر خروشچف کے زمانہ میں وہ یا تو مٹا دیے گئے یا غیر اہم بنا دیے گئے۔ یہی منظر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اندر نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر کتب خانہ کے رجسٹروں کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ ابتداء جب یہ رجسٹر تیار ہوئے تھے تو مولانا شبلی نعمانی کی کتابوں کے ساتھ مصنف کا نام علامہ شبلی نعمانی لکھا گیا تھا۔ اب ہر جگہ ناموں کے ساتھ 'علامہ' کاٹ کر 'مولانا' لکھ دیا گیا ہے۔ آئندہ اگر رجسٹروں کو بدل نہ دیا گیا تو کسی بھی وقت کوئی شخص کتب خانہ میں جا کر رجسٹروں میں یہ منظر دیکھ سکتا ہے۔ کاش لوگ جانتے کہ تاریخ میں اس قسم کی واپسی ممکن نہیں ہوتی۔ کمیونسٹ اسٹیٹ اپنے سارے اقتدار و اختیار کے باوجود ابھی تک اس کو ممکن نہیں بنا سکی ہے اور ندوہ کی چہار دیواری میں اس کو وجود میں لانے کی کوشش تو ایک مضحکہ خیز حرکت کے سوا اور کچھ نہیں۔

ندوہ ایک اعتبار سے ادارہ ہے اور دوسرے اعتبار سے وہ ایک تاریخ ہے۔ ادارے بدلے جا سکتے ہیں۔

مگر تاریخ نے کبھی کسی کا یہ حق تسلیم نہیں کیا ہے کہ وہ اس کو بدل ڈالے۔ اگر آپ کو وہ ندوہ پسند نہیں ہے جو مولانا شبلی نعمانی کی علمی وادبی روایات پر قائم ہو، اس کے بجائے آپ اس ندوہ کو پسند کرتے ہیں جو مولانا محمد علی مونگیری کی 'باطنی احوال وکیفیات' کا آئینہ دار ہو۔ اگر آپ دارالمصنفین کو طلبہ کا نشانہ بنتے دیکھنا نہیں چاہتے۔ اس کے بجائے 'خانقاہ رحمانی' کو ان کی منزل بنانا چاہتے ہیں، تو آپ ندوہ کا دستور بدلیے، ندوہ کے مقاصد بدلیے، معروف ندوہ کو ختم کرکے 'ایک نئے ندوہ' کے قیام کا اعلان کردیجیے۔ باقی یہ کوئی طریقہ نہیں ہے کہ آپ تاریخ کو بدلنے بیٹھ جائیں اور یہ ثابت کریں کہ ندوہ کا دریا 'دارالمصنفین' کے سرچشمہ سے نہیں بلکہ 'مونگیری خانقاہ' کے سرچشمہ سے جاری ہوا تھا۔ اس لیے اس کا رخ 'دارالمصنفین' کی طرف نہیں بلکہ 'خانقاہ رحمانی' کی طرف ہونا چاہیے۔

یہ طریق کار نہ صرف یہ کہ اپنے اندر اخلاقی جواز نہیں رکھتا بلکہ وہ مقصد کے حصول میں ناکام بھی ہے۔ کمیونسٹ حکومتوں اور مسلم ممالک کی جدید قوم پرست تحریکوں کی مثالیں اس کے ثبوت کے لیے کافی نہیں جہاں تاریخ کو بدل کر اپنے نقطۂ نظر کو جگہ دلانے کی تکنیک نے کم از کم اب تک کسی نئے سماج کو وجود نہیں دیا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ کے چند سرپھرے لوگ جو وہاں کے مسلمانوں کی تاریخ بدل کر ان کا رشتہ قدیم مشترک تہذیبوں سے جوڑنا چاہتے ہیں، وہ جس طرح ناکام ہوئے، اسی طرح ندوہ کی تاریخ بدلنے کی یہ مہم بھی ناکام ہوگی۔ اس کے سوا دوسرا کوئی انجام اس کے لیے مقدر نہیں ہے۔ (ہفت روزہ الجمعیۃ، نئی دہلی، 19 جنوری 1968ء، صفحہ:14-13)

قسط دوم

سنہ 1857ء کی سیاسی جدوجہد جب ناکام ہوگئی اور ملک میں انگریزوں کا اقتدار مسلّم ہوگیا تو قوم کے دردمند لوگوں نے سوچنا شروع کیا کہ مسلمانوں کو اب اپنی بقاء کے لیے کیا کرنا چاہیے۔ اس سوچ بچار نے عام طور پر دو راہیں اختیار کیں۔ ایک طرف وہ لوگ تھے جو شاملی کے میدان سے واپس آئے تھے۔ انھوں نے طے کیا کہ ہمیں اپنی دینی تعلیم خالص شکل میں جاری کرنا ہے تاکہ ایک طرف دین کا تقاضا ہو اور دوسری طرف استقلال کا جذبہ کئی بنیادوں پر قائم ہو سکے۔ یہی وہ طرزِ فکر ہے جس نے دیوبند (1866) کے عنوان سے ہندوستان کی مسلم تاریخ میں جگہ پائی۔ دوسری طرف سرسید احمد خان تھے جو اکتوبر 1870ء میں انگلستان کے ڈیڑھ سال کے قیام کے بعد ہندوستان واپس آئے۔ ان کی سمجھ میں یہ آیا کہ مسلمانوں کے لیے اب نجات کی راہ یہ ہے کہ وہ مغربی علم اور مغربی تہذیب کو پوری طرح اختیار کرلیں۔ اس طرزِ فکر نے اینگلو محمڈن کالج اور

بالآخر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کی۔

یہ دونوں کام اپنی اپنی جگہ مفید تھے۔ مگر ان کے بعد بھی ایک مسئلہ باقی تھا جو اپنے حل کا انتظار کر رہا تھا۔ دیو بند نے جو علماء پیدا کئے، انھوں نے بلا شبہ اس ملک میں عظیم ترین کارنامہ انجام دیا۔ مسلمانوں کے سیاسی زوال کے بعد اس ملک میں دینی اقدار کو محفوظ رکھنے کا سہرا بڑی حد تک انھیں کے سر جاتا ہے۔ دوسری طرف علی گڑھ نے بھی ایک کام کیا۔ سرکاری کاموں میں فارسی کی جگہ انگریزی زبان کے استعمال نے مسلمانوں کے لیے سرکاری ملازمت کے دروازے بند کر دیے تھے، اس تعلیم نے بہت سے لوگوں کے لیے یہ دروازہ کھول کر ان کے معاش کا انتظام کیا۔

مگر حالات کے اعتبار سے ایک کام اور تھا جو ابھی باقی تھا... یہ کہ ہمارے درمیان ایسے علماء تیار ہوں جو زمانہ کو سمجھیں، زمانہ کے چیلنج کا جواب دیں اور زمانہ کے مطابق مسلمانوں کی رہنمائی کریں۔

ان حالات میں پہلا شخص جس کو جدید تعلیمی پالیسی کا 'واضح شعور' حاصل ہوا وہ 'مولانا شبلی نعمانی' تھے۔ مولانا شبلی نعمانی کو اس پہلو سے جو ممتاز مقام حاصل ہے اس کی وجہ سے مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کو عہد جدید کا معلمِ اوّل (حیات شبلی، صفحہ:9) کہا ہے۔

مولانا شبلی نعمانی ایک انتہائی ذہین آدمی تھے، ان کی تعلیم قدیم طرز پر ہوئی۔ درسیات کی باقاعدہ تکمیل کے بعد انھوں نے اعظم گڑھ، جون پور، رام پور، سہارن پور اور لاہور (پاکستان) وغیرہ جا کر مختلف فنون کے ارباب کمال سے استفادہ کیا۔ مطالعہ کے ذوق کا یہ عالم تھا کہ کوئی کتاب مل جاتی تو اس کو پڑھے بغیر نہ چھوڑتے۔ ہمیشہ معیاری اور کلاسیکل کتابیں ہی پڑھتے۔

اس طرح اسلام اور اسلامی تاریخ سے براہ راست اور مکمل واقفیت کے بعد آپ کا تعلق علی گڑھ کالج سے قائم ہوا۔ علی گڑھ کے لیے مولانا شبلی کا پہلا سفر اکتوبر 1881ء میں ہوا (حیات شبلی، صفحہ:118) وہاں آپ 16 برس رہے۔ (صفحہ:297) علی گڑھ میں آپ نے جدید ماحول کو براہ راست دیکھا۔ وہاں انگریزی زبان اور مغربی علوم کی اہمیت سمجھ میں آئی۔ یورپ کی علمی تحقیقات سے آگاہی ہوئی۔ خاص طور پر پروفیسر ٹی ڈبلو آرنلڈ سے طویل اور گہرے تعلقات نے مولانا کو موقع دیا کہ وہ جدید دنیا کو سمجھ سکیں۔ مولانا حبیب الرحمن شروانی کے الفاظ میں 'علامہ ممدوح کی زندگی کا یہ دور بہت کچھ سبق آموز اور ایک بڑے تعلیمی مسئلہ کا حل کرنے والا ہے' (حیاتِ شبلی، صفحہ:140)۔

اس کے علاوہ آپ کی گوناگوں خصوصیات نے آپ کو وقت کی تمام سرگرمیوں سے بے حد قریب کر دیا

تھا۔قومی وسیاسی تحریکوں میں آپ کی دلچسپی، اتحاد اسلامی اور ترکی اور دوسرے اسلامی ملکوں کے مسائل میں شرکت، علمی و تعلیمی کانفرنسوں میں آپ کا مدعو کیا جانا۔

حیدر آباد اور دوسرے علمی مرکزوں سے آپ کا تعلق، غیر ممالک کے سفر وقت کے اعلیٰ ترین علمی حلقوں سے تعلقات، یہ اور اس طرح کے دوسرے واقعات اس دور میں، مولانا شبلی نعمانی کے سوا کسی اور کے گرد اکٹھا نہیں ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت مولانا شبلی نعمانی ہی وہ ممتاز شخص تھے جو اپنے حالات کے اعتبار نئے ڈھنگ سے سوچ سکتے تھے اور بلاشبہ انھوں نے سوچا اور قوم کو جدید تعلیمی فکر دیا۔

تعلیم پر مولانا شبلی نعمانی کی پہلی باقاعدہ تحریر 'مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم' ہے۔ یہ ایک خطبہ تھا جو دسمبر 1887ء کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں (بمقام لکھنؤ) پڑھ کر سنایا گیا اور اس کے بعد رسالہ کی شکل میں شائع ہوا۔ عبدالحلیم شرر کے الفاظ میں... مولانا شبلی نعمانی کی تاریخی تحقیق و تنقید کا سب سے پہلا نمونہ مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم پر ان کا لکچر تھا؛ جسے انھوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے دوسرے یا تیسرے اجلاس میں پیش کیا تھا۔ لکچر مسلمانوں کی نظر میں بالکل نئی اور دلچسپ چیز تھا، چنانچہ جب اس پر دلگداز میں ریویو (review) ہوا ہے تو کوئی نہ تھا جو اس کے دیکھنے کا مشتاق نہ ہو گیا ہو۔ (حیاتِ شبلی، صفحہ:172)

یہ اسلامی تعلیم کے موضوع پر تاریخی اور تحقیقی اعتبار سے اپنی قسم کی پہلی چیز تھی۔ اس نے مسلمانوں کو ان کا شاندار تعلیمی ماضی یاد دلایا؛ یہ احساس زندہ کیا کہ بدلے ہوئے حالات میں دوبارہ انھیں اس اعلیٰ تعلیمی مقام کو حاصل کرنا ہے اور اس کے ساتھ مضمون کے آخر میں ریمارک (remark) نے یہ بھی بتایا کہ عام طور پر جس نہج سے کام کرنے کا رجحان ابھر رہا ہے، وہ مسلمانوں کے مرض کا مکمل علاج نہیں ہے۔

اس کے بعد اس سلسلے کا دوسرا نمایاں واقعہ سنہ 1892ء میں مولانا شبلی نعمانی کا بیرونی مسلم ممالک کا سفر ہے، جس کے مشاہدات و تاثرات 'سفرنامہ روم ومصر وشام' کی شکل میں دنیا کے سامنے جولائی 1894ء میں آئے۔ اس کتاب میں مولانا شبلی نعمانی ایک جگہ لکھتے ہیں: ممالک اسلامیہ میں جو مقامات آج کل تعلیم کے مرکز خیال کئے جاتے ہیں، قسطنطنیہ اور قاہرہ ہیں۔ اسی لحاظ سے میں نے ان دونوں مقاموں کی تعلیمی حالت دریافت کرنے میں بہت کوشش کی۔ (سفرنامہ روم ومصر وشام، مولانا شبلی نعمانی، رحمانی پریس، صفحہ:119)

اس کتاب میں مولانا نے مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں جو کچھ لکھا ہے، وہ بلاشبہ اس تعلیمی طرزِ فکر کی قدیم ترین دستاویز ہے جس نے بعد کو دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نام سے باقاعدہ عملی شکل اختیار کی۔ یہاں میں چند اقتباسات نقل کروں گا تاکہ صورتِ حال کا اندازہ ہو سکے:

'ترکی میں پرانی تعلیم نہایت ابتر ہے اور ہوتی جارہی ہے۔نئی تعلیم کے متعلق جو مشکلات یہاں ہے، وہاں بھی ہے۔ پرانی تہذیب اور نئی تہذیب میں ابھی تک رقابت ہے اور دونوں سے مل کر کوئی مرکب مزاج پیدا نہیں ہوا ہے۔ پرانے خیال والے ابھی تک زمانہ کی رفتار سے بے خبر ہیں۔ نئے مذاق کے لوگ جس قدر کہتے ہیں کرتے نہیں ہیں۔(صفحہ:6)

ترکوں میں تعلیم کا آغاز سلطنت کے ساتھ ساتھ ہوا۔ یہ وہی تعلیم تھی جس کو ہم آج 'قدیم تعلیم' کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ بے شک یہ کسی زمانہ میں اعلیٰ درجہ پر تھی۔لیکن موجودہ تعلیم پستی کی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ اس کے مقابلہ میں ہمارے ہندوستان کی تعلیم غنیمت ہے، اس سفر میں جس چیز کا تصور میری تمام مسرتوں اور خوشیوں کو برباد کر دیتا تھا وہ اس قدیم تعلیم کی ابتری تھی۔

یہ مسئلہ آج کل ہندوستان میں بھی چھڑا ہوا ہے اور تعلیم قدیم کی ابتری پر عموماً (جدید طبقہ کی طرف سے) رنج وافسوس کیا جاتا ہے۔لیکن میرا افسوس دوسری قسم کا افسوس تھا۔ ہمارے ملک کے نئے تعلیم یافتہ پرانی تعلیم پر جو رنج وافسوس ظاہر کرتے ہیں وہ درحقیقت رنج نہیں بلکہ استہزا اور شماتت ہے۔

میں اگرچہ نئی تعلیم کو پسند کرتا ہوں اور دل سے پسند کرتا ہوں۔تاہم پرانی تعلیم کا سخت حامی ہوں اور میرا خیال ہے کہ مسلمانوں کی قومیت قائم رہنے کے لیے پرانی تعلیم ضروری اور سخت ضروری ہے۔اس کے ساتھ جب یہ دیکھتا ہوں کہ یہ تعلیم جس طریقہ سے جاری ہے، وہ بالکل بے سود اور بے معنی ہے تو نہایت رنج ہوتا ہے۔(صفحہ:52)

قسطنطنیہ کی طرح مصر میں بھی تعلیم کے دو طریقے ہیں، قدیم وجدید۔ یہ دونوں طریقے بالکل مختلف ہیں، اور اس اختلاف نے دونوں کو نہایت نقصان پہنچایا ہے (صفحہ:114)

مصر اور نہ صرف مصر بلکہ تمام ممالک اسلامیہ میں جو کالج مجھ کو سب سے زیادہ پسند آیا اور جس کو میں نے مسلمانوں کے درد کے لیے کافی سمجھا وہ یہی کالج (دارالعلوم) ہے۔اور میرا ہمیشہ یہ خیال ہے اور میں نہایت مضبوطی سے اس پر قائم ہوں کہ مسلمان مغربی علوم میں گو ترقی کے کسی رتبہ تک پہنچ جائیں، لیکن جب تک ان میں مشرقی تعلیم کا اثر نہ ہو، ان کی ترقی مسلمانوں کی ترقی نہیں کہی جاسکتی۔ بے شبہ مشرقی تعلیم کی موجودہ اسکیم نہایت ابتر یا اور غیر ضروری ہے۔لیکن اسی تعلیم میں ایسی چیزیں بھی ہیں جو مسلمانوں کی قومیت کی روح ہیں۔ اور جس تعلیم میں اس روحانیت کا مطلق اثر نہ ہو، وہ مسلمانوں کے مذہب، قومیت، تاریخ کسی چیز کو بھی زندہ نہیں رکھ سکتی۔جس مصیبت کا ہندوستان میں رونا ہے، وہی قسطنطنیہ، بیروت اور مصر میں بھی موجود ہے۔یعنی نئی

تعلیم میں قومیت اور مذہبی پابندی کا اثر کم ہو۔ اور پرانی تعلیم اس قابل نہیں کہ دنیا کی موجودہ ضرورتوں کا ساتھ دے سکے۔

صرف ایک یہ دار العلوم ہے جو دونوں ڈانڈوں کو ملانا چاہتا ہے۔ اگر چہ افسوس ہے کہ ابھی پورا کامیاب نہیں ہوا۔ اس کالج (دار العلوم) کا اول جس کو خیال آیا وہ علی پاشا مبارک مصر کا ایک روشن ضمیر ہے... اس نے خود مشرقی اور مغربی تعلیم دونوں حاصل کی ہیں... اس کالج (دار العلوم) میں داخل ہونے کی ضروری شرط یہ ہے کہ طالب علم مشرقی علوم میں سے نحو، صرف، فقہ، اصول فقہ، تفسیر، حدیث کی مناسب استعداد رکھتا ہو۔ (صفحہ:122-123)

اسی طرح مولانا شبلی نعمانی نے جامعہ ازہر اور دوسرے مدارس کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے، پڑھنے کے قابل ہے۔ (صفحہ:124-125، 128-129، 133-134)۔

مصر کی ملاقاتوں میں شیخ محمد عبدہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں: میں ان سے ملا تھا۔ دیر تک لطف کی صحبت رہی۔ ازہر کی ابتری تعلیم پر افسوس کرتے تھے لیکن اس کے ساتھ نئی تعلیم کے بھی سخت شاکی تھے اور کہتے تھے کر ھولاء اصل سبیلا (صفحہ:148)۔

اس کے بعد مولانا اپنی تحریروں اور تقریروں میں مختلف طور پر اس مسئلہ کو پیش کرتے رہے۔ وہ ایک طرف ماضی کو پوری طرح تسلیم کرتے تھے۔ دوسری طرف اس پر زور دیتے تھے کہ ماضی کو حال بنانے کے لیے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ فروری 1900ء میں انھوں نے درس نظامیہ پر ایک مضمون لکھا جس میں درس نظامیہ کی تاریخی اہمیت پوری طرح ثابت کرنے کے بعد آخر میں لکھا: 'اس موقع پر یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ موجودہ درس جو نظامیہ کے نام سے مشہور ہے، دراصل 'درس نظامیہ' نہیں ہے۔ اس میں بہت سی کتابیں ایسی اضافہ ہوگئی ہیں جو ملاّ نظام الدین کے عہد میں موجود نہ تھیں۔ مثلاً ملاّ حسن، حمد اللہ، حاشیہ غلام یحییٰ، قاضی مبارک، ہمارے نزدیک ضروریات زمانہ کے لحاظ سے درس نظامیہ میں بہت کچھ ترمیم و اضافہ کی ضرورت ہے۔ (مقالات شبلی، جلد سوم، صفحہ:110)

اس کا مطلب یہ تھا کہ جس طرح درس نظامیہ نے اس سے پہلے اپنے وقت کی ضرورت کو تسلیم کرتے ہوئے اپنے سابق نظام درس میں ردو بدل کیا تھا، اسی طرح آج بھی زمانہ کی تبدیلی کی بناء پر اس میں دوبارہ ایک نئے ردو بدل کی ضرورت ہے۔ اسی طرح اپنے مختلف مضامین میں انھوں نے عباسیہ کے زمانہ میں 'علوم یونانی' کی اشاعت اور 'علم کلام' کی ایجاد کی صورت پیش کی، جس کا مطلب ماضی کی مثال سے یہ واضح کرنا تھا

کہ مسلم سوسائٹی (muslim society) جب ایک نئے چیلنج سے دو چار ہوئی تو پیش آمدہ صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے نئے طریقے اختیار کئے گئے اور تعلیم و تعلم کے ڈھانچے میں تبدیلی کی گئی۔

اس طرح آج ہم دوبارہ ایک نئی صورت حال سے دوچار ہیں اور ماضی کی طرح پھر ہمیں اس کے مقابلے کے لیے نئے طریقے اختیار کرنے ہوں گے۔ دوسرے لفظوں میں عباسی دور دوبارہ ایک نئی اور شدید تر شکل میں تمہاری طرف لوٹ آیا ہے۔

اس موضوع پر مولانا شبلی نعمانی کا کام اتنا منفرد اور نمایاں تھا کہ ہندوستان میں وہ اصلاحِ نصاب کی تحریک کی علامت بن گئے تھے۔ چنانچہ مصر سے آپ کی واپسی کے چند سال بعد 1899ء میں جامع ازہر کی اصلاح کی تحریک شروع ہوئی۔ اس کے متعلق سید رشید رضا (ایڈیٹر المنار، مصر) نے مسلسل مضامین لکھے۔

30 جمادی الثانی 1317ھ کے المنار میں انھوں نے اپنی اصلاحی تحریک کے سلسلہ میں دنیائے اسلام کے تین نامور علماء کے نام سنداً پیش کئے: شیخ احمد جان روسی، شیخ شنقیطی مغربی (مراکش) اور اس کے بعد میرا اور آخری نام تھا شیخ شبلی نعمانی ہندی (حیات شبلی، صفحہ:19)

انیسویں صدی کا آخری زمانہ جب کہ مذکورہ بالا 'مولانا شبلی نعمانی' کو وجود میں لا چکا تھا، سنہ 1892ء میں مدرسہ فیض عام (کان پور) کے جلسہ دستار بندی کے موقع پر ملک کے بڑے بڑے علماء جمع ہوئے۔ اس اجتماع کے موقع پر ملک کی عام صورتِ حال پر بھی گفتگو ہوئی اور بالآخر یہ طے پایا کہ علماء کی ایک مجلس قائم کی جائے۔ اس مجلس کا نام 'ندوۃ العلماء' رکھا گیا اور یہ طے پایا کہ آئندہ سال مدرسہ فیض عام کے سالانہ جلسہ کے موقع پر اس کا پہلا اجلاس کیا جائے اور تمام ہندوستان کے علماء کو اس میں شرکت کی دعوت دی جائے۔ مولانا محمد علی مونگیری اس مجلس کے پہلے 'ناظم' مقرر ہوئے۔

ندوۃ العلماء کے قیام کے دو خاص مقصد تھے:

(الف) رفع نزاعی علماء جو کچھ دنوں سے اختلافی مسائل اور مباحث لا طائل کی وجہ سے آپس میں ہو رہی ہیں، جس کی وجہ سے شرمناک واقعات درپیش ہوتے ہیں۔

(ب) اصلاح طریقہ تعلیم جس سے مقصود علوم اسلامیہ کی ترقی اور اصلاح نفوس اور درستی اخلاق ہے۔ رداد، ندوۃ العلماء، حصہ دوم، بابت سال اوّل (اپریل 1894ء، صفحہ:1)

مولانا شبلی نعمانی کا ذہن جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ یہ تھا کہ اپنی الگ سے کوئی انفرادی تنظیم قائم نہ کرو بلکہ دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرو۔

اسی ذہن کے تحت وہ علی گڑھ گئے، اسی ذہن کے تحت ندوہ آئے، اسی ذہن کے تحت دوسروں سے اشتراک کی کوشش کی۔ مگر بڑھی ہوئی سطحیت اور تنگ نظری نے ہر جگہ مسئلہ پیدا کیا۔ یہاں تک کہ بالاآخر سب سے ہٹ کہ انھوں نے دارالمصنفین کو اپنا مرکز بنایا۔ چنانچہ مولانا شبلی نعمانی کو جب دعوت نامہ کے ذریعہ مدرسہ فیض عام کے فیصلہ کا علم ہوا تو انھوں نے پہلے ہی اجلاس میں شرکت کا ارادہ کرلیا۔ اگر چہ ابتداء 'ندوۃ العلماء' کے ارکان میں جدید علوم کے انتظام کا کوئی واضح تصور نہیں تھا۔ مگر مولانا شبلی نعمانی کو محسوس ہوا کہ تعلیم کے میدان میں جدید وقدیم کی یکجائی کا جو منصوبہ ان کے ذہین میں ہے؛ ندوۃ العلماء اس کی تکمیل کی زمین فراہم کرسکتا ہے انھوں نے ندوۃ العلماء کو اپنی کوششوں کا میدان بنانا طے کرلیا... وہ علی گڑھ سے آکر اس کے پہلے اجلاس میں شریک ہوہے۔ (ہفت روزہ الجمعیۃ، نئی دہلی، 26 جنوری 1968ء، صفحہ: 14-13)

قسط سوم

اب میں دوبارہ مکتبہ دارالعلوم ندوۃ العلماء کی طرف سے شائع شدہ کتاب سیرت مولانا محمد علی مونگیری کی طرف لوٹتا ہوں۔ یہ بات پیشگی واضح کردوں کہ اس کتاب کو میں اس قدر 'غیر معیاری' سمجھتا ہوں کہ میں ہرگز اس کو موضوع بنانا اپنے لیے پسند نہیں کرسکتا تھا۔ اس 'نا قابلِ اتفات کتاب' کو صرف اس لیے میں نے زیر بحث لانا گوارا کیا ہے کہ مولانا سید ابوحسن علی ندوی نے اس کی تصدیق کی ہے اور اس کو اس انداز سے پیش کیا ہے گویا کہ وہ خود ان کی اپنی لکھی ہوئی کتاب ہے۔

اس کتاب کے مصنف جناب مولانا سید محمد الحسنی ہیں جو مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کے قریبی عزیز ہیں، نیز انھوں نے خود مولانا مدظلہ کی رہنمائی ونگرانی میں اس کام کو انجام دیا ہے ہے... مولانا اپنے مقدمہ میں مصنف کے بارے میں لکھتے ہیں: 'عزیز موصوف کو میرے برے بھلے طرزِ نگارش سے سب سے زیادہ مناسبت ہے اور بعض وقت ان کی تحریر اور اپنی تحریر میں مجھے خود بھی اشتباہ ہوجاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نظر بد سے بچائے۔ ان کو اپنے نامور دادا (مقدمہ نگار کے والد) سے قلم کی روانی اور تحریر کی شگفتگی ورثہ میں ملی ہے۔ میں نے ان کا ذوق و شغف دیکھ کر اور اس امید پر کہ ان کی تحریر وتصنیف زیادہ سے زیادہ میری تحریر وتصنیف کی قائم مقامی کر سکے گی، ان کو اجازت دیدی۔ یہ معلوم کرکے مزید مسرت ہوئی کہ وہ اس کام کو خالص اپنی سعادت سمجھ کر انجام دے رہے ہیں اور ان تمام آداب کو ملحوظ رکھتے ہیں جو اہل اللہ اور برگزیدہ اصحاب کی سوانح وسیرت کی ترتیب و تصنیف میں ملحوظ رکھنے چاہئیں۔ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ انھوں نے کتاب کی ترتیب میں پوری محنت سے کام لیا اور اپنی اہلیت کا ثبوت دیا ہے۔ انھوں نے تمام متعلقہ مواد کو غائر نظر سے پڑھا اور بڑی خوبی کے ساتھ اس سے

فائدہ اٹھایا اور کام لیا ہے۔ کتاب جس شکل میں سامنے آئی وہ حقیقت میں میرے تصور و توقع سے بلند تھی۔ اس عدیم الفرصتی اور ذہنی تشتت و انتشار میں مجھے بہت شبہ ہے کہ (میں خود لکھتا) تو اس کو اتنے اچھے طریقہ پر انجام دے سکتا اور اس کے حقوق سے عہدہ برآ ہو سکتا۔ اس میں خامیاں بھی ہوں گی اور کوتاہیاں بھی۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ مصنف نے اس میں اپنی عمر و صلاحیت سے زیادہ پختگی کا ثبوت دیا ہے اور کہیں انصاف کے دامن اور نقطۂ اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا ہے۔ (صفحہ:26-25)

یہ کتاب جو مذکورہ بالا اقتباس کی شہادت کے مطابق اہلِ اللہ کے آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے لکھی گئی ہو اور جس میں 'کہیں انصاف کے دامن اور نقطۂ اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا' گیا ہے؛ مجھے افسوس ہے کہ اس کا یہی پہلو ہے جس سے اتفاق کرنا میرے لیے مشکل ہے۔

یہ کتاب مقدمہ نگار کے الفاظ میں ندوہ کی 'عظیم تحریک کی تاریخ' بھی ہے۔ (صفحہ:26) اگر اس کے منصفانہ بیان پر اعتماد کیا جائے تو قاری کا تاثر یہ ہوگا کہ ندوہ کی تاریخ میں مولانا شبلی نعمانی کا کردار بہت معمولی ہے۔ ندوہ کی اس منصفانہ تصویر میں یہ تاثر کیسے شامل ہوا؟ اس کا سادہ سا طریقہ جو کتاب کے مرتب نے اختیار فرمایا ہے وہ وہی ہے جس کی شکایت مستشرقین سے اور ہندوستان کے ہندو مورخین سے ہے۔ یعنی تاریخ کے واقعات سے اپنے ناپسندیدہ اجزاء کو حذف کر دینا یا اس کو گھٹا کر پیش کرنا۔ چنانچہ ندوہ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے مولانا شبلی نعمانی کے ساتھ میں یہی معاملہ کیا گیا ہے۔

ندوۃ العلماء کے پہلے اجلاس میں مولانا شبلی نعمانی کا کیا حصہ رہا؟ یہ کتاب تسلیم کرتی ہے کہ مولانا شبلی نعمانی ندوۃ العلماء کے اجلاسِ اوّل میں شریک تھے۔ البتہ اس کے الفاظ میں ان کی شرکت کی نوعیت یہ تھی: 'مولانا شبلی نعمانی بھی اس جلسہ میں شریک تھے اور نہ صرف شریک تھے بلکہ پوری دل چسپی کے ساتھ کارروائی میں حصہ لے رہے تھے ان ہی کی تحریک اور مولانا محمد حسین الہ آبادی کی تائید سے مولانا لطف اللہ صاحب اجلاس کے صدر قرار پائے (صفحہ:127-126)۔

دوسری جگہ مولانا شبلی نعمانی کا ذکر حسب ذیل الفاظ میں ہے: 'دستور العمل پیش کرنے کا کام مولانا محمد علی مونگیری نے مولانا عبدالحق حقانی کے سپرد کیا تھا۔ لیکن وہ وقت مقررہ پر تشریف نہ لا سکے۔ چنانچہ مولانا شبلی نعمانی نے صدر جلسہ کی اجازت سے دستور العمل پیش کیا۔ (صفحہ:128)

اس کے بعد تیسرا اور آخری مقام جہاں مولانا شبلی نعمانی کا نام نظر آتا ہے وہ 12 اشخاص کی اس کمیٹی کی فہرست ہے جو 'نصابِ تعلیم' پر غور کرنے کے لیے مقرر کی گئی تھی۔

یہ تو مولانا شبلی نعمانی کے 'شرکتِ اجلاس' کی وہ تصویر جو سیرت مولانا محمد علی مونگیری میں نظر آتی ہے۔

لیکن اگر آپ ندوۃ العلماء کی مطبوعہ روداد میں مولانا شبلی نعمانی کی شرکت کی تصویر دیکھنا چاہیں تو وہ اس سے مختلف ہوگی۔ روداد نہ صرف یہ کہ جلسہ کے متعدد امور کی انجام دہی کے سلسلہ میں صراحتاً مولانا شبلی نعمانی کا نام لیتی ہے بلکہ اس روداد (سال اوّل اپریل 1892ء) کے حصہ دوم کو آپ کھولیں تو صفحہ 3 پر آپ کو جلی حرفوں میں لکھا ہوا ملے گا:

'تقریر جناب شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی'۔ اس کے بعد مولانا شبلی نعمانی کی وہ تقریر ہے جو روداد کے 13 صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، یہ تقریر نہ صرف ترتیب میں نمبر ایک پر ہے بلکہ درج شدہ 10 تقریروں میں سب سے زیادہ اہم ہے۔ یہ تقریر اس درجہ واضح اور مدلّل ہے کہ شروع کرتے ہی اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اور ختم کئے بغیر اس کو چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ مگر ندوۃ العلماء کے اجلاس کا یہ اہم ترین واقعہ 'سیرت مولانا سید محمد علی مونگیری... بانی ندوۃ العلماءؒ کے مصنف مولانا سید محمد الحسنی ندوی لیے ایک 'لامعلوم واقعہ' ہے۔

کیوں... شاید اس لیے کہ اس کے ذکر سے یہ ثابت ہو رہا تھا کہ مولانا شبلی نعمانی ندوۃ العلماء کی تحریک کو فکر دینے والوں میں سے تھے جب کہ کتاب کے مصنف ان کو صرف 'شرکتِ اجلاس' کا کریڈٹ دینا چاہتے ہیں۔

یہاں میں اس تقریر کا ایک مختصر سا اقتباس نقل کرتا ہوں جس سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوگا:

'طرزِ تعلیم میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اصل فن کے بجائے کتاب کے ساتھ زیادہ اعتناء کی جاتی ہے۔ اصل مسئلہ کی تحقیق کے بجائے زیادہ وقت اس میں صرف کیا جاتا ہے کہ وہ مسئلہ کسی عبارت میں بیان کیا گیا ہے۔ اور اس عبارت سے کیا کیا احتمالات پیدا ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ اِن مباحث میں اعتراضات اور جوابات کا ایک سلسلہ قائم ہو جاتا ہے جن کی بنیاد کسی خاص کتاب کی عبارت والفاظ پر ہوتی ہے یعنی وہی مسئلہ اگر دوسرے لفظوں میں بیان کر دیا جائے تو وہ سلسلہ خود بخود منقطع ہو جائے۔

ان مباحث میں پڑ کر طالبِ علم کو اصل فن سے بعد ہوتا جاتا ہے اور تحقیق مسائل کے بجائے لفظی اعتراضات احتمال آفرینی توجیہات کی عادت ہو جاتی ہے۔ آج کل جو یہ شکایت عام ہے کہ موجودہ طریقہ تعلیم سے فن میں کمال نہیں حاصل ہو سکتا ہے، اس کی وجہ زیادہ تر یہی ہے کہ فن کی تعلیم ہی نہیں ہوتی تو اس میں کمال کیوں کر پیدا ہو، البتہ کتابوں کی تعلیم ہوتی ہے۔ اس لیے کتاب میں کمال پیدا بھی ہو رہا ہے۔ عموماً سننے میں آتا ہے کہ فلاں عالم میر زاہد ایسا پڑھاتے ہیں کہ کوئی اور نہیں پڑھا سکتا۔ قاضی مبارک کے نکات کا حل کرنا فلاں صاحب کا حصہ ہے۔ فلاں طالب علم نے حمد اللہ بڑی تحقیق سے پڑھی ہے۔ اگر کسی مستعد طالب علم کا اگر

مطول یا حمد اللہ میں امتحان لیا جائے تو ممکن ہے کہ وہ ان کتابوں کا مطلب نہایت شرح وبسط وایراد وجواب کے ساتھ بیان کرے۔ لیکن اسی طالب علم سے اگر یہ کہا جائے کہ قرآن مجید کے کسی رکوع یا آیت کو فصاحت و بلاغت کے قواعد اور اصول پر منطبق کر کے دکھائے یا کسی مسئلے پر جب گفتگو کرے تو دلائل منطقی کو قیاسات کے پیرائے میں بیان کرتا جائے، تو شاید نہ کر سکے۔ اس سے صاف ثابت ہے کہ کتاب کی تعلیم ہوتی ہے فن کی نہیں ہوتی... ملا نظام الدین کا طریقہ درس بھی یہی تھا کہ وہ کتابی خصوصیتوں کا چنداں لحاظ نہیں کرتے تھے بلکہ کتاب کو ایک ذریعہ قرار دے کر اصل فن کی تعلیم دیتے تھے۔ اسی طرزِ تعلیم نے لاکمال، بحر العلوم، حمد اللہ جیسے اہلِ کمال پیدا کئے۔ جب یہ طرز تعلیم نہ رہا تو اہلِ کمال بھی مفقود ہو گئے۔ (روداد، ندوۃ العلماء بابت سال اوّل (اپریل 1894ء)، حصہ دوم صفحہ: 7-6)

پوری تقریر اسی طرح کے جواہر ریزوں سے بھری ہوئی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اپنی اس خصوصیت میں وہ بالکل منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ مگر 'سیرت مولانا محمد علی مونگیری' میں 'انصاف واعتدال' نیز 'اہل اللہ کے آداب' کو ملحوظ رکھتے ہوئے ندوہ العلماء کے اجلاس اوّل کی جو تصویر کھینچی گئی ہے، اس میں یہ سرے سے قابلِ ذکر بھی نہیں:

ہاں ورق کہ سیہ گشتہ مدعا این جا است

اس کے بعد زیرِ نظر کتاب کا دوسرا باب شروع ہوتا ہے جس کا عنوان ہے 'ندوہ کا اجلاس لکھنؤ'۔ یہ ندوہ کے دوسرے سالانہ اجلاس کی روداد ہے، جو اپریل 1895ء میں لکھنؤ میں ہوا۔ 30 صفحات کے اس طویل باب میں مولانا شبلی نعمانی کو صرف ایک مقام پر جگہ ملی ہے اور وہ بھی ان الفاظ میں: 'مولانا محمد علی مونگیری اپنے ضعف وعلالت کی وجہ سے سال گزشتہ کی طرح اس سال بھی رپورٹ نہ پیش کر سکے اور قرعہ فال مولانا شبلی نعمانی کے نام پڑا، جنھوں نے یہ رپورٹ صدر کی اجازت سے پڑھ کر سنائی۔ (صفحہ: 137)

یہ واقعہ بذات خود صحیح ہے، صرف اس فرق کے ساتھ کہ اصل مطبوعہ روداد میں جو الفاظ ہیں وہ یہ ہیں:

'اب اس کا وقت آیا کہ یہ ناظم سال گذشتہ کی رپورٹ سنائے مگر بسبب ضعف وعلالت کے مجبور تھا اس لیے حسب اجازت صدر انجمن شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی صاحب اپنی کرسی سے کھڑے ہوئے اور سال گزشتہ کی کارروائی پڑھ کر سنائی۔ (روداد جلسہ دوم، ندوۃ العلماء، اپریل 1895ء، صفحہ: 53)

اس کے بعد کتاب کا یہ باب جس کا عنوان ہے 'ندوہ کا اجلاس لکھنؤ'۔ وہ مولانا محمد علی مونگیری کی تو ایک ایک بات کا نہایت تفصیل سے ذکر کرتا ہے مگر مولانا شبلی نعمانی کے اس ایک تذکرہ کے بعد خاموش ہے۔ حالاں کہ ندوہ کے اجلاس لکھنؤ میں مولانا شبلی نعمانی سے متعلق دوسری متعدد باتیں ہیں جو اس سے کہیں زیادہ

قابلِ ذکر ہیں۔ مثلاً نصابِ تعلیم کے سلسلہ میں مولانا شبلی نعمانی کا سلکٹ کمیٹی (select committee) کا ممبر منتخب ہونا (صفحہ:87) انتظامی اراکین میں مولانا شبلی نعمانی کا انتخاب (صفحہ:118) ندوہ العلماء کی رپورٹ کے بعد دوسری تقریر، جس کے متعلق مطبوعہ روداد میں حسب ذیل الفاظ درج ہیں:

'اس کے بعد مولوی محمد شبلی نعمانی صاحب اپنی کرسی سے اٹھے اور اپنا لکھا ہوا مضمون سنایا جو علاحدہ مولوی محمد ابراہیم، مولوی شاہ محمد سلیمان صاحب کی تحریر کے ساتھ طبع ہوا ہے، سوا گھنٹے میں یہ مضمون ختم ہوا۔ (صفحہ:58)

مولانا شبلی نعمانی کی اس تقریر کا عنوان تھا 'زمانہ موجودہ کے لحاظ سے ہمارے علماء کے فرائض'۔ اس کو اسی زمانے میں دوسری تین تقریروں کے ساتھ 'مضامین اربعہ' کے نام سے ندوۃ العلماء کی طرف سے شائع کر دیا گیا تھا۔ میں نے موجودہ مضمون کی ترتیب کے سلسلہ میں 30 اپریل 1967ء کو پہلی بار اسے حاصل کر کے پڑھا۔ بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ اس کو پڑھ کر مجھ پر وجد کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ اپنے موضوع پر اس قدر عالمانہ اور اتنا بصیرت افروز ہے کہ بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ ندوۃ العلماء کے قدیم اجلاسوں کی جتنی بھی شائع شدہ تقریریں اور تحریریں موجود ہیں، ان میں سے کسی میں بھی 'زمانہ موجودہ کے لحاظ سے علماء کے فرائض' کو اتنی واضح شکل میں بیان نہیں کیا گیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ندوۃ العلماء کے دوسرے سالانہ جلسہ کی یہ تقریر تنہا اس بات کے ثبوت کے لیے کافی ہے کہ مولانا شبلی نعمانی اس فکر کے اوّلین فکری معماروں میں ہیں۔

اسی طرح اس اجلاس کی یہ بات قابل ذکر تھی کہ علماء کی ایک خصوصی نشست میں اصولِ تقریر نصاب پر بحث ہوئی اور چند اصول پیش ہوئے:

(الف) علوم زیر درس پر کسی اور علم کا اضافہ ہونا ضروری ہے یا نہیں،

(ب) اگر ہونا چاہیے تو وہ کیا علوم ہیں۔

یہ رپورٹ کہتی ہے کہ پہلے امر کی نسبت، اتفاق عام ہوا کہ اضافہ ضرور ہونا چاہیے۔ دوسرے امر کے متعلق مختلف علوم کے نام لیے گئے۔ ان میں سے بعض علوم یعنی رجال و اصول و تفسیر و فن تاریخ و جغرافیہ (بشر طیکہ عربی زبان میں ہوں) کی نسبت اتفاقِ عام ہوا کہ درس میں اضافے کیے جائیں۔ لیکن جب علومِ جدیدہ کی تجویز مولوی منصور علی صاحب مراد آبادی نے پیش کی تو اختلاف رائے ہوا۔ اس میں خاص قابل ذکر بات یہ ہے کہ مولانا محمد فاروق چڑیا کوٹی جو ایک تبحر عالم ہونے کے ساتھ مولانا کے استاد تھے؛ وہ علوم جدیدہ کے اضافہ کے خلاف تھے۔ مگر مولانا شبلی نعمانی کا شعور اس معاملہ میں اتنا بڑھا ہوا تھا کہ استاد کی رائے سے اختلاف کرتے ہوئے انھوں نے اس کی تائید کی۔ (صفحہ:89)

یہاں کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ زیر تبصرہ کتاب ندوہ کی تاریخ نہیں بلکہ مولانا محمد علی مونگیری کی سیرت ہے۔اس لیے ندوہ کی ساری کارروائی کی تفصیل اس میں ضروری نہیں۔مگر یہ بات چند وجوہ سے نا قابلِ قبول ہے۔اوّل تو یہ کہ کتاب کا انداز توجیہ خود اس کے خلاف گواہی دیتا ہے۔اس کو پڑھنے سے صاف اندازہ ہوتا ہے کہ 'سیرت مولانا محمد علی مونگیری' کا مطلب جتنا مولانا محمد علی مونگیری کی سیرت ہے اس سے زیادہ یہ ہے کہ ندوہ کی تاریخ کو 'سیرت مولانا محمد علی مونگیری' کی شکل میں پیش کیا جائے، مقدمہ نگار کے الفاظ میں یہ کتاب 'نہ صرف ایک عظیم وبرگزیدہ شخصیت کی سوانح ہے بلکہ ایک عظیم تحریک کی تاریخ بھی ہے' (صفحہ:26)

مثال کے طور پر دار العلوم کے افتتاحی جلسہ (ستمبر 1898ء) میں مولانا محمد علی مونگیری شریک نہیں تھے۔ (صفحہ:200) مگر اس کے باوجود اس کی کارروائی کتاب میں درج کی گئی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جب ایک شخص اجلاس میں شریک ہوا اور وہاں دو قسم کی خدمات انجام دے۔

اوّل یہ کہ دوسرے کی لکھی ہوئی کہ رپورٹ کو صدر جلسہ کی اجازت سے' پڑھ کر سنانا۔

دوم تقریر پروگرام، کمیٹیوں کے غور وخوض اور جلسہ کی کارروائیوں میں براہِ راست شرکت۔تو اب دونوں میں سے کون سی بات زیادہ قابل ذکر ہے۔پہلی یا دوسری۔اگر کوئی صاحب پہلی بات کا ذکر کریں اور دوسری بات کو حذف کردیں تو کیا ایسی کتاب پر یہ الفاظ صادق آئیں گے کہ اس میں کہیں انصاف کے دامن اور نقطۂ اعتدال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا گیا ہے (صفحہ:26)

تیسری بات یہ کہ نام کے اعتبار سے اگرچہ کتاب کا موضوع مولانا محمد علی مونگیری کے حالات تک محدود تھا مگر اس کتاب میں اس سے آگے بڑھ کر ایک اور کام کیا گیا ہے۔وہ یہ کہ دار العلوم ندوۃ العلماء کی تاریخ سے مولانا شبلی نعمانی کے کردار کو گھٹا کر اور مولانا محمد علی مونگیری کے کردار کو بڑھا کر ایک تصویر بنائی گئی ہے اور اس کے نیچے لکھ دیا گیا ہے کہ دار العلوم ندوۃ العلماء کے معمار مولانا محمد علی مونگیری تھے۔

ظاہر ہے کہ آدمی جب واقعات کی دنیا میں اس قسم کی جسارت کرے تو اس کو یہ امید نہیں کرنی چاہیے کہ اس کا مقابلہ صرف 'بباید گفت اینک ماہ و پروین' جیسی مخلوق سے ہے۔

یقیناً اس کو علم اور تاریخ کی عدالت میں جواب دہ ہونا پڑے گا اور یہ عدالت وہ ہے جو اپنی فطرت کے اعتبار سے نہایت بے رحم واقع ہوئی ہے۔(ہفت روزہ الجمعیۃ، نئی دہلی، 2 فروری 1968ء، صفحہ:14-13)

قسط چہارم

ندوۃ العلماء کا تیسرا اجلاس رائے بریلی میں اپریل 1896ء میں ہوا۔مگر کتاب میں حسب معمول ایک

طرف مولانا محمد علی مونگیری کے لیے ایسے الفاظ اور انداز بیان اختیار کیے گئے ہیں کہ ان کی حیثیت کچھ بڑھ کر نظر آئے اور دوسری طرف مولانا شبلی نعمانی کے لیے ایسے الفاظ ہیں جس سے ان کی حیثیت گھٹ کر دکھائی دے۔ مثال کے طور پر درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہو: 'اب مولانا شبلی نعمانی کی باری تھی۔ تاخیر بہت ہوگئی تھی۔ اس لیے مولانا نے معذرت چاہی۔ لیکن شائقین کے اصرار سے کھڑے ہوئے اور ایک مختصر اور مؤثر تقریر کی۔ وہ تقریر مولانا نے حسب معمول قلم بند نہیں کی اس لیے روداد میں اس کی تفصیل نہیں ہے۔ (صفحہ:167)

اسی واقعہ کے لیے اصل روداد میں جو الفاظ ہیں وہ یہ ہیں: 'اس کے بعد شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی صاحب کا بیان ہونے کو تھا۔ مگر دیر ہو جانے کی وجہ سے گرمی کی شدت ہو چکی تھی۔ اس لیے شمس العلماء نے معذرت کی۔ مگر شائقین کے اصرار نے مجبور کیا تو بیان کرنے کو کھڑے ہوئے اور ندوہ کے مقاصد کے متعلق ایک مختصر تقریر کی۔ مگر ہم کو افسوس ہے کہ وہ قلم بند کر کے نہیں بھیجی۔ اس وجہ سے اس جگہ پر درج نہیں ہو سکی۔ (روداد جلسہ، سال سوم، ندوۃ العلماء، اپریل 1896ء، صفحہ:44-43)

ایک طرف مولانا شبلی نعمانی کو گھٹانے کا یہ ذہن ہے دوسری طرف مولانا محمد علی مونگیری کو بڑھانے کی کوشش کا یہ عالم ہے کہ پٹنہ (بہار) کے لیے ندوہ کے وفد میں حیاتِ شبلی کی روایت اور مطبوعہ ریکارڈ کے مطابق مولانا محمد علی مونگیری شامل نہیں تھے۔ اس کے باوجود زبردستی اپنے ایک خودساختہ قیاس کی بنیاد پر انھیں فہرست میں شامل کر دیا گیا ہے۔

صاحبِ کتاب کے نزدیک یہ واقعہ کہ مطبوعہ ریکارڈ میں مولانا محمد علی مونگیری کا نام نہیں ہے اور نہ وفد کی سرگرمیوں میں ان کے کسی حصہ کا ذکر ہے، کوئی قوی بنیاد نہیں ہے، البتہ ان کا اپنا قیاس اتنی قوی بنیاد ہے کہ انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی پر 'حیرت' کا اظہار کیا ہے کہ کیوں انھوں نے ان کے قیاس میں شریک ہو کر مولانا محمد علی مونگیری کا نام وفد کی فہرست میں داخل نہیں کر دیا۔ (صفحہ:181)

یہی معاملہ چوتھے اجلاس میرٹھ (مارچ 1897ء) کا ہے۔ عام طور پر اس کتاب میں مولانا محمد علی مونگیری کی نہایت چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر ہے۔ مگر بعض جگہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بالقصد ایک چیز حذف کر دی گئی ہو۔ اس جلسہ میں مولانا محمد علی مونگیری نے یہ تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کے ابتدائی درجہ کے ایک سال کے مصارف کا اسی وقت انتظام ہو جانا چاہیے۔ منشی اطہر علی صاحب نے اس کی تائید کی۔

مولانا شبلی نعمانی نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ 'علماء پر یہ الزام دیا جاتا ہے کہ وہ خود کسی کام کو اپنے روپیہ سے نہیں کرتے۔ اس واسطے میں یہ تحریک کرتا ہوں کہ درجہ ابتدائی دارالعلوم کے ابتدائی مصارف کے متکفل ارکانی

انتظامیہ ہو جائیں، زیر نظر کتاب میں اس 'اضافہ' کا ذکر تو ہے (صفحہ:190) مگر یہ ذکر نہیں ہے کہ تجویز کی منظوری کے بعد جب لوگوں نے اپنے چندے لکھوارہے تو مولانا شبلی نعمانی کا چندہ 'ایک سو روپیہ' اور مولانا محمد علی مونگیری کا 'پچاس روپیہ' تھا۔

حاشا وکلّا: میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انفاق فی سبیل اللہ میں مقدار کوئی اہمیت رکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں جذبہ دل کی حیثیت ہے نہ کہ مقدار زر کی۔ نیز مولانا محمد علی مونگیری ایک لحاظ سے مستقل چندہ دہندوں میں شامل تھے۔ کیوں کہ 1900ء میں جب ریاست حیدر آباد نے ندوہ کے لیے پچاس روپیہ اور ان کے اپنے صرف کے لیے پچاس روپے منظور کیے تو انھوں نے اپنے حصہ کی رقم بھی ندوہ کو دے دی اور ندوہ کو سو روپیہ مہینہ ملنے لگا۔ میں نے صرف اس ذہنیت کو نمایاں کرنے کے لیے یہ مثال دی ہے جو اس کتاب پر بالقصد چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔

مولانا شبلی نعمانی اگر کسی کارروائی میں موجود نہ ہوں تو اس کا اظہار ضروری ہوتا ہے اور وہ بھی اس طرح کے الفاظ نہیں کہ اس میں مولانا شبلی نعمانی شریک نہ تھے یا (صفحہ:183)۔ اس کے برعکس اگر یہ عدم شرکت کا واقعہ مولانا محمد علی مونگیری سے متعلق ہو تو اس کے الفاظ یہ ہوتے ہیں: عجیب بات ہے کہ مولانا محمد علی مونگیری اپنی علالت کی بناء پر اور مولانا حکیم سید عبدالحیؒ حسنی بھی کسی وجہ سے (جن کا علم ہمیں نہیں ہو سکا) اس اہم جلسہ میں شریک نہ ہوئے' (صفحہ:200)۔

مرتب کتاب کو اتنے الفاظ لکھ کر بھی تسکین نہیں ہوئی چوں کہ ندوہ کے اس 'تاریخی جلسہ' میں کمشنر مسٹر ہارڈی اور مسٹر گری قسم کے بھی کچھ لوگ موجود تھے، اس لیے اس موقع پر کتاب میں مزید حسب ذیل نوٹ کا اضافہ کیا گیا ہے:

'ہو سکتا ہے کہ مولانا کی علامت اور ناسازی طبع کے ساتھ اس غیر حاضری کا سبب 'صاحب بہادروں' کی حاضری بھی ہو (صفحہ:200)۔

مرتب کتاب یہ لکھتے ہوا سے بھول گئے کہ مولانا محمد علی مونگیری تو ان کے بیان کے مطابق ندوہ کے بانی، اس کے معمار اور اس کے سب کچھ تھے پھر دوسرا کون نکل آیا جو ان کی مرضی کے خلاف صاحب بہادروں کو اس کی بزم میں جگہ دے دی۔

کتاب کا ایک بیان یہ ہے، جس کو میں نہایت تکلیف کے ساتھ یہاں درج کرتا ہوں: '1900ء کا آغاز تھا کہ لارڈ انٹونی مکڈانلڈ جو صوبہ متحدہ اودھ کے لفٹنٹ گورنر تھے اور مسلمانوں پر ان کی خاص نظر عنایت تھی،

طرف مولانا محمد علی مونگیری کے لیے ایسے الفاظ اور انداز بیان اختیار کئے گئے ہیں کہ ان کی حیثیت کچھ بڑھ کر نظر آئے اور دوسری طرف مولانا شبلی نعمانی کے لیے ایسے الفاظ ہیں جس سے ان کی حیثیت گھٹ کر دکھائی دے۔ مثال کے طور پر درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہو: 'اب مولانا شبلی نعمانی کی باری تھی۔ تاخیر بہت ہوگئی تھی۔ اس لیے مولانا نے معذرت چاہی۔ لیکن شائقین کے اصرار سے کھڑے ہوئے اور ایک مختصر اور مؤثر تقریر کی۔ وہ تقریر مولانا نے حسب معمول قلم بند نہیں کی اس لیے روداد میں اس کی تفصیل نہیں ہے۔ (صفحہ:167)

اسی واقعہ کے لیے اصل روداد میں جو الفاظ ہیں وہ یہ ہیں: 'اس کے بعد شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی صاحب کا بیان ہونے کو تھا۔ مگر دیر ہو جانے کی وجہ سے گرمی کی شدت ہو چکی تھی۔ اس لیے شمس العلماء نے معذرت کی۔ مگر شائقین کے اصرار نے مجبور کیا تو بیان کرنے کو کھڑے ہوئے اور ندوہ کے مقاصد کے متعلق ایک مختصر تقریر کی۔ مگر ہم کو افسوس ہے کہ وہ قلم بند کر کے نہیں بھیجی۔ اس وجہ سے اس جگہ پر درج نہیں ہوسکی۔ (روداد جلسہ، سال سوم، ندوۃ العلماء، اپریل 1896ء، صفحہ:44-43)

ایک طرف مولانا شبلی نعمانی کو گھٹانے کا یہ ذہن ہے دوسری طرف مولانا محمد علی مونگیری کو بڑھانے کی کوشش کا یہ عالم ہے کہ پٹنہ (بہار) کے لیے ندوہ کے وفد میں حیاتِ شبلی کی روایت اور مطبوعہ ریکارڈ کے مطابق مولانا محمد علی مونگیری شامل نہیں تھے۔ اس کے باوجود زبردستی اپنے ایک خودساختہ قیاس کی بنیاد پر انھیں فہرست میں شامل کر دیا گیا ہے۔

صاحبِ کتاب کے نزدیک یہ واقعہ کہ مطبوعہ ریکارڈ میں مولانا محمد علی مونگیری کا نام نہیں ہے اور نہ وفد کی سرگرمیوں میں ان کے کسی حصہ کا ذکر ہے، کوئی قوی بنیاد نہیں ہے، البتہ ان کا اپنا قیاس اتنی قوی بنیاد ہے کہ انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی پر 'حیرت' کا اظہار کیا ہے کہ کیوں انھوں نے ان کے قیاس میں شریک ہو کر مولانا محمد علی مونگیری کا نام وفد کی فہرست میں داخل نہیں کر دیا۔ (صفحہ:181)

یہی معاملہ چوتھے اجلاس میرٹھ (مارچ 1897ء) کا ہے۔ عام طور پر اس کتاب میں مولانا محمد علی مونگیری کی نہایت چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر ہے۔ مگر بعض جگہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بالقصد ایک چیز حذف کر دی گئی ہو۔ اس جلسہ میں مولانا محمد علی مونگیری نے یہ تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کے ابتدائی درجہ کے ایک سال کے مصارف کا اسی وقت انتظام ہو جانا چاہیے۔ منشی اطہر علی صاحب نے اس کی تائید کی۔

مولانا شبلی نعمانی نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ 'علماء پر یہ الزام دیا جاتا ہے کہ وہ خود کسی کام کو اپنے روپیہ سے نہیں کرتے۔ اس واسطے میں یہ تحریک کرتا ہوں کہ درجہ ابتدائی دارالعلوم کے ابتدائی مصارف کے متکفل ارکانی

انتظامیہ ہو جائیں'۔ زیر نظر کتاب میں اس 'اضافہ' کا ذکر تو ہے (صفحہ:190) مگر یہ ذکر نہیں ہے کہ تجویز کی منظوری کے بعد جب لوگوں نے اپنے چندے لکھوا رہے تو مولانا شبلی نعمانی کا چندہ 'ایک سو روپیہ' اور مولانا محمد علی مونگیری کا 'پچاس روپیہ' تھا۔

حاشا و کلاّ: میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انفاق فی سبیل اللہ میں مقدار کوئی اہمیت رکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں جذبہ دل کی حیثیت ہے نہ کہ مقدار زر کی۔ نیز مولانا محمد علی مونگیری ایک لحاظ سے مستقل چندہ دہندوں میں شامل تھے۔ کیوں کہ 1900ء میں جب ریاست حیدر آباد نے ندوہ کے لیے پچاس روپیہ اور ان کے اپنے صرف کے لیے پچاس روپے منظور کئے تو انھوں نے اپنے حصہ کی رقم بھی ندوہ کو دے دی اور ندوہ کو سو روپیہ مہینہ ملنے لگا۔ میں نے صرف اس ذہنیت کو نمایاں کرنے کے لیے یہ مثال دی ہے جو اس کتاب پر بالقصد چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔

مولانا شبلی نعمانی اگر کسی کارروائی میں موجود نہ ہوں تو اس کا اظہار ضروری ہوتا ہے اور وہ بھی اس طرح کے الفاظ نہیں کہ اس میں مولانا شبلی نعمانی شریک نہ تھے یا (صفحہ:183)۔ اس کے برعکس اگر یہ عدم شرکت کا واقعہ مولانا محمد علی مونگیری سے متعلق ہو تو اس کے الفاظ یہ ہوتے ہیں: عجیب بات ہے کہ مولانا محمد علی مونگیری اپنی علالت کی بناء پر اور مولانا حکیم سید عبدالحئ حسنی بھی کسی وجہ سے (جن کا علم ہمیں نہیں ہو سکا) اس اہم جلسہ میں شریک نہ ہوئے' (صفحہ:200)۔

مرتب کتاب کو اتنے الفاظ لکھ کر بھی تسکین نہیں ہوئی چوں کہ ندوہ کے اس 'تاریخی جلسہ' میں کمشنر مسٹر ہارڈی اور مسٹر گری قسم کے بھی کچھ لوگ موجود تھے، اس لیے اس موقع پر کتاب میں مزید حسب ذیل نوٹ کا اضافہ کیا گیا ہے:

'ہو سکتا ہے کہ مولانا کی علامت اور ناسازی طبع کے ساتھ اس غیر حاضری کا سبب 'صاحب بہادروں' کی حاضری بھی ہو (صفحہ:200)۔

مرتب کتاب یہ لکھتے ہوا سے بھول گئے کہ مولانا محمد علی مونگیری تو ان کے بیان کے مطابق ندوہ کے بانی، اس کے معمار اور اس کے سب کچھ تھے پھر دوسرا کون نکل آیا جو ان کی مرضی کے خلاف صاحب بہادروں کو اس کی بزم میں جگہ دے دی۔

کتاب کا ایک بیان یہ ہے، جس کو میں نہایت تکلیف کے ساتھ یہاں درج کرتا ہوں: '1900ء کا آغاز تھا کہ لارڈ انٹونی مکڈانلڈ جو صوبہ متحدہ اودھ کے لفٹنٹ گورنر تھے اور مسلمانوں پر ان کی خاص نظر عنایت تھی،

طرف مولانا محمد علی مونگیری کے لیے ایسے الفاظ اور انداز بیان اختیار کئے گئے ہیں کہ ان کی حیثیت کچھ بڑھ کر نظر آئے اور دوسری طرف مولانا شبلی نعمانی کے لیے ایسے الفاظ ہیں جس سے ان کی حیثیت گھٹ کر دکھائی دے۔ مثال کے طور پر درج ذیل اقتباس ملاحظہ ہو: 'اب مولانا شبلی نعمانی کی باری تھی۔ تاخیر بہت ہوگئی تھی۔ اس لیے مولانا نے معذرت چاہی۔ لیکن شائقین کے اصرار سے کھڑے ہوئے اور ایک مختصر اور مؤثر تقریر کی۔ وہ تقریر مولانا نے حسب معمول قلم بند نہیں کی اس لیے روداد میں اس کی تفصیل نہیں ہے۔ (صفحہ:167)

اسی واقعہ کے لیے اصل روداد میں جو الفاظ ہیں وہ یہ ہیں: 'اس کے بعد شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی صاحب کا بیان ہونے کو تھا۔ مگر دیر ہو جانے کی وجہ سے گرمی کی شدت ہو چکی تھی۔ اس لیے شمس العلماء نے معذرت کی۔ مگر شائقین کے اصرار نے مجبور کیا تو بیان کرنے کو کھڑے ہوئے اور ندوہ کے مقاصد کے متعلق ایک مختصر تقریر کی۔ مگر ہم کو افسوس ہے کہ وہ قلم بند کر کے نہیں بھیجی۔ اس وجہ سے اس جگہ پر درج نہیں ہو سکی۔ (روداد جلسہ، سال سوم، ندوۃ العلماء، اپریل 1896ء، صفحہ:44-43)

ایک طرف مولانا شبلی نعمانی کو گھٹانے کا یہ ذہن ہے دوسری طرف مولانا محمد علی مونگیری کو بڑھانے کی کوشش کا یہ عالم ہے کہ پٹنہ (بہار) کے لیے ندوہ کے وفد میں حیاتِ شبلی کی روایت اور مطبوعہ ریکارڈ کے مطابق مولانا محمد علی مونگیری شامل نہیں تھے۔ اس کے باوجود زبردستی اپنے ایک خودساختہ قیاس کی بنیاد پر انھیں فہرست میں شامل کر دیا گیا ہے۔

صاحبِ کتاب کے نزدیک یہ واقعہ کہ مطبوعہ ریکارڈ میں مولانا محمد علی مونگیری کا نام نہیں ہے اور نہ وفد کی سرگرمیوں میں ان کے کسی حصہ کا ذکر ہے، کوئی قوی بنیاد نہیں ہے، البتہ ان کا اپنا قیاس اتنی قوی بنیاد ہے کہ انھوں نے مولانا سید سلیمان ندوی پر 'حیرت' کا اظہار کیا ہے کہ کیوں انھوں نے ان کے قیاس میں شریک ہو کر مولانا محمد علی مونگیری کا نام وفد کی فہرست میں داخل نہیں کر دیا۔ (صفحہ:181)

یہی معاملہ چوتھے اجلاس میرٹھ (مارچ 1897ء) کا ہے۔ عام طور پر اس کتاب میں مولانا محمد علی مونگیری کی نہایت چھوٹی چھوٹی باتوں کا ذکر ہے۔ مگر بعض جگہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بالقصد ایک چیز حذف کر دی گئی ہو۔ اس جلسہ میں مولانا محمد علی مونگیری نے یہ تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کے ابتدائی درجہ کے ایک سال کے مصارف کا اسی وقت انتظام ہو جانا چاہیے۔ منشی اطہر علی صاحب نے اس کی تائید کی۔

مولانا شبلی نعمانی نے اس پر یہ اضافہ کیا کہ 'علماء پر یہ الزام دیا جاتا ہے کہ وہ خود کسی کام کو اپنے روپیہ سے نہیں کرتے۔ اس واسطے میں یہ تحریک کرتا ہوں کہ درجہ ابتدائی دارالعلوم کے ابتدائی مصارف کے متکفل ارکانی

انتظامیہ ہوجائیں، زیر نظر کتاب میں اس 'اضافہ' کا ذکر تو ہے (صفحہ:190) مگر یہ ذکر نہیں ہے کہ تجویز کی منظوری کے بعد جب لوگوں نے اپنے چندے لکھوار ہے تو مولانا شبلی نعمانی کا چندہ 'ایک سو روپیہ' اور مولانا محمد علی مونگیری کا 'پچاس روپیہ' تھا۔

حاشا وکلا: میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انفاق فی سبیل اللہ میں مقدار کوئی اہمیت رکھتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں جذبہ دل کی حیثیت ہے نہ کہ مقدار زر کی۔ نیز مولانا محمد علی مونگیری ایک لحاظ سے مستقل چندہ دہندوں میں شامل تھے۔ کیوں کہ 1900ء میں جب ریاست حیدرآباد نے ندوہ کے لیے پچاس روپیہ اور ان کے اپنے صرف کے لیے پچاس روپے منظور کیے تو انھوں نے اپنے حصہ کی رقم بھی ندوہ کو دے دی اور ندوہ کو سو روپیہ مہینہ ملنے لگا۔ میں نے صرف اس ذہنیت کو نمایاں کرنے کے لیے یہ مثال دی ہے جو اس کتاب پر بالقصد چھائی ہوئی نظر آتی ہے۔

مولانا شبلی نعمانی اگر کسی کارروائی میں موجود نہ ہوں تو اس کا اظہار ضروری ہوتا ہے اور وہ بھی اس طرح کے الفاظ نہیں کہ اس میں مولانا شبلی نعمانی شریک نہ تھے یا (صفحہ:183)۔ اس کے برعکس اگر یہ عدم شرکت کا واقعہ مولانا محمد علی مونگیری سے متعلق ہو تو اس کے الفاظ یہ ہوتے ہیں: عجیب بات ہے کہ مولانا محمد علی مونگیری اپنی علالت کی بناء پر اور مولانا حکیم سید عبدالحئی حسنی بھی کسی وجہ سے (جن کا علم ہمیں نہیں ہوسکا) اس اہم جلسہ میں شریک نہ ہوئے' (صفحہ:200)۔

مرتب کتاب کو اتنے الفاظ لکھ کر بھی تسکین نہیں ہوئی چوں کہ ندوہ کے اس 'تاریخی جلسہ' میں کمشنر مسٹر ہارڈی اور مسٹر گری قسم کے بھی کچھ لوگ موجود تھے، اس لیے اس موقع پر کتاب میں مزید حسب ذیل نوٹ کا اضافہ کیا گیا ہے:

'ہوسکتا ہے کہ مولانا کی علامت اور ناسازی طبع کے ساتھ اس غیر حاضری کا سبب 'صاحب بہادروں' کی حاضری بھی ہو (صفحہ:200)۔

مرتب کتاب یہ لکھتے ہوا سے بھول گئے کہ مولانا محمد علی مونگیری تو ان کے بیان کے مطابق ندوہ کے بانی، اس کے معمار اور اس کے سب کچھ تھے پھر دوسرا کون نکل آیا جو ان کی مرضی کے خلاف صاحب بہادروں کو اس کی بزم میں جگہ دے دی۔

کتاب کا ایک بیان یہ ہے، جس کو میں نہایت تکلیف کے ساتھ یہاں درج کرتا ہوں: '1900ء کا آغاز تھا کہ لارڈ انٹونی مکڈانلڈ جو صوبہ متحدہ اودھ کے لفٹنٹ گورنر تھے اور مسلمانوں پر ان کی خاص نظر عنایت تھی،

مولانا شبلی نعمانی سے بدگمان ہو گئے اور ساتھ ہی ان کو منشی اطہر علی صاحب کا کوروی سے بھی انجمن تعلقہ داران اودھ کے بعض پیچیدہ معاملات کے سلسلہ میں کچھ بدگمانی پیدا ہو گئی۔ اس بدگمانی اور ناراضگی کا اثر جو ابتداء میں ان دونوں شخصیتوں تک محدود تھا، قدرتی طور پر ندوہ تک پہنچا۔ اس بات کا بعض عاقبت اندیش حضرات پر اتنا اثر پڑا کہ انھوں نے نہ صرف یہ کہ صوبہ بلکہ برطانی ہندوستان کو بھی خیر باد کہہ دیا۔ اس جملہ کی توضیح یہ ہے کہ مولانا شبلی نعمانی اور منشی اطہر علی دونوں حیدرآباد چلے گئے اور لارڈ مکڈانلڈ کے تبادلہ سے پہلے واپس نہ ہوئے۔ (سیرت مولانا محمد علی مونگیری، صفحہ:259-258)

مگر اس واقعہ کی جو تصویر حیات شبلی میں ملتی ہے وہ دوسری ہے: 'ہماری بدقسمتی اکثر ذاتیات سے شروع ہوتی ہے۔ لکھنؤ میں ندوہ کے بڑے حامی منشی اطہر علی صاحب کا کوروی تھے جو وہاں کے مشہور و ممتاز وکیل اور انجمن تعلقہ داران اودھ کے مشیر قانونی تھے۔ اور ان کے حریف چودھری نصرت علی صاحب سندیلہ تھے۔ چودھری صاحب نے منشی صاحب کو شکست دینے کے لیے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور جیسا کہ سنا جاتا ہے انھوں نے لفٹنٹ گورنر لارڈ مکڈانلڈ تک ندوہ کی تحریک کی سیاسی بدگمانیوں کی شکایتیں پہنچائیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ندوہ کے بڑے بڑے ارکان نے صوبہ بلکہ برطانی ہندوستان کو چھوڑ دیا۔ منشی اطہر علی صاحب حیدرآباد چلے گئے۔ ندوہ کے ناظم اور روح رواں مولانا سید محمد علی مونگیری بھی سنہ 1901ء مطابق 1318ھ میں حجاز تشریف لے گئے اور ان کی جگہ مولانا عبدالحق صاحب حقانی قائم مقام ناظم ہوئے۔ مگر انھوں نے دہلی ہی میں قیام رکھا۔ پھر بعد کو وہ بھی ایک ہی سال کے اندر مستعفی ہو گئے (حیات شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، صفحہ:353-352)۔

میں اس واقعہ میں مولانا محمد علی مونگیری اور مولانا شبلی نعمانی دونوں کو معذور سمجھتا ہوں۔ کیوں کہ اس سے 70 برس پہلے انگریزی حکومت کے زیر عتاب آنے کے جو بھیانک معنی تھے اس کے پیش نظر اس قسم کا فعل مستبعد نہیں ہوسکتا۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک ہی واقعہ کے بیان میں دونوں بزرگوں کے ساتھ دو بالکل مختلف انداز اختیار کیے گئے ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی کے متعلق تو یہ الفاظ ہیں، کہ ان پر عاقبت اندیشی غالب آئی اور وہ حیدر آباد چلے گئے اور انگریز گورنر کے تبادلہ سے پہلے واپس نہ ہوئے۔ دوسری طرف مولانا محمد علی مونگیری کا معاملہ یہ ہے کہ واقعات بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے: مولانا محمد علی مونگیری اس زمانہ میں حجاز میں تھے۔

گویا وہ بہت پہلے سے حجاز میں مقیم تھے۔ حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ سنہ 1900ء کے آغاز میں لارڈ مکڈانلڈ گورنر ہو کر آئے ہیں۔ اس کے بعد وہ قصہ پیدا ہوا جس کا ذکر حیاتِ شبلی کے مندرجہ بالا اقتباس میں ہے اور جنوری سنہ 1901ء مطابق رمضان 1318ھ میں وہ حجاز روانہ ہو گئے۔ مزید یہ کہ کتاب کا عام انداز تو یہ ہے

کہ ندوہ گویا مولانا محمد علی مونگیری کا دوسرا نام تھا۔ مولانا شبلی نعمانی کی حیثیت بس ایک ضمنی اور خارجی شخص کی تھی۔ مگر جب ندوہ پر سیاسی عتاب کو مولانا شبلی نعمانی کی طرف منسوب کرنا ہوا تو مولانا شبلی نعمانی کی ذات اتنی اہم بن گئی کہ شبلی سے حکومت کی بدگمانی پورے ندوہ سے بدگمانی کا سبب قرار پائی...نیز صاحبِ کتاب نے بیانِ واقعہ میں اس کی رعایت بھی نہیں کی کہ جس وقت یہ واقعہ پیش آیا مولانا محمد علی مونگیری ندوہ کے ناظم تھے اور بحیثیت عہدہ وہاں مقیم تھے۔ جب کہ مولانا شبلی نعمانی 'مجلس انتظامیہ' کے رکن تھے اور ندوہ سے ان کے قیام کا تعلق نہیں تھا۔ جن دنوں یہ واقعہ پیش آیا اس کے بہت پہلے سے علالت وغیرہ کی وجہ سے علی گڑھ سے رخصت لے کر وہ اپنے وطن اعظم گڑھ میں مقیم تھے اور اعظم گڑھ ہی سے علی گڑھ اور پھر حیدر آباد گئے۔

'دار العلوم کی تجویز اور مولانا کا ذہنی خاکہ' کے عنوان کے تحت ایک اقتباس ملاحظہ ہو: ندوۃ العلماء کے ماتحت بڑے پیمانہ پر ایک دار العلوم کے قیام کی تجویز سب سے پہلے مولانا محمد علی مونگیری کے ذہن میں آئی۔ اور مولانا نے اس کا ایک واضح خاکہ تیار کر کے 12 محرم الحرام 1313ھ کے جلسہ انتظامی میں پیش کیا۔ یہ تجویز منظور ہوئی۔ اور اس کے بعد یہ خاکہ 'مسودہ دار العلوم' کے نام سے شائع کر کے استصواب رائے کے لیے ممتاز علماء اکابرین اور اہلِ علم حضرات کو ارسال کیا گیا۔ (صفحہ:147)

آگے چل کر لکھتے ہیں: مسودہ دار العلوم میں مولانا محمد علی مونگیری نے درجات، طریقہ تعلیم، مدت تعلیم، ترتیب علوم، طلبہ و اساتذہ کی رہائش اور نظام الاوقات وغیرہ کا بڑی تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ایک جامع اور عملی نقشہ پیش کیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی مونگیری کی نظر اس شعبہ میں کتنی گہری، کتنی وسیع، کتنی جدید (Up to date) اور کتنی دور اندیش اور وقت شناس تھی۔ یہ خاکہ اتنا زمانہ گزرنے کے باوجود اسی طرح تازہ اور نیا ہے۔

یہ 'مسودہ دار العلوم' جس کی تخلیق کو تمام تر مولانا محمد علی مونگیری کی ذات سے منسوب کر دیا گیا ہے، اس کی حقیقت ندوۃ العلماء کے مطبوعہ ریکارڈ کے مطابق یہ ہے کہ ندوۃ العلماء کے پہلے اجلاس اپریل 1894ء مطابق شوال (1311ھ) میں مولوی شاہ محمد حسین صاحب الہٰ آبادی نے یہ تجویز پیش کی کہ موجودہ طریقہ تعلیم قابل اصلاح ہے یعنی قدیم طریقہ درس موجودہ زمانہ کے لیے کافی نہیں۔ اس میں ترمیم واصلاح کی حاجت ہے۔ (روداد، ندوۃ العلماء واقع کانپور، سال اوّل، اپریل 1894ء، صفحہ:3)

پہلے مجوز نے اس مسئلہ پر اظہار خیال کیا۔ رپورٹ کے الفاظ میں مولوی صاحب کے بیان کے بعد شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی صاحب کھڑے ہوئے اور اس کی تائید میں تقریر کی۔ یہ تقریر لفظ بہ لفظ مطبوعہ روداد کے

13 صفحات میں درج ہے، اس کے علاوہ "خطباتِ شبلی" میں بھی شائع ہو چکی ہے، یہ تقریر اپنے موضوع پر اتنی عالمانہ اور بصیرت افروز ہے کہ ندوہ کی تاریخ میں اس کی مثال پیش کرنا مشکل ہے۔ مولانا شبلی نعمانی کے بعد دوسرے حضرات نے تقریریں کیں۔

روداد کہتی ہے کہ اس کے متعلق مجلس کی تیسری نشست میں بحث ہوئی اور مولوی عبدالحکیم صاحب پٹنوی کے سوا تمام علماء نے جن کی تعداد 60-70 سے کم نہ تھی، اس پر اتفاق کیا کہ طریقہ موجودہ قابل اصلاح و ترمیم ہے۔ نیز یہ کہ اسی جلسہ میں یہ امر طے ہوا کہ حاضرین میں سے چند علماء انتخاب کئے جائیں، جن کے متعلق یہ کام ہو کہ ملک کے علماء سے خط و کتابت کر سکے اور خود اپنی غور و فکر سے کام لے کر نصابِ تعلیم کا ایک نقشہ مرتب کریں۔ یہ کام علماء کی جس کمیٹی کے سپرد ہوا اس کے ارکان کی تعداد کل 12 تھی؛ جن میں سے ایک مولانا شبلی نعمانی بھی تھے۔ (روداد سال اوّل، حصہ دوم، صفحہ:2)

کمیٹی کے ارکان اور دیگر علماء نے اپنی رائیں قلم بند کر کے بھیجیں جو کل 40 تھیں۔ ان کے علاوہ کچھ مستقل تجویزیں بھی موصول ہوئیں جو تعداد میں 14 تھیں۔ اس کے بعد جو ہوا وہ مولانا محمد علی مونگیری ناظم ندوۃ العلماء کے الفاظ میں یہ ہے: ان (40) رایوں اور (14) تجویزوں کے آنے کے بعد ان سب پر غور و فکر کر کے میں نے ایک نصاب مرتب کر کے جلسہ نظامیہ منعقدہ 12 محرم الحرام 1313ھ میں پیش کیا۔ (صفحہ:25)

مجلس انتظامیہ نے تجویز کیا کہ یہ خاکہ جو تمام علماء کی رایوں کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے اس کو چھپوا کر شائع کر دیا جائے' تاکہ علماء کو بجائے خود بھی اس پر غور کرنے کا موقع حاصل ہو۔ (صفحہ:25)

جلسہ انتظامیہ نے یہ بھی طے کیا تھا کہ خاکہ کی اشاعت کے بعد اس سلسلہ میں دوبارہ ایک اور 'خاص جلسہ' کیا جائے تاکہ جو نصاب اور تجویزیں دفتر ندوہ میں آ چکی ہیں، ان پر غور کیا جائے اور بعد غور اور بحث کے جو امور باہمی مشورہ سے ملے ہوں وہ قلم بند کئے جائیں؟ (صفحہ:42) اس جلسہ کی روداد مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کے الفاظ میں یہ ہے: '10 رجب 1313ھ کو بڑے دن کی تعطیل کے موقع پر ایک جلسہ علماء کا بمقام کانپور اس غرض سے منعقد ہوا کہ جو نصاب اور تجویزیں دفتر ندوہ میں آ چکی ہیں ان پر غور کیا جائے اور بعد غور اور بحث کے جو امور باہمی مشورہ سے طے ہوں وہ قلم بند کئے جائیں۔ ہندوستان کے بعض نہایت مشہور عالم جن کو تعلیم میں وسیع تجربہ ہے، اس جلسہ میں تشریف لائے تھے۔ مثلاً مولوی محمد فاروق صاحب چریا کوٹی، مولوی عبیداللہ صاحب پروفیسر پنجاب یونیورسٹی، مولوی حفیظ اللہ صاحب مدرس اعلی مدرسہ عالیہ رام پور، مولوی شبلی نعمانی۔ یہ جلسہ کئی روز رہا۔ نہایت مستعدی سے شب و روز جلسے ہوئے اور ایک حد تک نصاب بعد بحث مرتب

کیا گیا۔(رودو جلسہ، سال سوم، بانس بریلی، اپریل 1896ء صفحہ:42)

مندرجہ بالا حوالوں سے واضح ہے کہ مولانا محمد علی مونگیری نے 21 محرم الحرام 1313ھ کو جو 'مسودہ دارالعلوم' جلسہ انتظامی میں پیش کیا تھا، وہ درحقیقت ان کی 'اپنی تخلیق' نہیں تھی، بلکہ 'علماء کی موصول شدہ تجاویز' کی روشنی میں مرتب کیا ہوا ایک مجموعہ تھا۔

یہ مسودہ جن تحریروں کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا تھا، ان میں سے ایک مولانا شبلی نعمانی کی تحریر تھی؛ جس کے متعلق مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں: 12 علماء کی ایک مجلس ترتیبِ نصاب کے لیے مقرر کی گئی؛ جن میں ایک نام 'مولانا شبلی نعمانی' کا بھی تھا۔ ان بزرگوں نے اپنی اپنی رائے کے مطابق نصاب کے رسالے لکھے اور مولانا شبلی نعمانی نے دارالعلوم کے نصاب کے بجائے دارالعلوم کا مسودہ (خاکہ) تیار کیا۔ جس کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کا مسافر قسطنطنیہ کے کسی بڑے شہر میں کھڑا ہے۔ (حیات شبلی، صفحہ:310)

مختلف علماء کی مشترکہ کوشش سے وجود میں آیا ہوا یہی خاکہ ہے جس کو تمام تر مولانا محمد علی مونگیری کا طرف منسوب کر کے کہا گیا ہے: 'یہ مولانا کی وہ خصوصیت اور جامعیت ہے جو اس دور کے کم لوگوں میں نظر آتی ہے۔ (سیرت مولانا محمد علی مونگیری، صفحہ:150)

اس کے برعکس وہ رسالہ جو 'مسودہ نصاب عربی' کے نام سے شائع ہوا تھا۔ وہ بحیثیت ایک عالم کے اپنی ذاتی رائے کا اظہار ہے۔ مگر جیسا کہ اس میں اعتراف موجود ہے، وہ بھی مولانا نے دوسروں کی رایوں کے پیش نظر مرتب کیا ہے، مثال کے طور پر نصاب میں فلسفۂ جدید کا اضافہ، جس کو سیرت مولانا محمد علی مونگیری میں ان کی اپنی تخلیق کے طور پیش کیا گیا ہے (صفحہ:155) وہ دراصل مولانا شاہ محمد حسین صاحب سے لیا گیا ہے۔ جس کا تفصیلی اقتباس مسودہ نصاب عربی میں نقل کیا گیا ہے (صفحہ:11) مولانا شبلی نعمانی ندوہ کے چھٹے اجلاس (شاہ جہاں پور مارچ 1899ء) اور ساتویں اجلاس (پٹنہ 1900ء) میں شریک نہ ہوسکے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کے الفاظ میں 'یہ ان کی زندگی کے نہایت سخت سال گزرے۔ 1899ء میں وہ اکثر بیمار اور سنہ 1900ء میں وہ اپنے خانگی معاملات میں نہایت سرگرداں اور پریشان رہے۔ (حیاتِ شبلی، صفحہ:351)

ندوۃ العلماء کا پہلا اجلاس اپریل 1894ء میں کان پور میں ہوا۔ اس سے لے کر پانچویں اجلاس کانپور (مارچ 1898ء) تک مولانا شبلی نعمانی اس کی سرگرمیوں میں باقاعدہ شریک رہے اور اپنی صلاحیتوں سے اس کو فائدہ پہنچاتے رہے:

(الف) وہ ایک اعلیٰ درجہ کے عالم تھے اسی کے ساتھ ان کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ تھی مختلف اسباب کے تحت، جن کا اوپر ذکر ہوا، علماء کی فہرست میں وہ واحد شخص تھے جو دورِ جدید کی ضرورتوں کو سمجھ سکتے تھے اور ان کا احساس رکھتے تھے۔

ان کا خصوصی مضمون مسلمانوں کی تاریخ اور ان سے علمی اور تعلیمی کارنامے تھے اور دوسری طرف بیرونی ممالک کے سفر اور علی گڑھ سے طویل تعلق نے انھیں بتایا کہ آج علم اور تعلیم کے معنی کیا ہیں۔ ان وجوہ سے وہ اس پوزیشن (position) میں تھے کہ مسلمانوں کو جدید تعلیمی نقطہ نظر دے سکیں۔ اس معاملے میں ان کی دین اتنی نمایاں ہے کہ علمی طور پر کسی بھی طرح اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ندوۃ العلماء کی رودادوں میں ان کے بیانات اور شائع شدہ تحریری مجموعوں میں ان کے زبان وقلم سے نکلی ہوئی چیزیں آج بھی اس کی تاریخی دستاویز ہیں۔

سیرت مولانا محمد علی مونگیری کے مرتب کے الفاظ میں ابتدائی ندوہ دو بازوں کے اوپر قائم تھا۔ ایک مولانا محمد علی مونگیری کے 'ذہین ونظر کی وسعت، مجتہدانہ بصیرت، منصب ارشاد وتربیت' اور دوسرے مولانا شبلی نعمانی کا مرتبہ علمی، عالی دماغی وقوت فکریہ (صفحہ:205)

(ب) میں نے حال میں ندوۃ العلماء کے اجلاسوں میں کی ہوئی مولانا شبلی نعمانی کی تقریریں پڑھیں، یہ تقریریں اتنی نمایاں طور پر ممتاز ہیں اور اس قدر متاثر کرتی ہیں کہ میں نے سوچا 'میرے سامنے تو شبلی کے صرف الفاظ ہیں۔ جب ان الفاظ کا مصنف اپنی پوری شخصیت کے ساتھ کھڑا ہو کر بولتا ہوگا اس وقت کیا عالم ہوتا ہوگا'

حقیقت یہ ہے کہ مولانا شبلی نعمانی نہایت اعلیٰ درجہ کے عالم ہونے کے ساتھ نہایت کامیاب مقرر بھی تھے۔ مولانا عبدالسلام ندوی لکھتے ہیں کہ ندوۃ العلماء قائم ہوا تو اس کے جلسوں میں ان کی تقریروں نے خاص طور پر اہمیت حاصل کرلی اور وہ ہندوستان کے بے مثل اور بے نظیر خطیب اور مقرر تسلیم کئے جانے لگے'۔ (خطبات شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، دیباچہ، صفحہ:1)

ایسا ایک شخص بالکل آغاز سے ندوۃ العلماء کی تحریک میں شامل ہو، وہ اس کے اجلاسوں میں شرکت کرے، اس کے پروگراموں میں اس کا نام سرفہرست ہو نیز وہ اس کی مجلس انتظامیہ کا ممبر ہو، کیا یہ کوئی قابلِ قیاس بات نہیں کہ وہ تحریک پر اثر نہ ڈالے جب کہ ساری دنیا تسلیم کرتی ہے کہ وہ ایک صاحبِ فکر آدمی تھے اور خود سیرت مولانا محمد علی مونگیری میں اس کا نقشہ اس طرح کھینچا جاتا ہے کہ وہ فاعلانہ مزاج رکھتے تھے نہ کہ منفعلانہ مزاج۔ (ہفت روزہ الجمعیۃ، نئی دہلی، 9 فروری 1968ء، صفحہ:16-15)

قسط پنجم

ندوہ کی وہ معروف خصوصیات کیا ہیں؛ جن کی بنا پر اس درسگاہ کے فارغین اس کو ایک ممتاز ادارہ سمجھتے ہیں اور جن کے بارہ میں یہ سوال درپیش ہے کہ ان کو مولانا شبلی نعمانی کی طرف منسوب کیا جائے یا مولانا محمد علی مونگیری کی طرف۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں، ان خصوصیات کو تین عنوانات کے تحت تقسیم کیا جاسکتا ہے:

(الف) درس نظامی کے قدیم نصاب میں اصلاح

(ب) عربی تعلیم کے ساتھ مغربی زبان اور علوم کے اکتساب کو اہمیت دینا

(ج) تحریر و تقریر کی صلاحیت اور علمی اکتساب کے ساتھ ادبی ذوق کو ابھارنا

اب ایک ایک شق کے اعتبار سے جائزہ لیجیے۔ 'سیرت مولانا محمد علی مونگیری' کے مصنف کا دعویٰ ہے کہ 1894ء میں مولانا نے دار العلوم ندوۃ العلماء کے لیے جو نصاب تجویز کیا تھا وہ ایک 'انقلاب انگیز نصاب' تھا۔ ان کے الفاظ میں یہ مروجہ درسِ نظامی سے گویا 'بغاوت' تھی جس میں اس کے سارے نظام کو درہم برہم کر دیا گیا تھا۔

اس سلسلے میں ہم دو باتیں عرض کرنا چاہتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انیسویں صدی عیسوی کے آخر کا زمانہ جب کہ ندوہ کا نصاب تجویز کیا گیا، ایک ایسا زمانہ ہے جب کہ علماء کی کثیر تعداد اس خیال کی حامی ہو چکی تھی کہ موجودہ درس نظامی میں تبدیلی کی ضرورت ہے۔ یہ مولانا محمد علی مونگیری کی 'بداعتِ فکر' نہیں تھی۔ زیادہ سے زیادہ جو بات کہی جاسکتی ہے وہ یہ کہ وہ بھی ان علماء میں سے ایک تھے جنھیں احساس تھا کہ اس نصاب میں ترمیم و تغیر کی ضرورت ہے۔ ندوہ کی ابتدائی رودادوں میں مختلف علماء کی جو تقریریں اور مضامین درج ہیں، وہی اس کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ روداد اوّل، سال اوّل میں مولانا محمد علی مونگیری کی جو تحریر ہے، خود اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ 'اصلاحِ نصاب' کے عنوان سے جو چیز ان کے پیش نظر تھی وہ دراصل کوئی نئی بات نہیں تھی بلکہ وہی تھی جس کا اس وقت کے بہت سے علماء کو احساس تھا یعنی یہ کہ قاضی مبارک اور صدرا جیسی کتابوں میں بیشتر تعلیمی عمر گزر جاتی ہے اور قرآن و حدیث میں بصیرت پیدا نہیں ہوتی۔

نیز ندوہ کی قدیم مطبوعہ دستاویزوں ہی سے یہ بھی قطعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ اس کی ضرورت کا احساس مولانا شبلی نعمانی کو یقینی طور پر مولانا محمد علی مونگیری سے زیادہ تھا اور وہ اس کا نسبتاً زیادہ واضح شعور رکھتے تھے۔ اگر اس معاملہ میں کسی کو شبہ ہو تو ہم یہ کر سکتے ہیں کہ رودادوں سے وہ تمام تقریریں اور گفتگوئیں شائع کر دیں جو اس مسئلہ سے متعلق دونوں بزرگوں کے نام سے وہاں موجود ہیں۔ ان کو دیکھ کر ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ دونوں

میں سے کس کا فکر اس معاملہ میں زیادہ واضح تھا۔ خوش قسمتی سے اس تقابل کے لیے روددادوں میں کافی مواد موجود ہے۔ اس کے لیے ہمیں قیاس کرنے کی ضرورت نہیں۔

دوسری بات یہ کہ نصاب میں جس تغیر کے لیے سیرت مولانا محمد علی مونگیری کے مصنف 'بغاوت' اور 'انقلاب انگیز نصاب' کے الفاظ بول کر اس کو تاریخی اہمیت کا حامل قرار دینا چاہتے ہیں۔ وہ خود مولانا محمد علی مونگیری کے اپنے اعتراف کے مطابق صرف حسب ضرورت ترمیم تھی جس طرح اس کے اندر اس سے پہلے بار بار ترمیمیں ہوتی رہی ہیں (مسودہ نصاب عربی، صفحہ:7) مولانا محمد علی مونگیری کا مسودہ نصاب عربی جو 39 صفحات پر شائع ہوا تھا، اس کو پڑھئے۔ اس میں صریح طور پر یہ اعتراف موجود ہے کہ مقصود درس نظامیہ کو بدلنا نہیں بلکہ اس میں اس قسم کا 'ترمیم و اضافہ' کرنا ہے جو بحسب ضرورت اس سے پہلے ہوتا رہا ہے۔

مولانا محمد علی مونگیری نے اس مسودہ میں اپنا نقطۂ نظر بیان کرنے کے لیے شاہ محمد حسین صاحب کے وہ الفاظ مستعار لیے ہیں جو انھوں نے درس نظامیہ کی بابت فرمارہے تھے: 'میرے نزدیک اس طریقہ کا بالکل ترک کردینا انصاف کا خون کردینا ہے۔ ہاں دو ایک نقصانات قابلِ اصلاح اس تعلیم میں ضرور ہیں جو بیان کئے جاتے ہیں۔ (صفحہ:9)

ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اس قسم کی تبدیلی کو کس معنیٰ میں 'انقلاب انگیز نصاب' کہا جا سکتا ہے اور انقلاب انگیز بھی ایسا کہ مقدمہ نگار کے الفاظ میں ماحول کے اندر اس کے اسباب نظر نہیں آتے۔ اور براہِ راست معلمِ افلاک سے اس کا رشتہ جوڑنا پڑتا ہے۔ اگر اسی کا نام انقلاب انگیزی ہے تو علمائے فرنگی محل بھی انقلاب انگیز نصاب کے بانی تھے۔ کیوں کہ انھوں نے ملّا نظام الدین کے ابتدائی نصاب میں تغیر کیا تھا اور ان کا نصاب بعینہٖ وہ نہ تھا جو مثال کے طور پر علمائے دہلی کے یہاں رائج تھا۔

اسی طرح خود اس دور کے علمائے دہلی بھی انقلاب انگیز نصاب فراہم کرنے کے ہیرو (hero) تھے، کیوں کہ ان کا نصاب درس نظامی ہونے کے باوجود اپنے اندر کچھ فروق رکھتا تھا۔ اسی طرح پنجاب کے قدیم حلقے جہاں پچھلے زمانہ میں درس و تدریس کا کام ہوتا تھا، ان سب کے یہاں بھی انقلاب انگیز نصاب موجود تھے کیوں کہ ان کا درس نظامیہ بھی بالکل یکساں نہ تھا۔ موجودہ درسِ نظامیہ میں بہت سی ایسی کتابیں ہیں جو ملّا نظام الدین صاحب کے زمانہ میں سرے سے اپنا وجود ہی نہیں رکھتی تھیں۔ مثلاً ملاحسن، حمد اللہ، حاشیہ، غلام یحییٰ، قاضی مبارک وغیرہ۔ اس منطق کے مطابق ہر اس شخص کو 'انقلاب انگیز نصاب' کا بانی سمجھنا چاہیے جس نے درس نظامیہ میں بعد کو اس قسم کے ترمیم و اضافے کئے۔ آخر مولانا محمد علی مونگیری ہی اس 'عظمت' کے 'مستحق' کیوں ہیں؟

اب دوسرے جز کو لیجئے۔ یعنی قدیم کے ساتھ جدید کی یکجائی۔ یہاں سب سے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مولانا محمد علی مونگیری جو مکمل طور پر قدیم نظام درس کی پیداوار تھے، انھیں جدید علوم اور مغربی زبان کی اہمیت کا احساس کیوں کر ہوا۔ سیرت مولانا محمد علی مونگیری کے مصنف نے خود بھی یہ سوال اٹھایا ہے۔ فرماتے ہیں: دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جدید رجحانات اور جدید تقاضوں سے جو واقفیت مولانا کو حاصل تھی اور زمانہ کی تغیر پذیری اور انقلاب آفرینی کا جو احساس مولانا کے اندر موجود تھا، وہ کس طرح پیدا ہوا اور اس کے اسباب کیا تھے۔ (صفحہ:107)

اس کے بعد حسب ذیل الفاظ میں جواب دیتے ہیں۔

جہاں تک جدید تقاضوں اور جدید رجحانات سے مولانا محمد علی مونگیری کی واقفیت کا تعلق ہے اس میں بنیادی حصہ مولانا کے اس کارنامہ کا ہے جو انھوں نے عیسائیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے میں انجام دیا۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور ڈاکٹر وزیر خاں کے بعد اس فتنہ کے سدباب کے لیے جو شخصیت سب سے زیادہ نمایاں ہو کر سامنے آئی وہ مولانا محمد علی مونگیری ہی کی شخصیت تھی۔ انھوں نے اپنے قلم اور زبان سے عیسائی مشنریوں کا پوری طرح مقابلہ کیا اور اس طرح قدرتی طور پر مشنریوں کا طریقہ کار اور جدید ذرائع و وسائل کا استعمال ان کی تکنیک عملی طور پر ان کے سامنے آئی اور انھوں نے دیکھا کہ یہ لوگ کن کن میدانوں میں کام کرتے ہیں، اور کیا کیا ذرائع و وسائل استعمال کرتے ہیں۔ کانپور میں یتیم خانہ کا قیام، جہاں یتیم ولاوارث بچے تعلیم حاصل کر سکیں اور عیسائیوں کے جال میں گرفتار نہ ہوں، اسی تجربہ اور مقابلہ کا نتیجہ تھا۔ حلقۂ درس سے نکل کر ان مشنریوں کا مقابلہ کرنے سے جدید طریق کار اور جدید ذہن و مزاج کی ایک نئی دنیا مولانا محمد علی مونگیری کے سامنے آئی۔ ان کو نئے نئے تجربات حاصل ہوئے، بدلتی ہوئی دنیا کے مسائل سے واقفیت ہوئی۔ جن کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا مشنریوں کا خاص حربہ تھا اس کا 'علم' ہوا، اور ان کمزوریوں کو دور کرنے کی طرف توجہ ہوئی۔ مشنریوں کے باہمی اتفاق نرم رویہ، جذبہ اتحاد اور دلآویز طرزِ عمل کا اندازہ ہوا۔

اس کے مقابلہ میں علماء کے درشت رویہ اور باہمی کش مکش کا منظر بھی سامنے آیا، رفتارِ زمانہ اور عصری مسائل سے مشنریوں کی واقفیت کے مقابلہ میں علماء کی علیحدگی پسندی، قدیم پرستی اور بے خبری ظاہر ہوئی اور اس بات سے مولانا محمد علی مونگیر کو یہ اندازہ ہوا کہ ہمارے نظامِ تعلیم میں ایک انقلابی تبدیلی کی ضرورت ہے اور جب تک یہ تبدیلی عمل میں نہیں آئے گی۔ مدارس کی موجودہ فضا اور حالات کے رُخ میں بھی کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔ (سیرت مولانا محمد علی مونگیری، صفحہ:110-109)

یہاں 'جدید تقاضوں' اور 'جدید رجحانات' کے بارہ میں مولانا محمد علی مونگیری کی فقیہ المثال واقفیت کا جو ماخذ بتایا گیا ہے وہ نہایت 'حیرت انگیز' ہے۔

اوّل تو یہ کہ انگریزی سلطنت کے عروج کے بعد ہندوستان میں عیسائی مبلغین کا جو فتنہ پیدا ہوا اور مسلم مناظرین نے جس طرح اس کے مقابلے کئے، اس میں مولانا محمد علی مونگیری تنہا نہیں تھے اور نہ اس میدان کی سب سے زیادہ ممتاز شخصیت تھے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خان (آگرہ،) مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رحیم علی ننگلوری، اور حمایت رسول چڑیاکوٹی وغیرہ اسی کے نمایاں ناموں میں سے ہیں۔

بلاشبہ مولانا محمد علی مونگیری کا نام بھی اس فہرست میں آتا ہے جنھوں نے اس دور میں عیسائی مبلغین کا مقابلہ کیا۔ مگر دوسرے کئی لوگ یقینی طور پر اس میدان میں ان سے آگے تھے۔ مثلاً ڈاکٹر وزیر خاں جنھوں نے پادری فنڈر (Reverend K G Pfander) کے اعتراضات کے پرزے اڑا دیے۔ وہ عیسائیوں کے تمام اسرار سے واقف، ان کی مذہبی تصنیفات کے ماہر کامل اور عبرانی و یونانی زبانوں سے بخوبی واقف تھے۔ انھوں نے عیسائیوں کو خود ان کی ہی تصنیفات سے ملزم ٹھہرایا اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی کے ساتھ مل کر اسلام کی حفاظت کا ناقابلِ شکست قلعہ دم کے دم میں کھڑا کر دیا۔

اگر عیسائی مبلغین سے مقابلہ اور تعلق اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی 'جدید رجحانات' اور جدید تقاضوں کا ماہر ہو تو مولانا محمد علی مونگیری کے پہلے یا کم از کم ان کے ساتھ دوسروں کو حق پہنچتا ہے کہ اس واقفیت و مہارت کا سہرا انھیں پہنایا جائے۔ اس دلیل میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کی بنا پر مولانا محمد علی مونگیری کو اپنے زمانہ کی 'واحد شخصیت' سمجھا جائے جنھیں معجزاتی طور پر جدید رجحانات اور جدید تقاضوں کا 'عرفان' حاصل ہوا۔

مگر بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ اس سے آگے بڑھ کر میں کہتا ہوں کہ عیسائی مبلغین کے مقابلہ سے جدید رجحانات اور تقاضوں کا کوئی تعلق نہیں۔ اس دور کے مناظرہ کی کتابیں آج بھی چھپی ہوئی موجود ہیں۔ ان کو دیکھ کر کوئی بھی شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ عیسائی مبلغین نے جو مسائل چھیڑے تھے وہ تمام کے تمام قدیم طرز کے اعتقادی اور مذہبی مسائل تھے۔ ان کا جدید مغربی تہذیب یا جدید رجحانات سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ وہ باتیں جو مذہبی کتابوں میں ہزاروں برس سے لکھی ہوئی موجود ہیں وہی معترضین کے اعتراض کا بھی میدان تھا اور جواب دینے والوں کے جواب کا بھی میدان۔ ان میں نہ جدید فلسفہ و سائنس کے مسائل زیر بحث آتے تھے اور نہ ان کے لیے انگریزی یا تاریخ یا جرمن زبانوں کو جاننے کی ضرورت تھی۔ پھر آخر اس قسم کی قدیم دینیاتی بحثوں سے جدید رجحانات اور تقاضوں کا علم کیوں کسی کو حاصل ہو سکتا ہے؟

شاید سیرت مولانا محمد علی مونگیری کے مصنف مولانا سید محمد الحسنی الندوی نے اپنا یہ قیمتی استدلال، اس واقعہ سے اخذ کیا ہے کہ عیسائیت کی طرف سے جو لوگ ان دینیاتی بحثوں میں حصہ لے رہے تھے، ان میں یورپ کے پادری بھی تھے۔ اگر استدلال کی بنیاد یہی ہے تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص جدید تعلیم یافتہ نہ ہو اور نہ کالج یونیورسٹی کی اسے ہوا لگی ہو۔ البتہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے 'قرأت خانہ' کے قاری صاحب سے وہ اختلافِ قرآت کے مسائل پر بحث کر لے اور محض اس بنا پر سمجھ لیا جائے کہ وہ جدید تعلیم اور یونیورسٹی کے مسائل کا ماہر ہے۔

ایک طرف مولانا محمد علی مونگیری کے سلسلے میں فیاضانہ استدلال کا یہ عالم ہے۔ دوسری طرف مولانا شبلی نعمانی کے سلسلے میں مصنف کتاب کا رویہ یہ ہے کہ مولانا شبلی نعمانی کی حقیقی خصوصیات بھی ان کے خلاف دلیل قائم کرنے کا ذریعہ بن گئی ہیں۔

مولانا شبلی نعمانی نے انیسویں صدی عیسوی کے آخر میں 'یورپ' کے پڑوسی ملک 'ترکی' کا سفر کیا۔ جو اس وقت مغربی تہذیب سے کافی متاثر ہو چکا تھا۔ انھوں نے اپنی زندگی کے سولہ برس مسلم یونیورسٹی میں پروفیسر کی حیثیت سے گزارے۔ حیدر آباد کے علمی حلقوں سے ان کے گہرے روابط تھے جہاں جدید و قدیم دونوں قسم کے علماء زینتِ انجمن بنے ہوئے تھے، ملک کی ملی، قومی و سیاسی تحریکوں میں حصہ لینے کی وجہ سے ان کا تعلق انگریز حکام اور بہت سی مسلم شخصیتوں مثلاً سر آغا خان وغیرہ سے ہوا؛ جو مغربی تہذیب کے پروردہ تھے۔

انھوں نے خود 1883ء میں نیشنل اسکول (National School) کے نام سے ایک انگریزی اسکول اعظم گڑھ (اتر پردیش) میں قائم کیا جو اب ڈگری کالج کے مرتبہ کو پہنچ چکا ہے۔ 1892ء میں سر سید احمد خاں نے یورپ کی تاریخی غلطیوں کے جواب و تصحیح کے لیے ایک مجلس قائم کی تو 'مولانا شبلی نعمانی' کو اس کا سکریٹری بنایا گیا۔ وہ کئی سالوں تک الہٰ آباد یونیورسٹی کے فیلو (fellow) رہے۔ علی گڑھ کے طویل زمانہ قیام میں ان کا تعلق خصوصیت سے پروفیسر ٹی ڈبلو آرنلڈ (Professor T.W. Arnold) سے رہا جو ایک اعلیٰ درجہ کے مغربی عالم تھے۔ وہ مولانا سے عربی سیکھتے اور مولانا ان سے فرنچ کی تعلیم حاصل کرتے۔ اس طرح دونوں میں مسلسل تعلق قائم ہو گیا تھا۔ اس طرح کے اور بہت سے واقعات ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ شبلی اپنے وقت کے ان مخصوص علماء میں سے تھے جن کو 'جدید مغرب' کو سمجھنے کے وافر مواقع ملے جب کہ مولانا محمد علی مونگیری کے سلسلے میں اس طرح کی کوئی بھی چیز پیش نہیں کی جا سکتی۔

علی گڑھ کا طویل تعلق کس شان سے گزرا وہ بھی ذکر کے قابل ہے۔ شروع میں جب مولانا محمد شبلی نعمانی

علی گڑھ میں استاد مقرر ہوئے تو آغاز میں یہ کیفیت تھی کہ کسی تقریب میں استادوں کی کرسیاں بچھائی گئیں تو مولانا شبلی نعمانی کی کرسی ترتیب میں سب سے پیچھے تھی۔ مگر اپنی گوناگوں خصوصیات کی وجہ سے بہت جلد وہ وہاں کی مجالس پر اس طرح چھا گئے کہ ہر جگہ نمایاں نظر آنے لگے۔ مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

'محمڈن کالج علی گڑھ اپنے طرز کا پہلا کالج تھا جس میں انگریز، ہندو اور مسلمان ہر قسم کے استاد اور شاگرد تھے، ایسے ماحول میں ایک پرانا بوریا نشین عالم جس نے کبھی انگریزی کا ایک حروف بھی نہیں پڑھا تھا، جس نے انگریزوں کی صحبت کبھی نہیں اٹھائی تھی، جو نئے تمدن وتہذیب کے سایہ میں کبھی نہیں بیٹھا تھا، یکا یک آیا اور اس پورے ماحول میں رہ کر اس طرح سب میں سما گیا کہ وہ کہیں سے بے گانہ نہیں ہونے پایا، یہ بجائے خود ایک کمال ہے، اور کالج نے قدیم وجدید کی اس ہم آہنگی اور تعاون سے بڑا فائدہ اٹھایا، اور وہ چپلقش اور کشاکش نہ ہونے پائی جس کا ہونا ایسے ماحول میں ضروری تھا۔

اس بزم میں گو دوسرے علماء بھی شریک تھے، مگر وہ جہاں تھے وہیں رہے، لیکن مولانا شبلی نعمانی کا حال یہ تھا کہ وہ ہر محفل پر چھا رہے تھے اور ہر علمی بحث میں، ان کا قول 'فیصل' تھا، وہ اپنے فضل وکمال کی بناء پر بجائے اس کے کہ نئے علوم وفنون کے اہل کمال سے مرعوب اور اپنے علوم ان کی نگاہوں میں بے قدر ہوتے، انھوں نے نہ صرف اپنی بلکہ علماء اسلام کی قدر ومنزلت کو بڑھا دیا اور اپنے قدیم علوم وفنون کے مرتبہ کو اتنا اونچا کیا کہ پروفیسر آرنلڈ اور دوسرے انگریز پروفیسروں کو ان کی تحسین بلکہ تحصیل پر مجبور کر دیا اور ایسے زمانہ میں جب کہ کالج میں ہر طرف سے نئے علوم، نئے مسائل اور نئی تحقیقات کی بارش ہو رہی تھی ایک مولانا ہی کا وجود تھا جو اس مسلسل بارش کے طوفان میں اسلامی علم وفن کے منارہ کو اس مضبوطی سے اپنا جگہ پر جمائے ہوئے تھا کہ ان کو اس طوفان خیز سیلاب سے کوئی خطرہ نہ رہا۔ (حیات شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، صفحہ:148-147)

حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مولانا شبلی نعمانی کی خصوصیات جو درحقیقت یہ ثابت کر رہی تھیں کہ ندوہ سے متعلق تمام علماء میں وہ 'واحد شخص' تھے جو 'جدید تقاضوں' اور 'جدید رجحانات' کو سمجھ سکتے تھے اور اس کی روشنی میں تعلیمی رہنمائی دے سکتے تھے، وہی خصوصیات سیرت مولانا محمد علی مونگیری کے مصنف کے نزدیک اس بات کا ثبوت بن گئیں کہ وہ اس کے قطعاً اہل نہ تھے ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:

'جہاں تک ماحول اور تربیت کا تعلق ہے۔ مولانا محمد علی مونگیری اور مولانا شبلی نعمانی میں بڑا اختلاف نظر آتا ہے، مولانا شبلی نعمانی کی ذہنی وفکری نشب ونما اور ارتقاء میں علی گڑھ کا خاصا حصہ ہے، وہ پروفیسر ٹی ڈبلو آرنلڈ کے شاگرد تھے۔ سر سید احمد خان کے خیالات وافکار سے باوجود اختلاف کے متاثر تھے، علماء ومشائخ سے ان کو وہ تعلق

نہیں تھا جو مولانا محمد علی مونگیری کو تھا اور باوجود اس کے کہ وہ علی گڑھ کے مفید اور مضر رجحانات میں پوری تمیز رکھتے تھے لیکن بہر حال بشریت سے خالی نہ تھے، اس متلاطم سمندر میں رہ کر تر دامن نہ ہونا اور اس یک طرفہ ماحول میں قلب اور عقل کے حدود و امتیازات کو ملحوظ رکھنا اور روحانی خلا کا احساس ان کے لیے قدرتی طور پر دشوار تھا، جس منزل پر وہ اپنی آخری عمر میں پہنچے تھے اور جس نے ان کو 'سیرتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' کی طرف متوجہ کیا تھا وہ منزل اس وقت ان سے بہت دور تھی۔ (سیرت مولانا محمد علی مونگیری، صفحہ:278-279)

اس ذہنیت کی داد دیجئے کہ عیسائی مبلغین سے اختلاط مولانا محمد علی مونگیری کو تو حیرت انگیز طور پر مغربیات کو سمجھنے کا موقع فراہم کرتا ہے اور انہیں جدید رجحانات کا اس حد تک کا ماہر بنا دیتا ہے کہ وہ قوم کو عصر آفرین رہنمائی دے سکیں۔ دوسری طرف جدید طبقہ سے مولانا شبلی نعمانی کا اختلاط انھیں اس بات کے لیے غیر موزوں بنا دیتا ہے کہ وہ چیزوں کو سمجھیں اور اس کے معاملہ میں رہنمائی دیں۔

اوپر کی 'بے معنی عبارت' کو اگر ہم بامعنی بنا کر یہ متعین کرنا چاہیں کہ وہ کون سے اسباب تھے جن کی جہ سے شبلی جدید دنیا کو انتہائی قریب سے دیکھنے کے باجود جدید تقاضوں کو سمجھنے کے اہل نہ ہو سکے تو وہ حسب ذیل ہو سکتا ہے:

(الف) شبلی کا سرسید کے خیالات وافکار سے متاثر ہونا، (ب) سیرۃ النبی والے شبلی کا آخر عمر میں وجود میں آنا

جہاں تک پہلی شق کا تعلق ہے، وہ قطعی طور پر ایک غلط بات ہے۔ سرسید احمد خاں سے مولانا شبلی نعمانی کا اختلاف اس درجہ تھا کہ اسی کی وجہ سے انھیں علی گڑھ چھوڑنا پڑا۔ سرسید احمد خاں کے شدید اصرار کے باوجود انھوں نے کبھی 'تہذیب الاخلاق' میں لکھنا پسند نہ کیا۔ ایک بار مجبوراً ایک تاریخی مضمون دیا بھی تو اس پر اپنے نام کے بجائے اسے 'الاسدی الاعظمی' لکھا۔ سرسید کی انتہائی خواہش کے باوجود سرسید کی تفسیر کا عربی ترجمہ کرنے پر راضی نہیں ہوئے۔ اسی طرح سرسید کی خواہش کے باوجود ان کی لائف (life) نہیں لکھی اور مجبوراً یہ کام مولانا الطاف حسین حالی کے حوالے کیا گیا۔

مولانا شبلی نعمانی نے ندوہ کے ایک جلسہ میں تقریر کی۔ یہ تقریر اور اس کی روداد مولانا سید سلیمان ندوی نے ان الفاظ میں نقل کی ہے: دوسری قوموں کی ترقی یہ ہے کہ آگے بڑھتے جائیں، آگے بڑھتے جائیں، لیکن مسلمانوں کی ترقی یہ ہے کہ وہ پیچھے ہٹتے جائیں، پیچھے ہٹتے جائیں، یہاں تک کہ صحابہؓ کی صف سے جا کر مل جائیں۔

سرسید احمد خان کو ان کی اس تقریر پر بڑا غصہ آیا کیوں کہ ان کا خیال تھا کہ اس وقت مسلمانوں کو اس قسم کی نصیحتیں اس راستہ سے پیچھے ہٹا دیں گی، جس پر وہ لے جانا چاہتے ہیں، چنانچہ اس کے خلاف انھوں نے سخت

مضمون لکھا۔ (حیاتِ شبلی، صفحہ:290)

ایسے کثیر واقعات پیش کئے جاسکتے ہیں جن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مولانا شبلی نعمانی کے بارہ میں یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ وہ سر سید احمد خاں کے خیالات سے متاثر تھے۔

اگر چہ سیرت مولانا محمد علی مونگیری کے مصنف نے اپنے اس دعوے پر کوئی مثال نہیں دی ہے تاہم ایک بات کا امکان تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ وہ یہ کہ مولانا کسی مغربی زبان پر اس حد تک عبور نہ رکھتے تھے کہ براہِ راست اس سے مکمل واقفیت حاصل کر سکتے۔ اس بناء پر وہ پوری طرح اس پوزیشن (position) میں نہ تھے کہ مغربی افکار کا کماحقہ تجزیہ کر سکیں۔ وہ اپنی غیر معمولی ذہانت سے اکثر صورت حال کو سمجھ لیتے تھے اور اس سے عہدہ برآ ہونے میں کامیاب رہتے تھے۔ مگر ظاہر ہے کہ ذہانت علمی واقفیت کا بدل نہیں ہوسکتی۔

مگر اس بناء پر جو چوک ہو وہ حقیقتاً معذوری کے درجہ میں ہے اور امام غزالی تک کے لیے علماء نے اس کو ناقابلِ التفات سمجھا ہے اور آئندہ بھی اس طرح کے کیس میں بجا طور پر کسی کو معذور سمجھا جاسکتا ہے۔

مثال کے طور پر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے اپنی کتاب 'مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش' میں 'مغربیت کے زہر کا تریاق' یہ بتایا ہے کہ مغربیت کی معصومیت کا انکار کیا جائے اور اس کے علوم ونظریات کو آزادانہ تنقید اور جرأت مندانہ تشریح یعنی پوسٹ مارٹم (postmartam) کا موضوع قرار دیا جائے۔

اس سلسلے میں مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر محمد رفیع الدین کی فاضلانہ کتاب 'قرآن اور علمِ جدید' اس کا اچھا نمونہ ہے (حیات شبلی، صفحہ:175)

ڈاکٹر رفیع الدین صاحب کی کتاب کے بارہ میں اس ریمارک سے یہ نتیجہ نکالنا بالکل بجا ہوگا کہ مولانا اس کتاب سے متاثر ہیں۔ حالاں کہ یہ ایک واقعہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی کتاب نہ تو جدید علمی معیار کے اعتبار سے کوئی 'فاضلانہ کتاب' ہے اور نہ اسلامی نقطۂ نظر سے جرأت مندانہ تنقید کا اچھا نمونہ۔ اس کے برعکس دوناقص تنقید اور مغرب سے مرعوبیت کا نمونہ ہے۔ مگر اس کے باوجود ہم مولانا محترم کے بارہ میں یہ رائے نہیں رکھتے کہ وہ ڈاکٹر صاحب موصوف کی طرح مغرب سے متاثر ہیں۔ کیوں کہ ہم سمجھتے ہیں کہ مولانا کا یہ تبصرہ حقیقتاً مغرب سے مرعوبیت کی بناء پر نہیں بلکہ مغرب سے عدم واقفیت کی بناء پر ہے اگر وہ اس پوزیشن میں ہوتے کہ مغرب کے افکار اور مغرب کے علمی معیار کا صحیح انداز کر سکیں تو وہ ڈاکٹر صاحب کی کتاب کے بارہ میں یہ ریمارک ہرگز نہ دیتے۔

یہ معذوری اگر مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (ناظم ندوہ) کے لیے قابلِ اعتراض نہیں ہے، تو یہی معذوری اس سے کم تر درجہ میں مولانا شبلی نعمانی کے لیے کس بنا پر قابل اعتراض قرار پائے گی۔

دوسری بات یہ کہی گئی ہے کہ 'سیرت رسول' والے 'مولانا شبلی نعمانی' کا وجود آخر عمر میں بنا۔ حالاں کہ یہ بات تاریخی طور پر غلط ہے۔ مولانا نے اپنی زندگی کے ابتدائی حصہ میں جب کہ وہ علی گڑھ میں تھے، انھوں نے طلبہ میں ذاتِ پاک محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حسن عقیدت اور واقفیت پیدا کرنے کے لیے عربی میں سیرت کا ایک رسالہ 'بدء الاسلام' تھا اور وہ کالج کے نصاب میں بھی داخل ہوا۔

مولانا شبلی نعمانی نے اسی زمانہ میں علی گڑھ کالج کے طلبہ کو قرآن کا درس دینا بھی شروع کیا، ان کی ذات نے اس درس کو ایسا اثر انگیز بنا دیا کہ طلبہ کی بڑی تعداد اس میں شرکت کرنے لگی۔ مولانا محمد علی جوہر نے اپنی کتاب مائی لائیف اے فریگمنٹ (My Life: A Fragment) لکھا ہے کہ مجھ کو قرآن کا ذوق مولانا شبلی نعمانی کے انھیں درسوں سے ہوا۔ سید سجاد حیدر صاحب کہا کرتے تھے کہ مولانا شبلی کا درس ایسا ہوتا تھا کہ ہم اس کو سن کر وجد کرنے لگتے تھے۔

مولانا کی کوششوں نے حیرت انگیز طور پر علی گڑھ کالج کی فضا بدل دی۔ یہاں موصوف کا ایک مکتوب نقل کیا جاتا ہے: 'اس وقت مجھ سے نہ میری طبیعت کا حال پوچھیے، نہ کوئی اور واقعہ، آپ سنئے اور میں دل سے اٹھتے ہوئے جوش سے ایک تازہ کیفیت سناؤں، یوں تو مدرستہ العلوم کے قواعد میں داخل ہے کہ لڑکے مغرب کی نماز جماعت سے پڑھیں مگر ان دنوں ہوا کا رخ ہی بدل گیا ہے لڑکوں نے خود ایک مجلس قائم کی ہے جس کو 'تحیتہ الصلوٰۃ' کہتے ہیں، ایک بی اے سکریٹری ہے اور بہت سے تعلیم یافتہ اس کے ممبر ہیں، چار بجے صبح کے بعد ایک نوجوان انگریزی خوان لوگوں کو اس پُر اثر فقرے سے چونکا دیتا ہے، الصّلوۃ خیر من النوم پانچوں وقت کی نمازیں با جماعت ہوتی ہیں اور لطف یہ کہ محض اپنی خواہش بیرونی دباؤ کا نام بھی نہیں، مغرب کی نماز سبحان اللہ! کیا شان وشوکت سے ہوتی ہے کہ بس دل پھٹا پڑتا ہے، خود سید صاحب بھی شریک نماز ہوتے ہیں اور چوں کہ وہ عامل بالحدیث ہیں، آمین زور سے کہتے ہیں، ان کی آمین کی گونج مذہبی جوش کی رنگ میں خون بڑھا دیتی ہے۔ میں کبھی کبھی اسلام پر لکچر دیتا ہوں۔ مسجد بننے کی تیاری ہے، سید محمود کی سرگرمی نے اس کے پیمانہ تعمیر کو نہایت وسیع کر دیا ہے، وہ مہتمم خاص ہیں اور تین ہزار چندہ خود دیں گئے، میں نے بھی 50 روپے دیے ہیں، سید محمود صاحب خود ہاتھ میں پھاؤڑا لیں گے اور مسجد کی نیو کھودیں گے، لاگت کا تخمینہ ساٹھ ستر ہزار روپیہ ہے۔ مجھ کو اس بات کا فخر حاصل ہے کہ اس نئی زندگی کے پیدا ہونے میں میرا بھی حصہ ہے اور اس جوش مذہبی کا بر

انگیختہ کرنا میری قسمت میں بھی تھا ہے۔ (حیات شبلی، صفحہ:150)

علی گڑھ سے مولانا شبلی نعمانی کی غیر مرعوبیت کے سلسلے میں مولانا کا ایک مکتوب نقل کروں گا جوانھوں نے علی گڑھ جانے کے بعد وہاں سے اپنے عزیز کو لکھا تھا:

'یہاں آ کر میرے تمام خیالات مضبوط ہو گئے، معلوم ہوا کہ انگریزی خواں فرقہ نہایت مہمل فرقہ ہے، مذہب کو جانے دو، خیالات کی وسعت، سچی آزادی، بلند ہمتی، ترقی کا جوش برائے نام نہیں، یہاں ان چیزوں کا ذکر تک نہیں آتا، بس خالی کوٹ پتلون کی نمائش گاہ ہے، ہمارے شہر کے نوخیز لڑکے مجھ کو بی اے کی نسبت (اس زمانہ میں بھی اسے بڑی چیز تھی) یہ خیال دلاتے تھے کہ وہ مذہبی باتوں کو تمام تر ضعیف ثابت کر دیں گے، لاحول ولا...وہ غریب توزمین کی حرکت بھی نہیں سمجھ سکتے۔ (حیاتِ شبلی، صفحہ:131)

اس طرح کے بہت سے واقعات ہیں جو اس بات کا ثبوت ہیں کہ علی گڑھ نے مولانا شبلی نعمانی کو متاثر نہیں کیا۔ البتہ علی گڑھ کے 16 سالہ تعلق سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ مولانا شبلی نعمانی جدید تقاضوں کو سمجھ سکے جو اس وقت ندوہ سے متعلق علماء میں سے کسی کے حصہ میں نہ آیا تھا۔

مندرجہ بالا تقسیم میں تیسری شق یہ ہے کہ ندوہ کو علمی اور ادبی ذوق کس نے دیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس مسئلہ پر زیادہ گفتگو کی ضرورت نہیں۔ کیوں کہ سیرت مولانا محمد علی مونگیری کے مصنف نے مقدمہ نگار اور ان کے مخصوص حلقہ کے باہر مشکل ہی سے کوئی شخص باور کر سکتا ہے کہ اس کا سرچشمہ مولانا محمد علی مونگیری تھے۔ اس معاملہ میں مولانا شبلی نعمانی کی فوقیت اتنی واضح ہے کہ کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ بلا شبہ یہ صحیح ہے کہ مولانا محمد علی مونگیری نے ردمسیحیت اور ردِقادیانیت پر کچھ رسالے لکھے ہیں۔ مگر ان رسالوں کا اس علمی اور ادبی ذوق سے کوئی تعلق نہیں جو ندوہ کا سرمایہ افتخار سمجھا جاتا ہے۔ یہ صرف شبلی جیسے محقق اور ادیب ہی کے لیے ممکن تھا کہ وہ کسی ادارہ کو یہ ذوق منتقل کر سکے اور یقیناً انھیں نے ایسا کیا ہے۔ (ہفت روزہ الجمعیۃ، نئی دہلی، 16 فروری 1968ء، صفحہ:18-15)

قسط ششم

مشہور ہے کہ کسی شخص کا ایک بچہ تھا جو گڑ بہت کھاتا تھا اور اس کی وجہ سے اس کی صحت خراب ہو گئی تھی۔ اس نے بہت کوشش کی مگر لڑکے کی عادت ختم نہ ہوئی۔ بالآخر وہ بچے کو لے کر ایک بزرگ کے یہاں گیا اور ان سے درخواست کی کہ اس کو نصیحت فرمائیں کہ وہ گڑ کھانا چھوڑ دے۔

بزرگ نے بچہ کو دیکھا، کچھ دیر خاموش ہو کر سوچتے رہے اور اس کے بعد کہا کہ ایک مہینہ کے بعد آنا۔

مدت پوری ہونے کے بعد آدمی دوبارہ اپنے بچہ کو لے کر بزرگ کے یہاں گیا۔ بزرگ نے شفقت کے ساتھ بچہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور فرمایا: ’دیکھو بچے، گڑ نہ کھایا کرو‘۔

آدمی بچے کو لے کر گھر واپس آیا تو اس نے حیرت انگیز طور پر دیکھا کہ بچہ نے گڑ کھانا چھوڑ دیا ہے۔ جب لمبی مدت گزر گئی اور آدمی کو اطمینان ہو گیا کہ بچے نے واقعی اپنی عادت ترک کردی ہے، تو وہ دوبارہ بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ حضرت آپ کی نصیحت سے تو حیرت انگیز فائدہ ہوا۔ البتہ ایک بات سمجھ میں نہیں آئی۔

وہ کیا؟ بزرگ نے دریافت کیا۔

’اور وہ یہ کہ ایسی کارگر نصیحت آپ نے پہلے روز کیوں نہ فرمادی۔ ایک مہینہ کے لیے اس کو ملتوی کرنا کیوں پسند کیا‘۔

بزرگ نے کہا کہ ’اصل یہ ہے کہ پہلی بار جب تم بچہ کو لے کر آئے تو اس وقت میں خود بھی گڑ کھاتا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں خود جس چیز کا عادی ہوں، اس کے بارہ میں دوسرے کو نصیحت کروں کہ چھوڑ دو، تو اس سے فائدہ کیا ہوگا۔ اس لیے میں نے حقیقی ناصح بننے کے لیے ضروری سمجھا کہ پہلے خود گڑ چھوڑ دوں، اس کے بعد بچہ کو کچھ نصیحت کروں۔

یہ مثال مجھے سیرت مولانا محمد علی مونگیری دیکھ کر یاد آئی۔ اس کتاب میں دو باتیں بے حد نمایاں اور قابل تردید طور پر موجود ہیں۔ ایک یہ کہ اس میں تاریخ کو بدلنے کی کوشش کی گئی ہے اور دوسرے یہ کہ وہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس کے مصنف کے نزدیک دلیل کا کوئی وزن نہیں۔ دلیل سے خواہ کچھ بھی ثابت ہوتا ہو، اگر انھیں اپنی زبان وقلم کو حرکت دینے کا موقع حاصل ہے تو وہ سارے دلائل کو نظر انداز کر کے اپنی بات دہراتے رہیں گے۔

ایک وقت تھا کہ ایک مسلمان عالم اور بزرگ کی تقریر بادشاہوں کو لرزا دیتی تھی۔ بڑے بڑے ظالموں کے قدم ایک جملہ سن کر رک جاتے تھے مگر آج ہم تقریر اور تحریر کا طوفان اٹھائے ہوئے ہیں۔ اور صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج قیادت کے میدان میں لوگ زور آزمائی کر رہے ہیں وہ سیرت مولانا محمد علی مونگیری کے مصنفین جیسے لوگ ہیں۔ جب کہ اس سے پہلے قیادت کی ذمہ داری وہ لوگ

سنبھالتے تھے جس کا نقشہ اوپر کے بزرگ کی مثال میں نظر آتا ہے۔

مثال کے طور پر ہم کو شکایت ہے کہ ہندو اور انگریز مورخین ہماری تاریخ کو بگاڑتے ہیں۔ انھوں نے دانستہ طور پر ایسی تاریخ تصنیف کی؛ جس میں مسلم دورِ حکومت کا نہایت بھیانک نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ وہ لوگ جنھوں نے سینکڑوں برس تک ہندوستان کی صورت گری کی اور اس کو اپنی کوششوں سے سنوارا۔ ان کی تصویر اس طرح بنائی گئی ہے گویا وہ اس ملک کو صرف بگاڑتے رہے۔ یہی شکایت ہم کو مغرب کے عام مورخین سے ہے۔ انھوں نے عالمی تاریخ کو اس ڈھنگ سے مرتب کیا ہے کہ مغربی تہذیب تو اپنی واقعی حیثیت سے زیادہ ابھری ہوئی نظر آئے اور اسلامی تہذیب جس نے ایک ہزار برس تک دنیا کو انسانیت اور ترقی کا سبق دیا، وہ اپنی اصل حیثیت سے کم دکھائی دے۔

اس قسم کی تاریخ سازی کے خلاف ہم مسلسل احتجاج کرتے رہے ہیں کیوں کہ یہ ایک بدترین علمی جرم ہے کہ تاریخ کو اس طرح نہ لکھا جائے جیسی کہ وہ ہے بلکہ اس طرح لکھا جائے جیسا کہ چاہتے ہیں۔ یہ تاریخ سازی ہے نہ کہ تاریخ نگاری۔ اس میں شک نہیں کہ غیر مسلم مورخین کا یہ عمل حد درجہ قابلِ اعتراض ہے۔ مگر اس سے زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہمارا احتجاج کارگر نہیں ہو رہا ہے اور گاڑی اپنی پٹری پر چلی جارہی ہے۔ اس المیہ کی وجوہ بہت سی ہوسکتی ہیں، ایک وجہ یقیناً وہ صورتِ حال بھی ہے جو سیرت مولانا محمد علی مونگیری میں نظر آتی ہے۔ اس کتاب میں ٹھیک اس غلطی کو دہرایا گیا ہے جس کی شکایت ہمیں غیر مسلم مورخین سے ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ جب ہم خود تاریخ نگاری کے بجائے تاریخ سازی کا طریقہ اختیار کیے ہوئے ہیں تو دوسروں پر ہماری یہ نصیحت کس طرح کارگر ہوسکتی ہے کہ واقعات کو صحیح شکل میں بیان کرو۔ اپنی مرضی کے مطابق تاریخ کو تصنیف نہ کرو۔ ندوہ کی تاریخ لکھنے میں اگر آپ اس اصول کا لحاظ رکھنا ضروری نہیں سمجھتے کہ حقائق کو اپنی مرضی کے تابع نہ کریں بلکہ ان کو بے کم وکاست بیان کریں تو دوسروں سے کیوں یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ ہماری تاریخ لکھتے وقت اس اصول کا لحاظ رکھیں گے۔

آدمی خود جس غلطی میں مبتلا ہو؛ اسی غلطی کے بارہ میں دوسروں کو ٹوکنا ایک فعل عبث ہے اور ہرگز امید نہیں کی جاسکتی کہ اس قسم کی تنقید عالم واقعہ میں کبھی اپنا کوئی اثر دکھائے گی۔

اسی طرح مثلاً ہندوستان میں اکثریت اور حکومت کے خلاف مقدمہ کو لیجیے... ہم کو زبردست شکایت ہے

کہ ہماری ساری جدوجہد کے باوجود حکومت اور اکثریت ہماری باتوں کا کوئی اثر قبول نہیں کرتی؛ اس معاملے میں وہی مثل صادق آرہی ہے کہ کتے بھونکتے رہتے ہیں اور ہاتھی چلتا رہتا ہے۔

غور کیجیے کہ وہ کیا چیز ہے جو ہم نے اپنے اس مقدمہ کے حق میں پیش کی ہے اور جس کے لیے ہمیں شکایت ہے کہ ملک کی اکثریت اور حکومت اسے رد کر رہی ہیں۔ وہ صرف ایک چیز ہے اور وہ ہے لفظی دلیل کی قوت... ہم نے جو کچھ کیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ واقعات اور اعداد و شمار اور متعلق حوالوں سے یہ ثابت کریں کہ ہمارا مقدمہ صحیح ہے اور از روئے حقیقت فریق ثانی کو وہی کرنا چاہیے۔ جس کا ہم مطالبہ کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دلیل میں خود کوئی قوت نہیں ہوتی۔ اس میں قوت اس وقت آتی ہے؛ جب آدمی خود اس کا وزن تسلیم کرنے کے لیے تیار ہو۔ اب چوں کہ حکومت اور اکثریت محض لفظی دلیل کی بنا پر ہماری بات ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اس لیے ہمارا سارا مقدمہ اس طرح پڑا ہوا ہے گویا اس کے پیچھے کوئی صداقت ہی نہیں۔

ہماری دلیل کی یہ بے وزنی کیوں ہے؟ یہاں بھی میں کہوں گا کہ اس المیہ کی توجیہ کے لیے بہت سی چیزوں کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ مگر اس کی ایک وجہ یقیناً وہ بھی ہے۔ جس کا تجربہ سیرت مولانا محمد علی مونگیری کی شکل میں ہمارے سامنے آیا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی اور مولانا محمد علی مونگیری سے متعلق جن بحثوں کو 'حیاتِ شبلی' میں قطعی دلائل سے ثابت کیا جا چکا تھا؛ انھیں کو سیرت مولانا محمد علی مونگیری میں اس طرح دہرایا گیا ہے جیسے کہ سیرت مولانا محمد علی مونگیری کے لکھنے کے وقت حیاتِ شبلی کا کہیں وجود ہی نہیں تھا۔ اس کا مطلب ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتا ہے کہ سیرت مولانا محمد علی مونگیری کے مصنفین کے نزدیک دلیل کا کوئی وزن نہیں۔ اگر وہ منطقی دلیل کے وزن کو تسلیم کرتے تو حیات شبلی کے وجود میں آنے کے بعد وہ خاموش ہو جاتے۔ کیوں کہ حیات شبلی ان مباحث کے بارہ میں 'قولِ فیصل' ہے، جن کو بالکل سطحی انداز میں دوبارہ سیرت مولانا محمد علی مونگیری میں دہرایا گیا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ علمی دلیل جب ہمارا منھ بند کرنے کے لیے کافی نہ ہو تو ہم دوسروں سے یہ امید رکھنے کا حق رکھتے ہیں کہ ہمارے لفظی دلائل کو سن کر وہ خاموش ہو جائیں گے اور اپنی گاڑی کو اس سمت میں چلانے لگیں گے جدھر علمی دلائل تقاضا کر رہے ہیں۔

سیرت مولانا محمد علی مونگیری علم و تحقیق کی دنیا میں 'طفلانہ جسارت' کی ایک حیرت انگیز مثال ہے۔ دنیا جانتی ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی دور جدید کے ایک عظم محقق تھے۔ وہ مولانا محمد علی مونگیری کے زمانہ میں بالکل ابتدائی دور میں ندوہ میں داخل ہوئے اور وہاں سے انتہائی نمایاں طالبِ علم کی حیثیت سے فراغت

حاصل کی۔ ان کی ندویت اور علمیت دونوں اتنی بلند ہیں کہ فرزندانِ ندوہ میں سے شاید کسی کو بھی ان کے مقابلے میں رکھا نہیں جاسکتا۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ مولانا سید سلیمان ندوی انتہائی اعلیٰ درجہ کا تحقیقی ذوق رکھتے تھے۔ پورے اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ مؤرخانہ تحقیق کا اتنا بلند ذوق رکھنے والا ندوہ نے کوئی دوسرا پیدا نہیں کیا۔

اسی طرح مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں اپنی ساری علمی اور تحقیقی صلاحیتوں کو جمع کرکے ایک کتاب لکھی جس کا نام 'حیاتِ شبلی' ہے۔ یہ کتاب تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور 'محققانہ سوانح عمری' کی بے نظیر مثال ہے۔ اس کتاب میں مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا شبلی نعمانی اور ندوہ کے تعلق کے بارہ میں اس قدر محققانہ مواد فراہم کردیا ہے کہ بلا مبالغہ اس کتاب کو اس عنوان پر 'قولِ فیصل' کہا جاسکتا ہے۔

ایسی ایک کتاب وجود میں آنے کے 20 برس بعد ایک کتاب میں شائع ہوتی ہے جس کا نام ہے 'سیرت مولانا محمد علی مونگیری' اس کتاب میں صریح طور پر مولانا شبلی نعمانی اور ندوہ کے تعلق کے بارہ میں اس سے مختلف تصویر پیش کی جاتی ہے جو 'حیاتِ شبلی' میں کھینچی جاچکی ہے۔ سید صاحب کے مقابلہ میں ایک 'طفلِ مکتب' کو یہ جسارت کیوں ہوئی۔ کیا اس لیے کہ وہ مسئلہ زیر بحث سے زیادہ واقف تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا، کیا 20 برس بعد کوئی ایسا تحقیقی مواد مل گیا تھا جس سے صورتِ حال پر نئی روشنی پڑتی تھی، کتاب کے مطالعہ سے یہ بھی ثابت نہیں ہوتا، کیا آسمان سے کوئی غیبی اشارہ ہوا تھا جس کے اعتماد پر یہ جسارت کی گئی ہے۔ کتاب میں اس کا دعویٰ بھی نہیں کیا گیا ہے۔

اگر ان میں سے کوئی بات نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر اس جسارت کا مطلب کیا ہے؟ اگر اس جسارت کو جائز سمجھ لیا جائے تو پھر علمی تحقیق کے کوئی معنی نہیں رہتے، کسی بات کا اعلیٰ ترین دلائل سے ثابت ہوجانا یہ معنیٰ نہیں رہتا کہ اس کو مان لیا جائے اور اس کے مقابلہ میں زبانیں خاموش ہوجائیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ علم و تحقیق کے نام سے جو کچھ دنیا میں کام ہو رہا ہے وہ سب بالکل بے کار ہے۔ کیوں کہ کوئی بڑی سے بڑی تحقیق کسی سطحی ذہن کے لیے اس راستہ کو بند نہیں کرتی کہ وہ قلم کاغذ لے کر کچھ کالی لکیریں بنائے اور اس کو کاتب سے لکھوا کر ایک کتاب کی شکل میں چھاپ دے اور بے تکلف بیچنا شروع کر دے۔ اگر علمی دنیا میں حلت و حرمت کا کوئی قانون ہو تو ایسی جسارتوں کو یقینی طور پر حلال کی فہرست میں نہیں رکھا جاسکتا۔ (ہفت روزہ الجمعیۃ، نئی دہلی، 23 فروری 1968ء، صفحہ: 15-16)

...

دیکھ لی دنیا ہم نے

صفدر امام قادری

(پٹنہ، بہار)

غضنفر کی بنیادی حیثیت بے شک ناول نگار کی ہے اور دوسری اصناف میں ان کی گوناگوں خدمات کے باوجود انھیں دنیا ناول نگار کے طور پر ہی پہچانتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہو کہ انھوں نے جب اپنی خودنوشت شایع کرنے کا ارادہ کیا تو اسے 'سوانحی ناول' کے ناشرانہ الفاظ کے ساتھ پیش کرنے کی ایک سہولت ڈھونڈ لی۔ شاعری کی جدید و قدیم صنفوں کے ساتھ خاکہ نگاری اور تعلیم و تدریس کے موضوع سے تنقید و تحقیق ان کے دوسرے ایسے میدان ہیں جہاں وہ ہزارہا صفحات پیش کر چکے ہیں۔

50 برس سے زیادہ مدت سے غضنفر شعر و ادب کے میدان میں مستقل مزاجی کے ساتھ مصروفِ کار رہے ہیں اور ان کی طویل و مختصر کتابوں کی تعداد 25 سے تجاوز کر چکی ہے۔ ادب کی ہر صنف اگرچہ ذات و کائنات کے تجربات کے بغیر بے اعتبار ہوتی ہے مگر ناول کے بارے میں تو سب مانتے ہیں کہ مطالعۂ کائنات اس کا حقیقی مرکزہ ہے۔ غضنفر نے ایک دو نہیں کل نو ناول تحریر کیے؛ جن میں سے چند خاصی شہرت کے حامل ہوئے۔ قصہ گوئی میں حقیقت اور تخیل کی ایک حسین آمیزش ہوتی ہے جسے راجندر سنگھ بیدی نے 'جھوٹ سچ' کی اصطلاح سے واضح کیا تھا۔

اب یہ سوال ہمارے ذہن میں کوندتا ہے کہ اتنے ناولوں کے بعد بھی غضنفر کے پاس زندگی کے کون سے ایسے انوکھے قصے بچ گئے تھے جنھیں وہ علاحدہ طور پر خودنوشت یا سوانحی ناول کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں؟

'دیکھ لی دنیا ہم نے' کا نام غضنفر نے اپنے استاد شہریار کے اِس مشہور شعر سے اخذ کیا ہے:

جستجو جس کی تھی، اس کو تو نہ پایا ہم نے
اس بہانے سے مگر دیکھ لی دنیا ہم نے

غضنفر نے اپنے ناول فسوں کا عنوان بھی شہریار کے شعر سے ہی منتخب کیا تھا۔ شہریار کے پیش کردہ شعر کی تہہ داری کو چھوڑیے اور دوسرے مصرعے کی منطق پر غور کیجیے تو سمجھ میں آ جائے گا کہ غضنفر نے یہ خودنوشت آخر کار کیوں

حاصل کی۔ ان کی ندویت اور علمیت دونوں اتنی بلند ہیں کہ فرزندانِ ندوہ میں سے شاید کسی کو بھی ان کے مقابلے میں رکھا نہیں جاسکتا۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ مولانا سید سلیمان ندوی انتہائی اعلیٰ درجہ کا تحقیقی ذوق رکھتے تھے۔ پورے اعتماد کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ مؤرخانہ تحقیق کا اتنا بلند ذوق رکھنے والا ندوہ نے کوئی دوسرا پیدا نہیں کیا۔

اسی طرح مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں اپنی ساری علمی اور تحقیقی صلاحیتوں کو جمع کرکے ایک کتاب لکھی جس کا نام 'حیاتِ شبلی' ہے۔ یہ کتاب تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور 'محققانہ سوانح عمری' کی بے نظیر مثال ہے۔ اس کتاب میں مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا شبلی نعمانی اور ندوہ کے تعلق کے بارہ میں اس قدر محققانہ مواد فراہم کردیا ہے کہ بلا مبالغہ اس کتاب کو اس عنوان پر 'قولِ فیصل' کہا جاسکتا ہے۔

ایسی ایک کتاب وجود میں آنے کے 20 برس بعد ایک کتاب میں شائع ہوتی ہے جس کا نام ہے 'سیرت مولانا محمد علی مونگیری' اس کتاب میں صریح طور پر مولانا شبلی نعمانی اور ندوہ کے تعلق کے بارہ میں اس سے مختلف تصویر پیش کی جاتی ہے جو 'حیاتِ شبلی' میں کھینچی جا چکی ہے۔ سید صاحب کے مقابلہ میں ایک 'طفلِ مکتب' کو یہ جسارت کیوں ہوئی۔ کیا اس لیے کہ وہ مسئلہ زیر بحث سے زیادہ واقف تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا، کیا 20 برس بعد کوئی ایسا تحقیقی مواد مل گیا تھا جس سے صورتِ حال پر نئی روشنی پڑتی تھی، کتاب کے مطالعہ سے یہ بھی ثابت نہیں ہوتا، کیا آسمان سے کوئی غیبی اشارہ ہوا تھا جس کے اعتماد پر یہ جسارت کی گئی ہے۔ کتاب میں اس کا دعویٰ بھی نہیں کیا گیا ہے۔

اگر ان میں سے کوئی بات نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر اس جسارت کا مطلب کیا ہے؟ اگر اس جسارت کو جائز سمجھ لیا جائے تو پھر علمی تحقیق کے کوئی معنی نہیں رہتے، کسی بات کا اعلیٰ ترین دلائل سے ثابت ہو جانا یہ معنیٰ نہیں رہتا کہ اس کو مان لیا جائے اور اس کے مقابلہ میں زبانیں خاموش ہو جائیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ علم و تحقیق کے نام سے جو کچھ دنیا میں کام ہو رہا ہے وہ سب بالکل بے کار ہے۔ کیوں کہ کوئی بڑی سے بڑی تحقیق کسی سطحی ذہن کے لیے اس راستہ کو بند نہیں کرتی کہ وہ قلم کاغذ لے کر کچھ کالی لکیریں بنائے اور اس کو کاتب سے لکھوا کر ایک کتاب کی شکل میں چھاپ دے اور بے تکلف بیچنا شروع کر دے۔ اگر علمی دنیا میں حلت وحرمت کا کوئی قانون ہو تو ایسی جسارتوں کو یقینی طور پر حلال کی فہرست میں نہیں رکھا جاسکتا۔ (ہفت روزہ الجمعیۃ، نئی دہلی، 23 فروری 1968ء، صفحہ: 16-15)

...

دیکھ لی دنیا ہم نے

صفدر امام قادری

(پٹنہ، بہار)

غضنفر کی بنیادی حیثیت بے شک ناول نگار کی ہے اور دوسری اصناف میں ان کی گونا گوں خدمات کے باوجود انھیں دنیا ناول نگار کے طور پر ہی پہچانتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہو کہ انھوں نے جب اپنی خودنوشت شائع کرنے کا ارادہ کیا تو اسے 'سوانحی ناول' کے ناشرانہ الفاظ کے ساتھ پیش کرنے کی ایک سہولت ڈھونڈ لی۔ شاعری کی جدید و قدیم صنفوں کے ساتھ خاکہ نگاری اور تعلیم و تدریس کے موضوع سے تنقید و تحقیق ان کے دوسرے ایسے میدان ہیں جہاں وہ ہزارہا صفحات پیش کر چکے ہیں۔

50 برس سے زیادہ مدت سے غضنفر شعر و ادب کے میدان میں مستقل مزاجی کے ساتھ مصروفِ کار رہے ہیں اور ان کی طویل و مختصر کتابوں کی تعداد 25 سے تجاوز کر چکی ہے۔ ادب کی ہر صنف اگرچہ ذات و کائنات کے تجربات کے بغیر بے اعتبار ہوتی ہے مگر ناول کے بارے میں تو سب مانتے ہیں کہ مطالعۂ کائنات اس کا حقیقی مرکزہ ہے۔ غضنفر نے ایک دو نہیں کُل نو ناول تحریر کیے؛ جن میں سے چند خاصی شہرت کے حامل ہوئے۔ قصہ گوئی میں حقیقت اور تخیل کی ایک حسین آمیزش ہوتی ہے جسے راجندر سنگھ بیدی نے 'جھوٹ سچ' کی اصطلاح سے واضح کیا تھا۔

اب یہ سوال ہمارے ذہن میں کوندتا ہے کہ اتنے ناولوں کے بعد بھی غضنفر کے پاس زندگی کے کون سے ایسے انوکھے قصے بچ گئے تھے جنھیں وہ علاحدہ طور پر خودنوشت یا سوانحی ناول کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں؟

'دیکھ لی دنیا ہم نے' کا نام غضنفر نے اپنے استاد شہریار کے اس مشہور شعر سے اخذ کیا ہے:

جستجو جس کی تھی، اس کو تو نہ پایا ہم نے
اس بہانے سے مگر دیکھ لی دنیا ہم نے

غضنفر نے اپنے ناول فسوں کا عنوان بھی شہریار کے شعر سے ہی منتخب کیا تھا۔ شہریار کے پیش کردہ شعر کی تہہ داری کو چھوڑیے اور دوسرے مصرعے کی منطق پر غور کیجیے تو سمجھ میں آ جائے گا کہ غضنفر نے یہ خودنوشت آخر کار کیوں

حاصل کی۔ ان کی ندویت اور علمیت دونوں اتنی بلند ہیں کہ فرزندانِ ندوہ میں سے شاید کسی کو بھی ان کے مقابلے میں رکھا نہیں جا سکتا۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ مولانا سید سلیمان ندوی انتہائی اعلیٰ درجہ کا تحقیقی ذوق رکھتے تھے۔ پورے اعتماد کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ مؤرخانہ تحقیق کا اتنا بلند ذوق رکھنے والا ندوہ نے کوئی دوسرا پیدا نہیں کیا۔

اسی طرح مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں اپنی ساری علمی اور تحقیقی صلاحیتوں کو جمع کر کے ایک کتاب لکھی جس کا نام 'حیاتِ شبلی' ہے۔ یہ کتاب تقریباً ایک ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور 'محققانہ سوانح عمری' کی بے نظیر مثال ہے۔ اس کتاب میں مولانا سید سلیمان ندوی نے مولانا شبلی نعمانی اور ندوہ کے تعلق کے بارہ میں اس قدر محققانہ مواد فراہم کر دیا ہے کہ بلا مبالغہ اس کتاب کو اس عنوان پر 'قولِ فیصل' کہا جا سکتا ہے۔

ایسی ایک کتاب وجود میں آنے کے 20 برس بعد ایک کتاب میں شائع ہوتی ہے. جس کا نام ہے 'سیرت مولانا محمد علی مونگیری' اس کتاب میں صریح طور پر مولانا شبلی نعمانی اور ندوہ کے تعلق کے بارہ میں اس سے مختلف تصویر پیش کی جاتی ہے جو 'حیاتِ شبلی' میں کھینچی جا چکی ہے۔ سید صاحب کے مقابلہ میں ایک 'طفلِ مکتب' کو یہ جسارت کیوں ہوئی۔ کیا اس لیے کہ وہ مسئلہ زیر بحث سے زیادہ واقف تھا۔ ظاہر ہے کہ اس کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا، کیا 20 برس بعد کوئی ایسا تحقیقی مواد مل گیا تھا جس سے صورتِ حال پر نئی روشنی پڑتی تھی، کتاب کے مطالعہ سے یہ بھی ثابت نہیں ہوتا، کیا آسمان سے کوئی غیبی اشارہ ہوا تھا جس کے اعتماد پر یہ جسارت کی گئی ہے۔ کتاب میں اس کا دعویٰ بھی نہیں کیا گیا ہے۔

اگر ان میں سے کوئی بات نہیں ہے اور یقیناً نہیں ہے تو میں سمجھنے سے قاصر ہوں کہ آخر اس جسارت کا مطلب کیا ہے؟ اگر اس جسارت کو جائز سمجھ لیا جائے تو پھر علمی تحقیق کے کوئی معنی نہیں رہتے، کسی بات کا اعلیٰ ترین دلائل سے ثابت ہو جانا یہ معنی نہیں رہتا کہ اس کو مان لیا جائے اور اس کے مقابلہ میں زبانیں خاموش ہو جائیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہے کہ علم و تحقیق کے نام سے جو کچھ دنیا میں کام ہو رہا ہے وہ سب بالکل بے کار ہے۔ کیوں کہ کوئی بڑی سے بڑی تحقیق کسی سطحی ذہن کے لیے اس راستہ کو بند نہیں کرتی کہ وہ قلم کاغذ لے کر کچھ کالی لکیریں بنائے اور اس کو کاتب سے لکھوا کر ایک کتاب کی شکل میں چھاپ دے اور بے تکلف بیچنا شروع کر دے۔ اگر علمی دنیا میں حلت و حرمت کا کوئی قانون ہو تو ایسی جسارتوں کو یقینی طور پر حلال کی فہرست میں نہیں رکھا جا سکتا۔ (ہفت روزہ الجمعیۃ، نئی دہلی، 23 فروری 1968ء، صفحہ: 16-15)

...

دیکھ لی دنیا ہم نے

صفدر امام قادری

(پٹنہ، بہار)

غضنفر کی بنیادی حیثیت بے شک ناول نگار کی ہے اور دوسری اصناف میں ان کی گونا گوں خدمات کے باوجود انھیں دنیا ناول نگار کے طور پر ہی پہچانتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہو کہ انھوں نے جب اپنی خودنوشت شایع کرنے کا ارادہ کیا تو اسے 'سوانحی ناول' کے ناشرانہ الفاظ کے ساتھ پیش کرنے کی ایک سہولت ڈھونڈ لی۔ شاعری کی جدید و قدیم صنفوں کے ساتھ خاکہ نگاری اور تعلیم و تدریس کے موضوع سے تنقید و تحقیق ان کے دوسرے ایسے میدان ہیں جہاں وہ ہزارہا صفحات پیش کر چکے ہیں۔

50 برس سے زیادہ مدت سے غضنفر شعر و ادب کے میدان میں مستقل مزاجی کے ساتھ مصروفِ کار رہے ہیں اور ان کی طویل و مختصر کتابوں کی تعداد 25 سے تجاوز کر چکی ہے۔ ادب کی ہر صنف اگرچہ ذات و کائنات کے تجربات کے بغیر بے اعتبار ہوتی ہے مگر ناول کے بارے میں تو سب مانتے ہیں کہ مطالعۂ کائنات اس کا حقیقی مرکزہ ہے۔ غضنفر نے ایک دو نہیں کُل نو ناول تحریر کیے؛ جن میں سے چند خاصی شہرت کے حامل ہوئے۔ قصہ گوئی میں حقیقت اور تخیل کی ایک حسین آمیزش ہوتی ہے جسے راجندر سنگھ بیدی نے 'جھوٹ سچ' کی اصطلاح سے واضح کیا تھا۔

اب یہ سوال ہمارے ذہن میں کوندتا ہے کہ اتنے ناولوں کے بعد بھی غضنفر کے پاس زندگی کے کون سے ایسے انوکھے قصّے بچ گئے تھے جنھیں وہ علاحدہ طور پر خودنوشت یا سوانحی ناول کے طور پر پیش کرنا چاہتے ہیں؟

'دیکھ لی دنیا ہم نے' کا نام غضنفر نے اپنے استاد شہریار کے اِس مشہور شعر سے اخذ کیا ہے:

جستجو جس کی تھی، اس کو تو نہ پایا ہم نے
اس بہانے سے مگر دیکھ لی دنیا ہم نے

غضنفر نے اپنے ناول فسوں کا عنوان بھی شہریار کے شعر سے ہی منتخب کیا تھا۔ شہریار کے پیش کردہ شعر کی تہہ داری کو چھوڑیے اور دوسرے مصرعے کی منطق پر غور کیجیے تو سمجھ میں آ جائے گا کہ غضنفر نے یہ خودنوشت آخر کار کیوں

لکھی اور نرے ناول کے بجائے 'آپ بیتی' کے طور پر اسے کیوں کر پیش کیا؟ زندگی کی جو سات دہائیاں گزریں، انھیں دنیا دیکھنے کا بہانہ اگر غضنفر نہ سمجھتے تو ایسے نام کو اپنی خودنوشت کے لیے شاید ہی وہ منتخب کر پاتے!

ناول لکھتے وقت اس بہانے کی ضرورت نہیں ہوتی، اس لیے بھانت بھانت کے کردار سجتے چلے گئے مگر خودنوشت کے مرحلے میں اپنے مرکزی کردار کو قائم کرنا اور پھر اس کے آس پاس ایک جمِ غفیر کا کھڑا کرنا قصہ نگار کے لیے ایک ایسا مرحلۂ امتحان رہا ہوگا جب تخیل کی کارسازی سے خود کو الگ کر کے کسی بہانے سے دیکھی ہوئی دنیا کی ایک حقیقی اور تفتیشی رپورٹ پیش کرنے کا فریضہ متعین ہو جائے۔

336 صفحات کی اس خودنوشت میں مصنف نے ڈیڑھ صفحے کا رسمی 'آغازِ قصہ' شامل کیا ہے۔ چار صفحات پر مشتمل سید محمد اشرف کے تاثرات کے علاوہ یہ کتاب جو ایک بار زندگی کی کہانی کی گرہیں کھولنا شروع کرتی ہے تو انجامِ کلام تک یہی تسلسل برقرار رہتا ہے۔ درمیان میں چند واقعات کے بیچ ایسا کوئی نشان موجود ہے جس سے یہ سمجھا جا سکے کہ زماں و مکاں کی کچھ تبدیلی ہو رہی ہے ورنہ یہ کتاب ایک بار شروع ہوتی ہے تو آخری صفحے تک رواں دواں رہتی ہے۔ ابواب بندی سے ارادتاً گریز کا شاید یہی مقصد ہو کہ علمی دستاویزات کی پر تکلّف فضا نہ قائم ہو جائے۔ حالاں کہ خود غضنفر کے کئی ناولوں میں ابواب کا تکلّف موجود ہے۔

قارئین کو ایسی ابواب بندی اور فہرست سازی سے ایک ذرا سہولت پیدا ہو جاتی ہے مگر ہمارے عہد کے اس معتبر فکشن نویس کو اپنی حقیقی قصہ گوئی پر اتنا اعتماد حاصل ہے کہ وہ قاری کو ایک ایسے دریا میں اتار دیتا ہے جہاں بہاؤ اور روانی اپنے آپ منزل تک پہنچا دینے کے لیے مستعد ہیں۔

اسلوبیاتی مشق اور زبان و بیان پر قدرت نے غضنفر کو یہ طویل قصہ پیش کرنے کے لیے بھی اکسایا ہوگا اور انھوں نے من ہی من یہ ٹھان لیا ہوگا کہ کون ہے جو ہمارے قصّے کو اسی ترتیب اور اہتمام سے پڑھے بغیر رہ جائے! ہر فن پارے میں اگر مصنف کا امتحان ہوتا ہے تو ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہر مصنف اپنی کتاب میں بار بار اپنے قارئین کا امتحان بھی لیتا رہتا ہے۔ غضنفر نے بھی اس تحریر مسلسل کو پیش کر کے پڑھنے والوں کا امتحان لیا ہے اور اپنی فن کاری کے سلسلے سے داد طلب نگاہوں سے دیکھا ہے۔

عام طور سے کچھ خودنوشتیں اپنے چٹخارے کی وجہ سے زیر بحث ہو جاتی ہیں۔ تخلیقی فن کار لکھے تو زیبِ داستاں کے نہ جانے کتنے وسائل اسے اپنے آپ میسر آجاتے ہیں۔ زبان دانی اور تخیل کے پروں سے اُڑنا ایک آسان راستہ

ہے۔ یہیں حقائق سے گریز اور بیان میں ملمع کاری کا عمل شروع ہو کر 'یادوں کی برات' کا طور پیدا ہو جاتا ہے۔ غضنفر نے ناکام خودنوشتوں کے احوال دیکھے تھے، اس لیے اس پوری خودنوشت میں صاف، سادہ اور غیر آرائشی بنیادوں پر زبان اور قصّے کو قائم کیا گیا ہے۔

واقعات کی پیش کش میں نوے فیصدی سے زیادہ توصیفی اور تعریفی رُخ پیشِ نظر رکھا۔ محض دس فی صد ایسے واقعات ملیں گے جہاں کوئی تنقیدی یا منفی رُخ اپنایا گیا ہے۔ اس میں بھی اجمال زیادہ ہے اور صراحت سے گریز کے آداب بالارادہ سامنے آئے ہیں۔ اس طرح سے یہ خودنوشت اپنی اور دوسروں کی نیکی کا گوشوارہ بھی ہے۔ غضنفر کے خاکوں میں بھی شخصیت کے سلسلے سے تنقیدی پہلو صرف اشارے اور کنایے سے ہی سامنے آتے ہیں۔ کم و بیش یہی رویہ خودنوشت میں بھی موجود ہے۔

غضنفر نے اپنی جو زندگی اس خودنوشت میں پیش کی ہے، وہ بالعموم سادہ ہے۔ ان کے مزاج میں پیچیدگیاں بھی کم سے کم ہیں، اس لیے اس خودنوشت میں پوشیدہ عناصر کے ادھیڑنے میں ان کی زیادہ توجہ نہیں ہے۔ جب کہ اس کے برخلاف اشخاص میں ممکن حد تک خوبیوں کا کوئی پہلو تلاش کر لینے کا ایک خاص جذبہ ہے جس سے یہ خودنوشت ایک علاحدہ تہذیبی بنیاد پر خود کو کامیابی کے ساتھ قائم کرتی ہے۔ اس لیے جو اشخاص چٹخارہ تلاش کر کے خودنوشتوں کے مابہ النزاع بننے دینے کے خوگر ہوتے ہیں، انھیں یہاں مایوسی ہاتھ لگے گی۔ غضنفر نے اپنی شخصیت کی طرح ہی سادہ زبان و بیان میں اپنی خودنوشت کو اس طرح پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیابی پائی جیسے کسی ناول کے کردار کا ایک سادہ سا مگر طویل بیان انھیں صفحہ قرطاس پر اُتارنا ہے۔

سید محمد اشرف نے اچھی خودنوشت کی تعریف اس کتاب کے پیشِ لفظ میں اس طرح کی ہے: 'ایک اچھی خودنوشت کا غالباً یہ بھی کمال ہوتا ہے کہ وہ سرتاپا صرف مصنف کے ذکر سے گراں بار نہیں ہوتی بلکہ زندگی کی راہ میں آنے والے تمام انسان اس میں حصہ پاتے ہیں۔'

واقعتاً یہ خودنوشت اجتماعی زندگی کی تصویروں کے ساتھ اپنا وجود مستحکم کرتی ہے۔ یہ بحث تو بہت پرانی ہے کہ فرد سے سماج ہے یا سماج سے فرد؛ مگر غضنفر نے اپنی خودنوشت میں جس طرح خود کو اور آس پاس کی زندگیوں کو پیش کیا ہے، یہ یقین ہو جاتا ہے کہ وہ سماج سے فرد کی شناخت کے مدعی ہیں۔ ہر چند خودنوشت انفرادی زندگی کا شناخت نامہ ہوتی ہے مگر غضنفر نے خود کو سماجی زندگی اور اجتماعی سرگرمیوں کا ایک حصہ تصور کیا اور اسی طور پر اپنی شناخت کے لیے

واقعات اور کرداروں کی تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔ ایسی خود نوشتوں کا دائرہ کار وسیع تر ہو جاتا ہے کیوں کہ یہاں لکھنے والے میں ایسی کوئی لازمی ضد نہیں ہوتی کہ وہ ہر حال میں خود کو مثالی زندگی قرار دے یا بہ ذاتِ خود ہیرو کی شکل میں ابھر کر سامنے آئے۔ اس کے برخلاف غضنفر کا عمومی طور تو یہ رہا ہے کہ وہ کارزارِ حیات کے سینکڑوں چہروں کو اُن کے افکار و اعمال کے حوالے سے صفحۂ قرطاس پر اتارتے چلیں۔ اس مرحلے میں وہ دانش ورانہ چالاکی بھی ان کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتی جس کے مرتکب بہت سارے آپ بیتی نگار ہوتے رہے ہیں کہ خود سے معتبر افراد کو بالارادہ اپنے سامنے نہیں لایا جائے یا اپنے ہم سر اور ہم عصر سامنے ہوں تو ان کے کرداروں کو کچھ اس طرح سے مسخ کر دیا جائے کہ اپنے آپ صاحبِ تصنیف کی شخصیت قد آور، اور نکلتی ہوئی معلوم ہو۔

غضنفر نے اپنے اساتذہ، ہم جماعت، رفقائے کار اور زندگی کے الگ الگ موڑ پر ملنے والے افراد کو بار بار اور کبھی تفصیل کے ساتھ بھی تذکرے کا حصہ بنایا ہے مگر مقدور بھر ان کی یہ کوشش رہی ہے کہ سب کی اسی انداز کی اور حقیقی تصویریں سامنے آئیں جس طرح اصل میں وہ اس خاص موقعے سے ان کے پیشِ نظر رہیں۔

غضنفر نے خود نوشت کا آغاز اپنی مہارتِ قصہ گوئی کے ساتھ کیا ہے۔ تجسس اور تحیّر کا ایسا مرکب تیار کیا ہے کہ پڑھنے والا اس کے داخل میں اُترے بغیر رہ نہیں سکتا۔ کمال یہ ہے کہ زندگی کا وہ سچا واقعہ تھا مگر اس میں ایسی افسانویت اپنے آپ موجود رہی ہے کہ کسی رنگ آمیزی کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ناول نگار کی حیثیت سے ان کی مہارت بس اسی قدر یہاں کام آسکتی تھی کہ اپنی داستانِ حیات وہ اسی مقام سے شروع کریں؟ ہر چند کہ وہ فکشن نہیں لکھ رہے تھے مگر انھیں معلوم تھا کہ ان کے خاص پڑھنے والوں کو خود نوشت کے داخل میں اتارنے کے لیے کسی جادو گھر کی سیڑھی چاہیے اور انھوں نے زندگی کے اسی سچے واقعے سے اپنی داستانِ حیات شروع کر کے یہ بتا دیا کہ کوئی مشّاق لکھنے والا اپنے پڑھنے والوں کو کس طرح خاموشی کے ساتھ اپنے نگار خانے کا حصہ بنا لیتا ہے۔

سچی بات تو یہ بھی ہے کہ اس کے بعد انھوں نے کوئی ایسا افسانہ نما واقعہ بھی اس کتاب میں شامل نہیں کیا اور نہ ہی غیر ضروری طور پر پڑھنے والوں کو حقیقت اور افسانوی حقیقت کی پیچیدہ مگر متضاد راہوں میں الجھنے کے لیے مجبور کیا۔ زندگی کی ڈور جہاں سے ان کی پکڑ میں آ گئی، وہاں سے لے کر اپنی سبک دوشی اور اس کے آس پاس کے واقعات اور حجِ بیت اللہ سے مشرف ہونے تک یہ زندگی اپنے آپ پھیلتی چلی گئی۔

اس خود نوشت میں پڑھے لکھے اشخاص کی ایک بھیڑ جمع ہے۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے اساتذہ، پرانے طلبا

جو بعد میں صف اساتذہ میں شامل ہوئے اور علی گڑھ سے تعلق رکھنے والے بھانت بھانت کے کردار اپنی سچائی اور حقیقی تصویروں کے ساتھ نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ ابتدائی اور تشکیلی زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد میں غضنفر نے اپنے والد اور چچا کے علاوہ چند مقامی چہروں پر توجہ دی ہے۔ والد اور چچا کی زندگی اور ان کے سائے میں غضنفر کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کے واقعات قدرے تفصیل سے قلم بند ہوئے ہیں۔ حقیقت میں یہی دونوں اس خودنوشت میں سب سے مفصل جگہ پانے میں کامیاب رہے ہیں۔

ملازمت کے دوران غضنفر علی گڑھ، سولن (ہماچل پردیش)، لکھنؤ، پٹیالہ، میسور اور دہلی جیسے شہروں میں مختصر اور طویل مدت تک قیام پذیر رہے۔ ان اداروں اور شہروں سے متعلق افراد کے احوال بھی حسبِ ضرورت اختصار اور تفصیل کے ساتھ درج کیے گئے ہیں۔ ہر جگہ ادیبوں، شاعروں اور ادبی جلسوں کے معاملات سامنے آجاتے ہیں۔ غضنفر کا زیادہ اٹھنا بیٹھنا بھی اسی جمیعتِ انسانی کے بیچ رہا ہے۔ اس لیے یہ طبقہ اس خودنوشت میں چھایا ہوا ہے۔ تھوڑے بہت ایسے کردار یہاں موجود ہیں جو دوسرے شعبۂ حیات سے تعلق رکھتے ہیں ورنہ نوے فیصدی سے زیادہ افراد تعلیمی اور بالخصوص ادبی رشتے سے اس کتاب کا حصہ بنے ہیں۔

غضنفر افسانہ نگار اور ناول نگار تو ہیں ہی مگر وہ باضابطہ طور پر خاکہ نگار بھی ہیں۔ 'سرخ رو'، 'روئے خوش رنگ' اور 'خوش رنگ چہرے' نام سے ان کے خاکوں کے تین مجموعے اب تک شایع ہو چکے ہیں۔ اس فن میں مہارت کا استعمال وہ اشخاص کو پیش کرتے ہوئے جگہ جگہ بڑے سلیقے سے کرتے ہیں۔ ڈاکٹر نسیم عالم، نسیم قریشی، نادر علی خاں، شہریار، سعیدالدین مینائی، سید محمد امین، محمد زاہد، رشید قریشی، جاوید حبیب، کرنل یونس، خورشید احمد، طارق چھتاری، شافع قدوائی، محمد جمال، شکیب نیازی، محسن خاں وغیرہ کا مختلف شہروں اور ملازمتوں کے سلسلے سے غضنفر نے جس طرح تفصیلی تذکرہ کیا ہے اور ان کے پراثر مرقعے جس اہتمام سے روشن ہوئے ہیں، یہ اس وقت تک ممکن نہیں تھا اگر لکھنے والے کے پاس خاکہ نگاری اور ناول نویسی دونوں کے حربے ایک ساتھ نہ میسر آئے ہوتے۔ یہ مرقعے نہ صرف یہ کہ دل چسپ ہیں بلکہ ان کی رنگارنگ کیفیتوں سے غضنفر کی ایک بھرپور شخصیت ہمارے سامنے آتی ہے۔ ان کی وجہ سے یہ خودنوشت حقیقتاً ایسے کارخانۂ قدرت میں تبدیل ہوگئی ہے جہاں زندہ عجائب گھر کا بھی گمان ہوتا ہے۔

ان اشخاص میں سے بہت سارے آج ہمارے بیچ موجود ہیں، کچھ ماضی قریب میں ہم سے بچھڑ گئے، کچھ خوش وخرم ملتے ہیں اور کچھ صبر آزمائی کی چکی میں پس کر نہ جانے کہاں بکھر گئے۔ کچھ تو ایسے ہیں جو اقبال کے لفظوں میں

'درد وداغ وجستجو وآرزو' کا پیکر معلوم ہوتے ہیں۔ ان مرقعوں کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے، اس سے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ غضنفر اشخاص کو ان کی پیچ در پیچ کیفیتوں کے ساتھ اور ان کی تمام تر رنگا رنگیوں کے باوصف اپنی خودنوشت اور اپنی زندگی کے دائرہ کار کو توسیع دینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

غضنفر نے اس خودنوشت میں خود کو سماجی یا سیاسی مفکر یا دانشور کے طور پر ابھرنے کے لیے کوئی موقع نہیں تلاش کیا۔ ان کے ناول 'دویہ بانی'، 'فسوں'، 'شوراب'، 'مانجھی' اور 'وش منتھن' وغیرہ میں ملک اور دنیا کے بارے میں سلجھے ہوئے افکار پیش کیے گئے ہیں۔ ان کے بعض افسانوں میں بھی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کو بہ غور ملاحظہ کرتے ہیں۔ خودنوشت لکھتے ہوئے شاید انھیں اس کا احساس بھی نہ ہوا ہو کہ اس موقعے سے انھیں اپنے فلسفۂ زندگی اور حیات و کائنات کے نظریات پر بھی روشنی ڈالنی چاہئے۔

اکثر خودنوشتوں میں اشخاص اور مقامات خصوصی توجہ کے حق دار ہوتے ہیں۔ مگر اتنے بڑے تخلیقی فن کار سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ سوا تین سو صفحات کی کتاب لکھتے ہوئے وہ اپنے کھلے افکار اور زمانے کے سلسلے سے واضح نتائج کا اظہار نہ کرے۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز، میسور کے تعلیمی اور انتظامی ڈھانچے کے بارے میں جگہ بہ جگہ غضنفر نے جو مشاہدات درج کیے ہیں، ان کے احتسابی رویے اور نظامِ تعلیم کے بارے میں سمجھی ہوئی فکر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ تقرری کے طور طریقے اور پیچ وخم کو بھی انھوں نے مختلف جگہوں پر واضح کرنے میں کامیابی پائی ہے۔ حق داروں کی حق تلفی اور نقلی امیدواروں کی پشت پناہی پر انھوں نے ماتم بھی کیا ہے۔

تعلیم، تحقیق اور تدریس کے ساتھ ساتھ عمومی ماحول اور اخلاقی صورتِ حال کی پامالی پر غضنفر غم زدہ دکھائی دیتے ہیں۔ علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ، دونوں اداروں کے افراد کے معیارِ اخلاق پر جہاں جہاں انھوں نے سوالیہ نشانات لگائے ہیں، وہ مقامِ فکر ہیں اور ان کے تدارک کے بغیر ہمارے ادارے منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔ غضنفر نے اپنی خودنوشت میں ایسے اشارے تلخی سے کم اور سوزِ انسانی اور دردمندی کے ساتھ زیادہ پیش کیے ہیں۔

علی گڑھ، لکھنؤ، ہماچل پردیش، پٹیالہ اور دہلی کے ساتھ ساتھ بہار کے افراد کی جو تحلیلِ نفسی ان کی اس خود نوشت میں موجود ہے، اسے اس بات کے ثبوت کے لیے پیشِ نظر رکھنا چاہئے کہ غضنفر کس طرح مدبرانہ اور دانش ورانہ انداز سے اپنے عہد اور اس کی بدلتی ہوئی زندگی کا محاسبہ کرتے ہیں۔

غضنفر ایک کثیر التصانیف فن کار ہیں اور ہمہ دم مصروفِ تصنیف نظر آتے ہیں۔ گذشتہ 30 برسوں کا حساب بٹھائیے تو ہر برس ایک کتاب کا تناسب قائم ہوتا ہے۔ غیر مطبوعہ اور زیر ترتیب کتابیں اس سے الگ ہیں۔ نثر و نظم کی اکثر معتبر صنفوں میں انھوں نے اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ شاعری کی اصطلاح کا پورے ادب پر اطلاق کریں تو انھیں مکمل طور پر قادر الکلام کہہ سکتے ہیں۔ اگر چہ ان کی شہرت اور قبولِ عام کے تعلق سے پورے اردو معاشرے میں ایک ہموار رائے ہے اور معاصر ناول نگاروں میں انھیں صفِ اوّل میں شامل کیا جاتا ہے مگر ان کی زبان اور اسلوب کے حوالے سے وہ سنجیدہ اور موزوں گفتگو شروع نہیں ہوئی ہے جس کا انھیں حق پہنچتا تھا۔

معاصر ناول نگاروں میں حسین الحق اور سید محمد اشرف کے یہاں اسلوبیاتی قمقمے آزادہ روی سے روشن نظر آتے ہیں مگر اسلوبیاتی رنگا رنگیوں اور بیان کے بوقلموں ذائقوں کے لیے ہمارے عہد میں غضنفر سے بڑھ کر شاید ہی کوئی ہم عصر نثر نگار سامنے آ سکتا ہے۔

سادہ اور بے لوث نثر تو بنیاد کی اینٹ ہے ہی مگر استعاراتی زبان، شاعرانہ لطف و انبساط سے لیس زبان، مفکّرانہ اور مدبرانہ اسلوب، طنزیہ و ظریفانہ بیانیہ اور علمی و تنقیدی کون سی ایسی نثر ہے جس کے نمونے مختلف واقعات کے بیان میں حسبِ ضرورت غضنفر نے اس خودنوشت میں پیوست نہیں کر رکھا ہو۔ یہ درست ہے کہ آج محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی یا ابوالکلام آزاد جیسی زبان لکھنے والے کہاں سے لائے جائیں مگر ہمارے عہد میں غضنفر واحد ایسے نثر نگار ہیں جو اردو نثر کے اصحابِ گذشتہ کو اپنے مزاج میں انگیز کرتے ہوئے ساحرانہ اسلوبِ بیان وضع کرنے کے لیے کوشاں رہے ہیں۔

اس خودنوشت میں ان کی اسلوبیاتی رنگا رنگی کے نقش کہیں واضح اور کہیں مدھم دیکھے جا سکتے ہیں۔ سید محمد اشرف نے ان کے ہم قافیہ اور ہم معنی فقروں کی داد دے کر پڑھنے والوں کو غضنفر کی نثر کے اجزائے ترکیبی کے بارے میں توجہ کرنے کا ایک شعور فراہم کیا ہے۔ مجھے توقع ہے کہ 'دیکھ لی دنیا ہم نے' کے مطالعے کے بعد ناقدین غضنفر کے اس اسلوبیاتی نگار خانے میں نہ صرف یہ کہ لطف حاصل کرنے کے لیے اُتریں گے بلکہ یہاں سے روشنی لے کر ان کے ناولوں، خاکوں اور دوسری تنقیدی کتابوں کے امتیازی پہلوؤں تک پہنچیں گے اور تب انھیں یہ پتا چل سکے گا کہ ہمارے عہد میں ایک صاحبِ اسلوب اور ایک کامل انشا پرداز تھا مگر ہم نے اسے صرف ناول نگار یا نقاد یا شاعر سمجھا اور اس کے نگار خانے سے سرسری گزر گئے حالاں کہ وہیں ایک جہانِ دیگر موجود تھا۔

'درد و داغ و جستجو و آرزو' کا پیکر معلوم ہوتے ہیں۔ ان مرقعوں کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے، اس سے یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ غضنفر اشخاص کو ان کی پیچ در پیچ کیفیتوں کے ساتھ اور ان کی تمام تر رنگارنگیوں کے باوصف اپنی خودنوشت اور اپنی زندگی کے دائرہ کار کو توسیع دینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

غضنفر نے اس خودنوشت میں خود کو سماجی یا سیاسی مفکر یا دانشور کے طور پر ابھرنے کے لیے کوئی موقع نہیں تلاش کیا۔ ان کے ناول 'دو یہ بانی'، 'فسوں'، 'شوراب'، 'مانجھی' اور 'وش منتھن' وغیرہ میں ملک اور دنیا کے بارے میں سلجھے ہوئے افکار پیش کیے گئے ہیں۔ ان کے بعض افسانوں میں بھی یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ سیاسی اور سماجی تبدیلیوں کو بہ غور ملاحظہ کرتے ہیں۔ خودنوشت لکھتے ہوئے شاید انھیں اس کا احساس بھی نہ ہوا ہو کہ اس موقعے سے انھیں اپنے فلسفۂ زندگی اور حیات و کائنات کے نظریات پر بھی روشنی ڈالنی چاہیے۔

اکثر خودنوشتوں میں اشخاص اور مقامات خصوصی توجہ کے حق دار ہوتے ہیں۔ مگر اتنے بڑے تخلیقی فن کار سے یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ سوا تین سو صفحات کی کتاب لکھتے ہوئے وہ اپنے کھلے افکار اور زمانے کے سلسلے سے واضح نتائج کا اظہار نہ کرے۔ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ، سنٹرل انسٹی ٹیوٹ آف انڈین لینگویجز، میسور کے تعلیمی اور انتظامی ڈھانچے کے بارے میں جگہ بہ جگہ غضنفر نے جو مشاہدات درج کیے ہیں، ان کے احتسابی رویے اور نظامِ تعلیم کے بارے میں سمجھی ہوئی فکر کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ تقرری کے طور طریقے اور پیچ و خم کو بھی انھوں نے مختلف جگہوں پر واضح کرنے میں کامیابی پائی ہے۔ حق داروں کی حق تلفی اور نقلی امیدواروں کی پشت پناہی پر انھوں نے ماتم بھی کیا ہے۔

تعلیم، تحقیق اور تدریس کے ساتھ ساتھ عمومی ماحول اور اخلاقی صورتِ حال کی پامالی پر غضنفر غم زدہ دکھائی دیتے ہیں۔ علی گڑھ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ، دونوں اداروں کے افراد کے معیارِ اخلاق پر جہاں جہاں انھوں نے سوالیہ نشانات لگائے ہیں، وہ مقامِ فکر ہیں اور ان کے تدارک کے بغیر ہمارے ادارے منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔ غضنفر نے اپنی خودنوشت میں ایسے اشارے تلخی سے کم اور سوزِ انسانی اور دردمندی کے ساتھ زیادہ پیش کیے ہیں۔

علی گڑھ، لکھنؤ، ہماچل پردیش، پٹیالہ اور دہلی کے ساتھ ساتھ بہار کے افراد کی جو تحلیلِ نفسی ان کی اس خودنوشت میں موجود ہے، اسے اس بات کے ثبوت کے لیے پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ غضنفر کس طرح مدبرانہ اور دانش ورانہ انداز سے اپنے عہد اور اس کی بدلتی ہوئی زندگی کا محاسبہ کرتے ہیں۔

غضنفر ایک کثیر التصانیف فن کار ہیں اور ہمہ دم مصروفِ تصنیف نظر آتے ہیں۔ گذشتہ 30 برسوں کا حساب بٹھائیے تو ہر برس ایک کتاب کا تناسب قائم ہوتا ہے۔ غیر مطبوعہ اور زیرِ ترتیب کتابیں اس سے الگ ہیں۔ نثر و نظم کی اکثر معتبر صنفوں میں انھوں نے اپنی خدمات پیش کی ہیں۔ شاعری کی اصطلاح کا پورے ادب پر اطلاق کریں تو انھیں مکمل طور پر قادر الکلام کہہ سکتے ہیں۔ اگر چہ ان کی شہرت اور قبولِ عام کے تعلق سے پورے اردو معاشرے میں ایک ہموار رائے ہے اور معاصر ناول نگاروں میں انھیں صفِ اوّل میں شامل کیا جاتا ہے مگر ان کی زبان اور اسلوب کے حوالے سے وہ سنجیدہ اور موزوں گفتگو شروع نہیں ہوئی ہے جس کا انھیں حق پہنچتا تھا۔

معاصر ناول نگاروں میں حسین الحق اور سید محمد اشرف کے یہاں اسلوبیاتی قمقمے آزادہ روی سے روشن نظر آتے ہیں مگر اسلوبیاتی رنگارنگیوں اور بیان کے بوقلموں ذائقوں کے لیے ہمارے عہد میں غضنفر سے بڑھ کر شاید ہی کوئی ہم عصر نثر نگار سامنے آسکتا ہے۔

سادہ اور بے لوث نثر تو بنیاد کی اینٹ ہے ہی مگر استعاراتی زبان، شاعرانہ لطف و انبساط سے لیس زبان، مفکّرانہ اور مدبرانہ اسلوب، طنزیہ و ظریفانہ بیانیہ اور علمی و تنقیدی کون سی ایسی نثر ہے جس کے نمونے مختلف واقعات کے بیان میں حسبِ ضرورت غضنفر نے اس خودنوشت میں پیوست نہیں کر رکھا ہو۔ یہ درست ہے کہ آج محمد حسین آزاد، شبلی نعمانی یا ابوالکلام آزاد جیسی زبان لکھنے والے کہاں سے لائے جائیں مگر ہمارے عہد میں غضنفر واحد ایسے نثر نگار ہیں جو اردو نثر کے اصحابِ گذشتہ کو اپنے مزاج میں انگیز کرتے ہوئے ساحرانہ اسلوبِ بیان وضع کرنے کے لیے کوشاں رہے ہیں۔

اس خودنوشت میں ان کی اسلوبیاتی رنگارنگی کے نقش کہیں واضح اور کہیں مدھم دیکھے جاسکتے ہیں۔ سید محمد اشرف نے ان کے ہم قافیہ اور ہم معنی فقروں کی داد دے کر پڑھنے والوں کو غضنفر کی نثر کے اجزائے ترکیبی کے بارے میں توجہ کرنے کا ایک شعور فراہم کیا ہے۔ مجھے توقع ہے کہ 'دیکھ لی دنیا ہم نے' کے مطالعے کے بعد ناقدین غضنفر کے اس اسلوبیاتی نگارخانے میں نہ صرف یہ کہ لطف حاصل کرنے کے لیے اُتریں گے بلکہ یہاں سے روشنی لے کر ان کے ناولوں، خاکوں اور دوسری تنقیدی کتابوں کے امتیازی پہلوؤں تک پہنچیں گے اور تب انھیں یہ پتا چل سکے گا کہ ہمارے عہد میں ایک صاحبِ اسلوب اور ایک کامل انشاپرداز تھا مگر ہم نے اسے صرف ناول نگار یا نقاد یا شاعر سمجھا اور اس کے نگارخانے سے سرسری گزر گئے حالاں کہ وہیں ایک جہانِ دیگر موجود تھا۔

غضنفر کی یہ خودنوشت موجودہ عہد کی ایک قابلِ ذکر، قابلِ مطالعہ اور زندگی بہ داماں کتاب ہے جس کے مطالعے سے بہت کچھ پایا جاسکتا ہے۔ یہ خودنوشت کے ساتھ ساتھ خاکہ نگاری اور قصہ نویسی کے اوصاف سے مستحکم ہوئی آپ بیتی ہے، اس لیے دوسری خودنوشتوں سے یہ مختلف اور زیادہ قابلِ توجہ کتاب ثابت ہوگی۔

...

Safdar Imam Quadri,
Department of Urdu,
College of Commerce, Arts and Science,
Patna-800020(Bihar)
Mob:9430466321, Email:safdarimamquadri@gmail.com
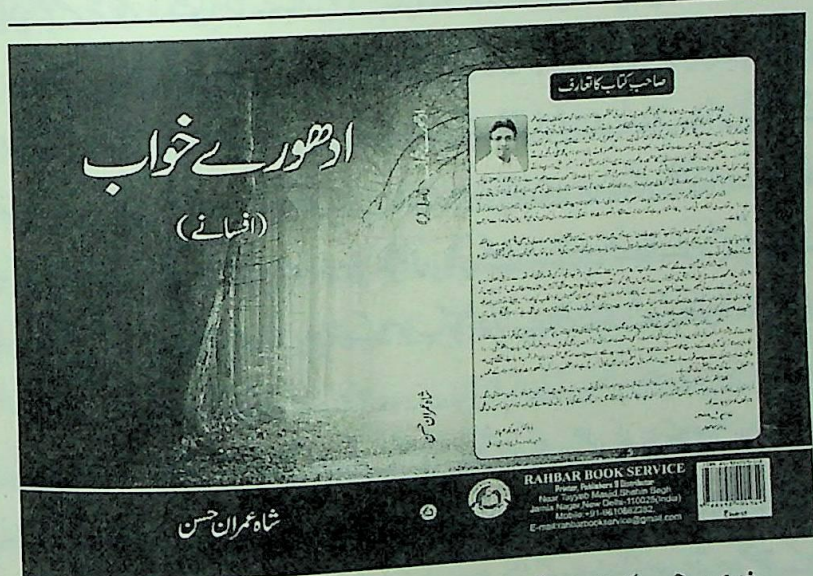
شاہ عمران حسن کے افسانوی مجموعہ 'ادھورے خواب' کے لیے رابطہ کریں:9810862382

'غبارِ حیات' کا ایک تجزیاتی مطالعہ

محمد علم اللہ
(نئی دہلی)

کہانیاں انسانی زندگی پر اثر انداز ہوتی ہیں، لوگ اسے سنتے یا پڑھتے ہوئے نہ صرف یہ کہ اس کے ساتھ خود کو وابستہ کر لیتے ہیں بلکہ دوسروں کے جذبات واحساسات اور دکھ سکھ کو اپنا سمجھ کر کبھی آنسو بہاتے ہیں تو کبھی خوش ہوتے ہیں۔ ایسا لکھنا سب کے نصیب میں نہیں ہوتا، مگر جو ایسا لکھتے ہیں وہ 'فن کار' ہوتے ہیں۔

عربی زبان کے ادیب ڈاکٹر عمر فروخ کی کہانی بھی کچھ ایسی ہی ہے جسے اردو کا جامہ ڈاکٹر شمس کمال انجم نے پہنایا ہے۔ یہ دراصل ایک ادیب، دانشور اور محقق کی خود نوشت ہے۔ اصل کتاب کا نام 'غبار السنین' ہے، اردو میں اسے 'غبارِ حیات' کا نام دیا گیا ہے۔ یہ 1980 سے 1982 کے درمیان لکھے گئے کالم کا مجموعہ ہے جو مصر کے معروف اخبار 'النہار' روزنامہ 'اللواء' اور بیروت سے شائع ہونے والے روزنامہ 'السفیر' میں سنیچر کے دن شائع ہوتا تھا۔ مصنف کے بقول:

'میں بہت دنوں سے ان مختصر کالموں کو لکھ رہا ہوں۔ دراصل انھیں میں نے اپنے مجلّہ 'الامانی' میں شائع کرنا شروع کیا تھا۔ اس مجلّے کو میں نے ڈاکٹر محمد خیر نوری، عارف ابوشفراء، محمد علی حرمانی، عبداللہ مشوق اور ذکی نقاش کے ساتھ مل کر جاری کیا تھا جو 1939ء سے 1941ء تک شائع ہوتا رہا، اس میں، میں نے ان کالموں میں سے الصدر الاعظم (1939/1/23)، کسری والحلاق (1939/2/3) صلوٰۃ الجمیل (1939/3/24) اور قریۃ النمل (1939/7/28) نامی کالم شائع کیے۔' (صفحہ: 21)

کتاب میں کیا ہے اس کے بارے میں مصنف کہتے ہیں: 'یہ کتاب میری زندگی کی تاریخ نہیں ہے بلکہ میری زندگی کے متفرق واقعات کا آئینہ ہے۔ ایسا آئینہ جو میرے نقش قدم کی تصویر کشی کرتا ہے۔' (صفحہ: 17)

کتاب کے مشمولات کے بارے میں اور ڈاکٹر شمس کمال انجم نے اس کو اردو میں کیوں پیش کیا ہے اس پر گفتگو کرنے سے قبل مناسب معلوم ہوتا ہے، یہ جان لیا جائے کہ ڈاکٹر عمر فروخ کون تھے اور ان کا تعارف کیا ہے؟

ڈاکٹر عمر فروخ (1906-1987) ایک لبنانی مصنف اور استاد تھے۔ ان کی پیدائش بیروت میں ہوئی تھی اور انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم سرکاری اور نجی اسکولوں سے حاصل کی تھی۔ انھوں نے 1919ء میں بیروت

میں امریکن یونیورسٹی کے ابتدائی اسکول میں داخلہ لیا۔ بیچلر آف سائنس کی ڈگری امریکن یونیورسٹی آف بیروت سے حاصل کی اور نابلس (فلسطین) کے النجاح نیشنل اسکول میں تاریخ اور طبعی جغرافیہ کے استاد کے طور پر کام کیا۔ انھوں نے 1937 میں جرمنی سے پی ایچ ڈی کیا تھا۔ انھیں عربی، ترکی اور فرانسیسی زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ دار المعلمین العالیہ اور دمشق یونیورسٹی میں وزیٹنگ پروفیسر کے ساتھ، المجمع العلمی العربی دمشق کے علاوہ مختلف علمی و ادبی اکیڈمیوں کے ممبر رہے۔ انھوں نے عربی زبان و ادب کے علاوہ فلسفہ اور اسلامیات پر درجنوں گرانقدر علمی سرمایہ چھوڑا ہے۔ 'غبار السنین' یعنی 'غبارِ حیات' بھی انھیں کتابوں میں سے ایک ہے۔

ڈاکٹر شمس کمال انجم نے اس کتاب کا خوبصورت، رواں اور سلیس ترجمہ کیا ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ مترجم خود ایک اچھے شاعر، مصنف اور محقق ہیں، زبان و ادب پر ان کی اچھی گرفت ہے، اس کا عکس بھی اس کتاب میں نظر آتا ہے۔ انھوں نے عربی کی بڑی وقیع اور اہم کتابوں کو اردو میں ترجمہ کیا ہے جب کہ درجنوں تالیفات وتصنیفات علمی دنیا کو دیے ہیں۔ فی الحال وہ بابا غلام شاہ بادشاہ یونیورسٹی راجوری، جموں وکشمیر میں پروفیسر ہیں۔

کتاب کے شروع میں تقریباً 40 صفحات پر مشتمل مترجم کے قلم سے وقیع مقدمہ ہے، جس میں مترجم نے خودنوشت کی روایت اور خصوصی طور پر عربی زبان وادب میں اس کی ابتدا اور تاریخی حوالے سے خودنوشتوں اور تذکروں پر فاضلانہ گفتگو کی ہے، جس سے نہ صرف سوانحی ادب پر ان کی گرفت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ اس بات کا بھی ادراک ہوتا ہے کہ کتنے مراحل سے گزرتے ہوئے اس فن کو شناخت ملی اور علم وادب کے کیسے کیسے شہ پارے کس طرح وجود میں آئے؟۔

مقدمہ کے بعد تقریباً گیارہ صفحات پر مشتمل 'غبارِ حیات: ایک تجزیاتی مطالعہ' کے عنوان سے ایک معلوماتی مضمون بھی شامل ہے جس میں ڈاکٹر شمس کمال انجم نے مختلف عناوین کے تحت کتاب پر تبصرہ اور تجزیہ کیا ہے جو ایک عام انسان کو کتاب پڑھنے پر ابھارتا ہے۔ یوں تو انھوں نے اس مضمون میں سلیقے سے کتاب کے ماحصل اور روح کو سمیٹ دیا ہے لیکن مکمل کتاب کا مطالعہ بھی کم دلچسپ اور معلوماتی نہیں ہے۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت اس کے مضامین کا مختصر ہونا ہے یعنی مصنف تین چار صفحے یا پھر زیادہ سے زیادہ پانچ سات صفحات میں اپنی بات سمیٹ دیتے ہیں۔ لکھنے کا انداز بھی چوں کہ واقعاتی اور داستانوی ہے، اس لیے قاری بوجھل بھی محسوس نہیں کرتا اور ایک نشست میں پوری کہانی پڑھ لیتا ہے اور پھر ایک کے بعد دوسری پھر تیسری، چوتھی، پانچویں پڑھتے ہوئے پوری کتاب ختم کر کے دم لیتا ہے اور پڑھنے کے

بعد اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

اس کتاب کی ایک اور بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں شامل تقریباً ہر واقعہ دل پذیر اور سبق آموز ہے۔ عام طور پر خودنوشتوں میں بات کو جس انداز سے بڑھا چڑھا کر اور رومانٹک انداز میں بیان کیا جاتا ہے، اس سے اس میں گریز کیا گیا ہے، جس سے کتاب کی حیثیت محض ادبی نہ ہو کر مقصدی ہوگئی ہے۔ خصوصاً نوجوانوں کے لیے تو یہ کتاب ایک اکسیر ہے۔

اپنی اسی کتاب میں ڈاکٹر عمر فروخ نے اپنے بچپن سے لے کر عمر کے ستر سال تک کی کہانی کو بڑے ہی خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ جس سے عربوں کے طرزِ معاشرت کے ساتھ ساتھ مغرب اور اہل مغرب کی بھی سماجی وسیاسی صورتحال کا پتہ چلتا ہے۔ متعدد جگہوں پر وہ عرب اور عجم کا موازنہ بھی کراتے ہیں، جس سے کتاب کی اہمیت دوچند ہو جاتی ہے۔ مثلاً ہٹلر کا زمانہ جسے انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اس کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتے ہیں:

'اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ معاملات کی ترتیب اور درستگی کو استبداد کہتے ہیں تو آپ یہ سمجھ لیں کہ جرمنی اس وقت استبداد کی بلندی پر تھا۔ مثال کے طور پر اگر بلغاریہ سے انڈے آجانا بند ہو جاتا یا کسی موسم میں جرمنی میں پنیر کا پروڈکشن کم ہو جاتا اور آپ کسی ایسی دوکان میں داخل ہوتے جہاں ایک ہی انڈا ہوتا یا ایک پاؤ پنیر ہوتی تب بھی آپ اس انڈے اور اس پنیر کو اسی قیمت میں خریدتے جس قیمت میں آپ نے کل یا اس سے پہلے خریدا تھا۔' (صفحہ:145)

کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے کس قدر تکلیف اور مشقت کی زندگی گذاری ہے۔ سماج میں لوگ عام طور پر ایک کامیاب انسان کی زندگی کے محض اس پہلو کو دیکھتے ہیں جو انھیں نظر آتا ہے، لوگ ماضی اور شہرت ونا موری سے قبل محنت ومشقت کے ان ایام کو بھول جاتے ہیں جس سے کوئی شخص گذر کر ایک شخصیت کا روپ لیتا ہے۔ ہمارے ملک کے سابق صدر اے پی جے عبدالکلام کی طرح مصنف کی ابتدائی زندگی بھی بڑی مشکلات سے بھری رہی۔ پیٹ پالنے کے لیے انھوں نے بیت الخلاء صاف کیا۔ اخبار فروخت کیا، ٹیوشن پڑھائے۔ لفافہ سازی کا کام کیا۔ چنانچہ عمر فروخ ایک جگہ فرماتے ہیں:

'عجیب بات یہ ہے کہ جب آپ محتاجی اور دولت وثروت کی بات کرتے ہیں تو زیادہ تر لوگوں کا خیال مال کی قلت وکثرت کی طرف ہی جاتا ہے۔ جب کہ حقیقی محتاجی لوگوں کے ذہن ودماغ میں پائی جانے والی محتاجی ہے نہ کہ ان کے جیب میں پائی جانے والی محتاجی۔' (صفحہ:90)

اس کتاب میں سیکھنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ تقریباً ساڑھے تین سو صفحات کی کتاب سے ساری چیزیں تو نقل نہیں کی جاسکتیں، تاہم مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ چیزوں کا ذکر ہو، تاکہ جو لوگ پوری کتاب نہیں پڑھ سکتے کم از کم اس مضمون سے ان کے پیغام کو پاسکیں۔

کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف تعلیم اور اس کی اہمیت پر بڑا زور دیتے ہیں چنانچہ ایک جگہ وہ کہتے ہیں:

'علم دراصل شائع شدہ کتابوں میں قید نہیں ہوتا، اسے کتاب فطرت سے بھی اخذ کیا جاسکتا ہے۔' (صفحہ:92)

اسی مضمون میں 'لفظوں کی تصویر کشی' عنوان سے گفتگو میں ایک جگہ فرماتے ہیں:

'جب میں یہ بات کہتا ہوں کہ ڈگری سے فی نفسہ کوئی فائدہ نہیں تو بہت سارے لوگ میری یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوتے ہیں جب کہ ڈگری تو دراصل صرف ایک کنجی ہے جس کے ذریعہ زندگی کا دروازہ کھولا جاتا ہے۔ اس کے کھل جانے کے بعد اس کنجی کی کوئی قیمت نہیں رہ جاتی۔ یہ بے کار ہو جاتی ہے۔' (صفحہ:93)

اساتذہ کے تعلق سے ایک جگہ فرماتے ہیں:

'حقیقت یہ ہے کہ تعلیم و تربیت اسکولوں کی عمارتوں میں حاضری کا نام نہیں ہے۔ نہ ہی تعلیم و تربیت استادوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کرنے کا نام ہے۔ تعلیم و تربیت یہ ہے کہ طلبہ کا اساتذہ کے ساتھ اختلاط ہو، ایک دوسرے کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ہو۔ اساتذہ طلبہ کی تعلیم و تربیت کا اسی طرح اہتمام کریں جس طرح باپ اپنے بچوں کی تعلیم و تربت کا اہتمام کرتا ہے۔' (صفحہ:97)

تربیت کے حوالے سے کچھ واقعات کا تذکرہ کرنے کے بعد جو والدین یا اساتذہ شاکی ہوتے ہیں کہ ان کی اولاد بگڑ گئی اس پر کہتے ہیں کہ:

'یہ فضول سی بات ہے کہ کھلے پن، اڈوانس منٹ اور موڈرن ازم کے نام پر ہم اپنے بچوں کو بیس سال چھوڑ دیں۔ وہ جو سمجھ میں آئے کریں۔ یا ان کے ساتھ دوسرے لوگ جو چاہیں کریں۔ پھر اس کے بعد ایک دن اس کے کسی کام پر ہم اس کی سرزنش کریں۔ میں یہ بات کہنا بھولنا نہیں چاہتا کہ 'قدوۂ حسنہ' تربیت کی پہلی بنیاد ہے۔ ہر بچے کے اہل خانہ کے لیے ضروری ہے کہ بچے کی موجودگی اور اس کی غیر حاضری دونوں حالات میں صحیح اخلاقیات کا مظاہرہ کریں۔ کیوں کہ باپ بچے سے چھپ کر؛ جو بھی حرکتیں کرتا ہے کسی نہ کسی دن بچہ انھیں جان ہی لیتا ہے۔'' (صفحہ:106)

کتاب میں اس زمانے کی ادبی چشمک اور معرکہ آرائی کا بھی ذکر ہے چنانچہ ایک جگہ مجمع اللغہ العربیہ

قاہرہ کے حوالے سے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ڈاکٹر طہٰ حسین نے ایک تجویز پیش کی جس میں انھوں نے مطالبہ کیا کہ عربی کے حروف تہجی کے ساتھ کچھ اور حروف کا اضافہ کیا جائے۔ مصنف نے دریافت کیا کہ آخر اس مطالبے کا سبب کیا ہے؟

ڈاکٹر طہٰ حسین نے دوٹوک لفظوں میں جواب دیا کہ اگر ہمارے یہاں یہ زائد حروف نہ ہوں گے تو ہم 'فیکٹر ہوجو' جیسے غیر عربی لفظ کو آخر کس طرح درست طریقے سے لکھ سکیں گے؟ مصنف کہتے ہیں:

'میں نے کہا فرض کریں اگر جن حروف کے اضافے کی تجویز آپ پیش کررہے ہیں اگر ان سے فرانسیسی زبان کے ناموں کا مسئلہ حل ہوجائے گا جو کہ درست نہیں ہے لیکن ایسی صورت میں ترکی، فارسی، انگریزی، جرمن، اسپانوی اور چینی زبانوں میں وارد ناموں کا مسئلہ کس طرح حل ہوگا۔ اور میں نے طہٰ حسین کی تجویز کے بجائے اپنی تجویز پر ووٹنگ کا مطالبہ کردیا۔ مگر ووٹنگ میں میری تجویز کو شکست ہوگئی۔

اس وقت عباس محمود عقاد اپنے بھاری بھر کم قد و قامت کے ساتھ کھڑے ہوئے اور اپنی پرسکون اور پختہ آواز میں گویا ہوئے: فلاں صاحب درست کہہ رہے ہیں ہمارے لیے جائز نہیں ہے کہ ہم عربی زبان میں اس طرح کا دروازہ کھولیں۔ ان سے کہا گیا یہ تجویز ابھی نہیں پیش کی گئی ہے بلکہ اس کمیٹی کی پیش کردہ ہے جس کے صدر طہٰ حسین ہیں۔ عقاد نے کہا اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟ ہم دوسری کمیٹی بنا لیتے ہیں۔

چنانچہ عقاد کی اس دفاعی تقریر کا فائدہ یہ ہوا کہ دوبارہ ووٹنگ ہوئی اور عربی حروف تہجی میں کچھ نئے حروف کی تجویز کو اس بار شکست حاصل ہوئی۔' (صفحہ: 229)

مصنف نے آگے لکھا ہے کہ حالاں کہ عقاد کے ساتھ ان کے تعلقات اچھے نہ تھے اور انھوں نے اپنے پرچے میں ان کے خلاف لکھا بھی تھا لیکن تہذیب اور ثقافت کی بات آئی تو انھوں نے ان کا ساتھ دیا اور ان کی وجہ سے عربی زبان ایک ایسی تجویز سے نجات پا گئی کہ اگر مجمع اللغہ العربیہ نے طہٰ حسین کی تجویز کو تسلیم کرلیا ہوتا تو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ اس تجویز کے کیا اثرات مرتب ہوتے اور کہاں تک ہوتے؟۔

کتاب میں ایک جگہ مسئلہ فلسطین کے حوالے سے بڑی خوبصورت بات نقل کی ہے۔ یہ بات انھوں نے 13 اکتوبر 1910ء میں شیخ احمد عباس ازہری کے اخبار 'الحقیقہ' میں شائع ایک فلسطینی قاری کی معرفت بیان کی ہے، صہیونیوں کی کوششوں اور ریشہ دوانیوں کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

'فلسطین میں رہائش اختیار کرنے پر ہمیں یہودیوں کو ملامت نہیں کرنی چاہیے۔ نہ ہی ان کی کوششوں اور کاوشوں پر تنقید کے تیر چلانے چاہئیں۔ بلکہ ہمیں ان فلسطینیوں کو ملامت کرنی چاہئیں جو خواب غفلت سے ابھی

بھی بیدار نہیں ہو رہے ہیں۔ زندگی کی یہ حقیقت ہے کہ زندگی میں کچھ غافل لوگ ہوتے ہیں اور کچھ باہوش، کچھ کوشش و کاوش کرتے ہیں اور کچھ سست اور کاہل ہوتے ہیں۔ اسی طرح کچھ ذہین ہوتے ہیں تو کچھ احمق، لیکن ان تمام سے زیادہ نقصان دہ وہ دشمن خدا ہوتے ہیں جو اپنی سر کی آنکھوں سے صبح کو طلوع ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں اور پھر بھی وہ اپنے بستروں پر پڑے ہوتے ہیں کیوں کہ وہ رات بھر شب بے داری کر رہے ہوتے ہیں۔ لہولعب میں سرمست ہوتے ہیں۔ جب کہ ان کا دشمن بڑی سنجیدگی سے جاگ رہا ہوتا ہے۔ جب یہ لوگ خواب غفلت سے بیدار ہوں گے اور دیکھیں گے کہ شر نے انھیں ہر سمت سے گھیر لیا ہے تو وہ چیخنا شروع کریں گے اور ہمیں معلوم نہیں ہو سکے گا کہ ان کی اس چیخ کا مقصد کیا ہے۔ کیوں کہ انھیں خود پتہ نہیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ کون سا راستہ اختیار کر رہے ہیں پھر وہ اپنی چیخ و پکار سے لوگوں کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں۔' (صفحہ:253)

کتاب سے کچھ خوبصورت اور کارآمد باتیں ملاحظہ فرمائیں۔ 'اگر آپ اپنے گھر میں خوش نہیں ہوں گے تو آپ کسی بھی جگہ خوش نہیں ہو سکتے۔ اگر آپ اپنے آپ میں خوش نہیں ہوں گے تو آپ دوسروں سے خوشیاں حاصل نہیں کر سکتے۔' (صفحہ:261)

'لوگ جب محرومی کا ذکر کرتے ہیں تو وہ عام طور سے مال و دولت کی قلت کو محرومی سمجھتے ہیں۔ یہ سوچ غلط ہے کیوں کہ انسان اپنی بہت ساری مادی ضرورتوں سے بے نیاز ہو کر بھی اچھی صحت، اچھی حالت اور اچھے مقام و مرتبے کا حامل ہو سکتا ہے۔ محرومی یہ ہے کہ انسان کو کوئی سوچ محاصل ہو مگر وہ اس سوچ کا درست استعمال کرنے سے قاصر ہو۔' (صفحہ:292)

'مختلف مذاہب کے لوگ اس وقت تک امن و امان کی زندگی باہم نہیں گذار سکتے ہیں جب تک کہ ان میں بہت سارے مسائل ہر اتفاق رائے نہیں ہو جاتا۔ ان کے اندر آپس میں مفاہمت نہیں ہو جاتی۔ بلا شبہ ڈائلاگ کرنے والے فریقین کے درمیان کبھی کبھی ڈائیلاگ کسی اچھی چیز پر جا کر ختم ہوتا ہے۔' (صفحہ:300)

'اشیاء کی ظاہری اور باطنی چیزوں کی معرفت کے لیے ضروری نہیں ہے کہ آپ انتظار کریں یہاں تک کہ آپ کے کاندھوں پر آپ کی زندگی کا غبار جمع ہو جائے بلکہ دوسروں کے کاندھوں پر جمع ہو جانے والے غبار کو بھی آپ دیکھ سکتے ہیں۔ اگر آپ زندگی میں کوئی بھلائی کا کام کریں تو ہو سکتا ہے کہ آپ کسی ایسے شخص کو نہ پائیں جو آپ کے کام کی کما حقہ یا تھوڑا بہت بھی قدر کر سکے۔ ہو سکتا ہے کچھ لوگ ایسے بھی ہوں جو آپ کے کام کو برا سمجھیں۔ ہاں اگر آپ کوئی کام برا کریں تو کوئی آدمی اس پر آپ کے ساتھ خیر کا معاملہ نہیں کرنے والا۔ خیر کے ساتھ شر کے مکافاتِ عمل کو فرض کرنا انسانی منطق اور الٰہی عدل و انصاف کے بھی منافی ہے۔' (صفحہ:313)

'طلبہ کے لیے سب سے آسان فنون علم ومعرفت ہونا چاہیے۔ کیوں کہ حساب کا جو قاعدہ طالبِ علم ایک بار سیکھتا ہے وہ اس کے ذہن میں ہمیشہ کے لیے نقش کالحجر ہو جاتا ہے کبھی بھی نہیں بدلتا۔ جہاں تک تاریخ سیاست اور فلسفے کی بات ہے تو یہ اسے فنون ہیں جن کے مسائل بدلتے رہتے ہیں۔ ہر جگہ ان کے الگ قاعدے اور ضابطے ہوتے ہیں۔ ہر زمانے میں ان کے مسائل اسباب ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر شخص اس میں خاص طرح کی تاویلات گھڑتا رہتا ہے۔' (صفحہ:319)

'ابن خلدون نے کہا ہے کہ تلاشِ علم کے لیے سفر کا مطلب علم سیکھنا نہیں ہوتا بلکہ ان کے بقول تلاشِ علم کے لیے سفر کا مطلب ہے، تلاشِ علم میں کمال پختگی اور یہ ایسی غایت ہے جس کا حصول لوگوں سے اختلاط کے بغیر ممکن نہیں، تاکہ انسانی آزمائش کا مرحلہ ایک فرد سے دوسرے فرد میں منتقل ہو جائے۔' (صفحہ:131)

'کچھ لوگوں کے لیے یہ بڑی خوش نصیبی کی بات ہوتی ہے کہ وہ کسی عظیم اور مشہور آدمی کے زمانے میں جیتے ہیں۔ ابن اشیق کے نزدیک شہرت کی کئی نوعیت ہوسکتی ہے۔ لیکن عظیم آدمی کی تعریف میں لوگوں کا اختلاف ہے۔ پھر بھی کم از کم ایک ایسی تعریف ہے جس پر سب کا اتفاق ہونا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ عظیم آدمی وہ ہے جو اپنے بعد بڑے نفع بخش اثرات چھوڑ کر جاتا ہے۔' (صفحہ:145)

'قدیم حکیمانہ مقولہ ہے! بادشاہوں کے ساتھ مت اٹھو بیٹھو۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر وہ تم سے محبت کرتے ہیں تو تمھیں رسوا کرتے ہیں اور اگر تم سے نفرت کرتے ہیں تو تمھیں قتل کروا دیتے ہیں۔' (صفحہ:158)

یہاں پر ہم نے محض نمونے کی خاطر کچھ اقتباسات نقل کیے ہیں، ورنہ پوری کتاب میں اس قسم کی عبارتیں بھری پڑی ہیں، جس سے ایک طرف زبان کے رمز کا پتہ چلتا ہے وہیں دوسری جانب علم و دانش کے در وا ہوتے ہیں۔

کتاب کے اخیر میں تقریباً 17 صفحات پر مشتمل مصنف کی مختصر سوانحِ حیات ہے۔ جس میں انھوں نے قدرے تفصیل سے اپنی زندگی کے مختلف پڑاؤ کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں بچپن سے لے کر عمر کے آخری ایام کی ایک سرسری کہانی بیان کی گئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے کتاب کا خلاصہ بھی کہہ سکتے ہیں۔

کتاب میں ضرب الامثال، اشعار، محاورات اور عرب تمثیلات کا کثرت سے استعمال ہوا ہے جس سے زبان کی نازکی اور اس کی باریکی کا اندازہ ہوتا ہے۔ کئی جگہوں پر مصنف عام روش سے ہٹ کر اشعار سے وہ نکات نکال کر لاتے ہیں جہاں عام آدمی کی نگاہ نہیں جاتی، ایسے میں پڑھنے والا عش عش کیے بغیر نہیں رہتا۔ مثلاً احمد شوقی کا یہ شعر ملاحظہ فرمائیں:

نَــــظَـــــرَ فَـــــابتِســــــامَ فَسَـــلام

فَـــكَـــلام فَـــمَـــوعِـــدفَـلِـــقــــاءُ

(یعنی نظر ملتی ہے، پھر مسکراہٹ، پھر سلام، پھر گفتگو، پھر وعدہ اور پھر ملاقات تک بات جا پہنچتی ہے۔)

ڈاکٹر عمر فروخ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

'آپ ملاقات تک پہنچنا ہی نہیں چاہتے تو لازم ہے کہ آپ نظر سے اس کی شروعات بھی نہ کریں۔' (صفحہ:165)

کتاب میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔اسی کا نتیجہ تھا کہ لڑکیوں کو جب اپنی کسی سہلی تک ملاقات کے لیے گھر والے اجازت نہیں دیتے تھے تو وہ عمر سے ملنے کا جھوٹا بہانا بنا کر اپنی سہیلیوں سے ملنے جاتی تھی۔ یہی وہ وجوہات تھیں کہ جب ڈاکٹر عمر فروخ تعلیم مکمل کر کے جرمنی سے اپنے وطن لوٹ رہے تھے تو ان کے استاد رو رہے تھے، فروخ نے رونے کی وجہ دریافت کی تو انھوں نے کہا کہ لوگوں کی پاک دامنی کے بارے میں کتابوں میں پڑھا تھا، اسے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

بحیثیت مجموعی 'غبارِ حیات' ایک عمدہ کتاب ہے۔ ڈاکٹر شمس کمال انجم نے اس کا خوبصورت ترجمہ بھی کیا ہے۔ یہ کتاب بہت سبق آموز ہے۔ اسے خصوصی طور پر والدین اور نوجوانوں کو پڑھنے کی سفارش کی جاتی ہے۔ اتنی اچھی کتاب کا ترجمہ کرنے پر ڈاکٹر شمس کمال انجم مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اس کتاب کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس (نئی دہلی) نے شائع کیا ہے جس کی قیمت 209 روپے ہے۔

...

Mohd Alamullah

Research Scholar,

K R Narayanan Centre for Dalit & Minority studies,

Jamia Millia Islamia, New Delhi-110025

Mob:9911701772, E-mail: alamislahi@gmail.com

http://alamullah.blogspot.in/

ہندوستانی سیاست اور میری زندگی

نایاب حسن
(نئی دہلی)

ہندوستانی دانش، ثقافت و سیاست کی تاریخ کے مختلف ادوار میں متعدد خاندانوں کی اہم خدمات رہی ہیں، انھی میں سے ایک بارہویں صدی میں ترکی سے ہندوستان ہجرت کرکے آنے والے قدوۃ العلما قاضی معزالدین کی اولاد واحفاد کا خانوادہ بھی ہے۔ان میں بے شمار اہلِ علم وفضل ہوئے، جنھوں نے گراں قدر علمی، ثقافتی وسیاسی کارنامے انجام دیے۔ مفتی مظہر کریم (وفات:1872ء) اسی خاندان کے جید عالم ومفتی تھے، جو 1857ء میں انگریزوں کے خلاف فتوائے جہاد دینے والے علما میں شامل تھے، جس کی پاداش میں دیگر بہت سی شخصیات کے ساتھ انھیں بھی کالا پانی کی سزا ہوئی تھی۔ ممتاز مجاہد آزادی رفیع احمد قدوائی کا تعلق بھی اسی خانوادے سے تھا۔ بعد کے دنوں میں بھی تہذیب وثقافت اور علم وادب کے کئی روشن ستارے اس خاندان کی مختلف شاخوں سے چمکے، آج بھی کئی قدوائی اشخاص علم ونظر اور فکر وفن کی قندیلیں جلائے ہوئے ہیں۔ سینئر کانگریسی لیڈر اور یوپی ومرکزی حکومت میں متعدد وزارتوں پر فائز رہ کر ملک کی خدمت کرنے والی محسنہ قدوائی کا تعلق اسی قدوائی خاندان سے ہے، ممتاز عالم دین، مفسر وانشا پرداز مولانا عبدالماجد دریابادی محسنہ قدوائی کے والد قطب الدین صاحب کے چچا تھے اور اس طرح وہ محسنہ صاحبہ کے دادا ہوتے تھے۔

محسنہ قدوائی 1960 سے اب تک کی ہندوستانی سیاست کا اہم ایکٹیو حصہ رہی ہیں، کانگریس کے بزرگ ترین اور تجربہ کار لیڈروں میں ان کا شمار ہے، کانگریس ورکنگ کمیٹی کی ممبر اور ان دنوں چھتیس گڑھ کے رائے پور سے راجیہ سبھا کی ممبر ہیں۔ کم وبیش نوے سال کی قد آور خاتون سیاست داں کی خودنوشت سوانح اکتوبر 2022ء میں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں میں شائع ہوئی ہے۔

کتاب اپنے مواد کے اعتبار سے نہایت پرلطف ہے اور اس کے مطالعے سے نہ صرف محسنہ قدوائی کی تقریباً ساٹھ سالہ سرگرم سیاسی وسماجی زندگی کی روداد سے آگاہی ہوتی ہے؛ بلکہ اس طویل عرصے میں یوپی اور مرکزی حکومتوں کی بہت ساری کارکردگیوں، اس دوران رونما ہونے والی سیاسی اتھل پتھل، بہت سے اہم اور تاریخی، سیاسی وسماجی سانحات، اس دورانیے میں قومی سطح پر ابھرنے والے درجنوں لیڈروں اور دیگر شخصیات وواقعات کے ان پہلوؤں سے بھی ہمارا سامنا ہوتا ہے، جن کے بارے میں اب تک ہمیں یا تو بہت زیادہ علم نہیں تھا یا اس علم کا زاویہ کچھ اور تھا۔ محسنہ قدوائی نے 1960ء میں حادثاتی طور پر محض 28 سال کی عمر میں ریاستی قانون

نَــــظَــــرَ فَــــابتِســــامَ فَسَــلام

فَـــكَــلام فَـــمَـــوعِـــدفَـلِـقـــاءُ

(یعنی نظر ملتی ہے، پھر مسکراہٹ، پھر سلام، پھر گفتگو، پھر وعدہ اور پھر ملاقات تک بات جا پہنچتی ہے۔)

ڈاکٹر عمر فروخ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

'آپ ملاقات تک پہنچنا ہی نہیں چاہتے تو لازم ہے کہ آپ نظر سے اس کی شروعات بھی نہ کریں۔'(صفحہ:165)

کتاب میں اس کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ لڑکیوں کو جب اپنی کسی سہلی تک ملاقات کے لیے گھر والے اجازت نہیں دیتے تھے تو وہ عمر سے ملنے کا جھوٹا بہانا بنا کر اپنی سہیلیوں سے ملنے جاتی تھی۔ یہی وہ وجوہات تھیں کہ جب ڈاکٹر عمر فروخ تعلیم مکمل کر کے جرمنی سے اپنے وطن لوٹ رہے تھے تو ان کے استاد رو رہے تھے، فروخ نے رونے کی وجہ دریافت کی تو انھوں نے کہا کہ لوگوں کی پاک دامنی کے بارے میں کتابوں میں پڑھا تھا، اسے میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔

بحیثیت مجموعی 'غبارِ حیات' ایک عمدہ کتاب ہے۔ ڈاکٹر شمس کمال انجم نے اس کا خوبصورت ترجمہ بھی کیا ہے۔ یہ کتاب بہت سبق آموز ہے۔ اسے خصوصی طور پر والدین اور نوجوانوں کو پڑھنے کی سفارش کی جاتی ہے۔ اتنی اچھی کتاب کا ترجمہ کرنے پر ڈاکٹر شمس کمال انجم مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اس کتاب کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس (نئی دہلی) نے شائع کیا ہے جس کی قیمت 209 روپے ہے۔

...

Mohd Alamullah
Research Scholar,
K R Narayanan Centre for Dalit & Minority studies,
Jamia Millia Islamia, New Delhi-110025
Mob:9911701772, E-mail: alamislahi@gmail.com
http://alamullah.blogspot.in/

ہندوستانی سیاست اور میری زندگی

نایاب حسن
(نئی دہلی)

ہندوستانی دانش، ثقافت و سیاست کی تاریخ کے مختلف ادوار میں متعدد خاندانوں کی اہم خدمات رہی ہیں، انھی میں سے ایک بارہویں صدی میں ترکی سے ہندوستان ہجرت کر کے آنے والے قدوۃ العلما قاضی معزالدین کی اولاد واحفاد کا خانوادہ بھی ہے۔ان میں بے شمار اہلِ علم وفضل ہوئے،جنھوں نے گراں قدر علمی، ثقافتی وسیاسی کارنامے انجام دیے۔مفتی مظہر کریم (وفات:1872ء) اسی خاندان کے جید عالم ومفتی تھے، جو 1857ء میں انگریزوں کے خلاف فتوائے جہاد دینے والے علما میں شامل تھے، جس کی پاداش میں دیگر بہت سی شخصیات کے ساتھ انھیں بھی کالا پانی کی سزا ہوئی تھی۔ممتاز مجاہد آزادی رفیع احمد قدوائی کا تعلق بھی اسی خانوادے سے تھا۔بعد کے دنوں میں بھی تہذیب وثقافت اور علم وادب کے کئی روشن ستارے اس خاندان کی مختلف شاخوں سے چمکے، آج بھی کئی قدوائی اشخاص علم ونظر اور فکر وفن کی قندیلیں جلائے ہوئے ہیں۔سینئر کانگریسی لیڈر اور یوپی ومرکزی حکومت میں متعدد وزارتوں پر فائز رہ کر ملک کی خدمت کرنے والی محسنہ قدوائی کا تعلق اسی قدوائی خاندان سے ہے، ممتاز عالم دین، مفسر وانشا پرداز مولانا عبدالماجد دریابادی محسنہ قدوائی کے والد قطب الدین صاحب کے چچا تھے اور اس طرح وہ محسنہ صاحبہ کے دادا ہوتے تھے۔

محسنہ قدوائی 1960 سے اب تک کی ہندوستانی سیاست کا اہم اکیٹیو حصہ رہی ہیں، کانگریس کے بزرگ ترین اور تجربہ کار لیڈروں میں ان کا شمار ہے، کانگریس ورکنگ کمیٹی کی ممبر اور ان دنوں چھتیس گڑھ کے رائے پور سے راجیہ سبھا کی ممبر ہیں۔کم وبیش نوے سال کی قد آور خاتون سیاست داں کی خودنوشت سوانح اکتوبر 2022ء میں انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں شائع ہوئی ہے۔

کتاب اپنے مواد کے اعتبار سے نہایت پر لطف ہے اور اس کے مطالعے سے نہ صرف محسنہ قدوائی کی تقریباً ساٹھ سالہ سرگرم سیاسی وسماجی زندگی کی روداد سے آگاہی ہوتی ہے؛ بلکہ اس طویل عرصے میں یوپی اور مرکزی حکومتوں کی بہت ساری کارکردگیوں، اس دوران رونما ہونے والی سیاسی اتھل پتھل، بہت سے اہم اور تاریخی، سیاسی وسماجی سانحات، اس دورانیے میں قومی سطح پر ابھرنے والے درجنوں لیڈروں اور دیگر شخصیات وواقعات کے ان پہلوؤں سے بھی ہمارا سامنا ہوتا ہے، جن کے بارے میں اب تک ہمیں یا تو بہت زیادہ علم نہیں تھا یا اس علم کا زاویہ کچھ اور تھا۔محسنہ قدوائی نے 1960ء میں حادثاتی طور پر محض 28 سال کی عمر میں ریاستی قانون

ساز کونسل کی ممبر کی حیثیت سے میدانِ سیاست میں قدم رکھا اور 1978ء میں اعظم گڑھ سے 36000 ووٹوں کے فرق سے لوک سبھا کے ضمنی الیکشن میں کامیابی حاصل کر کے نہ صرف ایمرجنسی کی مار جھیل رہی کانگریس کو یوپی میں نئی زندگی دی؛ بلکہ وہیں سے خود ان کا سیاسی قد بھی دراز ہونا شروع ہوا، جو بعد میں دراز تر ہوتا چلا گیا۔

انگریزی میں ان کی یہ دلچسپ خودنوشت مائی لائف اِن انڈین پالیٹکس (My Life in Indian Politics) کے نام سے ہارپر کالنز سے چھپی ہے، جب کہ اس کا اردو ترجمہ براؤن بک پبلی کیشنز علی گڑھ سے شائع ہوا ہے۔

اس کے راوی قدوائی خاندان ہی کے ایک نامور فرد، سینئر صحافی، سونیا گاندھی سمیت متعدد سیاسی شخصیات کے سوانح نگار، مشہور انگریزی اخبار 'دی ٹیلی گراف' کے سابق ایسوسی ایٹ ایڈیٹر اور کالم نگار و تجزیہ کار رشید قدوائی ہیں۔ انگریزی میں یہ طریقہ بہت دنوں سے رائج ہے کہ کوئی بڑی شخصیت اپنا زندگی نامہ کسی قابلِ اعتماد صاحبِ قلم کو نقل کرواتی ہے یا وہ اپنا احوال اسے سنا دیتی ہے اور وہ صاحبِ قلم کتابی شکل میں اس کی جمع و ترتیب کا کام انجام دیتا ہے۔ اردو میں ایسی مثالیں شاذ ہیں، ایک مثال مولانا ابوالکلام آزاد کی پیش کی جاسکتی ہے، جنھوں نے اپنی رودادِ حیات جستہ جستہ اپنے ایک معتمد رفیق مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کو نقل کروائی تھی، جو انھوں نے 'آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی' کے نام سے 1958ء میں مولانا کی وفات کے بعد شائع کروائی تھی۔

محسنہ قدوائی کی یہ خودنوشت اردو میں 'ہندوستانی سیاست اور میری زندگی' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

کتاب کے سات سیکشنز (حصے) ہیں، جن میں انھوں نے اپنی بیتی بیان کی ہے۔ پہلا حصہ ہے 'کہانی یہاں سے شروع ہوتی ہے'، اس میں انھوں نے اعظم گڑھ کے ضمنی انتخاب میں اپنی کامیابی اور اس کے پس منظر پر روشنی ڈالی ہے۔ دوسرا حصہ ہے 'مستقبل کا فلیش بیک'، اس میں انھوں نے ذرا تفصیل سے اپنی سیاسی وابستگی کی کہانی، جواہر لال نہرو سے پہلی ملاقات، یوپی کانگریس کی صدارت، ایمرجنسی کی وجہ سے کانگریس سرکار کے خاتمے کے بعد دوبارہ اندرا گاندھی کو اقتدار میں لانے کے لیے ان کی اور دیگر کانگریسی رہنماؤں کی کوشش وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

اس حصے میں اندرا گاندھی کے ایمرجنسی کے فیصلے کو انھوں درست قرار دیا ہے، حالاں کہ ان کا ماننا یہ بھی ہے کہ اسے ہندوستان جیسے وسیع وعریض ملک میں صحیح سے نافذ نہیں کیا گیا، جس کا کانگریس کو نقصان ہوا۔ اسی طرح خاندانی منصوبہ بندی سکیم کانگریس کے دیگر متعدد ترقیاتی سکیموں کی ایک شق تھی، جسے ان کے مطابق سنجے گاندھی نے دوراندیشی سے کام لیے بغیر شہروں اور دیہاتوں میں یکساں طور پر آزمانے کی کوشش کی، جس کی وجہ سے کانگریس کو سخت عوامی ردِعمل کا سامنا کرنا پڑا اور سنگھ نے عوامی غم وغصے کو بڑی خوبی سے استعمال کرلیا۔

تیسرا حصہ 'یہ سب کیسے شروع ہوا؟' کے عنوان سے ہے، اس میں انھوں نے اپنا خاندانی بیک گراؤنڈ بتانے کے ساتھ اپنی سیاسی سرگرمیوں اور خصوصاً ستر کی دہائی میں کانگریس پارٹی میں ابھرنے والی گروہ بندیوں پر قدرے تفصیل سے لکھا ہے، اس میں انھوں نے متعدد صفِ اول کے کانگریسی رہنماؤں کی نفسیات، سیاسی توڑ جوڑ اور ایک دوسرے کو زیر کرنے کے لیے مختلف غیر اخلاقی حربے اختیار کیے جانے کی جھلکیاں بھی پیش کی ہیں۔ چوتھا

حصہ ہے 'بیٹیاں اور دیگر یادیں' اس میں انھوں نے ایک ماں کی حیثیت سے اپنی بیٹیوں کی تربیت اور خود ان کے تعلق سے ان کے تاثرات وغیرہ کے ذکر کے ساتھ اپنی سیاسی زندگی کے اہم تجربات، غیر ملکی دوروں اور اندرا گاندھی کے قتل کیے جانے کے بعد راجیو گاندھی کی سرکار میں اپنی وزارت کے تجربات شیئر کیے ہیں۔

پانچواں حصہ ہے 'ہندوستانی سیاست کا سفر' اس میں انھوں نے آزادی کے بعد سے لے کر عصرِ حاضر تک ہندوستانی سیاست میں رونما ہونے والے تغیرات، اتار چڑھاؤ، انقلابات اور اہم واقعات پر روشنی ڈالتے ہوئے خصوصاً فرقہ وارانہ سیاست کے ابھرنے اور پنپنے کے اسباب ووجوہات پر بھی گفتگو کی ہے۔

چھٹے حصے میں انھوں نے اپنے پارلیمانی حلقے میرٹھ میں اپنی کارکردگی کا ذکر کرتے ہوئے اسی کی دہائی میں وہاں رونما ہونے والے بدترین فرقہ وارانہ فساد اور ہاشم پورہ وملیانہ کے انسانیت کش سانحات پر اپنا نقطہ؟ نظر پیش کرنے کی کوشش کی ہے، وہ کہتی ہیں کہ انھوں نے ان واقعات کو روکنے اور فرقہ وارانہ کشیدگی کو دور کرنے کی بے پناہ کوشش کی، مگر فرقہ پرست طاقتوں کے ساتھ خود مقامی کانگریسی لیڈران بھی اپنے سیاسی مفادات کی خاطر ماحول کو زہر آلود کرنے میں ملوث تھے، جس کی وجہ سے میرٹھ میں پے در پے متعدد فرقہ وارانہ فسادات رونما ہوئے۔

ہاشم پورہ سانحے پر سابق ڈی جی پی آف اتر پردیش، ہاشم پورہ سانحے کے زمانے میں غازی آباد کے پولیس کپتان اور بعد میں اس واقعے کو منظر عام پر لانے اور عدالت تک پہنچانے میں پیش پیش رہنے والے وبھوتی نارائن رائے کا ورژن بھی قابلِ توجہ ہے، جسے انھوں نے اپنی کتاب 'ہاشم پورہ:22 مئی' میں تفصیل سے پیش کیا ہے، جو انگریزی میں 2016ء میں اور اردو میں 2018ء میں شائع ہوئی ہے۔

محسنہ قدوائی نے اُن دنوں تیزی سے بدلتے ہوئے سیاسی حالات کا قدرے احتیاط، مگر خاصی دیانت داری سے تجزیہ کیا ہے اور فرقہ وارانہ سیاست کے ابھرنے کی وجہ سے ان کی پارٹی یا خود ان کی اپنی سیاسی ساکھ کو جو نقصان پہنچا، اس کی طرف اشارے کیے ہیں۔ اسی حصے میں انتخابی سیاست سے کنارہ کشی کے بعد کانگریس پارٹی میں تنظیم کی سطح پر اپنی سرگرمیوں کی تفصیلات پیش کرتے ہوئے مختلف ریاستوں مثلاً پنجاب، مدھیہ پردیش، چھتیس گڑھ، مغربی بنگال، منی پور، آسام، میگھالیہ، ہماچل پردیش، بہار اور ہریانہ وغیرہ میں پارٹی کی تنظیم واستحکام کے سلسلے میں اپنی کارکردگی کا احوال بیان کیا ہے۔ 2010ء میں یو پی اے سرکار نے انھیں مرکزی حج کمیٹی کی سربراہ بنایا تھا، اس عہدے پر رہتے ہوئے انھوں نے حج کمیٹی کو فعال رکھنے اور حاجیوں کی سہولت وغیرہ کے لیے جو اقدامات کیے، ان کا ذکر ایک مستقل عنوان کے تحت کیا ہے۔ کتاب کا آخری حصہ 'ساتھی اور مخالفین' کے عنوان سے ہے اور بہ ایں طور معنی خیز ہے کہ اس میں انھوں نے اپنی طویل سرگرم سیاسی زندگی کے کچھ اہم رفیقوں، راہِ عمل میں ملنے والے دوسری پارٹیوں کے رہنماؤں اور سیاست دانوں کے تعلق سے اپنے تجربات شیئر کیے ہیں۔

اس کے مطالعے سے ان سیاست دانوں کی شخصیت و کردار کی دلچسپ پرتیں سامنے آتی ہیں۔ اندرا گاندھی اور راجیو گاندھی کی تو سرکاروں میں وہ وزیر رہیں؛ اس لیے کتاب کے گزشتہ ابواب میں انھوں نے ان دونوں کے تئیں اپنے جذبات و احساسات اور تجربوں کا بھرپور اظہار کیا ہے، جبکہ اِس حصے میں سونیا گاندھی، ملائم سنگھ یادو، این ڈی تیواری، منموہن سنگھ، پرنب مکھرجی، احمد پٹیل، لالو پرساد یادو، ارجن سنگھ، مادھو راؤ سندھیا، راجیش و سچن پائلٹ، جتندر پرساد، وی پی سنگھ، چندر شیکھر، ایچ ڈی دیوے گوڑا، اندر کمار گجرال اور آخر میں اروند کیجریوال اور ان کی 'عام آدمی پارٹی' کے تعلق سے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

الغرض مجموعی طور پر یہ کتاب خاصی دلچسپ ہے، اس میں نہ صرف خود محسنہ قدوائی کی سیاسی زندگی کے مناظر بکھرے ہوئے ہیں؛ بلکہ تقریباً چھ عشروں کی ہندوستانی سیاست رسیاست دانوں کے بھی رنگارنگ چہروں سے بھی ہمارا تعارف ہوتا ہے۔ جتنے سیاست دانوں کا اس کتاب میں ذکر ہے، تقریباً سبھی ہمارے لیے جانے پہچانے ہیں، مگر ان کے بارے میں ہماری معلومات جو کچھ ہیں، اس کتاب کے مطالعے سے ان میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ واقعات کے تجزیے میں عموماً انھوں نے خاصا محتاط رویہ اختیار کیا ہے اور شعوری طور پر یہ کوشش کی ہے کہ کانگریس پارٹی یا ہندوستانی سیاست میں انھوں نے ایک طویل عرصہ گزارنے اور تنظیمی و وزارتی عہدوں پر رہتے ہوئے اپنی کارکردگی وغیرہ کے ذریعے اپنی جو امیج بنائی ہے، وہ ہلنے نہ پائے۔

متعدد سیاست دانوں کے طرزِ عمل سے اختلاف اور بہت سے سیاسی معاملات و واقعات کے تئیں انھوں نے اپنی ناراضی کا بھی کھل کر اظہار کیا ہے، مگر سنجیدہ و متین اسلوب اور وضع دارانہ انداز میں، جو یقیناً ان کی شخصی خوبی اور جس وجیہ خاندانی پس منظر سے ان کا رشتہ ہے، اس کا اثر کہا جائے گا۔ کتاب کا ترجمہ بہت رواں دواں، سلیس اور شگفتہ ہے، کہیں کہیں کچھ اٹکاؤ سا محسوس ہوتا ہے، مگر من حیث المجموع ترجمے کی زبان بڑی پرلطف اور تخلیقیت آمیز ہے۔

کتاب کے شروع میں متعدد سینئر کانگریسی رہنماؤں: اے کے انٹونی، ڈگ وجے سنگھ، آنند شرما، بھوپیش بگھیل اور ششی تھرور وغیرہ کی اس کتاب اور محسنہ قدوائی کے تعلق سے رائیں شامل کی گئی ہیں۔ طباعت بہت دیدہ زیب اور خوب صورت ہے، یہ کتاب بڑے لوگوں کی سوانح رخود نوشت سوانح کے مطالعے کا شوق رکھنے والوں کے علاوہ ہندوستانی سیاست کو پڑھنے، جاننے اور سمجھنے کا ذوق رکھنے والوں کے لیے بھی خاصی دلچسپ ہے۔

...

Nayab Hasan
New Delhi
Mob: 9560188574/09871523432
E-mail: qindeelonline@gmail.com

شاہ عمران حسن کی وحید شناسی

علیزے نجف
(اعظم گڑھ، یوپی)

شاہ عمران حسن علمی دنیا کے ایک معروف اسکالر اور قلم کار ہیں، ان کا قلم تجسس اور تحقیق کی روشنائی سے اب تک بیشمار سفید صفحات کو سیاہ کر چکا ہے، انھوں نے عام ڈگر پہ چل کر گھسی پٹی علمی روایتوں اور نظریات کو اپنانے کے بجائے اس راستے کا انتخاب کیا جو نہ صرف ان کے ذہنی رجحان و دلی میلان کے مطابق ہے بلکہ یوں لگ رہا ہے گویا اس راستے کو شاہ عمران حسن ہی کی تلاش تھی، ان کے قلم سے لکھے جانے والے مضامین متنوع موضوعات کا احاطہ کئے ہوئے ہیں جس میں انھوں نے اپنے مشاہدے و مطالعے کو ادبی اسلوب میں اس سادگی کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس کی اثریت قاری کی توجہ کو اپنی طرف مرکوز کئے بغیر نہیں رہتی۔

ایک قلمکار کے لیے اس کی تحریروں کی سب سے بڑا وصف اس کا مؤثر ہونا ہوتا ہے جو احساسات پہ اپنی گرفت مضبوط کر سکے۔ شاہ عمران حسن کی شخصیت کی سب سے بڑی خوبی ان کی سادگی ہے اور یہ سادگی ان کے قلم سے لکھی جانی والی تحریروں کے ساتھ ساتھ ان کی عام گفتگو میں بھی محسوس کی جاسکتی ہے، فنکار وہی ہوتا ہے جو لفظوں کے پیچ وخم میں اُلجھانے کے بجائے اپنے خیالات ونظریات کو سلجھے ہوئے انداز میں پیش کرنے کا ہنر رکھتا ہو، جس کے اندر اپنے مشن کے تئیں متزلزل آرزوؤں کے بجائے استقلال پسند جذبہ ہو جو لفظوں کے سحر میں ڈوبنے کے بجائے احساسات کی آبیاری کرنے کا ہنر رکھتا ہو شاہ عمران حسن ایسے ہی محکم جذبے کے ساتھ اس جستجو کے سفر میں مسلسل سرگرداں ہیں۔

شاہ عمران حسن کی شخصیت کو علمی بساط پہ ممتاز مقام دلانے میں اردو سوانحی ادب نے مرکزی کردار ادا کیا ہے، سوانح نگاری ایک ایسی صنف ہے جو قاری کی شخصیت سازی اور ذہن سازی میں اہم کردار ادا کرتی ہے، اس کے ذریعے معاشرے کی رول ماڈل شخصیات کے کردار کو ادبی پیرہن میں پیش کیا جاتا ہے تاکہ ہر خاص و عام تک اس کی رسائی کو ممکن بنایا جا سکے اور تاریخ میں انھیں ہمیشہ زندہ رکھا جا سکے۔

سوانح نگاری ایک مفید و مؤثر صنف ہونے کے باوجود اب تک وہ توجہ و مقام نہیں حاصل کر سکی جس کی وہ مستحق تھی اس کی اسی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے شاہ عمران حسن نے 'سوانح نگاری' کی صنف میں طبع آزمائی کرنے کا فیصلہ کیا اس سے ذہنی مناسبت رکھنے کی وجہ سے وہ پوری دلجمعی اور ایمانداری کے ساتھ سوانحی ادب کو لکھتے گئے، حیات رحمانی (2012ء)، اوراق حیات (2015ء)، حیات ولی (2016ء)، حیات غامدی (2017ء) ان

کی فعالیت کی روشن مثال ہے۔ یہ کتابیں جلیل القدر عالی المرتبت شخصیتوں کی زندگی کو اس تفصیل کے ساتھ بیان کرتی ہیں کہ قاری اس کے ذریعے ان کی زندگی کے تمام روشن پہلوؤں سے واقف ہوسکتا ہے۔

شاہ عمران حسن صاحب نے جن کی سوانح عمری کو اپنے زرخیز قلم سے لفظوں کو قرطاس پہ بکھیرا ہے یہ وہ شخصیات ہیں جنھوں نے لوگوں کے اذہان وافکار کو متاثر کئے ہیں جن کا علمی کام امت مسلمہ کے لیے ایک بیش قیمت سرمایہ ہے ان شخصیات کا شمار اپنے وقت کے مجددین و مفکرین میں ہوتا ہے۔ شاہ عمران حسن صاحب نے ان کی سوانحِ حیات لکھ کر نہ صرف اپنی صلاحیت و قابلیت کو شناخت دی ہے بلکہ ان شخصیات کی زندگی کے گوشے گوشے کو زیرِ قلم لاکر ہم سب پہ بڑا احسان بھی کیا ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے علمی وفکری راہیں ہموار کرنے کی ایک کامیاب کوشش بھی کی ہے۔

اس وقت میرے سامنے ان کی مرتب کردہ کتاب 'مولانا وحید الدین خاں: اہلِ قلم کی تحریروں کے آئینے میں' رکھی ہوئی ہے جس کے سرورق پہ مولانا وحید الدین خاں کی روشن تصویر منقش ہے۔

مولانا وحید الدین خاں کی شخصیت آج کی تاریخ میں کسی کے لیے بھی محتاج تعارف نہیں۔ یہ ایک نابغۂ روزگار ہستی، جید عالم دین، ممتاز مذہبی اسکالر اور مصلح تھے۔ ان کا شمار ان علما میں ہوتا ہے جو ساری زندگی اپنی قوم میں اعلیٰ کردار اور محققانہ ذہن پیدا کرنے کے لیے جدوجہد کرتے رہے، اس سعی مسلسل میں انھیں اگر ایک طرف عزت و مقبولیت حاصل ہوئی وہیں دوسری طرف نظریات کے اختلاف کی وجہ سے مذہبی رہنماؤں کی طرف سے شدید مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔

بے سروسامانی کے عالم میں بھی انھوں نے اپنے خواب اور مقصد حیات کے ساتھ کوئی مفاہمت نہیں کی، آج ان کا علمی کام صرف ملکی سطح پہ ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پہ بھی مقبولیت حاصل کر چکا ہے یہ ان کی غیر معمولی استقامت اور بے پناہ صلاحیتوں کا نتیجہ ہے جو انھیں اللہ عزوجل کی طرف سے عطا ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنی قوم کی رہنمائی کے لیے 200 سے زائد کتابیں لکھیں، اس میں انھوں نے اپنی زندگی بھر کے تجربے، مشاہدے و مطالعے کے حاصل کو سمو دیا ہے، یہ کتابیں مذہبی کتابوں کی روایت میں گراں قدر اثاثے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

بے شک کسی کو اس سے اختلاف ہونا ممکن ہے کیوں کہ انسان خطاؤں سے مبرا نہیں ہوسکتا؛ ان کی لکھی جانے والی کتاب الاسلام یتحدیٰ جامعہ الازہر یونیورسٹی (مصر) سمیت کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ تقریباً دنیا کے گوشے گوشے میں ان کے قاری موجود ہیں۔ ان کے کارہائے نمایاں کی تفصیل میں صفحات کے صفحات لکھے جاسکتے ہیں، جو کہ اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں۔

شاہ عمران حسن صاحب نے یہ کتاب مرتب کر کے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اس کے ذریعے انھوں نے ان تمام مضامین کو یکجا کر دیا ہے جو کہ مولانا وحید الدین خان کی شخصیت اور ان کے افکار و خیالات سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں، ایسے میں کوئی بھی قاری بآسانی اسے پڑھ سکتا ہے۔

شاہ عمران حسن صاحب جو کہ مولانا وحید الدین خاں کی زندگی میں ان کی سوانح حیات مرتب کرنے کا
اعزاز رکھتے ہیں۔ چوں کہ مولانا وحید الدین خاں کی خواہش تھی کہ ان کی سوانح عمری ان کے ہی لفظوں میں
لکھی جائے۔ اس لیے ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے شاہ عمران حسن صاحب نے مولانا کی رہنمائی میں
ان کی تمام کتابوں کے ساتھ ہزاروں غیر شائع شدہ صفحات کا مطالعہ کر کے وہ سارے مواد اکٹھا کئے جس سے
کہ ان کی زندگی کے تمام نشیب وفراز کو مفصل انداز میں بیان کیا جا سکے۔

انھوں نے 'اوراق حیات' کو اس عرق ریزی کے ساتھ مرتب کیا ہے کہ قاری مولانا وحید الدین خاں کی
زندگی سے واقفیت حاصل کرتے ہوئے شاہ عمران حسن کی سوانح نگاری کی مہارت کو بخوبی محسوس کر سکتا ہے۔ یہ
ایک ضخیم جامع کتاب ہے۔ اوراق حیات کو مرتب کرتے ہوئے وہ مولانا کی زندگی سے جڑے ہر واقعے اور ان
کے نظریات وخیالات سے واقف ہو چکے تھے جس نے انھیں مولانا کا عقیدت مند بنا دیا تھا۔

جب مولانا وحید الدین خاں اس دار فانی سے کوچ (21 اپریل 2021ء) کر گئے۔ اس وقت پوری دنیا
سے جو تعزیتی تاثرات مضمون کی صورت موصول ہوئے، انھوں نے ہر مضمون کا بغور مطالعہ کرتے ہوئے؛ یہ
بات بڑی شدت کے ساتھ محسوس کی کہ مولانا سے جڑے ان احساسات وتاثرات کو ضائع نہیں ہونے دینا
چاہئے۔ مولانا کی لکھی گئی کتابوں کی طرح ان کے عقیدت مندوں کے احساسات بھی قیمتی ہیں کیوں کہ
چراغوں سے چراغ جلائے جاتے ہیں۔ رہی بات مولانا مولانا وحید الدین خاں کے نظریات سے اتفاق
اختلاف کی تو یہ بے شک ہر ذی شعور انسان کا حق ہے کہ وہ شرح صدر کے لیے سوال کرے اور اپنے
اعتراضات ظاہر کرے اسی طرح مولانا وحید الدین خاں کے نظریات پہ بھی اعتراض کیا جا سکتا ہے جیسا کہ بے
شمار لوگوں نے کیا بھی ہے لیکن ہماری قوم کی بد قسمتی ہے کہ ہمارے یہاں تنقید برائے تنقیص کا مزاج پایا جاتا
ہے اس میں دلیل نہیں تضحیک ہوتی ہے اس ذہنیت کے پیچھے پائی جانے والی نفسیات میں تقلید اور جذباتیت کا
عنصر غالب ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں بیشتر علماء کسی کو مذہبی روایت پہ سوال کرنے کا حق نہیں دیتے اگر کوئی غلطی
سے اس کی جرأت کر بیٹھے تو اسے 'زندیق' اور 'کافر' قرار دینے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگاتے۔ اسی نفسیات نے
مسلم امت میں تحقیقی وتفتیشی مزاج کا بیڑہ غرق کر دیا ہے، تحقیق اور تفتیش کے میدان میں مستعد رہنے والی قوم
ہی قوموں کی امامت کرتی ہے۔

اس کتاب کے مرتب شاہ عمران حسن صاحب ایک وقت میں مولانا وحید الدین خاں پہ برملا تنقید بھی
بھی کرتے رہے ہیں۔ مولانا نے بہت ہی خندہ پیشانی کے ساتھ ان کے جوابات دیے۔ شاہ عمران حسن
صاحب کی تنقید علمی تنقید تھی اس لیے جیسے جیسے وہ مولانا کے نظریاتی پس منظر سے واقف ہوتے گئے ویسے
ویسے وہ ایک طالب علم کی طرح ان سے استفادہ کرتے گئے۔ ایسا بالکل بھی نہیں کہ وہ ہر معاملے میں مولانا
صاحب کی رائے سے صد فیصد اتفاق کرتے ہیں۔ انھوں نے خود مولانا صاحب سے اختلاف کے باوجود

کی فعالیت کی روشن مثال ہے۔ یہ کتابیں جلیل القدر عالی المرتبت شخصیتوں کی زندگی کو اس تفصیل کے ساتھ بیان کرتی ہیں کہ قاری اس کے ذریعے ان کی زندگی کے تمام روشن پہلوؤں سے واقف ہو سکتا ہے۔

شاہ عمران حسن صاحب نے جن کی سوانح عمری کو اپنے زرخیز قلم سے لفظوں کو قرطاس پہ بکھیرا ہے یہ وہ شخصیات ہیں جنھوں نے لوگوں کے اذہان و افکار کو متاثر کئے ہیں جن کا علمی کام امت مسلمہ کے لیے ایک بیش قیمت سرمایہ ہے ان شخصیات کا شمار اپنے وقت کے مجددین و مفکرین میں ہوتا ہے۔ شاہ عمران حسن صاحب نے ان کی سوانحِ حیات لکھ کر نہ صرف اپنی صلاحیت و قابلیت کو شناخت دی ہے بلکہ ان شخصیات کی زندگی کے گوشے گوشے کو زیرِ قلم لاکر ہم سب پہ بڑا احسان بھی کیا ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے علمی و فکری راہیں ہموار کرنے کی ایک کامیاب کوشش بھی کی ہے۔

اس وقت میرے سامنے ان کی مرتب کردہ کتاب 'مولانا وحید الدین خاں: اہلِ قلم کی تحریروں کے آئینے میں' رکھی ہوئی ہے جس کے سرورق پہ مولانا وحید الدین خاں کی روشن تصویر منقش ہے۔

مولانا وحید الدین خاں کی شخصیت آج کی تاریخ میں کسی کے لیے بھی محتاج تعارف نہیں۔ یہ ایک نابغۂ روزگار ہستی، جید عالم دین، ممتاز مذہبی اسکالر اور مصلح تھے۔ ان کا شمار ان علما میں ہوتا ہے جو ساری زندگی اپنی قوم میں اعلیٰ کردار اور محققانہ ذہن پیدا کرنے کے لیے جدوجہد کرتے رہے، اس سعی مسلسل میں انھیں اگر ایک طرف عزت و مقبولیت حاصل ہوئی وہیں دوسری طرف نظریات کے اختلاف کی وجہ سے مذہبی رہنماؤں کی طرف سے شدید مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔

بے سروسامانی کے عالم میں بھی انھوں نے اپنے خواب اور مقصد حیات کے ساتھ کوئی مفاہمت نہیں کی، آج ان کا علمی کام صرف ملکی سطح پہ ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پہ بھی مقبولیت حاصل کر چکا ہے یہ ان کی غیر معمولی استقامت اور بے پناہ صلاحیتوں کا نتیجہ ہے جو انھیں اللہ عزوجل کی طرف سے عطا ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنی قوم کی رہنمائی کے لیے 200 سے زائد کتابیں لکھیں، اس میں انھوں نے اپنی زندگی بھر کے تجربے، مشاہدے و مطالعے کے حاصل کو سمو دیا ہے، یہ کتابیں مذہبی کتابوں کی روایت میں گراں قدر اثاثے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

بے شک کسی کو اس سے اختلاف ہونا ممکن ہے کیوں کہ انسان خطاؤں سے مبرا نہیں ہو سکتا؛ ان کی لکھی جانے والی کتاب الاسلام یتحدیٰ جامعہ الازہر یونیورسٹی (مصر) سمیت کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ تقریباً دنیا کے گوشے گوشے میں ان کے قاری موجود ہیں۔ ان کے کارہائے نمایاں کی تفصیل میں صفحات کے صفحات لکھے جاسکتے ہیں، جو کہ اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں۔

شاہ عمران حسن صاحب نے یہ کتاب مرتب کر کے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اس کے ذریعے انھوں نے ان تمام مضامین کو یکجا کر دیا ہے جو کہ مولانا وحید الدین خان کی شخصیت اور ان کے افکار و خیالات سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں، ایسے میں کوئی بھی قاری بآسانی اسے پڑھ سکتا ہے۔

شاہ عمران حسن صاحب جو کہ مولانا وحیدالدین خاں کی زندگی میں ان کی سوانح حیات مرتب کرنے کا اعزاز رکھتے ہیں۔ چوں کہ مولانا وحیدالدین خاں کی خواہش تھی کہ ان کی سوانح عمری ان کے ہی لفظوں میں لکھی جائے۔ اس لیے ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے شاہ عمران حسن صاحب نے مولانا کی رہنمائی میں ان کی تمام کتابوں کے ساتھ ہزاروں غیر شائع شدہ صفحات کا مطالعہ کر کے وہ سارے مواد اکٹھا کیے جس سے کہ ان کی زندگی کے تمام نشیب وفراز کو مفصل انداز میں بیان کیا جاسکے۔

انھوں نے 'اوراق حیات' کو اس عرق ریزی کے ساتھ مرتب کیا ہے کہ قاری مولانا وحیدالدین خاں کی زندگی سے واقفیت حاصل کرتے ہوئے شاہ عمران حسن کی سوانح نگاری کی مہارت کو بخوبی محسوس کرسکتا ہے۔ یہ ایک ضخیم جامع کتاب ہے۔ اوراق حیات کو مرتب کرتے ہوئے وہ مولانا کی زندگی سے جڑے ہر واقعے اور ان کے نظریات وخیالات سے واقف ہو چکے تھے جس نے انھیں مولانا کا عقیدت مند بنا دیا تھا۔

جب مولانا وحیدالدین خاں اس دار فانی سے کوچ (21 اپریل 2021ء) کر گئے۔ اس وقت پوری دنیا سے جو تعزیتی تاثرات مضمون کی صورت موصول ہوئے، انھوں نے ہر مضمون کا بغور مطالعہ کرتے ہوئے؛ یہ بات بڑی شدت کے ساتھ محسوس کی کہ مولانا سے جڑے ان احساسات وتاثرات کو ضائع نہیں ہونے دینا چاہیے۔ مولانا کی لکھی گئی کتابوں کی طرح ان کے عقیدت مندوں کے احساسات بھی قیمتی ہیں کیوں کہ چراغوں سے چراغ جلائے جاتے ہیں۔ رہی بات مولانا مولانا وحیدالدین خاں کے نظریات سے اتفاق و اختلاف کی تو یہ بے شک ہر ذی شعور انسان کا حق ہے کہ وہ شرح صدر کے لیے سوال کرے اور اپنے اعتراضات ظاہر کرے اسی طرح مولانا وحیدالدین خاں کے نظریات پہ بھی اعتراض کیا جاسکتا ہے جیسا کہ بے شمار لوگوں نے کیا بھی ہے لیکن ہماری قوم کی بدقسمتی ہے کہ ہمارے یہاں تنقید برائے تنقیص کا مزاج پایا جاتا ہے اس میں دلیل نہیں تضحیک ہوتی ہے اس ذہنیت کے پیچھے پائی جانے والی نفسیات میں تقلید اور جذباتیت کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں بیشتر علماء کسی کو مذہبی روایت پہ سوال کرنے کا حق نہیں دیتے اگر کوئی غلطی سے اس کی جرأت کر بیٹھے تو اسے 'زندیق' اور 'کافر' قرار دینے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگاتے۔ اسی نفسیات نے مسلم امت میں تحقیقی وتفتیشی مزاج کا بیڑہ غرق کر دیا ہے، تحقیق اور تفتیش کے میدان میں مستعد رہنے والی قوم ہی قوموں کی امامت کرتی ہے۔

اس کتاب کے مرتب شاہ عمران حسن صاحب ایک وقت میں مولانا وحیدالدین خاں پہ برملا تنقیدیں بھی کرتے رہے ہیں۔ مولانا نے بہت ہی خندہ پیشانی کے ساتھ ان کے جوابات دیے۔ شاہ عمران حسن صاحب کی تنقید علمی تنقید تھی اس لیے جیسے جیسے وہ مولانا کے نظریاتی پس منظر سے واقف ہوتے گئے ویسے ویسے وہ ایک طالب علم کی طرح ان سے استفادہ کرتے گئے۔ ایسا بالکل بھی نہیں کہ وہ ہر معاملے میں مولانا صاحب کی رائے سے صد فیصد اتفاق کرتے ہیں۔ انھوں نے خود مولانا صاحب سے اختلاف کے باوجود

کی فعالیت کی روشن مثال ہے۔ یہ کتابیں جلیل القدر عالی المرتبت شخصیتوں کی زندگی کو اس تفصیل کے ساتھ بیان کرتی ہیں کہ قاری اس کے ذریعے ان کی زندگی کے تمام روشن پہلوؤں سے واقف ہو سکتا ہے۔

شاہ عمران حسن صاحب نے جن کی سوانح عمری کو اپنے زرخیز قلم سے لفظوں کو قرطاس پہ بکھیرا ہے یہ وہ شخصیات ہیں جنھوں نے لوگوں کے اذہان وافکار کو متاثر کئے ہیں جن کا علمی کام امت مسلمہ کے لیے ایک بیش قیمت سرمایہ ہے ان شخصیات کا شمار اپنے وقت کے مجددین و مفکرین میں ہوتا ہے۔ شاہ عمران حسن صاحب نے ان کی سوانحِ حیات لکھ کر نہ صرف اپنی صلاحیت و قابلیت کو شناخت دی ہے بلکہ ان شخصیات کی زندگی کے گوشے گوشے کو زیرِ قلم لاکر ہم سب پہ بڑا احسان بھی کیا ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے علمی و فکری راہیں ہموار کرنے کی ایک کامیاب کوشش بھی کی ہے۔

اس وقت میرے سامنے ان کی مرتب کردہ کتاب 'مولانا وحیدالدین خاں: اہلِ قلم کی تحریروں کے آئینے میں' رکھی ہوئی ہے جس کے سرورق پہ مولانا وحیدالدین خاں کی روشن تصویر منقش ہے۔

مولانا وحیدالدین خاں کی شخصیت آج کی تاریخ میں کسی کے لیے بھی محتاج تعارف نہیں۔ یہ ایک نابغۂ روزگار ہستی، جید عالم دین، ممتاز مذہبی اسکالر اور مصلح تھے۔ ان کا شمار ان علما میں ہوتا ہے جو ساری زندگی اپنی قوم میں اعلیٰ کردار اور محققانہ ذہن پیدا کرنے کے لیے جدوجہد کرتے رہے، اس سعی مسلسل میں انھیں اگر ایک طرف عزت و مقبولیت حاصل ہوئی وہیں دوسری طرف نظریات کے اختلاف کی وجہ سے مذہبی رہنماؤں کی طرف سے شدید مخالفت کا سامنا بھی کرنا پڑا۔

بے سروسامانی کے عالم میں بھی انھوں نے اپنے خواب اور مقصد حیات کے ساتھ کوئی مفاہمت نہیں کی، آج ان کا علمی کام صرف ملکی سطح پہ ہی نہیں بلکہ عالمی سطح پہ بھی مقبولیت حاصل کر چکا ہے یہ ان کی غیر معمولی استقامت اور بے پناہ صلاحیتوں کا نتیجہ ہے جو انھیں اللہ عزوجل کی طرف سے عطا ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنی قوم کی رہنمائی کے لیے 200 سے زائد کتابیں لکھیں، اس میں انھوں نے اپنی زندگی بھر کے تجربے، مشاہدے و مطالعے کے حاصل کو سمو دیا ہے، یہ کتابیں مذہبی کتابوں کی روایت میں گراں قدر اثاثے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

بے شک کسی کو اس سے اختلاف ہونا ممکن ہے کیوں کہ انسان خطاؤں سے مبرا نہیں ہو سکتا؛ ان کی لکھی جانے والی کتاب الاسلام یتحدیٰ جامعہ الازہر یونیورسٹی (مصر) سمیت کئی یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہے۔ تقریباً دنیا کے گوشے گوشے میں ان کے قاری موجود ہیں۔ ان کے کارہائے نمایاں کی تفصیل میں صفحات کے صفحات لکھے جا سکتے ہیں، جو کہ اس مختصر مضمون میں ممکن نہیں۔

شاہ عمران حسن صاحب نے یہ کتاب مرتب کر کے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا ہے اس کے ذریعے انھوں نے ان تمام مضامین کو یکجا کر دیا ہے جو کہ مولانا وحیدالدین خان کی شخصیت اور ان کے افکار و خیالات سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہیں، ایسے میں کوئی بھی قاری بآسانی اسے پڑھ سکتا ہے۔

شاہ عمران حسن صاحب جو کہ مولانا وحید الدین خاں کی زندگی میں ان کی سوانح حیات مرتب کرنے کا اعزاز رکھتے ہیں۔ چوں کہ مولانا وحید الدین خاں کی خواہش تھی کہ ان کی سوانح عمری ان کے ہی لفظوں میں لکھی جائے۔ اس لیے ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے شاہ عمران حسن صاحب نے مولانا کی رہنمائی میں ان کی تمام کتابوں کے ساتھ ہزاروں غیر شائع شدہ صفحات کا مطالعہ کر کے وہ سارے مواد اکٹھا کئے جس سے کہ ان کی زندگی کے تمام نشیب و فراز کو مفصل انداز میں بیان کیا جا سکے۔

انھوں نے 'اوراق حیات' کو اس عرق ریزی کے ساتھ مرتب کیا ہے کہ قاری مولانا وحید الدین خاں کی زندگی سے واقفیت حاصل کرتے ہوئے شاہ عمران حسن کی سوانح نگاری کی مہارت کو بخوبی محسوس کر سکتا ہے۔ یہ ایک ضخیم جامع کتاب ہے۔ اوراق حیات کو مرتب کرتے ہوئے وہ مولانا کی زندگی سے جڑے ہر واقعے اور ان کے نظریات و خیالات سے واقف ہو چکے تھے جس نے انھیں مولانا کا عقیدت مند بنا دیا تھا۔

جب مولانا وحید الدین خاں اس دار فانی سے کوچ (21 اپریل 2021ء) کر گئے۔ اس وقت پوری دنیا سے جو تعزیتی تاثرات مضمون کی صورت موصول ہوئے، انھوں نے ہر مضمون کا بغور مطالعہ کرتے ہوئے؛ یہ بات بڑی شدت کے ساتھ محسوس کی کہ مولانا سے جڑے ان احساسات و تاثرات کو ضائع نہیں ہونے دینا چاہئے۔ مولانا کی لکھی گئی کتابوں کی طرح ان کے عقیدت مندوں کے احساسات بھی قیمتی ہیں کیوں کہ چراغوں سے چراغ جلائے جاتے ہیں۔ رہی بات مولانا مولانا وحید الدین خاں کے نظریات سے اتفاق و اختلاف کی تو یہ بے شک ہر ذی شعور انسان کا حق ہے کہ وہ شرح صدر کے لیے سوال کرے اور اپنے اعتراضات ظاہر کرے اسی طرح مولانا وحید الدین خاں کے نظریات پہ بھی اعتراض کیا جا سکتا ہے جیسا کہ بے شمار لوگوں نے کیا بھی ہے لیکن ہماری قوم کی بد قسمتی ہے کہ ہمارے یہاں تنقید برائے تنقیص کا مزاج پایا جاتا ہے اس میں دلیل نہیں تضحیک ہوتی ہے اس ذہنیت کے پیچھے پائی جانے والی نفسیات میں تقلید اور جذباتیت کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ ہمارے یہاں بیشتر علماء کسی کو مذہبی روایت پہ سوال کرنے کا حق نہیں دیتے اگر کوئی غلطی سے اس کی جرأت کر بیٹھے تو اسے 'زندیق' اور 'کافر' قرار دینے میں ایک لمحہ بھی نہیں لگاتے۔ اسی نفسیات نے مسلم امت میں تحقیقی و تفتیشی مزاج کا بیڑہ غرق کر دیا ہے، تحقیق اور تفتیش کے میدان میں مستعد رہنے والی قوم ہی قوموں کی امامت کرتی ہے۔

اس کتاب کے مرتب شاہ عمران حسن صاحب ایک وقت میں مولانا وحید الدین خاں پہ برملا تنقیدیں بھی کرتے رہے ہیں۔ مولانا نے بہت ہی خندہ پیشانی کے ساتھ ان کے جوابات دیے۔ شاہ عمران حسن صاحب کی تنقید علمی تنقید تھی اس لیے جیسے جیسے وہ مولانا کے نظریاتی پس منظر سے واقف ہوتے گئے ویسے ویسے وہ ایک طالب علم کی طرح ان سے استفادہ کرتے گئے۔ ایسا بالکل بھی نہیں کہ وہ ہر معاملے میں مولانا صاحب کی رائے سے صد فیصد اتفاق کرتے ہیں۔ انھوں نے خود مولانا صاحب سے اختلاف کے باوجود

اتحاد کو قائم رکھنا سیکھا۔ وہ اپنی اس مرتب کردہ کتاب میں بھی لکھتے ہیں: یہ ضروری نہیں کہ جو مضامین یہاں جمع کئے گئے ہیں، ان سے میں صد فی صد اتفاق رکھتا ہوں؛ بلکہ نفس مضمون سے اختلاف کے باوجود میں نے یہاں کچھ مضامین شامل کئے ہیں تا کہ کسی کو یہ شکایت نہ ہو کہ مولانا کا مطالعہ جانبدارانہ انداز میں کیا گیا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مولانا وحید الدین خاں سے مجھے کلی اتفاق ہے، کلی اتفاق تو صرف انبیاء علیہم السلام سے مطلوب ہوتا ہے، کسی انسان سے نہ مطلوب ہے اور نہ ممکن ہے۔ (مولانا وحید الدین خاں: اہلِ قلم کی تحریروں کے آئینے میں، شاہ عمران حسن، صفحہ: 11، سنہ اشاعت: 2022ء)

شاہ عمران حسن صاحب نے اس کتاب کو جس طرح غیر جانبدارانہ انداز میں مرتب کیا ہے۔ اسی طرح قاری کا بھی یہ اخلاقی فرض بنتا ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی اپنے تعصب وتنگ نظری کو پرے رکھ کے مولانا صاحب کی لکھی ہوئی کتابوں اور ان کی شخصیت پہ لکھی گئی اہل قلم کی تحریروں کا مطالعہ کرے اور اپنے آپ کو بھی انسان سمجھے، جس سے غلطیوں کا صدور ممکن ہے۔ اگر غلطی مولانا وحید الدین خاں کر سکتے ہیں تو غلطی آپ بھی تو کر سکتے ہیں۔ یا پھر اس کتاب کو پڑھتے ہوئے آپ اپنے اختلاف کے لیے کوئی علمی دلیل پا جائیں یا پھر ان کی لکھی جانے والی دلیلوں سے آپ قائل ہو جائیں، دلیل کے ساتھ اختلاف واتفاق کرنے کا مقصد ہی یہی ہے کہ علم کا ارتقاء ہو۔ انسانی ذہن کو اس کا مقصد مل جائے وہ دنیاوی لہو ولعب اور شیطانی ہتھکنڈوں کو شکار نہ ہو کر صحیح جگہ پہ اپنی توانائی صرف ہو سکے۔

اس کتاب میں دنیائے اسلام کی معتبر علمی شخصیات کے مضامین شامل ہیں انھوں نے مولانا کی رحلت کو ایک ایسا سانحہ قرار دیا ہے جس کی تلافی مشکل سے ہی ہو سکتی ہے، بے شک دنیا کبھی قحط الرجال کا شکار نہیں ہوتی لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ایسی شخصیات روز روز نہیں پیدا ہوتیں سالہا سال گذر جاتے ہیں تب کہیں خاک کے پردے سے ایسا انسان پیدا ہوتا ہے۔ اس کتاب کے آغاز میں سفرِ حیات کے عنوان سے مولانا وحید الدین خاں کا ایک مضمون بھی شامل ہے جس میں مولانا کی زندگی کا معروضی خاکہ پیش کیا گیا ہے، جس کو کہ انھوں نے خود اپنی زندگی میں لکھا تھا۔ شاہ عمران حسن نے اس تحریر کو شامل کر کے ان قارئین کے لیے آسانی پیدا کر دی ہے جو اس کتاب کے پڑھنے سے پہلے مولانا کی شخصیت، نظریات وخیالات سے واقف نہیں تھے۔ اس کتاب میں ان کے اہل خانہ کے تاثراتی مضامین بھی شامل ہیں جیسے ان کے صاحب زادے ڈاکٹر ظفر الاسلام خان، ڈاکٹر ثانی اثنین خان ان کی صاحبزادی ڈاکٹر فریدہ خانم، ڈاکٹر مسلمہ خانم۔ ان مضامین کو پڑھتے ہوئے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا صاحب صرف ایک ملی قائد ہی نہیں تھے بلکہ وہ بطور والد ایک با اصول مربی بھی تھے۔

انھوں نے عام باپ کی طرح اپنی اولاد کے لیے جاگیریں نہیں چھوڑیں بلکہ انھوں نے بہترین مربی باپ کی طرح اپنی اولاد کو اعلیٰ اخلاق وکردار کا نمونہ بنایا اور ان کے لیے علم کی میراث چھوڑی جو نبیوں کا بھی ورثہ رہا ہے، انھوں نے ان کی تربیت میں ہمیشہ مسلمہ اصولوں کو ترجیح دی اور اس پہ قائم بھی رہے۔ اپنی عملی زندگی

سے انھیں یہ پیغام دیا کہ زندگی کو کامیاب بنانے کے لیے آسائشوں کی نہیں بلکہ نظریات وخیالات کی ضرورت ہوتی ہے، انھوں نے ایک باپ کی طرح اپنی اولاد سے محبت کا اظہار کیا اور ایک مربی کی طرح انھیں زندگی کے نشیب وفراز بھی سمجھائے، وہ ساری عمر سادہ زندگی اور اونچی سوچ کے اس طرح مصداق بنے رہے کہ ان کی اولادیں بھی ان کے نقش قدم پہ چل پڑیں۔

انھوں نے ان مضامین میں اپنی والد کی رحلت پہ رنج وتاسف کا اظہار کرتے ہوئے ان سے جڑی ہوئی یادوں کو تازہ کیا ہے۔ بے شک یادیں کبھی شکستہ نہیں ہوتیں اور نہ ہی وہ مرتی ہیں، وہ بہترین زادِراہ کی طرح ہوتی ہیں۔ ایک اولاد کے لیے اس کے والدین سے جڑی ہوئی یادیں ایک بہترین جذباتی سہارا بھی ہوتی ہیں، ان مضامین کو پڑھتے ہوئے کچھ ایسا ہی محسوس ہوتا ہے۔

اس کتاب میں شاہ عمران حسن صاحب نے معتبر علمی ہستی مثلاً شیخ الاسلام ڈاکٹر طاہر القادری، معروف مذہبی اسکالر ومفکر جاوید احمد غامدی، پروفیسر اختر الواسع، جماعت اسلامی ہند کے امیر سید سعادت اللہ حسینی، ڈاکٹر ظفر الاسلام خان، مولانا محمد ذکوان ندوی، پروفیسر ظہیر الدین خواجہ، فاروق ارگلی، نایاب حسن، حقانی القاسمی، مولانا رضی الاسلام ندوی، مولانا سلطان احمد اصلاحی، محمد عارف اقبال، پروفیسر محسن عثمانی ندوی، مولانا اخلاق حسین قاسمی دہلوی جیسی کئی ساری جلیل القدر شخصیات کے مضامین شامل کیے ہیں۔

ہر نفس مضمون پہ تبصرہ کرنا تو ممکن نہیں ہے ان کا اگر معروضی جائزہ پیش کروں تو کچھ یوں ہوگا کہ ان تمام شخصیات نے مولانا صاحب کے طرزِ فکر اور کردار کا مطالعہ کیا ان کی علمی عظمت کا کھلے لفظوں میں اعتراف کیا ہے، انھوں نے اس حقیقت کو بسروچشم قبول کیا ہے کہ زمانے کی تنگ نظری وتعصب نے مولانا کے علمی وتحقیقی کاموں کو عوام کے درمیان قبولیت ہائے عام کا مقام دینے میں بے شمار اڑچنیں پیدا کیں لیکن سچ کی آواز کو زیادہ دیر تک دبایا نہیں جا سکتا۔

یہ دور جبر وتشدد کا دور نہیں، اکیسویں صدی عیسوی میں امکانات کی ایک ایسی دنیا دریافت ہو چکی ہے کہ لمحوں میں کون سا انقلاب برپا ہو جائے کسی کو کچھ خبر نہیں، ٹکنالوجی سے آراستہ اس دنیا نے مولانا وحید الدین خاں کے افکار ونظریات کا چہار دانگ عالم میں پھیلا دیا جہاں مخالفین کے علاوہ متفقین کی ایک بڑی تعداد ظہور پزیر ہوئی، اس وقت مولانا کے افکار وخیال کے حامیوں کی ایک بڑی تعداد پوری دنیا میں پائی جاتی ہے۔

یہاں میں ایک بات خصوصی طور پہ کہنا چاہتی ہوں کہ مولانا وحید الدین خاں کی شخصیت اور ان کے نظریات وخیالات اور امت مسلمہ کے لیے ان کی کی جانے والی خدمات کے اعتراف کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ ہم ان کے ہر نظریے سے صد فیصد اتفاق کرتے ہیں اور ہم ان سے تقلیدی نوعیت کی عقیدت رکھتے ہیں، بے شک مولانا کا تحقیقی کام گراں قدر اہمیت کا حامل ہے لیکن اس سے اختلاف کرنے کا حق ہر کسی کو حاصل ہے بشرطیکہ اس اختلاف کو دلیل کے ساتھ ادب وتمیز کے دائرے میں رہتے ہوئے کیا جائے تا کہ علمی اختلاف کی

سنجیدہ روایت کو پھر سے زندہ کیا جاسکے اور علم و تحقیق کی راہیں ہموار ہوں۔

مولانا نے خود اپنے اسلاف سے اختلاف کیا ہے وہ بھلا ہم سے کیسے تقلیدی نوعیت کی عقیدت کا مطالبہ کر سکتے ہیں ان کے افکار و نظریات کی طرح ان کی سیرت بھی ہمارے لئے مشعل راہ ہے۔

بدقسمتی سے ہم نے مذہبی روایات کو جذباتیت کے ایسے غلاف میں لپیٹ دیا ہے جس پہ غلطی سے تحقیقی نظر ڈالنا بھی کسی 'جرم کبیرہ' سے کم نہیں اسی ذہنیت نے امتِ مسلمہ کی پستی میں اضافہ کیا ہے، یہ دور سائنسی علوم کے غلبے کا دور ہے۔ سائنسی علوم کی پوری تاریخ تحقیق کی بنیاد پہ کھڑی ہے ایسے میں ہم آج کی محققانہ ذہنیت کو تقلیدی فکر اور جذباتیت سے کیسے متاثر کر سکتے ہیں؟

آج کی تاریخ میں یہ ضروری ہو چکا ہے کہ تحقیقی روایت کو فروغ دینے کی کوشش کی جائے اس میں جتنی تاخیر ہوگی ہماری حالت اتنی ہی غیر مستحکم ہوتی جائے گی، خود مولانا وحیدالدین خاں نے ساری زندگی تحقیق کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا، اس لیے میں بس یہی کہنا چاہوں گی کہ بصد شوق مولانا سے اختلاف کیجئے لیکن ان کی کتابیں پڑھ کر دلیل کے ساتھ سوال کر کے اختلاف کا حق ادا کیجئے۔ کسی سے اختلاف رکھنا آپ کو یہ حق نہیں دیتا کہ آپ اس کی نیت اور شخصیت کی تضحیک کریں اور ان کے ایمان کا درجہ متعین کریں یہ اللہ کا حق ہے اسے اپنے ہاتھ میں لینا اللہ کے بالمقابل سرکشی اختیار کرنا ہے۔

اس کتاب میں مرتب شاہ عمران حسن صاحب کے نو مضامین شامل ہیں اس میں سے ایک مضمون 'ایک عہد ساز شخصیت' کے عنوان سے ہے اس میں انھوں نے مولانا کی شخصیت سے جڑے نمایاں پہلوؤں کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ کس طرح مولانا نے عہد جدید کے بدلتے تقاضوں کو سمجھتے ہوئے روایتی طرز سے ہٹ کر نہ صرف انگریزی زبان سیکھی بلکہ سائنس کے اسرار و رموز کو سمجھنے کی بلا تکان کوشش کی یہی وجہ ہے کہ مولانا موصوف کا خاص موضوع اسلام اور دور جدید رہا ہے، ان پہلوؤں کی وضاحت کے لئے حوالہ کے طور پہ انھوں نے مولانا کی تحریروں کو بھی نقل کیا ہے جس سے اس مضمون کی اثریت میں اضافہ ہوتا ہے لیکن اگر وہ انھیں اپنے لفظوں میں لکھتے تو شاید یہ ان کی 'وحید شناسی' میں مزید اضافہ کرتی اور قاری کے لیے مؤثر بھی ہوتی۔

ایسا بالکل نہیں کہ یہ حوالے مضمون کو بوجھل کر رہے ہیں، انھوں نے اس مضمون میں مولانا کے کردار و اوصاف کو بیان کرتے ہوئے ان کے ملنے والے اعزازات کا بھی ذکر کیا ہے جس کی تفصیل آپ اس مضمون کا مطالعہ کر کے بخوبی حاصل کر سکتے ہیں۔

اس کتاب میں انھوں نے 'کتابِ سبز کی بات' کے مضمون کے تحت مولانا وحیدالدین خاں کی زندگی کے اس رخ کا ذکر کیا ہے جس میں انھیں اپنے معاندین و مخالفین کی طرف سے بے بنیاد الزامات کا سامنا کرنا پڑا تھا، دراصل کتابِ سبز کرنل معمر قذافی کی کتاب 'الکتاب الاخضر' کا اردو ترجمہ ہے جس کے پہلے حصے کے مترجم ڈاکٹر ظفر الاسلام خان ہیں۔ اس وجہ سے لوگوں نے مولانا صاحب کا تعلق معمر قذافی سے جوڑنے کی کوشش کی

جس کی مولانا صاحب نے تردید کرتے ہوئے کہا کہ افسوس انھیں وحید الدین کی زبان اور کسی دوسرے کی زبان و بیان میں فرق کرنے کی تمیز نہیں، اندھی مخالفت ان کی سرشت میں داخل ہو چکی ہے، اس پورے معاملے کو شاہ عمران حسن صاحب نے اپنے اس مضمون میں سمیٹا ہے اس کی روشنی میں یہ بھی سمجھا جا سکتا ہے کہ مولانا کے مخالفین کی نفسیات کیسی تھی اور انھوں نے کس سطح پہ رہتے ہوئے ان سے اختلاف کیا تھا۔

اس کتاب میں شاہ عمران حسن صاحب کے اس کتاب میں شامل سبھی مضمون پہ تبصرہ کرنا مقصود نہیں اور نہ ہی ممکن ہے بلکہ اس کا مقصد محض ایک جزوی جائزہ پیش کرنا ہے تا کہ قاری کو اس ضخیم اور بیش قیمت کتاب سے مختصراً متعارف کروایا جا سکے اور اس کے تجسس کی آبیاری بھی کی جا سکے وہ اسے خود پڑھے اور رائے قائم کرے۔

اس کتاب کے آخر میں شاہ عمران حسن صاحب نے تعزیت و تاثرات کے ضمن میں مولانا کی رحلت پہ عالمی سطح پہ موصول ہونے والے تعزیتی تاثرات کو یکجا کیا ہے جس میں علماء، سیاست داں، صحافی و دانشور اور قارئین الرسالہ شامل ہیں۔ ان تمام شخصیات نے مولانا کی سانحہء ارتحال پہ گہرے دکھ کا اظہار کیا ہے، اس مضمون میں انھوں نے مولانا کے انتقال کے بعد ملنے والے والے اعزاز پدم وبھوشن کا بھی ذکر کیا ہے جوان کے چھوٹے صاحبزادے ڈاکٹر ثانی اثنین خان نے 9 نومبر 2021 کو قومی دارالحکومت نئی دہلی میں واقع راشٹر پتی بھون کی ایک پروقار تقریب کے دوران صدر جمہوریہ ہند رام ناتھ کووند کے ہاتھوں سے یہ ایوارڈ وصول کیا تھا، بے شک یہ ایک خوشی کا موقع تھا، مگر افسوس کہ اس وقت مولانا صاحب باحیات نہیں رہے تھے۔

اس کتاب کے آخر میں شاعروں کے منظوم تاثرات بھی شامل ہیں۔ انھوں نے مولانا سے وابستہ اپنے خیالات کو جس ردھم کے ساتھ پیش کیا ہے اسے قاری بآسانی محسوس کر سکتا ہے اس میں فی البدیہہ برجستہ شاعری کے لیے مشہور شاعر احمد علی برقی اعظمی کی نظم بھی شامل ہے جو خود اب دار فانی سے کوچ کر چکے ہیں۔

شاہ عمران حسن نے جس طرح اس کتاب کو مرتب کیا ہے انھوں نے واقعی مولانا صاحب کی شاگردی کا حق ادا کر دیا ہے وہ ان کے لیے 'روحانی باپ' کی طرح تھے۔ روح کا تعلق بے شک لفظوں سے ماورا ہوتا ہے ہاں اس کا عکس اس کتاب کے لفظوں میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ شاہ عمران حسن صاحب کی یہ کتاب یہ حق رکھتی ہے کہ اسے اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچایا جائے اور ان شاء اللہ آنے والے وقتوں میں یہ معتبر کتابوں میں شامل نظر آئے گی، شاہ عمران حسن صاحب اللہ آپ کے قلم کو تا حیات متحرک رکھے، آمین!

...

Alizey Najaf

Sarai Mir,

Azamgarh-276305 (U.P.)

منظوم کلام

سرسید احمد خاں

مولانا محمد علی جوہر

بیاں کس طرح ہو اے سید احمد خاں کہ کیا تم ہو
ہمارے عاشق دلدادہ تم ہو دلربا تم ہو

تم ہی تھے پیشوائے قوم جب تک جان تھی تن میں
مگر سید، موئے پر بھی ہمارے پیشوا تم ہو

خبر لو قوم کی، گو کشتی سے باہر ہو
ہوئے ساحل پہ بھی تو کیا ہمارے ناخدا تم ہو

یہاں مانا کہ تاثیر دعا میں شک رہا تم کو
وہاں ضائع نہ ہوگی پھر بھی مشغول دعا تم ہو

کرو اس قوم کے حق میں دعا اے سید احمد خاں
کہ معتوب الٰہی ہم ہیں، مقبولِ خدا تم ہو

بہت تھے باخدا دنیا میں جب تم ایک کافر تھے
مگر دارُالجزا میں شک نہیں اک باخدا تم ہو

نہ ہوں بے دل تمہارے بعد لڑکے قوم کے کیوں کر
ہمارا دل تمہاری قبر میں ہے دلربا تم ہو

تمہارے جذبۂ دل کا اثر اب تک نمایاں ہے
فدا ہے تم پہ کالج کیوں کہ کالج پر فدا تم ہو

تم ہی کو ڈھونڈتی پھرتی ہیں آنکھیں اب علی گڑھ میں
اور اس پر یہ تماشا ہر طرف اور جا بجا تم ہو

تمہاری روح منڈلائی ہوئی پھرتی ہے کالج پر
قفس خالی ہے لیکن عندلیب باوفا تم ہو

لحد پر تیری کشکول گدائی سایہ افگن ہے
کہ زیر چرخ زیر خاک بس قومی گدا تم ہو

صف آخر میں سرداروں کے جو رہتے تھے دنیا میں
تعجب کیا صف اوّل میں جو روز جزا تم ہو

جنہیں احساس ہے قومی محبت کا وہی جانیں
نہیں معلوم جس کو، کیا کہیں اُس سے کہ کیا تم ہو

سوا اللہ کے ہم کو نہیں امید غیروں سے
سہارا ہے محمدؐ کا ہمیں دنیا میں یا تم ہو

ملا ہے تم کو ورثہ قوم کی مشکل کشائی کا
عزیز مصطفیؐ تم ہو، عزیز مرتضیٰؓ تم ہو

حسین ابن علیؓ کا تم سکھاتے ہو سبق ہم کو
کہ کالج کے محرّم میں بھی یادِ کربلا تم ہو

یداللہ چوم کر جب تک تم آنکھوں سے لگاتے ہو
تو ہم ہرگز نہ مانیں گے کہ اب بے دست و پا تم ہو

نئی خواہش نہیں کچھ قوم کی، ہم تم کو روتے ہیں
ہماری آرزو تم ہو، ہمارے مدعا تم ہو

سکھایا تھا تم ہی نے قوم کو یہ شور و شر سارا
جو اس کی انتہا ہم ہیں تو اس کی ابتدا تم ہو

تم عاشق قوم کے ہو اور سب معشوق امت ہیں
جو پابند جفا ہیں وہ تو پابند وفا تم ہو

تمہارے جانشیں پیرو نہیں اگلے اصولوں کے
جو پگڈنڈی ہیں ٹیڑھی ہم تو سیدھا راستہ تم ہو

رہا کرتے تھے اکثر سرگراں تم، ہم سبک سر ہیں
جو تعبیر مذلت ہم ہیں تفسیر حیا تم ہو

تمہیں ہو زندہ و جاوید باقی جانے والے ہیں
نمونہ ہیں فنا کا ہم تو تمثیل بقا تم ہو

تمہارے دوستوں [1] کو ضعف دل ضعف بصارت ہے
دلاسا تم ہو پیری کا اندھیرے کا دیا تم ہو

بتا دو صاف رستہ ہم کو تم قومی ترقی کا
کہ ہم گم کردہ رہ ہیں ہمارے رہنما تم ہو

وقار الملکؒ کی قوت ہو، حالیؔ کی زباں تم ہو
تو ہر مہدیٔ امت کی بس آنکھوں کی ضیا تم ہو

یہی کافی نہیں ہے، قوت بازو ہی ہو ان کی
اور ان کے قلب کی قوت ہو، سینے کی صفا تم ہو

جو ہیں محتاج رہبر افسران مدرسہ سید
تو بک [2] مرحوم یہ کہہ دو کہ ان کے رہنما تم ہو

یہ سب کچھ ہو مگر ان اولڈ بوائز سے بھی تو کہہ دو
تمہیں محسن بنو اس کے وقار اس قوم کا تم ہو

(1) اشارہ نواب محسن الملک، (2) اشارہ تھیوڈ بیک
(بشکریہ کلامِ جوہر، سنہ اشاعت: 1936، ناشر مکتبہ جامعہ، صفحہ: 33-29)

...

ڈاکٹر مقبول احمد مقبول

کمال الدین شمیمؔ

بیدر (کرناٹک)

ڈاکٹر مقبول احمد مقبول مشہور رباعی گو شاعر ہیں۔اس کے علاوہ وہ مہاراشٹرا اودے گیری کالج کے پروفیسر شعبۂ اردو ہیں۔ان کی ادبی خدمات کے اعتراف میں کمال الدین شمیمؔ نے یہ تہنیتی نظم لکھی ہے۔(ادارہ)

لکھ رہا ہوں تہنیت میں ڈاکٹر مقبولؔ کی
گلشنِ اردو ادب کے اک مہکتے پھول کی

کیا بتاؤں میں، کہ اس کی کیا نرالی شان ہے
اہلِ علم وفن میں اس کی بن گئی پہچان ہے

اِس کے علم وفن کا چرچا دیکھیے ہے چارسُو
مل گیا اِس کو صلہ جو اِس نے کی ہے جستجو

شاعری کا اِس کی بالکل منفرد انداز ہے
درحقیقت اِس کی شہرت کا یہی تو راز ہے

ہے سبھی اصنافِ شعری پر اسے کامل عبور
خود ستائی سے مگر رکھا ہے اس نے خود کو دور

جذبہ پاکیزہ ہے اس کا فکر ہے اس کی نظیف
اس کا اندازِ بیاں سب سے الگ، سب سے لطیف

اس کے ہر اک شعر میں آباد معنی کا جہاں
بے شک اس کی شاعری ہے حق بیانی کا نشاں

تمہارے دوستوں [1] کو ضعف دل ضعف بصارت ہے
دلاسا تم ہو پیری کا اندھیرے کا دیا تم ہو

بتا دو صاف رستہ ہم کو تم قومی ترقی کا
کہ ہم گم کردہ رہ ہیں ہمارے رہنما تم ہو

وقار الملکؔ کی قوت ہو، حالؔی کی زباں تم ہو
تو ہر مہدیٔ امت کی بس آنکھوں کی ضیا تم ہو

یہی کافی نہیں ہے، قوت بازو ہی ہو ان کی
اور ان کے قلب کی قوت ہو، سینے کی صفا تم ہو

جو ہیں محتاج رہبر افسران مدرسہ سید
تو بک [2] مرحوم یہ کہہ دو کہ ان کے رہنما تم ہو

یہ سب کچھ ہو مگر ان اولڈ بوائز سے بھی تو کہہ دو
تمہیں محسن بنو اس کے وقار اس قوم کا تم ہو

(1)اشارہ نواب محسن الملک، (2)اشارہ تھیوڈ بیک
(بشکریہ کلامِ جوہر، سنہ اشاعت:1936، ناشر مکتبہ جامعہ، صفحہ:33-29)

...

ڈاکٹر مقبول احمد مقبول

کمال الدین شمیمؔ
بیدر (کرناٹک)

ڈاکٹر مقبول احمد مقبول مشہور رباعی گو شاعر ہیں۔اس کے علاوہ وہ مہاراشٹرا اودے گیری کالج کے پروفیسر شعبۂ اردو ہیں۔ان کی ادبی خدمات کے اعترف میں کمال الدین شمیمؔ نے یہ تہنیتی نظم لکھی ہے۔(ادارہ)

لکھ رہا ہوں تہنیت میں ڈاکٹر مقبولؔ کی
گلشنِ اردو ادب کے اک مہکتے پھول کی

کیا بتاؤں میں، کہ اس کی کیا نرالی شان ہے
اہلِ علم وفن میں اس کی بن گئی پہچان ہے

اِس کے علم وفن کا چرچا دیکھیے ہے چارسُو
مل گیا اِس کو صلہ جو اِس نے کی ہے جستجو

شاعری کا اِس کی بالکل منفرد انداز ہے
درحقیقت اِس کی شہرت کا یہی تو راز ہے

ہے سبھی اصنافِ شعری پر اسے کامل عبور
خود ستائی سے مگر رکھا ہے اس نے خود کو دور

جذبہ پاکیزہ ہے اس کا فکر ہے اس کی نظیف
اس کا اندازِ بیاں سب سے الگ، سب سے لطیف

اس کے ہر اک شعر میں آباد معنی کا جہاں
بے شک اس کی شاعری ہے حق بیانی کا نشاں

قوم کی بگڑی ہوئی حالت پہ ہردم بے قرار
قوم کی اصلاح کی رہتی ہے اس پر دُھن سوار

اپنے فن سے قوم کی اصلاح کا لیتا ہے کام
اس کی خاطر حسبِ طاقت کر رہا ہے اہتمام

اس لیے عزت بڑی، اس کا بڑا ہے احترام
جستجو سے رات دن کی مل گیا ہے یہ مقام

کیا کروں میں تذکرہ اخلاق کا کردار کا
اصل میں پیکر ہے یارو! یہ خلوص اور پیار کا

اس کو اپنے علم اور فن پر نہیں ہر گز غرور
اِس سے ہوگا نام اِس کا اور بھی اونچا ضرور

سادگی کا اِس کا آخر ذکر میں کیوں کر کروں
ہے عیاں جو بات سب پر،اُس پر اب میں کیا کہوں

شاعری کا اس کی ہے انداز دلکش،دلنشیں
اپنے اطراف و جوانب میں کوئی ایسا نہیں

ایک مدت سے ہے یہ اردو کا جو خدمت گزار
گلشنِ اردو ادب ہے اس کے دم سے پُر بہار

پیشۂ تدریس ہے محبوب اس کا مشغلہ
یہ یقیناً خدمتِ اردو کا پائے گا صلہ

بن گیا مقبولؔ اب جو صاحبِ دیوان ہے
شاعری کی اُس کی، اِس سے بن گئی پہچان ہے

دل کی گہرائی سے میں کرتا ہوں اس کا احترام
میری نظروں میں بلندو بالا ہے اس کا مقام

پورے اخلاص ومحبت سے میں کرتا ہوں دعا
حاسدانِ وقت سے اس کو بچا لے یا خدا !

سرفرازی دوجہاں کی اس کو یارب !ہو عطا
درگذر سے کام لے سرزد ہو گر کوئی خطا

دین کا داعی بنا، اسلام کا کچھ کام لے
اپنے ہاتھوں میں یہ کچھ کارِ نبوت تھام لے

یا خدا! تیرا یہ بندہ ہے بڑے ہی کام کا
ہے زباں پر اس کی چرچا بس ترے ہی نام کا

میرے احساسات کا اظہار ہے یہ اے شمیم
کوئی یہ ہرگز نہ سمجھے، کارنامہ ہے عظیم

...

Kamaluddin Shameem
H.No.2-1-171,Cimkori Gali
Hydar Chowk,Taleem Siddeeq Shah
Bidar-585401,Karnataka State
Mob:8482220707/9632455851

قوم کی بگڑی ہوئی حالت پہ ہردم بے قرار
قوم کی اصلاح کی رہتی ہے اس پر دُھن سوار

اپنے فن سے قوم کی اصلاح کا لیتا ہے کام
اس کی خاطر حسبِ طاقت کر رہا ہے اہتمام

اس لیے عزت بڑی، اس کا بڑا ہے احترام
جستجو سے رات دن کی مل گیا ہے یہ مقام

کیا کروں میں تذکرہ اخلاق کا کردار کا
اصل میں پیکر ہے یارو! یہ خلوص اور پیار کا

اس کو اپنے علم اور فن پر نہیں ہر گز غرور
اِس سے ہوگا نام اِس کا اور بھی اونچا ضرور

سادگی کا اِس کا آخر ذکر میں کیوں کر کروں
ہے عیاں جو بات سب پر،اُس پر اب میں کیا کہوں

شاعری کا اس کی ہے انداز دلکش،دلنشیں
اپنے اطراف و جوانب میں کوئی ایسا نہیں

ایک مدت سے ہے یہ اردو کا جو خدمت گزار
گلشنِ اردو ادب ہے اس کے دم سے پُر بہار

پیشۂ تدریس ہے محبوب اس کا مشغلہ
یہ یقیناً خدمتِ اردو کا پائے گا صلہ

بن گیا مقبولؔ اب جو صاحبِ دیوان ہے
شاعری کی اُس کی، اِس سے بن گئی پہچان ہے

دل کی گہرائی سے میں کرتا ہوں اس کا احترام
میری نظروں میں بلندو بالا ہے اس کا مقام

پورے اخلاص ومحبت سے میں کرتا ہوں دعا
حاسدانِ وقت سے اس کو بچا لے یا خدا !

سرفرازی دوجہاں کی اس کو یارب !ہو عطا
درگذر سے کام لے سرزد ہو گر کوئی خطا

دین کا داعی بنا، اسلام کا کچھ کام لے
اپنے ہاتھوں میں یہ کچھ کارِ نبوت تھام لے

یا خدا! تیرا یہ بندہ ہے بڑے ہی کام کا
ہے زباں پر اس کی چرچا بس ترے ہی نام کا

میرے احساسات کا اظہار ہے یہ اے شمیمؔ
کوئی یہ ہرگز نہ سمجھے، کارنامہ ہے عظیم

...

Kamaluddin Shameem
H.No.2-1-171,Cimkori Gali
Hydar Chowk,Taleem Siddeeq Shah
Bidar-585401,Karnataka State
Mob:8482220707/9632455851

قوم کی بگڑی ہوئی حالت پہ ہردم بے قرار
قوم کی اصلاح کی رہتی ہے اس پر دُھن سوار

اپنے فن سے قوم کی اصلاح کا لیتا ہے کام
اس کی خاطر حسبِ طاقت کر رہا ہے اہتمام

اس لیے عزت بڑی، اس کا بڑا ہے احترام
جستجو سے رات دن کی مل گیا ہے یہ مقام

کیا کروں میں تذکرہ اخلاق کا کردار کا
اصل میں پیکر ہے یارو! یہ خلوص اور پیار کا

اس کو اپنے علم اور فن پر نہیں ہر گز غرور
اِس سے ہوگا نام اِس کا اور بھی اونچا ضرور

سادگی کا اِس کا آخر ذکر میں کیوں کر کروں
ہے عیاں جو بات سب پر،اُس پر اب میں کیا کہوں

شاعری کا اس کی ہے انداز دلکش،دلنشیں
اپنے اطراف و جوانب میں کوئی ایسا نہیں

ایک مدت سے ہے یہ اردو کا جو خدمت گزار
گلشنِ اردو ادب ہے اس کے دم سے پُر بہار

پیشۂ تدریس ہے محبوب اس کا مشغلہ
یہ یقیناً خدمتِ اردو کا پائے گا صلہ

بن گیا مقبولؔ اب جو صاحبِ دیوان ہے
شاعری کی اُس کی، اِس سے بن گئی پہچان ہے

دل کی گہرائی سے میں کرتا ہوں اس کا احترام
میری نظروں میں بلندو بالا ہے اس کا مقام

پورے اخلاص ومحبت سے میں کرتا ہوں دعا
حاسدانِ وقت سے اس کو بچا لے یا خدا !

سرفرازی دوجہاں کی اس کو یارب !ہو عطا
درگذر سے کام لے سرزد ہو گر کوئی خطا

دین کا داعی بنا، اسلام کا کچھ کام لے
اپنے ہاتھوں میں یہ کچھ کارِ نبوت تھام لے

یا خدا! تیرا یہ بندہ ہے بڑے ہی کام کا
ہے زباں پر اس کی چرچا بس ترے ہی نام کا

میرے احساسات کا اظہار ہے یہ اے شمیم
کوئی یہ ہرگز نہ سمجھے، کارنامہ ہے عظیم

...

Kamaluddin Shameem
H.No.2-1-171,Cimkori Gali
Hydar Chowk,Taleem Siddeeq Shah
Bidar-585401,Karnataka State
Mob:8482220707/9632455851

نامے

قارئین کے تاثرات

● **نور شاہ، سری نگر، جموں و کشمیر (موبائل:8899637012)**: شاہ عمران حسن! کتابی سلسلہ 'آپ بیتی' کا پہلا شمارہ (مئی جون 2023ء) واقعی پاکیزگی اور شفافیت سے بھرپور ہے اور انسانی ذہنوں کو سیراب کرنے میں مدد کرتا ہے۔ قلم کاروں نے اپنی داستانوں کو نہایت سریلے اور رواں دواں انداز میں سلیقہ مندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ بوریت کا احساس تک نہیں۔ قلم کار جب خود ہی اپنے چہروں سے نقاب الٹ دیتے ہیں تو اُن کی داستانیں اور بھی دلچسپ بن جاتی ہیں۔ بہت سی کہی ان کہی باتوں کی جانکاری ملتی ہے اور ان کی کڑواہٹ مٹھاس میں بدل جاتی ہے۔ آپ کی ترتیب و تہذیب میں ایک نئے پن کا احساس ہوتا ہے۔ ہم نے حال ہی میں (24 جون 2023ء) نگینہ انٹرنیشنل (سری نگر) کی ایک پُروقار محفل ہیں 'آپ بیتی' کی رونمائی بھی کی تھی۔

● **مشتاق احمد نوری، پٹنہ، بہار (موبائل:9771276062)** پیارے شاہ عمران حسن!

بھائی تم بھی کمال کرتے ہو
دھوتی پھاڑ کر رومال کرتے ہو

یہ اچانک بت خانے میں اذان دینا شروع کر دیا۔ ہزاروں ادبی رسالوں کی بھیڑ میں 'آپ بیتی' سنانے لگ گئے۔ ایک بات کہوں 'آپ بیتی' سننے اور پڑھنے میں اچھی لگتی ہے۔ ماضی کی سوندھی مٹّی میں جب یادوں کے کونپل نکلتے ہیں تو بڑے بھلے لگتے ہیں۔ سنہری یادوں کے پنکھ نکل جاتے ہیں، تھوڑی دیر کے لیے وقت کی گردش رُک جاتی ہے اور پڑھنے والا شخص کھٹی میٹھی یادوں سے اوت پروت ہونے لگتا ہے۔

جانتے ہو کتابی سلسلہ 'آپ بیتی' کا پہلا شمارہ (بابت مئی جون 2023ء) ملتے ہی میں ابا (حفیظ الدین احمد) کی یادوں میں کھو گیا۔ ان کی چلت پھرت نظر آنے لگی۔ تحریر میری ہی تھی لیکن 11 ٹکروں میں لکھی لیکن جب ایک ساتھ پڑھا تو 'بھاوک' ہو گیا۔ کبھی آنکھیں وضو کرنے لگیں، کبھی حروف دھندلے پڑنے لگے تو کبھی مسکرایا بھی۔ پھر اچانک خیال آیا کہ اب ابا کہاں رہے لیکن کسی نے سرگوشی کی وہ گئے ہی کب ہیں۔ تمہاری 'آپ بیتی' میں زندہ ہیں۔ تمہارا شکر گزار ہوں کہ تمہاری وجہ سے ہی ساری قسطیں ساتھ آ گئیں۔ میں تو ہار گیا تھا لیکن تم نے گم شدہ کڑیوں کو تلاش کر؛ میرا حوصلہ بڑھا دیا۔

بزرگوں کی سوانح بہت کچھ سیکھ دے گئی۔ بھائی نورالحسنین اور ڈاکٹر شاہد جمیل کی آپ بیتیوں نے ان کی تعلیمی زندگی میں جھانکنے کا موقع دیا۔ کچھ تحریر بھرتی کے لگے یعنی لکھنا تھا لکھ دیا۔

صدیقہ بیگم کا آخری خط اپنے شوہر اطہر پرویز کے نام بہت دلچسپ انداز میں لکھا گیا۔ پروفیسر شارب

رودولوی نے بھی اپنی بیگم شمیم نکہت پر بہت اچھا خاکہ لکھا۔ زندگی کی کھٹی میٹھی یادیں پروس دیں۔ شمیم نکہت کا زندگی نامہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ ان کے حوصلے کی اڑان، ان کی غمگساری اور ان کی شائستگی کا نمونہ ہے جوان کے وقار میں اضافہ کرتا ہے۔ شخصیت پر دیگر تحریر بھی رسالے کا وقار بڑھاتی ہے۔

پیارے تم نے بھی ایک سفر کیا۔ ایک غیر معروف شہر 'شاملی' کا جس کا نام میں نے نہیں سنا تھا۔ سوچا پڑھ لوں کہ شاملی کو جان جاؤں لیکن اس سفر نامے میں شاملی کہاں ہے؟ میں نے بہت سا سفر نامہ پڑھا ہے جس میں سفر کئے گئے شہر کا بھرپور تذکرہ ہے لیکن پیارے تمہارے اس سفر نامے نے میرے چودہ طبق روشن کر دیے (اگر اور بھی طبق ہوتے تو وہ بھی روشن ہو جاتے) بھائی ایسے بھی کوئی سفر نامہ لکھتا ہے۔

بس اسٹینڈ کسی سفر کا پہلا پڑاؤ ہوتا ہے لیکن کوئی یہ تھوڑے بتاتا ہے کہ یہاں 166 بسیں کھڑی ہو سکتی ہیں روزانہ 1800 بسیں مسافروں کو لیکر مختلف روٹ پر نکلتی ہیں۔ بس پانی پت سے روزانہ گزرتی ہیں لیکن تم نے پانی پت کی تینوں لڑائیوں کی تفصیل بتادی۔ مجھے ان جنگوں کی تھوڑی جانکاری تھی لیکن تم نے تفصیل بتائی کہ پانی پت کی پہلی جنگ ظہیر الدین بابر اور دہلی کے سلطان ابراہیم لودھی سے 1526 میں ہوئی تھی۔ ابراہیم لودھی کی ایک لاکھ سے زاید فوج کو بابر کی بارہ ہزار کی فوج نے روند کر رکھ دیا۔ تم یہیں نہ رکے 1556 اور 1761 کی پانی پت کی جنگوں کی تفصیل لکھ کر میرے علم میں اضافہ کیا۔

پانی پت کے حوالے سے مولانا الطاف حسین حالی کا بھی ذکر خیر ہوا۔ راستے میں سرنگوں ترنگے پر نظر پڑتے ہی تم نے ملکہ الزبیتھ کی موت کی خبر کے ساتھ یہ بھی بتا گئے کہ وہ تین بار ہندوستان کے دورے پر آئیں اور تم ملکہ کی جیون گاتھا بھی سنا گئے۔ شاملی کے ایک علاقے کا نام 'کاندھلہ' ہے تو تم نے مولانا محمد الیاس کاندھلوی کا ذکر شروع کر کے بتایا کہ انھوں نے 1926 تبلیغ شروع کی پھر 'تبلیغی جماعت' کی تفصیل سامنے آگئی۔

اس سفر نامے میں وہ سب کچھ ہے جو دیگر سفر نامے میں نہیں ہوتا۔ مجھے محسوس ہوا کہ تمہارے پاس 'بھانومتی' کا پٹارہ ہے جب چاہتے ہو پٹارے سے ایک داستان لیکر بیٹھ جاتے۔ عزیزم یقین جانو میں نے ایسا 'نادر سفر نامہ' پہلی بار پڑھا۔ رسالے کے تینوں تبصرے بہت جامع اور دلچسپ ہیں جو کتاب پڑھنے پر اکساتے ہیں۔ اس بار نئی دہلی کے سفر میں یہ تینوں کتابیں تمہاری معرفت حاصل کرونگا ان شاءاللہ۔

تمہاری کاوش نے متحیر کر دیا ساتھ ہی تمہارے ذہن کی اس 'خوبصورت کجروی' نے واہ واہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ اب دیگر ادب نواز بھی اپنی سوانح یا خاکے لے کر حاضر ہوں گے اور ادبی خزانے کو مالا مال کریں گے۔

● **معین الدین عثمانی، جلگاؤں، مہاراشٹر (موبائل: 9921299749)**: اپنی نوعیت کا منفرد رسالہ 'آپ بیتی' کتابی شکل میں جب دستیاب ہوا تو یوں لگا جیسے ادبی خزاں کے ویرانے موسم میں اچانک بہار سی آگئی ہو۔ اپنی اب تک کی ادبی زندگی میں اس طرح کے رسالے سے پہلی مرتبہ روشناس ہونے کا موقع ملا تو

مسرت کے احساس نے بھی آ گھیرا۔ میرا یقین ہے کہ میری طرح اوروں کی رسالے میں دلچسپی کی بڑی وجہ انسانی نفسیات کی کارگزاری ہی ہو سکتی ہے کہ ہر کوئی فی زمانہ اپنے ذاتی جھروکے سے دوسرے کے آنگن میں جھانکنے کا خواہشمند ہوتا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ رسائل میں خطوط کے کالم بھی اب اولین صفحات میں جگہ پانے لگے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ رسالہ کی مشمولات نے مہینے بھر کے مطالعے کا سامان مہیا فرما کر ادب نوازی کو جلا بخشی ہے۔ تقریباً تین سو صفحات (288) کی ضخامت میں ادب کی متروک اصناف کے علاوہ فوری توجہ کی مستحق اصناف کے مواد کو خاطر خواہ جگہ فراہم کر کے شاہ عمران حسن نے غیر معمولی فریضہ انجام دیا ہے۔ میرے خیال سے اتنے سارے اہم قلمکاروں کو ان کی مقتدر نگارشات کے ہمراہ پیش کرنا بھی کسی تخلیقی مرحلے سے کم نہیں گردانا جانا چاہئے۔

اداریے کے تحت دل لگتی باتیں تو سوانحی سرگزشت میں کلاسکی اور موجود فنکاروں کے احساسات کو مدیر محترم شاہ عمران حسن کے حسن ترتیب نے جس طرح منور کیا ہے اس کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہے۔ شخصیات کے کالم میں قلمکار کے ہمراہ شخصیات کا قاری کے روبرو ہونے سے تحریر میں دوام کی کیفیت آ گئی ہے۔ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ کس کس کو مبارکباد پیش کی جائے۔ مزید اس پر مصاحبوں اور سفرناموں نے سونے پر سہاگہ کا کام انجام دیا ہے۔ اخیر میں بس اتنا ہی عرض ہے کہ اس قدر وقیع اور معیاری مواد کے ساتھ رسالہ پیش کرنے پر دلی مبارک باد واجب ہے؛ توقع ہے کہ اہلِ اردو کا تعاون تادیر شامل حال رہے گا۔

● **ذوالفقار علی بخاری (کراچی، پاکستان)**: شاہ عمران حسن کا شمار ان احباب میں ہوتا ہے جو کچھ خاص کر دکھانے کو اپنی زندگی کا مقصد حیات بنائے ہوئے ہیں۔ شاہ عمران حسن معروف اسکالر اور قلم کار ہیں۔ ان کا 'ادھورے خواب' کے نام سے افسانوی مجموعہ شائع ہو چکا ہے جب کہ حیاتِ رحمانی، اوراقِ حیات، حیاتِ ولی اور حیاتِ غامدی کے نام سے منظر عام پر آنے والی کتب نے خاصی مقبولیت حاصل کی ہے۔ شاہ عمران حسن اردو سوانحی ادب میں تیزی سے اپنا مقام بنا رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنے لیے ایک خاص میدان چنا ہے۔ مجھے ان احباب سے گہری محبت ہے جو پاکیزہ سوچ کے ساتھ ادب کے فروغ کے لیے زندگی وقف کرتے ہیں۔ شاہ عمران حسن نے کتابی سلسلہ 'آپ بیتی' کے آغاز کا فیصلہ کیا ہے جس میں سات موضوعات شخصیات، خودنوشت، انٹرویو، اسفار، تبصرے (سوانحی کتب پر)، منظوم کلام (منقبت، سوانحی نظمیں)، نامے (مدیر کے نام) شامل ہیں۔ یہ ایک بہترین آغاز ہے اس کی بدولت کئی نام ور اور نئے ادیبوں کے حوالے سے تحریریں پڑھنے کو ملیں گی۔ میری خواہش ہے کہ کتابی سلسلہ 'آپ بیتی' کامیابی سے ہمکنار ہو۔ اردو ادب میں ایسا سلسلہ نئے رجحان کا سبب بنے۔ مجھے یقین ہے کہ دیگر ممالک میں بھی کچھ ایسا کام ہوتا دکھائی دے گا جس کا سہرا یقینی طور شاہ عمران حسن کے سر ہوگا کہ انھوں نے پہل کی ہے۔ شاباش شاہ عمران حسن صاحب!

● پروفیسر مقبول احمد مقبول، اُودگیر، ضلع لاتور، مہاراشٹر (موبائل:9028598414): شاہ عمران حسن!

'آپ بیتی' کا پہلا شمارہ ہمدست ہوا۔ رسالوں کی بھیڑ میں 'آپ بیتی' کا کتابی سلسلہ یقیناً اپنی نوعیت کا منفرد جریدہ ہے۔ اس منفرد نوعیت کے کتابی سلسلے کا اجرا آپ کی تجربہ پسند طبیعت اور کچھ نیا کر دکھانے کا غماز ہے۔ یہی نہیں بلکہ آپ کا یہ اقدام، سوانحی ادب سے آپ کی گہری دلچسپی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ قریب قریب آدھی کتاب پڑھ لی ہے۔ خودنوشت کے حصے میں 'اپنی عمر کے پچاس سال' (مولانا محمد علی جوہر) اور 'رودادِ چمن' (مولانا وحیدالدین خاں) بڑے شوق سے پڑھا۔ ان بزرگوں کے اوراقِ حیات سے بہت ساری دلچسپ ، انوکھی اور سبق آموز باتیں معلوم ہوئیں۔ ایسی شخصیات کی زندگی کے واقعات ہمارے اندر حوصلہ، امنگ اور تحرک پیدا کرتے ہیں۔ پروفیسر مظفر حنفی کی خودنوشت سے ان کی تگ ودو اور جستجو کا خوب خوب اندازہ ہوتا ہے۔ پروفیسر یعقوب یاور کے تقرر کی داستان میں بڑی ڈرامائیت نظر آئی۔ سید معظم راز کی خودنوشت بھی بڑی دلچسپ ہے۔ مکرم نیاز کا اپنے نانا خسر پر خاکہ نما مضمون شگفتگی کا حامل ہے۔ تبصرے کے حصے میں تینوں مبصرین کے تبصرے معقول اور متوازن ہیں۔ خاص طور سے محمد علم اللہ کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ آپ کے سفرنامے 'شمالی کا سفر' کے مطالعے سے اندازہ ہوا کہ آپ اچھے سوانح نگار کے ساتھ ساتھ اچھے سفرنامہ نگار بھی ہیں۔ آپ نے صفحہ 258 پر محمود علی رامپوری کا درج ذیل شعر نقل کیا ہے:

موت اس کی ہے کرے زمانہ جس کا افسوس
ورنہ دنیا میں آئے ہیں کبھی مرنے کے لیے

یہ شعر غلط نقل ہوا ہے۔ دراصل یہ شعر یوں ہے:

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز کی خودنوشت ''سچ تو مگر کہنے دو'' کے صفحہ نمبر 145 پر ایک شعر یوں درج ہے:

حفاظت جس سفینے کی انھیں منظور ہوتی ہے
کنارے تک اسے لاکر خود طوفاں چھوڑ جاتے ہیں

اس شعر کا ثانی مصرع دراصل اس طرح ہے:

کنارے تک اسے خود لا کے طوفاں چھوڑ جاتے ہیں

ابھی بہت سی نگارشات پڑھنا باقی ہے۔ یہ خط مختصر تاثرات کے ساتھ بطورِ رسید ارسال ہے۔ بہر حال آپ قابلِ مبارکباد ہیں کہ اردو رسائل کی دنیا میں ایک انوکھے رسالے کا اجرا کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ساری اردو دنیا میں خالص غیر افسانوی ادب کی ترویج و اشاعت کے حوالے سے شائع ہونے والا یہ پہلا رسالہ ہے۔ اللہ اس کی عمر دراز فرمائے۔ آمین!

● **ڈاکٹر الطاف انجم (موبائل:7006425827، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر)**: شاہ عمران حسن! یقیناً علم و ادب کی ترویج وترقی میں وہی لوگ آگے بڑھتے ہیں جو صاحبِ ذوق ہونے کے ساتھ ساتھ عمدہ اوراعلیٰ ثقافتی شعور بھی رکھتے ہیں۔آپ نے 'آپ بیتی' کے نام سے جو کتابی سلسلہ شروع کیا ہے؛ وہ باذوق قارئین کی ایک بڑی ضرورت کو نہ صرف پورا کرے گا بلکہ سوانحی اور خودنوشت قسم کی تحریروں کی تخلیق کے لیے بھی اہلِ قلم خواتین وحضرات کا رجحان مزید جڑ جائے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ فی زمانہ بلکہ کہنا چاہئے کہ ابتدا سے ہی ہر ادبی رسالے اور جریدے میں تنقیدی اور تحقیقی مضامین کی کثرت ہوتی ہے، جس کی وجہ سے تخلیقی ادب کی کمی شدت سے محسوس کی جاتی رہی ہے۔میرے خیال میں یہ اُردو دُنیا کا واحد اور بیدار رسالہ ہے جو خالص 'سوانحی تحریروں' پر مشتمل ہے۔میں ذاتی طور پر اردو کے تئیں آپ کی جذباتی وابستگی کی دل سے قدر کرتا ہوں اور اس رسالہ کے اجرائی کے لیے صمیم قلب سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

آپ نے اداریے میں جن حقائق کو پیش کئے ہیں۔ان سے اردو کا سنجیدہ قاری واقف بھی ہے اور پریشان بھی۔لہٰذا آپ کی اس بات سے ذاتی طور پر اتفاق کرنے میں تامل ہے کہ 'ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا ہے، ہم اخبار ورسائل کی آمد کا شدت سے انتظار کرتے تھے۔پسندیدہ اخبار ورسائل مقامی کتب فروش سے لے لیا کرتے تھے اور کچھ ڈاک سے منگواتے تھے۔' (کتابی سلسلہ آپ بیتی-1، شمارہ مئی جون 2023ء، صفحہ:5) میں یقین سے کہتا ہوں کہ آج بھی بعض افراد اسی انہماک اور اضطراب کے ساتھ رسائل وجرائد نیز اخبارات کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں، بشرطیکہ وہ رسائل، جرائد، اخبارات ان کے ذوق وشوق کے تپتے صحراؤں کو باراں سے سرسبز و شاداب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔آپ کا یہ کتابی سلسلہ مجھے ذاتی طور پر پسند ہے اور اس لیے مجھے اس کے دوسرے شمارے کا انتظار رہے گا۔ان شاءاللہ!

● **عامر اقبال، نئی دہلی (موبائل:7207981626)**: عرصہ دراز کے بعد آپ کے تحریر کردہ سفرنامہ 'شاملی کا سفر' سے روبرو ہونے کا موقع ملا، آپ کی ہر تحریر، ہر مضمون جامع اور اعلیٰ معیار کی ہوتی ہیں۔زیرِ نظر مضمون کو از اوّل تا آخر پڑھنے کے بعد ریاست اتر پردیش کے مردم خیز علاقوں میں سے چند علاقے جیسے کیرانہ، شاملی، تھانہ بھون سمیت دیگر علاقہ جات کی علمی، ثقافتی، سماجی، اور مذہبی سرگرمیوں سے واقفیت ہوئی۔اس کے علاوہ آپ کے مضمون کی جس طرزِ ادا نے مضمون کو دلچسپ بنا کر قاری کو تجسس کے ساتھ پڑھنے پر آمادہ کیا ہے وہ نمایاں اسلوب یہ ہے کہ آپ نے جن شخصیات یا پھر جن مقامات کا ذکر کیا ہے ان کی تاریخی اور جغرافیائی خدوخال پر کبھی اجمالاً تو کہیں بقدرِ ضرورت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، یہ چیزیں دیگر مضمون نگاروں یا مصنفوں کی تحریر سے مستثنیٰ رہتی ہیں۔

● **پروفیسر مقبول احمد مقبول، اُودگیر ضلع لاتور مہاراشٹر (موبائل: 9028598414):** شاہ عمران حسن!

'آپ بیتی' کا پہلا شمارہ ہمدست ہوا۔ رسالوں کی بھیڑ میں 'آپ بیتی' کا کتابی سلسلہ یقیناً اپنی نوعیت کا منفرد جریدہ ہے۔ اس منفرد نوعیت کے کتابی سلسلے کا اجرا آپ کی تجربہ پسند طبیعت اور کچھ نیا کر دکھانے کا غماز ہے۔ یہی نہیں بلکہ آپ کا یہ اقدام، سوانحی ادب سے آپ کی گہری دلچسپی کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ قریب قریب آدھی کتاب پڑھ لی ہے۔ خودنوشت کے حصے میں 'اپنی عمر کے پچاس سال' (مولانا محمد علی جوہر) اور 'رودادِ چمن' (مولانا وحیدالدین خاں) بڑے شوق سے پڑھا۔ ان بزرگوں کے اوراقِ حیات سے بہت ساری دلچسپ، انوکھی اور سبق آموز باتیں معلوم ہوئیں۔ ایسی شخصیات کی زندگی کے واقعات ہمارے اندر حوصلہ، امنگ اور تحرک پیدا کرتے ہیں۔ پروفیسر مظفر حنفی کی خودنوشت سے ان کی تگ ودو اور جستجو کا خوب خوب اندازہ ہوتا ہے۔ پروفیسر یعقوب یاور کے تقرر کی داستان میں بڑی ڈرامائیت نظر آئی۔ سید معظم راز کی خودنوشت بھی بڑی دلچسپ ہے۔ مکرم نیاز کا اپنے نانا خسر پر خاکہ نما مضمون شگفتگی کا حامل ہے۔ تبصرے کے حصے میں تینوں مبصرین کے تبصرے معقول اور متوازن ہیں۔ خاص طور سے محمد علم اللہ کا تبصرہ بہت پسند آیا۔ آپ کے سفرنامے 'شاملی کا سفر' کے مطالعے سے اندازہ ہوا کہ آپ اچھے سوانح نگار کے ساتھ ساتھ اچھے سفرنامہ نگار بھی ہیں۔ آپ نے صفحہ 258 پر محمود علی رامپوری کا درجِ ذیل شعر نقل کیا ہے:

موت اس کی ہے کرے زمانہ جس کا افسوس
ورنہ دنیا میں آئے ہیں کبھی مرنے کے لیے

یہ شعر غلط نقل ہوا ہے۔ دراصل یہ شعر یوں ہے:

موت اس کی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس
یوں تو دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کے لیے

ڈاکٹر سید فاضل حسین پرویز کی خودنوشت ''سچ تو مگر کہنے دو'' کے صفحہ نمبر 145 پر ایک شعر یوں درج ہے:

حفاظت جس سفینے کی انھیں منظور ہوتی ہے
کنارے تک اسے لاکر خود طوفاں چھوڑ جاتے ہیں

اس شعر کا ثانی مصرع دراصل اس طرح ہے:

کنارے تک اسے خود لا کے طوفاں چھوڑ جاتے ہیں

ابھی بہت سی نگارشات پڑھنا باقی ہے۔ یہ خط مختصر تاثرات کے ساتھ بطورِ رسید ارسال ہے۔ بہرحال آپ قابلِ مبارکباد ہیں کہ اردو رسائل کی دنیا میں ایک انوکھے رسالے کا اجرا کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ساری اردو دنیا میں خالص غیر افسانوی ادب کی ترویج واشاعت کے حوالے سے شائع ہونے والا یہ پہلا رسالہ ہے۔ اللہ اس کی عمر دراز فرمائے۔ آمین!

● **ڈاکٹر الطاف انجم (موبائل: 7006425827؛ کشمیر یونیورسٹی، سری نگر)**: شاہ عمران حسن! یقیناً علم و ادب کی ترویج و ترقی میں وہی لوگ آگے بڑھتے ہیں جو صاحبِ ذوق ہونے کے ساتھ ساتھ عمدہ اور اعلیٰ ثقافتی شعور بھی رکھتے ہیں۔ آپ نے 'آپ بیتی' کے نام سے جو کتابی سلسلہ شروع کیا ہے؛ وہ باذوق قارئین کی ایک بڑی ضرورت کو نہ صرف پورا کرے گا بلکہ سوانحی اور خودنوشت قسم کی تحریروں کی تخلیق کے لیے بھی اہلِ قلم خواتین وحضرات کا رجحان مزید جڑ جائے گا۔

واقعہ یہ ہے کہ فی زمانہ بلکہ کہنا چاہئے کہ ابتدا سے ہی ہر ادبی رسالے اور جریدے میں تنقیدی اور تحقیقی مضامین کی کثرت ہوتی ہے، جس کی وجہ سے تخلیقی ادب کی کمی شدت سے محسوس کی جاتی رہی ہے۔ میرے خیال میں یہ اُردو دُنیا کا واحد اور بیدار رسالہ ہے جو خالص 'سوانحی تحریروں' پر مشتمل ہے۔ میں ذاتی طور پر اردو کے تئیں آپ کی جذباتی وابستگی کی دل سے قدر کرتا ہوں اور اس رسالہ کے اجرائی کے لیے صمیم قلب سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

آپ نے اداریے میں جن حقائق کو پیش کئے ہیں۔ ان سے اردو کا سنجیدہ قاری واقف بھی ہے اور پریشان بھی۔ لہٰذا آپ کی اس بات سے ذاتی طور پر اتفاق کرنے میں تامل ہے کہ 'ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا ہے، ہم اخبار و رسائل کی آمد کا شدت سے انتظار کرتے تھے۔ پسندیدہ اخبار و رسائل مقامی کتب فروش سے لے لیا کرتے تھے اور کچھ ڈاک سے منگواتے تھے۔' (کتابی سلسلہ آپ بیتی-1، شمارہ مئی جون 2023ء، صفحہ:5) میں یقین سے کہتا ہوں کہ آج بھی بعض افراد اسی انہماک اور اضطراب کے ساتھ رسائل و جرائد نیز اخبارات کا انتظار کررہے ہوتے ہیں، بشرطیکہ وہ رسائل، جرائد، اخبارات ان کے ذوق وشوق کے تپتے صحراؤں کو باراں سے سرسبز و شاداب کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ آپ کا یہ کتابی سلسلہ مجھے ذاتی طور پر پسند ہے اور اس لیے مجھے اس کے دوسرے شمارے کا انتظار رہے گا۔ ان شاء اللہ!

● **عامر اقبال، نئی دہلی (موبائل: 7207981626)**: عرصہ دراز کے بعد آپ کے تحریر کردہ سفر نامہ 'شاملی کا سفر' سے روبرو ہونے کا موقع ملا، آپ کی ہر تحریر، ہر مضمون جامع اور اعلیٰ معیار کی ہوتی ہیں۔ زیر نظر مضمون کو از اوّل تا آخر پڑھنے کے بعد ریاست اتر پردیش کے مردم خیز علاقوں میں سے چند علاقے جیسے کیرانہ، شاملی، تھانہ بھون سمیت دیگر علاقہ جات کی علمی، ثقافتی، سماجی، اور مذہبی سرگرمیوں سے واقفیت ہوئی۔ اس کے علاوہ آپ کے مضمون کی جس طرزِ ادا نے مضمون کو دلچسپ بنا کر قاری کو تجسس کے ساتھ پڑھنے پر آمادہ کیا ہے وہ نمایاں اسلوب یہ ہے کہ آپ نے جن شخصیات یا پھر جن مقامات کا ذکر کیا ہے ان کی تاریخی اور جغرافیائی خدوخال پر کبھی اجمالاً تو کہیں بقدر ضرورت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے، یہ چیزیں دیگر مضمون نگاروں یا مصنفوں کی تحریر سے مستثنیٰ رہتی ہیں۔

مثلاً آپ نے جب عمارتوں پر قومی پرچم کو سرنگوں دیکھا تو اس کی وجہ یہ تھی کی ملکہ الزابیتھ کے سوگ میں اسے سرنگوں کیا گیا تھا۔ پھر آپ نے ملکہ الزابیتھ کے کارنامے، ان کے اسفار، ان کے شاہی خاندان، متعدد تقاریب میں ان کی شرکت سمیت دیگر سرگرمیوں کو جس طرح ضبط تحریر کیا ہے وہ نہ صرف منفرد ہے بلکہ پڑھنے والوں کو وقت کی تنگ دامنی کے باوجود پڑھنے کا لطف دیتا ہے۔ پانی پت سے جب آپ گزرے تو یہاں کی تاریخی جنگوں کے علاوہ آپ نے خواجہ الطاف حسین حالی کا ذکر کیا، جو یہیں کے پروردہ تھے۔ جن کی مسدس اور مقدمہ شعر و شاعری سمیت دیگر کتابیں اہل دانش و بینش کے زیر مطالعہ رہتی ہیں یا رہ چکی ہیں۔ ان کے علاوہ زیر نظر مضمون میں قاری کو کہیں پر الجھاؤ یا مضمون کی طوالت کا احساس نہیں ہوتا ہے، بلکہ قاری اس جستجو میں رہتا ہے کہ آگے ذکر کئے گئے مقامات اور شخصیات کے متعلق ان پہلوں سے واقف ہو سکے جن سے تا حال وہ انجان ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آپ کے قلم میں مزید ترقی دے۔ آمین!

● **پروفیسر محمد اقبال، سابق وائس چانسلر جامعہ ہمدرد، نئی دہلی (موبائل:9873137770):**

Dear *Shah Imran Hasan* Sb,

I am happy to read about yourself and feel proud of your literary talent and achievements in a very young age. May Allah keep you happy, healthy and prosperous!

Thank you so much for sending me the maiden issue of "Aap Beeti" Urdu Quarterly. A cursory glance over its contents seems to assure that this would make an interesting reading material. My heartiest greetings and best wishes for this noble initiative.I shall try to mobilize a few 'Urdu-knowing' friends, who are very few unfortunately, to become the annual subscriber of this apparently promising periodical.

Most of the items included in the first issue are interesting and well-produced. However, the level of proofreading leaves enough to be desired, and requires greater attention in future.

I take the liberty of attaching herewith a small write-up, a personal sketch of a known personality in our Urdu literature, Dr Abid Raza Bedar. If you find it worth reading, may kindly consider it for inclusion in the next issue of "Aap Beeti". You are free to insert changes required for purpose of editing.

With thanks and regards.(*Prof. Muhammad Iqbal*)

...

ماضی، حال اور مُستقبل کو
فکری اور اقداری تسلسل میں باندھتے ہوئے ___

گنگا جمنی تہذیبی روایت کے فہم وادراک

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لئے!
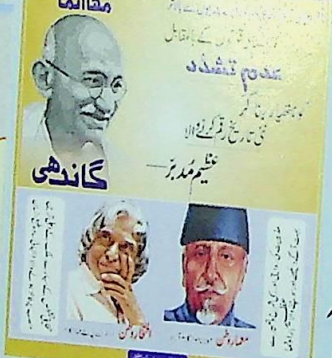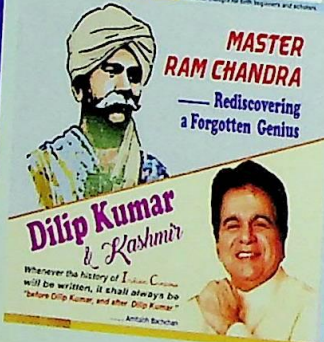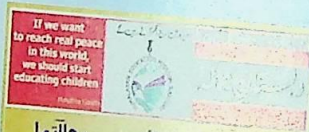
اور
تلاش وتوسیع
کا سنجیدہ
اور
غیر جانبدارانہ
اظہار وابلاغ

ایک مکمل جریدہ | کثیر لسانی ششماہی ڈائجسٹ

دبستانِ ہمالہ

اُمید ہے کہ صاحبانِ علم ودانش اور سنجیدہ قارئین
ہماری کاوش کو ___ غیر روایتی ترتیب وپیشکش
اور نئی فکری جہات کے ساتھ پسند فرمائیں گے

ترتیب وتہذیب:
فاروق مضطر

ہمالین کیمپس وارڈ نمبر:9، راجوری (جموں)؛ 185131

رابطہ: 7889316788,9906355140, 9419184689, 7006452955,9419171296, 9419170905
dabistanhimala@gmail.com

July, August, September 20

KITABI SILSILA AAPBEETI -2 (Book Series)

Editor
Shah Imran Hasan

Honorary Editor
Dr Mohd Saleem

شمارہ:3
1974
اشاعت جدید
ستمبر
2023ء

بیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں جموں و کشمیر
سے شائع ہونے والا رجحان ساز ادبی مجلہ

دھنک

معیار و اقدار کا نیا میزان

ترتیب و تہذیب
فاروق مضطر

پیشکش: دبستانِ ہمالہ

رابطہ: شہر یار "دبستانِ ہمالہ" ہمالین کیمپس؛ وارڈ نمبر:9، راجوری (جموں)
9419171296
9906355140
9419170905
9419184689
dabistanhimala@gmail.com

Makki Masjid Colony, Madanpur Khadar Extn., Part 3, Gaushala Road, Sarita Vihar, New Delhi-110076
Mob: 9810862382 | E-mail: aapbeetiquarterly@gmail.com